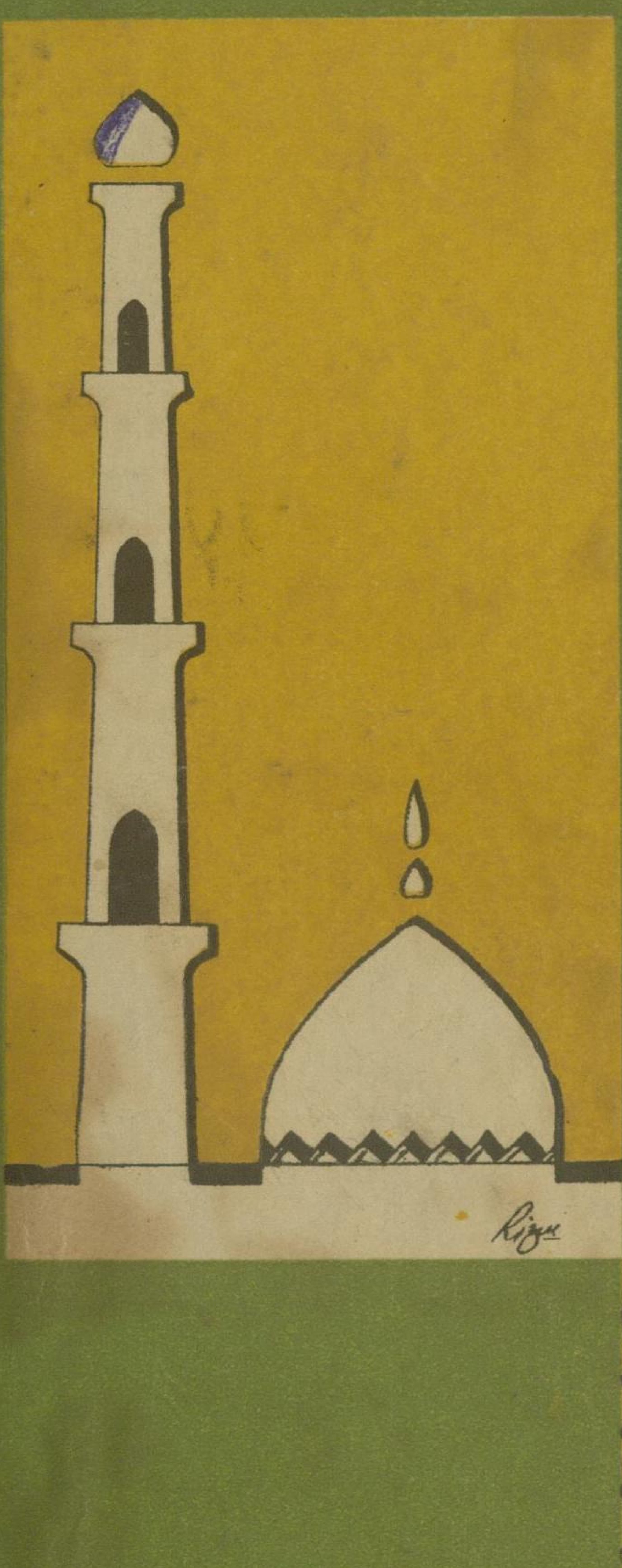
الخطبات الاحمدیہ

فی

العرب

والسیرت المحمدیہ



مصنفہ

سرسید احمد خاں

نفیس اکیڈمی کراچی

الخطبات الاحمدیہ

فی

العرب والسیرۃ المحمدیہ

مصنفہ

سر سید احمد خاں

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ ـــــــــ کراچی نمبر ۱

قیمت:۔ بارہ روپیہ

نفیس اکیڈیمی کا شائع کردہ

پہلا ایڈیشن: ——————— مارچ ۱۹۶۴ء

کتابت: ——————— انوری بیگم دہلوی

طباعت: ——————— جاوید پریس کراچی

فہرست مضامین کتاب خطبات الاحمدیہ

ردِّ عیسائیت اور سیرت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم

(از محمدؐ اقبال سلیم گاھندری)

سر سید ہماری زبان وادب کے ان پانچ بڑے معماروں میں سرفہرست ہیں۔ جن کی بدولت اُردو تحریر کو ایک انداز ایک اسلوب اور ایک پیرایۂ بیان میسر ہوا۔ ادیب انشاپرداز، محقق اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ہی مذہبی علوم میں بھی ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ اور مذہب کا تقابلی مطالعہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ بڑے باہمت اور غیرت مند مسلمان بھی تھے چنانچہ جب ان کے ہم عصر سر ولیم میور گورنر آگرہ و اودھ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات شائع کی۔ اور اس میں نہ صرف تعلیمات اسلام بلکہ آنحضرت کے ممتاز خاندان اور حضورؐ کے جدامجد حضرت اسمٰعیلؑ کی شرافتِ نسب کے بارے میں دور از کار خلاف واقعہ اور گمراہ کن باتیں لکھیں تو سر سید احمد خاں کے جذبۂ دینی کو سخت ٹھیس لگی۔ اور انھوں نے سر ولیم میور کی رسوائے زمانہ کتاب کی غلطیوں اور تحریفوں کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر سید کی مشہور کتاب خطبات احمدیہ سر ولیم میور کی .... "لائف اوف محمدؐ" کا بہترین اور مُسکت جواب ہے۔ سر سید احمد خاں نے اپنی اس محققانہ کتاب میں عہد نامہ عتیق، زبور، تورات، اور قدیم انبیاء بنی اسرائیل کے اور صحیفوں اور عہد نامہ، جدید کے حوالہ جات سے حضرت اسمٰعیلؑ کی ذاتی اور خاندانی شرافت، نیز حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور — پیغمبرانہ خصوصیات و امتیازات کو جدید ترین اصول تاریخ و تنقید کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔

آج ایک ولیم میور کی جگہ پچاسوں ولیم میور پیدا ہو چکے ہیں، گولڈ زیہر، منٹگمری واٹ اور آربری جیسے بہت سے افترا پرداز پوری قوت کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر افشانیوں اور افتراپردازیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر مسلمان حق وصداقت کی حمایت کے لئے کمربستہ ہو جائے اور جس سے جو کچھ ہو سکے، اور جس جس طرح ممکن ہو، حق اور صداقت کی حمایت کرے، آج عیسائیوں کا حملہ ہمیشہ سے زیادہ تیز اور ہمیشہ سے زیادہ قوت د

شدت کے ساتھ جاری ہے، عیسائی اہل قلم، قلم کے زور سے اور اہل ثروت اپنی دولت و ثروت کے زور سے ہماری معصوم اولاد کو اسلامی تعلیمات سے ناواقف پاکر جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونکنے پر تلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے وہ احساس جس کی بنا پر سر سید مرحوم کی یہ کتاب "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ شایع کی جارہی ہے۔

یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہماری نئی نسل اسے غور سے پڑھے، تاکہ عیسائیت کے دجل و فریب کو سمجھنے کی ان میں علمی استطاعت پیدا ہو۔ اور مغربی مفکرین کے زہریلے اور ایمان کُش پروپیگنڈہ کا مبسوط، مدلل اور محققانہ جواب بھی دے سکیں۔

مُقدّمہ

(از جناب شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

سرسید کے ذاتی عقائد خواہ کچھ ہی ہوں۔ بعض اسلامی مسائل کے متعلق اُن کے خیالات خواہ کتنے ہی غلط ہوں شق صدر اور معراج۔ نبوت اور رسالت۔ وحی اور الہام۔ دعا اور اس کی استجابت۔ جنت اور جہنم۔ معجزات اور خرق عادات۔ ملائکہ اور ابلیس۔ جن اور شیاطین وغیرہ کے متعلق خواہ وہ کچھ ہی تاویلات کرتے ہوں، علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کے نزدیک خواہ وہ کتنے ہی کافر ملحد۔ مرتد۔ بے ایمان۔ دجال اور کرشتان ہوں، یہ سب کچھ درست اور ٹھیک سہی، مگر اس حقیقت اور واقعیت میں بھی کچھ شبہ اور شک نہیں کہ مسلمانوں کی ہمدردی۔ اسلام کی محبت اور سب سے بڑھ کر حضور رسول مقبول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے والہانہ عشق اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اسی عشق و محبت کا سب سے بڑا مظاہرہ اُس وقت ہوا جب ۱۸۶۱ء میں سر ولیم میور لفٹیننٹ گورنر ممالک آگرہ و اودھ کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چار ضخیم جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی جس کے متعلق بقول مولانا حالی۔ عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا۔" نیز اکثر انگریزوں کا خیال تھا کہ "اسلام کے متعلق جو ٹھیک اطلاعیں سر ولیم میور نے اہلِ یورپ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں" مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت گمراہ کن واقعات اور نہایت غلط اور بیہودہ الزامات سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس کے ہر صفحہ سے اُس تعصب اور بغض کا اظہار ہوتا تھا جو عیسائی دنیا کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات سے ہے۔ یہ کتاب ایسے ڈھنگ اور ایسے پیرایہ میں لکھی گئی تھی کہ اہلِ یورپ اسے پڑھ کر آنحضرتؐ کی دشمنی میں اور زیادہ بڑھ جائیں اور مسلمان انگریزی خوانوں کے دلوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ اور مطہر زندگی کے متعلق شبہات اور شکوک پیدا ہو جائیں۔ یہ کتاب سر ولیم میور نے ایک مشہور یورپین پادری پی۔ فنڈر کی فرمائش اور اصرار سے لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس میں وہ تمام جوہر موجود تھا۔ جو پادریوں کے دلوں میں اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے بھرا ہوا ہے۔

اُس وقت مسلمانوں میں آج کل جیسا قحط الرجال نہ تھا۔ بلکہ بڑے بڑے فاضل اور جید علماء موجود تھے۔

جن کی ساری عمر قال اللہ اور قال الرسول میں گذری تھی۔ جنھوں نے مختلف نیہ مسائل پر سینکڑوں کتابیں لکھی تھیں۔ اور لکھ رہے تھے۔ مگر پورے ملک میں سے ایک عالم کے بھی کان پر جوں نہ رینگی اور کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ یہ اسلام اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کتنا بڑا اٹیم بم پھینکا گیا ہے۔ اور اسے پڑھ کر کتنے سادہ لوح اور ناواقف انگریزی خواں مسلم نوجوان ذات نبوی سے بدظن ہوکر عیسائیت کی آغوش میں چلے جائیں گے! اس ملک کے مسلمانوں میں سے بلکہ صحیح طور پر یوں کہئے کہ ایران و ترکستان۔ عرب و عراق۔ شام و مصر۔ تونس و طرابلس الجیریا و مراکش غرض تمام دنیائے اسلام میں سے صرف سرسید ایسا پیدا ہوا جو اگرچہ انگریزی نہیں جانتا تھا مگر اُس نے اس کتاب کو منگوایا اور اُس کا ترجمہ کروا کے اُس کے مضامین کو پڑھا تو اُس کا دل جل کر کوئلہ ہوگیا۔ چنانچہ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اُس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا۔ اور دلی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیر آباد سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ یہ بھی اُس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کے ہمراہ میں بھی گیا تھا۔ گو اُس وقت تک میری سرسید سے جان پہچان نہ تھی۔ مگر چونکہ ہم اُن ہی کی کوٹھی میں ٹھیرے تھے (اس لئے) اُن کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہوکر بیٹھتے تھے (تو) اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے۔ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔ اُسی وقت ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار جن سے اُس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہٖ نقل کئے گئے ہیں ایک مولوی سے انتخاب کرا رہے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا پختہ ارادہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے"۔

سرسید اس کتاب کا جواب علی گڑھ ہی میں بیٹھ کر لکھتے اور یہیں سے شائع کرتے۔ مگر اس راہ میں مشکل یہ آپڑی کہ مسلمانوں کے جتنے نایاب اور قیمتی کتب خانے اس ملک میں تھے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ میں قریباً سب تباہ اور برباد ہو گئے اور جن کتابوں کی اس کتاب کے جواب کے لئے ضرورت تھی۔ وہ یہاں کہیں سے نہیں ملیں، اور جب تک کتابیں فراہم نہ ہوں اُس وقت تک جواب لکھنا ناممکن تھا، کوئی دوسرا ہوتا تو ایسے موقع پر اور ایسی حالت میں ہمت ہار کر بیٹھ جاتا۔ مگر اولوالعزم سید نے اس روک کی پروانہ کی اور دل میں سوچا کہ ؎

اگر ٹھنڈک میں چلنا نہ آیا میسر　　تو پہنچیں گے ہم دھوپ کھا کھا کے سر پر

یعنی اگر کتابیں یہاں نہیں ملتیں تو میں لندن جا کر کتابیں مہیا کروں گا اور پھر اس کتاب کا جواب لکھوں گا۔

مگر لندن کے سفر کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور روپیہ سرسید کے پاس تھا نہیں (اُس زمانہ میں گورنمنٹ نے سرسید کے فرزند سید محمود کو ولایت میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کچھ وظیفہ دیا تھا، مگر وہ اتنا کم تھا کہ خود سید محمود کے لئے کافی نہ تھا، سرسید کے لئے کہاں سے کافی ہوتا) ۔ سرسید سرکاری ملازم تھے اور تنخواہ اتنی نہ تھی کہ خانگی اخراجات میں سے کچھ پس انداز کر کے جمع کر سکتے ۔ کچھ سرمایہ بھی پاس نہ تھا کہ جو اس وقت کام آتا ۔

مگر آفریں ہے اس عاشقِ رسولؐ پر کہ اُس نے اپنے جنونِ عشق میں کسی مشکل اور کسی وقت کی پروانہ کی اور جس طرح بھی ہو سکا لندن روانہ ہو گیا ۔ سرسید کے نہایت ہی گہرے دوست نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں لکھتے ہیں کہ :-

"جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا، مگر اُنھوں نے اپنا (نہایت قیمتی) کتب خانہ فروخت کر ڈالا ۔ اپنے گھر اور کوٹھی کو رہن رکھ دیا اور لندن کے سفر کی تیاری کی ۔" (حیات جاوید صفحہ ۲۰۳)

سرسید کے بعض مخالف کہا کرتے ہیں کہ سرسید کا مقصد لندن جانے سے اسلام اور پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حمایت اور نصرت میں کتاب لکھنے کا نہ تھا، بلکہ اس سفر کا حقیقی مقصد اکسفورڈ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرنا تھا ۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسید کا مقصد سفرِ ولایت سے ولایت کے طریقہ تعلیم کا معائنہ تھا ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ضمنی تھیں ۔ اصل مقصد سرسید کا سفرِ ولایت سے اپنے محبوب آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے اعتراضات کا دور کرنا تھا ۔ چنانچہ سرسید کے سوانح نویس حضرت شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ اپنی مشہور عالم کتاب "حیات جاوید" میں فرماتے ہیں :-

"سرسید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرا کر شائع کرنا تھا ۔ جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو ۔ اور جو غلطیاں کثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں اسلام کی حقیقت اور بانیٔ اسلام (علیہ السلام) کے کیرکٹر کو ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں اُن کو رفع کیا جائے ۔" (حیات جاوید صفحہ ۲۱۳)

دنیا میں ڈرپوک ۔ بزدل ۔ اور زمانہ شناس بھی لوگ بکثرت ہوتے ہیں اور ہر زمانہ میں ہوتے ہیں ۔ چنانچہ جب اس بات کی عام شہرت ہوئی کہ سید احمد خاں ولایت جا کر سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنا چاہتے ہیں تو سرسید کے بعض ملنے والوں نے اُن کو اس ارادہ سے بہت سختی کے ساتھ روکنا چاہا ۔ اور طرح طرح سے سمجھایا کہ "موقع ۔ وقت اور مصلحت ہرگز ایسی نہیں کہ ایسا اقدام کیا جائے ۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو، نوکری سے بھی جاؤ گے اور آزادی سے بھی ۔ نہ صرف تمھیں قید ہو گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ

پھانسی کا بھی حکم ہو جائے۔ غدر ابھی ہو چکا ہے۔ اور انگریز کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا۔ اس غصہ کی آگ میں تم بھسم ہو کر رہ جاؤ گے۔ پہلے ہی مرتے مرتے بچے ہو۔ جب تم "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا تھا۔ ویسی ہی بیوتوفی اب پھر کرنے لگے ہو۔ اور نئی کتاب لکھ کر اپنے سر پر نئی مصیبت لانا چاہتے ہو"۔

مگر کوئی بھی خطرہ اور کوئی بھی مصلحت سر سید کو اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکی اور وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو ولایت روانہ ہو گئے۔ (حیات جاوید صہ ۲۰۳) کتاب "لائف آف محمد" میں کیا ہے۔ اور کس طرح اس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ اور کتاب کو پڑھ کر سر سید کے دل پر کیا اثر ہوا؟ اور وہ کس طرح اس فتنہ عظیمہ کے استیصال کے لئے کھڑے ہوئے؟ اس کی کیفیت خود سر سید اس طرح لکھتے ہیں۔

"جب یہ کتاب (لائف آف محمد) چھپی اور ہندوستان میں پہنچی تو لوگوں نے اس کو نہایت شوق و ذوق سے پڑھا۔ مگر جب اُن کو یہ بات دریافت ہوئی کہ مصنف نے اسلام کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی نہایت سیدھی سادھی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے ہی سے اس کتاب کا اس طرح لکھنا مقصود اور مرکوز خاطر تھا۔ تو اُن کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر جو نوجوان مسلمان طالب علم انگریزی علم کی تحصیل کرتے تھے اور اپنے دینیات اور الٰہیات سے محض ناواقف تھے۔ اُن میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگر سر ولیم میور صاحب نے سیدھی سادھی اور صاف باتوں کو بھی بڑے پہلو پرے جا کر لکھا ہے تو فی الواقع اُن کی اصلیت کیا ہے؟

میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اُسی زمانہ میں میں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے متعلق ایک کتاب اس طرح پر لکھی جائے کہ

۱ ۔ جو جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں اُن کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کے ترتیب سے لکھا جاوے۔

۲ ۔ اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور اُن کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے اُن کو جُداگانہ اُسی ترتیب سے جمع کیا جاوے۔

۳ ۔ اور جو محض جھوٹ اور افترا و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور حمقا کو دام تزویر میں پھنسانے والے لوگوں یا حق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں اُن کو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جاوے اور اُن ہی کے ساتھ اُن کے غلط اور نا معتبر ہونے کا ثبوت اور اُن کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جاویں۔

مگر میں اپنے اس ارادہ کو بہت سے موانعات کے سبب سے پورا نہ کر سکا۔

ا۔ جس میں سب سے بڑا اپنی فکر معاش میں مبتلا رہنا تھا۔

ب۔ اور اس سے بھی بڑا کسی کا میرے ارادہ کے مدد و معاون نہ ہونا تھا۔

ج۔ اور علاوہ اس کے اس کام کے لئے بہت سی پرانی کتابیں جن کو قدیم مصنفوں نے تصنیف کیا ہے درکار تھیں جو مجھ کو بہ سبب برباد ہوجانے قدیم کتب خانوں کے دستیاب نہ ہوسکیں۔ اور یہ بھی ایک قوی سبب اس ارادہ کے پورا نہ ہونے کا ہوا۔

مگر اس پر بھی میں مختلف اوقات میں مختصر طور سے مختلف مضامین اور مسائل مذہب اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر کچھ کچھ لکھتا رہا۔ چنانچہ ان ہی تحریروں میں وہ بارہ مضمون ہیں جو بہ عنوان بارہ خطبوں کے لکھے گئے ہیں۔ اور جن کو میں نے اس ایک جلد میں جمع کر دیا ہے۔"

لندن پہنچ کر سرسید محلہ میکلن برگ سکوئر کے مکان نمبر ۲۱ میں مقیم ہوئے اور رہائش کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد اُنھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کتاب لکھنے کی تیاری میں مصروف ہوگئے اس سلسلہ میں سب سے اول مرحلہ کتابوں کی فراہمی تھی، جن کے بغیر کتاب نہیں لکھی جا سکتی تھی اور خاص اسی غرض کے لئے اُنھوں نے لندن کا دور دراز سفر اختیار کیا تھا۔ یہ کتابیں اُنھوں نے تین طریقوں سے حاصل کیں:۔

(۱) برٹش میوزیم کے نادر کتب خانہ سے بعض کتابیں منگوائیں۔

(۲) انڈیا آفس کی لائبریری سے بھی استفادہ کیا۔

(۳) اسمار الرجال اور اسلامی تاریخ کی بعض عربی کتب جو لندن میں نہ مل سکیں وہ مصر سے قیمتاً منگوائیں۔

(۴) بعض قدیم عربی تاریخیں فرانس اور جرمنی کے مستشرقین نے نہایت محنت سے تلاش کر کے اور اُن کو بڑی قابلیت سے ایڈٹ کر کے متعدد جلدوں میں چھپوائی تھیں۔ اُن کتابوں کے لئے فرانس اور جرمنی میں خطوط بھیجے اس قسم کی کتابوں کی قیمتیں بڑی زبردست تھیں۔ مگر سرسید نے جس طرح بھی ہو سکا قیمتیں ادا کیں اور کتابیں فراہم کیں۔

(۵) جواب لکھنے کے لئے صرف عربی ہی کی نہیں بلکہ بعض کتابیں لیٹن اور انگریزی کی بھی مطلوب تھیں جو بہت پرانی اور نایاب تھیں، وہ سرسید نے تمام لندن میں پھر کر پرانی کتابوں کے تاجروں سے نہایت گراں قیمت پر خریدیں۔

اور جب یہ سارا مصالحہ فراہم ہوگیا تو سرسید نے اُن فراہم شدہ لیٹن اور انگریزی کتابوں کے ضروری

مقامات کا ترجمہ کروایا۔عربی کتابوں سے خود ترجمہ کیا۔اور پھر کتاب لکھنی شروع کی۔

جیسا کہ ناظرین کرام کتاب کی فہرست مضامین میں پڑھیں گے، سرسید نے اُس کو بارہ ابواب اور ایک دیباچہ پر تقسیم کیا تھا۔ اور ہر ایک باب کو "خطبہ" کا نام دیا تھا۔کتاب کا پورا نام الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ ہے۔کتاب تالیف کرتے وقت سرسید نے بعض اور نام بھی اس کے تجویز کئے تھے۔مثلاً "مواعظ احمدیہ" اور "سیرۃ مصطفوی" وغیرہ۔مگر آخر کو یہی نام قرار پایا جو اوپر لکھا گیا۔

سرسید کو اس کتاب کی تالیف وتدوین میں جن مشکلات کا سامنا ہوا۔اخراجات کی وجہ سے جو پریشانیاں اُن کو لاحق ہوتیں۔کوئی مددگار ساتھ نہ ہونے کے باعث جس قدر دقتیں اُنھیں پیش آئیں، اُن کا ذکر اُن خطوط میں مفصل موجود ہے جو اُن ایام میں سرسید نے اپنے نہایت ہی گہرے دوست نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں کو لکھے۔اور جن کو میں نے "مکتوبات سرسید" میں جمع کردیا ہے۔

جب کتاب اُردو میں تیار ہوگئی تو سرسید نے اُس کا ایک خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کروایا۔اور اُسے "ایسیز آن دی لائف آف محمدؐ" (ESSAYS ON THE LIFE OF MOHAMMED.) کے نام سے لندن ہی میں ۱۸۷۰ء میں شائع کردیا۔کتاب پر چار ہزار روپیہ کے قریب لاگت آئی۔جو سرسید نے اپنی کتابیں۔گھر کا سامان، کھانا پکانے کے برتن بیچ کر۔سود پر قرض لے کر۔اپنے گہرے دوستوں سے چندہ کرکے بڑی مصیبت کے ساتھ پورا کیا۔ایک ایک کوڑی جمع کرکے سرسید نے عشقِ رسول صلعم پر قربان کردی۔اُس زمانہ میں نواب محسن الملک کو لکھا کہ "چاہے میں محتاج۔فقیر۔بھیک مانگنے کے قابل ہوجاؤں۔مگر کتاب ضرور چھپواؤں گا۔تاکہ جب قیامت کے دن میرا نام پکارا جائے تو خدا فرمائے کہ سید احمد کو بلاؤ جو اپنے نانا کے نام پر فقیر ہوکر مرگیا۔"

روپیہ سارا خرچ ہوگیا تھا اتنا بھی پاس نہ رہا تھا کہ واپسی کا کرایہ ادا ہوتا۔نہ معلوم کس طرح سے سرسید نے اس کا انتظام کیا اور ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان پہنچ گئے۔

اُن مہتم بالشان بیانات کے علاوہ جو سرسید نے بکمال تحقیق اس کتاب میں درج کئے ہیں اور جس قدر محنت اور کاوش کے ساتھ اُنھیں جمع اور مرتب کیا ہے۔کتاب کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔جو ہم بہت اختصار کے ساتھ یہاں لکھتے ہیں:

(۱) سرسید سے پہلے کسی مسلمان مصنف نے عیسائیوں کے اعتراضات کے ایسے مدلل اور محققانہ جواب پر کوئی مضمون یا کتاب خود عیسائیوں کے مرکز میں بیٹھ کر۔اُنہی کے کتب خانوں سے اخذ وانتخاب کرکے اُن ہی کی زبان میں آج تک نہیں لکھی تھی۔

(۲) اصل کتاب اگرچہ ایک متعصب پادری کی لکھوائی ہوئی اور ایک متعصب انگریز کی لکھی ہوئی ہے مگر سرسید نے اس کا جواب دیتے وقت نہایت اعتدال اور شرافت کا ثبوت دیا ہے. کوئی سخت لفظ انھوں نے سر ولیم میور کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ نہ اُن پادریوں کو بُرا بھلا کہا ہے جنھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کذب بیانیوں کا ایک طوفان عظیم کھڑا کر رکھا ہے۔ اپنے خطبات میں جو بات بھی سرسید نے بیان کی ہے۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے بیان کی ہے۔ اور کتاب میں مناظرانہ رنگ کو بالکل دخل نہیں دیا۔

(۳) اس کتاب کا طرز استدلال نہایت محققانہ اور عالمانہ ہے۔ اور اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے افضل اور بہتر ہے، جس مسئلہ پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ اُس پر نہایت سیر حاصل اور قابل اطمینان طور پر بحث کی ہے اور کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ جذبات کی رو میں مصنف کا قلم جادۂ اعتدال سے کبھی بھی باہر نہیں ہوا۔

(۴) اس قسم کی تحریروں اور کتابوں اور مقالوں میں عام طور سے خصم کو الزامی جواب دے کر مرعوب یا خاموش ہو جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر سرسید نے اپنی اس تالیف میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ جس مسئلہ کو بھی لیا ہے، اُس پر تحقیق اور تنقید کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور جہاں کہیں الزامی جواب دیا بھی ہے۔ وہاں تحقیقی جواب دینے کے بعد اس کا اظہار کیا ہے۔

اس بے نظیر اور بے عدیل کتاب کا خلاصہ انھوں نے انگریزی میں لندن ہی میں چھپوا دیا تھا۔ مگر اصل اردو کتاب جو انگریزی کی نسبت بہت زیادہ مفصل، مکمل اور مشرح تھی۔ اُس کا مسودہ ولایت سے واپس آنے کے بعد سرسید کے پاس یونہی پڑا رہا۔ آخر سرسید نے ۱۸۸۷ء میں اُسے تصانیف احمدیہ جلد دوم کے ساتھ آخر میں شائع کیا۔

یہ کتاب سر ولیم میور کی لائف آف محمدؐ کے صرف پہلے حصے کا جواب ہے۔ صد ہزار افسوس کہ سرسید کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ پوری انگریزی کتاب کا جواب چار ضخیم جلدوں میں لکھتے۔ جیسا کہ انگریزی کتاب ہے۔ مگر تاہم جو کچھ اور جتنا کچھ سرسید لکھ گئے ہیں اُس کی بھی اُردو میں کوئی دوسری نظیر موجود نہیں ہے۔ کاش کوئی ایسا صاحب دل اور فاضل شخص پیدا ہو، جو سرسید کے نامکمل کام کو پورا کر دے۔ اور سر ولیم میور کی پوری کتاب کا پورا جواب تیار کر دے۔ یہ اسلام کی خاص خدمت ہوگی اور وہ شخص خدا تعالیٰ کے نزدیک بے انتہا اجر کا مستحق ہوگا۔

اس کتاب کے جہاں تک معلوم ہے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) پہلا اڈیشن ۴۵۹ بہت بڑے صفحات پر ٹائپ میں جس میں متعدد نقشے اور شجرے بھی نہایت خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ سرسید نے تیار کروا کے لگوائے تھے۔ کتاب علی گڑھ انسٹیٹوٹ پریس میں لالہ گلاب رائے کے اہتمام سے ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں چھپی تھی۔ یہ اس کتاب کا بہترین ایڈیشن ہے اور آج تک اس سے زیادہ عمدہ اڈیشن اور کوئی نہیں چھپا۔ مگر آج کل بالکل نایاب اور عنقا ہے۔ اتفاق سے محمد احمد پبلک لائبریری لاہور میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

(۲) بعد میں مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ سے اس کا ایک اڈیشن $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ سائز پر شائع ہوا تھا

(۳) ایک اڈیشن بہت عرصہ ہوا۔ وکیل ٹریڈنگ ایجنسی امرتسر نے $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ سائز پر شائع کیا تھا مگر نہایت ہی ناقص۔ غلط اور بدخط تھا۔ کتاب کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔

(۴) ستمبر ۱۹۶۳ء میں اس کا ایک جدید اڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور نے ٹائپ میں نفاست کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ اور صفحات ۸۰۳ ہیں۔ مگر اس میں نقشے اور شجرے نہیں ہیں۔

اب اس کتاب کا پانچواں اور آخری اڈیشن نفیس اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع ہو رہا ہے، اور آپ کے سامنے ہے۔

خاکسار محمد اسمٰعیل پانی پتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

عجائبات دنیا میں سب سے زیادہ عجیب وہ خیال ہے۔ جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں۔ مذہب اُس امتیاز کا نام ہے جو انسانوں کے افعال سے علاقہ رکھتا ہے۔ اور جس کے سبب انسانوں کے افعال اچھے یا بُرے یا نہ اچھے نہ بُرے خیال کئے جاتے ہیں کیونکہ اگر انسان کے افعال میں یہ تمیز نہ ٹھیرائی جائے تو کسی مذہب کا وجود باقی نہیں رہتا۔

تمام خیالات جو انسان میں پیدا ہوتے ہیں اور تمام یقین جو انسان کسی چیز پر رکھتا ہے اُس کا منشا اُن خیالات اور یقین کے سوا کچھ اور چیزیں ہوتی ہیں۔ جو اُن خیالات اور یقین کے اسباب سمجھی جاتی ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ وہ خیال جس کو مذہب کہتے ہیں۔ بغیر کسی خارجی اسباب کے اور بغیر تجربہ اور امتحان کے اور بدون کسی معقول ثبوت کے یکایک دل سے اُٹھتا ہے اور اس لئے وہی اُس کا مخرج سمجھا جاتا ہے اور پھر اُس پر ایسا یقین ہوتا ہے کہ کسی آنکھ دیکھی چیز پر بھی نہیں۔

اس تعجب پر اور تعجب یہ ہے کہ اُس بن دیکھی چیز اور ان سمجھی بات اور بے دلیل خیال کا لوگوں کی طبیعت پر ایسا سخت اثر ہوتا ہے کہ وہ اثر انسان کے تمام افعال پر اور قدرتی جذبات پر جو انسان میں خدا نے پیدا کئے ہیں غالب ہو جاتا ہے اور جو جوش اور ولولہ اُس از خود پیدا ہوئے خیال سے انسانوں کی طبیعتوں پر ہوتا ہے۔ کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا۔ گو کہ اُس دوسری چیز کے صحیح اور یقینی ہونے کے لئے کیسی ہی عمدہ عمدہ دلیلیں اور کیسے ہی قطعی ثبوت موجود ہوں۔

اگر وہ خیال تمام انسانوں میں مختلف نہ ہوتا تو شاید یہ کہا جا سکتا کہ تمام عالم کا اُس پر یقین رکھنا ہی اُس کی سچائی کا ثبوت ہے مگر تعجب تو یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر فرقہ بلکہ ہر فرد بشر میں وہ خیال ایسا مختلف رہا ہے کہ کسی ایک پر بھی یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور اس پر تعجب یہ ہے۔ کہ ہر شخص کو یہی یقین ہے کہ میرا ہی خیال اور سب کے خیالوں سے

بالکل صحیح اور بالکل سچا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح یونانی اپنے خدا اور دیوتا پر اور مسلمان و یہودی اپنے ایک خدا پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں اسی طرح ہندو اور مصری اپنے تنیتیس کروڑ دیوتاؤں پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں۔

کیا یہ مسئلہ کہ تمام چیزیں ایک ہی کل کے جزو یا اُس کی عین یا وہ بمنزلہ جان اور یہ بمنزلہ جسم کے ہیں صحیح ہے کیا یہ سب مختلف چیزیں جو ہم کو دکھائی دیتی ہیں سب ایک ہیں کیا نور و ظلمت اور کالا اور سفید دونوں یکساں ہیں، جیسا کہ ایک عارف باللہ کہتا ہے ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یا یہ مسئلہ صحیح ہے کہ تمام چیزوں کا اسی سے ظہور ہے وہی ظلمت کا باعث اور وہی نور کے ظہور کا سبب ہے۔ وہی آسمانوں پر کڑکاتا ہے اور وہی زمینوں پر پانی برساتا ہے وہی ستاروں کو چمکاتا ہے اور وہی پھولوں کی کلیوں کو کھلاتا ہے۔ اُسی کا جلوہ بہشتوں کی کہاوت اور اُسی کا پردہ دوزخوں کی آفت ہے۔ غمگین دل کا غم شاداں دل کی شادی اُسی سے ہے وہ کسی جگہ نہیں اور سب جگہ ہے وہ کسی میں نہیں اور سب میں ہے۔ عابد کے نورانی سینے اور فاسق کے بریاں دل اور معشوق کے عاشق کش ابرو اور عاشق کی گریاں چشم، سب میں اُس کی یکساں جگہ ہے۔ جس طرح کہ وہ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ اُسی طرح سے وہ باریک سے بال میں بھی ہے۔ وہ سب کو دیکھتا ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے مگر اس کا جاننا یا علم ہم سے دو درجہ کم ہے۔ کیونکہ وہاں ماضی اور استقبال نہیں ہے بہرحال اُس بن دیکھی جناب اور ان سمجھی ذات کو جو کہو سو کہو۔ مگر ان تمام مشکلوں پر ہم کو یہ مسلمانی مسئلہ کہ "انا عند ظن عبدی بی" اور بھی مشکل میں ڈالتا ہے۔

رَبِّی اَنْتَ عِنْدَ ظَنِّی رَحِیْم فَارْحَمْ عَلَیَّ

پھر ہم کو اور زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ تمام مختلف خیالات جو لوگوں کے دلوں میں ہیں اور جو مذہب کہلاتے ہیں وہ ایک ہی مخرج سے یعنی دل سے نکلے ہیں اور دل کے اُس فعل کا جس سے یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں اعتقاد نام رکھا جاتا ہے۔ پس اگر مدار مذہب کا اعتقاد ہو تو ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط ٹھیرانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

کیا وجہ تمیز کی ہے اس سچی دلی پرستش میں جو ابراہیم کے باپ نے ایک بت کی کی اور اس سچے دل کے خیال میں جس سے ابراہیم نے اپنے باپ کے اُس بت کو توڑا۔

ایک ہی واقعہ حضرت مسیح کے قتل کا ہے جو کالوری کی پہاڑی میں بیت المقدس کے پاس گذرا اُن بے رحم قاتلوں نے اپنی دانست میں جو کچھ کیا مذہبی نہایت سچے اور مستحکم اعتقاد اور دل کے کپکپا دینے والے ایمانی جوش سے کیا۔ پس اُن دو گروہوں میں سے جو نہایت سچے دل سے اُس کو نہایت ہی نیک کام سمجھتے ہیں۔ اور جو نہایت پاک دلی سے اُس کو نہایت ہی بدکام جانتے ہیں کونسی چیز تفرقہ کرنے والی ہے۔

کیا وجہ تمیز کی ہے سینٹ پال کی اُس حالت میں جب کہ وہ دلی اعتقاد اور ابن کے جوش سے اُن لوگوں کا ساتھی تھا، جنھوں نے سینٹ اسٹیفن شہید کو سنگسار کیا۔ اور اُس حالت میں جب کہ اُس نے اپنے سچے دلی اعتقاد سے حضرت مسیح کو مانا۔

کیا چیز ہے جس سے ہم عمرؓ کی اُس حالت میں تمیز کریں جب کہ اُس نے لات و منات پر سچا دلی اعتقاد رکھ کر ابن عرب کے قتل پر کمر باندھی اور اُس حالت میں جب کہ اُس نے نہایت سچی دلی تصدیق سے کہا کہ اشهد ان محمداً رسول اللہ۔

یہ وہی عجیب خیال ہے جو دونوں طرف برابر نسبت رکھتا ہے اور جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں۔ پس ایسی ذو جہتین چیز کی جو ضدین میں برابر نسبت رکھتی ہو کسی جہت پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ ان تمام خیالوں میں سچا خیال یا تمام مذہبوں میں سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے۔ جو ضدین میں برابر نسبت رکھنے کے نقص سے پاک ہو۔

مذہب کیا چیز ہے؟ وہ ایک ایسا سچا اُصول ہے کہ جب تک انسان اپنے قوائے جسمانی اور عقلی پر قادر ہے اُس کے تمام افعال ارادی، جوارح، نفسانی، و روحانی کا اُسی اُصول کے مطابق ہونا چاہیے۔ پھر اگر وہ اُصول ایسے ہیں کہ صرف کسی قسم کے اعتقاد پر مبنی ہیں تو اگر متعدد لوگوں کا متضاد اُصولوں پر کسی وجہ سے اعتقاد ہے تو ایک کو سچا یا صحیح اور دوسرے کو جھوٹا یا غلط کہنے کی بجز تحکم کے اور کوئی وجہ نہیں۔ سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے۔ جس کی سچائی نہ کسی اعتقاد پر بلکہ حقیقی سچائی پر مبنی ہو۔ کیونکہ مذہب اعتقاد کی فرع نہیں ہے۔ بلکہ سچائی مذہب کی اصل یعنی عین مذہب ہے۔ اور اعتقاد اس کی فرع ہے۔ پس جب کہ ہم مختلف مذہبوں میں سے سچے مذہب کو پرکھنا چاہیں تو دیکھیں کہ وہ سچے اُصول کے

مطابق ہے یا نہیں؟

سچا اُصول کیا ہے؟ جہاں تک کہ انسان اپنے قوائے عقلی سے جان سکتا ہے وہ بجز قدرت یا قانون قدرت کے اور کچھ نہیں جس کی نسبت اسلام کے خدا نے یہ فرمایا کہ ما تری فی خلق الرحمٰن من تفاوتؕ فارجع البصر ہل تریٰ من فطورؕ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیرؕ

قدرت یا قانون قدرت کیا ہے؟ وہ وہ ہے جس کے بموجب اُن تمام چیزوں مادی یا غیر مادی کا جو ہمارے اردگرد ہیں۔ ایک عجیب سلسلہ انتظام سے وجود ہے اور ہمیشہ اُن ہی کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی اُن سے جُدا نہیں ہوتا۔ قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنادیا ہے بغیر خطا کے اُسی طرح پر ہوتا ہے۔ اور اُسی طرح پر ہوگا۔ پس وہی سچ ہے اور جو اُصول اس کے مطابق ہیں وہی سچے اُصول ہیں نہ وہ جن کی بنا ایک فانی قابل سہو و خطا وجود یعنی انسان کے اعتقاد پر منحصر ہو۔

قدرت ہم کو صرف اپنے وجود اور اپنے سلسلہ انتظام اور اپنے تعلقات ہی کے جو بے انتہا مخلوق میں پایا جاتا ہے سچائی نہیں دکھلاتی بلکہ اُس سے ایسے بھی اُصول پائے جاتے ہیں جس سے ہم اپنے افعال ارادی جسمانی اور روحانی کی بھلائی اور بُرائی بھی جان سکتے ہیں۔ اور جو کہ قدرت سچی اور کامل ہے تو ضرور ہے کہ وہ اصول بھی سچا اور کامل ہو، اور یہی کامل اُصول یا یوں کہو کہ وہ مذہب جس کے اُصول اُس کے مطابق ہیں وہی سچا مذہب ہونے کا مستحق ہے۔

یہ مت سمجھو کہ ہم قدرت یا قانون قدرت ہی کو مسبب یا اخیر سبب اس تمام کارخانہ کا سمجھتے ہیں۔ جس کا کوئی خالق نہ ہو جیسے کہ دہریوں کا مذہب ہے نعوذ باللہ منہا بلکہ قدرت کو تو ہم ایک قانون کہتے ہیں جس کا کوئی بنانے والا ہے اور اسی لئے ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ ایک ہی مسبب اور ایک ہی اخیر سبب پر ختم ہوتا ہے جس پر تمام چیزوں کی ہستی منحصر ہے۔ وہ جس کی ان پہچان ذات کو ہزاروں، لاکھوں کروڑوں ناموں سے لوگ پکارتے ہیں او میرے پیارے خدا تم پردہ میں تو ہو پر سب پر ظاہر ہو۔ ایسے جھوٹ موٹ کے پردہ سے کیا فائدہ۔

رشک آیدم وگرنہ نقابت کشودمے

دست ترا گرفتہ بعالم نمودمے

معاذاللہ توبہ توبہ میں نے کیا کہا کہیں کافر تو نہیں ہوگیا "الٰهی انت عبدی وانا ربك استغفراللہ استغفراللہ انت ربی وانا عبدك" پس آدمی کو چاہیے۔ کہ اس کارخانۂ قدرت سے اس کے بنانے والے کو اور اُس کی راہ کو یا اُس کی راہ بتانے والے کو تلاش کرے کہ یہی سیدھی سڑک سیدھا راستہ چلنے کا ہے۔

مذہب کی تمثیل میں علمائے اسلام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے کیسی کیسی غلطیاں کی ہیں۔ اور کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں بعضوں نے مالک اور غلام کی تمثیل دی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ مذہب اور شریعت کو مصالحِ قدرت اور اعمال کو اُس کے بدلہ یعنی جزا اور سزا سے کچھ مناسبت نہیں اور اس کے اوامر و نواہی میں بجز اس کے کہ مالک کا حکم بجالانا ہے اور کچھ فائدہ نہیں شاید ان لوگوں کا خدا ایسا ہو جو لغو کام کرنے کو کہے میرا تو خدا ایسا نہیں وہ تو نہایت دانا اور سب سے بڑا حکیم مطلق ہے۔ اُس کی تو کوئی بات بھی حکمت اور منفعت سے خالی نہیں۔

اس رائے کو تو شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی غلط ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ "قد یظن ان احکام الشریعۃ غیر متضمنۃ لشی من المصالح وانہ لیس بین الاعمال وبین ما جعل اللہ جزاء لها مناسبۃ وان مثل التکلیف بالشرائع کمثل سید اراد ان یختبر طاعۃ عبدہ فامرہ برفع حجر او لمس شجر مما لا فائدۃ فیہ غیر الاختیار۔ فلما اطاع او عصی جوزی بعملہ وھذا ظن فاسد تکذبہ السنۃ واجماع القرون المشهود لها بالخیر۔

بعض عالموں نے مالک اور بیمار غلام سے مذہب کی تمثیل دی ہے جس پر مالک نے اُس کے علاج کے لئے اپنا مصاحب مقرر کیا ہو اور اس مصاحب کے حکم کو ماننا باعثِ نجات اور نہ ماننا باعث درکات ٹھیرایا ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب بھی حجۃ اللہ البالغہ میں اسی رائے کو صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ" وظھر مما ذکرنا ان الحق فی التکلیف بالشرائع ان مثلہ کمثل سید مرض عبیدہ فسلط علیہم رجلا من خاصتہ لیسقیهم دواء فان اطاعوا اللہ اطاعوا السید ورضی عنہم سیدہم واثابہم خیرا ونجوا من المرض وان عصوہ عصوا السید واحاط بہم غضبہ وجازھم اسوء الجزاء وھلکوا من المرض۔

مگر میں اس کو نہیں مانتا اور پوچھتا ہوں کہ دوا کا کرنا باعث نجات کا تھا یا مصاحب کے حکم کا ماننا تھا؟ اگر بے حکمِ مصاحب کے بھی وہ دوا کرتا تو نجات پاتا یا نہیں، ضرور پاتا اِس لئے کہ اُس دوا سے نجات پانا قدرت کا قانون تھا جو کسی طرح بدل نہیں سکتا۔

بعضے عالموں نے مذہب کی تمثیل ایسے طبیب سے دی ہے جو نہ تو خود کسی چیز کو لمرت

بناتا ہو اور نہ کسی کو حلال ٹھیراتا ہو۔ بلکہ ہر چیز میں قدرت نے جو اثر رکھا ہے اُسی کو بتاتا ہو۔ تاکہ جو لوگ صحیح ہیں اپنے حفظ صحت کے اصول جانیں اور جو بیمار ہیں وہ حصُولِ صحت کی دوا کو پہچانیں اور مذہب بہ نسبت اس کے کہ صرف بیمار غلاموں ہی کے لئے ہو سب کے لئے عام ہو جائے۔

افسوس کہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں اس رائے کو نہیں مانتے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وانہ لیس الامر علیٰ ماظن من احسن الاعمال وقبحہا بمعنی استحقاق العامل الثواب والعقاب عقلیان من کل وجہ وان الشرع وظیفۃ الاخبار عن خواص الاعمال علیٰ ماہی علیہ دون انشاء الایجاب والتحریم بمنزلۃ طبیب یصف خواص الادویۃ والواع المرض فانہ ظن فاسد تجد السنۃ بادی امرائے۔

مگر میں اسی کو مانتا ہوں اور اسی کو سچا اُصول سمجھتا ہوں جو قانون قدرت کے بالکل مطابق ہے اور کتاب وسنت دونوں کو اسی کا موئید پاتا ہوں جو علم مذہب اسلام کی بنیاد ہیں۔ پس جہاں تک کہ سچے مذہب کی میں تحقیق کر سکا۔ میں نے اسلام ہی کو سچّا مذہب پایا اور اُمید ہے کہ جو لوگ سچائی کو دوست رکھتے ہیں وہ ہمیشہ صفائی اور سچائی سے اسلام کی سچائی کی تحقیقات کریں گے۔

مگر ایک مشکل یہ پیش ہے کہ جب اسلام کا نام لیا جاتا ہے۔ تو لوگ اُس مجموعۂ احکام کو جو اب احکام مذہبی سمجھے جاتے ہیں مذہب اسلام خیال کرتے ہیں۔ ہاں مجازاً تو اُن پر مذہب اسلام کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقتاً وہ مجموع من حیث المجموع بمعنی حقیقی' مذہب اسلام کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ موجودہ مسائل مذہب اسلام میں دو قسم کے اُصول واحکام شامل ہیں۔ ایک وہ جن کو خود شارع نے صاف صاف بیان کیا ہے۔ جو احکام منصوصہ کہلاتے ہیں اور ایک وہ جن کو عالموں اور مجتہدوں نے اپنے ذہن کی خوبی اور اپنے علم کی روشنی سے باستدلال دلالت النص یا اشارۃ النص یا قیاس کے قائم کیا ہے جو اجتہادیات کہلاتے ہیں اور جو بجز ایک قابل سہو وخطا وجود کی رائے کے اور کچھ زیادہ رُتبہ نہیں رکھتے۔ پس اِن دونوں قسم کے مسائل میں تمیز نہ کرنے سے آدمی طرح طرح کی سخت غلطیوں میں پڑ جاتے ہیں اور یہ وہی ترک امتیاز ہے کہ جب مسلمان اُس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا نام تقلید رکھتے ہیں۔ اور جب غیر مذہب کے لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں۔ تو اُس کو ایک حقیر نام تعصب یا جہل مرکب

یا ضلالت سے موسوم کرتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

پہلی قسم کے احکام بھی جن کا نام احکام منصوصہ ہے۔ دو قسم کے احکام ہیں ایک وہ جو اصلی احکام ہیں اور بلا شبہ وہ بالکل قانون قدرت کے مطابق بلکہ اُس کی جان ہیں اور دوسرے وہ جو اِن اصلی احکام کی حفاظت اور اُن کے بقار اور قیام کے لئے ہیں۔ پس جو کوئی مذہب اسلام کی سچائی اُن سچے قدرتی اُصولوں سے پرکھنی چاہے۔ تو اُس کو اُن دونوں قسم کے احکام کی اور اُن میں سے ہر ایک کے درجہ اور رُتبہ کی تمیز کرنی لازم ہے۔

علاوہ مذکورہ بالا دو قسموں کے ایک تیسری قسم بھی احکام مذہب اسلام میں ہے جو ذو معینین عبارتوں یا ناکامل سند یا مشتبہ سندوں سے قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم تو اجتہادیات میں داخل ہے اور دوسری قسم مذہب اسلام میں کچھ وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی۔ گو اُس پر اِس وجہ سے کہ اُس میں کچھ نقصان نہیں ہے عمل ہوتا ہو۔

پس یہ سچا مذہب اور وہ شخص جس کی معرفت ہم کو اُس کی تعلیم ہوئی۔ ہمارے بے انتہا ادب اور نا محدود ثنا وصفت کا مستحق ہے اور بلا شبہ اسی خطاب کے لائق ہے کہ "انت احب الی یا رسول اللہ من نفسی التی بین جنبی" چنانچہ ہم کو بہت بڑی خوشی اور مبارکی اسی بات کی ہے کہ ہم نے اُس کو نہ خُدا سمجھا اور نہ خدا کا بیٹا۔ نہ کوئی فرشتہ بلکہ ایک وحی بھیجا ہوا انسان جانا۔ مگر اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جانا۔ بابی انت وامی یا رسول اللہ ﷺ

دل و جانم فدایت یا محمدؐ
سرِ من خاک پایت یا محمدؐ

یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

آنحضرتؐ کی زندگی کے حالات جن کو مسلمان سِیَر اور انگریز لیف کہتے ہیں صرف دین دار مسلمان عالموں ہی نے نہیں لکھے۔ بلکہ غیر مذہب کے علماء اور مؤرخین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ وہ دونوں افراط و تفریط میں پڑ گئے، پہلوں کی آنکھوں میں تو کمال روشنی کے سبب چکا چوند آگئی۔ اور پچھلوں کی آنکھیں بجلی کی چمک سے بند ہو گئیں، پہلے تو شراب محبت کی سرشاری میں بات سے بھٹک گئے۔ اور پچھلے اُس رستہ کی ناواقفی سے منزل تک نہ پہنچے۔ پہلے تو یہ بھولے وہ کس کا بیان کرتے ہیں اور پچھلوں نے اُسی کو نہ جانا جس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔

کسی مشہور محدث نے بجز ایک کے جس کا ہم ابھی ذکر کریں گے کوئی خاص کتاب آنحضرت کی زندگی کے حالات میں نہیں لکھی۔ لیکن تمام محدثین نے جن کی سعی اور کوشش کا دُنیا پر بہت بڑا احسان ہے اپنی اپنی کتابوں میں اُن حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے۔ جو آنحضرت کی زندگی کے حالات سے متعلق ہیں۔ پس وہی حدیث کی کتابیں ہیں۔ جن سے کم وبیش آنحضرت کی زندگی کے حالات صحیح صحیح دریافت ہو سکتے ہیں اور جن کو معقول طرح پر ترتیب دینے سے اور صحیح کو غلط سے تمیز کرنے سے ایک معتبر تذکرہ آپ کی زندگی کا جمع ہو سکتا ہے۔

ابوعیسیٰ ترمذی نے جو سنہ ۲۰۹ ہجری مطابق سنہ ۸۲۴ء میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۲۷۹ ہجری مطابق سنہ ۸۹۲ء میں انتقال کیا اپنی مشہور کتاب جامع ترمذی کے سوا ایک اور کتاب بھی آنحضرت کے حالات میں لکھی ہے۔ "جو شمائل ترمذی" کے نام سے مشہور ہے۔ مگر اس میں آپ کی زندگی کے تمام حالات مُندرج نہیں ہیں بلکہ وہ خاص خاص باتیں اور عادتیں جو بالتخصیص نفسِ نفیس آنحضرتؐ سے متعلق تھیں مذکور ہیں۔ بااین ہمہ جس قدر حدیثیں آنحضرت کے حالات سے متعلق اُن مشہور حدیث کی کتابوں میں مندرج ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ جن کو ہم مثل کتاب اللہ کے بے غور اور بلا تحقیقات اندھادھوندی سے مان لیں۔ بلکہ ہم پر واجب ہے کہ اُن تمام حدیثوں کو خواہ وہ بخاری کی ہوں یا مُسلم کی اور جامع ترمذی کی ہوں یا شمائل ترمذی کی قبل اُن کے سچا قبول کرنے کے اُن کی سچائی اور صحت کی تحقیقات اُن اصول وقواعد کے ساتھ کرلیں جو اس کے لئے مقرر ہیں۔ اور جن کو ہم نے ایک جُداگانہ خطبہ میں بیان کیا ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو سخت غلطیوں میں پڑیں گے۔ کیونکہ بے سند حدیث مسلمانوں کے مذہب میں کوئی وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی کتاب تحفہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں "حدیث بے سند گوز شتراست"۔ مگر افسوس ہے کہ بہت ہی کم مصنف ہیں۔ جنھوں نے اُس ضروری اور نہایت ضروری اُصول کی پیروی کی ہو۔

ان حدیث کی کتابوں کے سوا جن کا ابھی ذکر ہوا۔ اور بہت سی کتابیں ہیں جو خاص آنحضرت کے حالات کے لئے لکھی گئی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں اُن کے سوا اور بھی حالات ہیں اور یہ تمام کتابیں عموماً کتب سیر کے نام سے موسوم ہیں۔ اور جن میں سے کتب مفصلہ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

ابن اسحاق۔ ابن ہشام۔ طبقات کبیر المشہور بواقدی۔ طبری۔ سیرت شامی۔ ابوالفدا۔

مسعودی - مواہب لدنیہ - ان کے سوا عربی اور فارسی زبان میں اور بھی کتابیں ہیں جو انہی سے بنائی گئی ہیں - ان کتابوں میں سے پہلی چار کتابیں بہت قدیم ہیں اور باقی بہت پچھلی۔

یہ سب کتابیں تمام سچی اور جھوٹی روایتوں اور صحیح وموضوع حدیثوں کا مخلط مجموعہ ہے جس میں صحیح اور غلط۔ مشتبہ اور درست اور جھوٹی اور سچی کسی کا کچھ امتیاز نہیں - اور جو کتابیں زیادہ قدیم ہیں اُن میں اس قسم کا اختلاط اور زیادہ ہے۔ قدیم مصنفوں اور اگلے زمانہ کے مؤرخوں کو تصنیفات سے زیادہ غرض یہ تھی کہ ہر ایک قسم کی روایتوں اور افواہوں کو جو اُن کے زمانہ میں پھیل رہی تھیں ایک جگہ جمع کریں اور اس بات کی تحقیقات اور تصحیح کہ کونسی ان میں کی بالکل صحیح ہے اور کون سی غلط اور کس میں زیادتی یا کمی ہوئی ہے اور کس میں مضمون کے سمجھنے اور واقعہ کے بیان میں غلط فہمی ہوئی ہے - آئندہ وقت یا آئندہ نسلوں پر منحصر رکھیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ پچھلی نسلوں نے بعوض اُس کے کہ تحقیقات مطلوبہ کرنے سے اپنے بزرگوں کے مقاصد کی تکمیل کرتے - اُنہی کتابوں کو اپنی تصنیفات جدیدہ کا ماخذ ٹھیرایا۔ اور اس لئے ان پچھلے مصنفوں کی تصنیفوں میں بھی وہی نقص پیدا ہوا جو ان قدیم مصنفوں کی تصنیفوں میں تھا - غرض کہ اب فن سیر[1] کی تمام کتابیں کیا قدیم کیا جدید مثل ایسے غلہ کے انبار کے ہیں - جس میں سے کنکر پتھر کوڑا کرکٹ کچھ چنا نہیں گیا - اور اُن میں تمام صحیح و موضوع جھوٹی اور سچی سند اور بے سند ضعیف وقوی مشکوک ومشتبہ روایتیں مخلوط اور گڈمڈ ہیں۔

سر[2] ولیم میور صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کے حالات زندگی کی تین کتابیں ہشامی واقدی - طبری ایسی ہیں کہ جو شخص دانشمندی سے آنحضرتؐ کے حالات لکھے گا - تو اپنی تحریر کے لئے اُن ہی کتابوں کو سند گردانے گا" مگر صاحب ممدوح نے اس بات کو بیان نہیں فرمایا کہ اُن کتابوں میں کس قدر ایسی روایتیں ہیں - جن سے آنحضرتؐ کو کچھ بھی علاقہ نہیں - اور کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ ٹوٹا ہوا ہے - اور کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کی خصلت نہ کسی مذہبی مسئلہ کے سبب بلکہ اخلاقی نقصانوں کے سبب مشتبہ اور اُن کی راست بیانی مشکوک یا مطعون ہے - اور کس قدر ایسی ہیں جن کے بیان کرنے والے بالکل لامعلوم شخص ہیں۔ اور

---

[1] سِیَر - سیرت (عادت - خو) واحد ہے - احمد مخدومی۔

[2] کچھ عرصہ گزرا ہے کہ یہ صاحب صوبہ الہ آباد کے لفٹیننٹ گورنر تھے - عربی زبان سے بھی آگاہ تھے۔ (مخدومی)

کس قدر ایسی ہیں جن کی تحقیق یا تصدیق نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے نہایت گرم جوشی سے واقدی کی قدر و منزلت کو اُس کی اصلی حقیقت سے بہت بڑھا دیا ہے۔ جس کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ الزام فرماتے ہیں کہ "ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی تعریف اُس کی حد سے زیادہ کی ہے"۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے صاحب ممدوح نے بھی واقدی کی کم قدر نہیں کی۔ اور اوروں پر ترجیح دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اس لیے کہ اُنھوں نے بھی آنحضرتؐ کی زندگی کے تمام حالات کو اُسی کتاب سے لکھا ہے۔ اور اُسی کی سند پر مذہب اسلام کے برخلاف تمام رایوں کو قائم کیا ہے۔

واقدی کچھ بڑا معتبر شخص نہیں ہے۔ وہ تو حاطب اللیل یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں چُننے والا ہے۔ اُس کی غلط روایتوں اور جھوٹے قصہ کہانیوں اور بے سند باتوں سے تمام علماء نے اُس کو نامعتبر ٹھیرایا ہے۔ محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں میزان سے واقدی کی نسبت یہ جملہ نقل کیا ہے۔ "الواقدی محمد بن عمر بن الواقدی الاسلمی المدنی الذی استقر الاجماع علی وھنہ کذا فی المیزان)

کسی کے کہنے اور سننے پر کیا موقوف ہے۔ خود اس کی کتابیں موجود ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت کے لائق نہیں۔ بجز اس کے کہ جو افواہاً اُس نے سُنا اور جو آواز چڑیا کی خواہ کوّے کی اُس کے کان میں آئی وہ اُس نے لکھدی۔ کوئی طریقہ تحقیق کا اور کوئی رستہ تنقیح کا اُس نے اختیار نہیں کیا۔ پس کیا وہ کتابیں ایسی ہیں۔ جو مذہب اسلام کی بنیاد سمجھی جا سکتی ہیں اور کیا کوئی مخالف مذہب اسلام کا ان کتابوں کی سند پر مذہب اسلام یا اُس کے واعظ میں عیب نکال کر اور اپنے آپ کو فتح مند سمجھ کر خوش ہو سکے گا۔ ان ھذا الشیئ عجاب۔

البتہ ابوالفدا کی کتاب کسی قدر اچھی ہے اور جہاں تک ہو سکے اعتبار کے لائق ہے۔ اُس نے اپنی کتاب احتیاط سے لکھی ہے اگرچہ تحقیق و تنقیح کے رستہ کو اُس نے اختیار نہیں کیا۔ الّا اس بات پر کوشش کی ہے کہ کوئی موضوع یا مشتبہ یا لغو روایت اس میں نہ داخل ہونے پاوے۔ مگر بااینہمہ یہ کہنا کہ اُس کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اُس میں کوئی روایت موضوع یا مشتبہ نہیں ہے۔ حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جانا ہے۔

مسلمان مؤرخوں کے سوا جن کا اوپر ذکر ہوا عیسائی مؤرخوں نے بھی مذہب اسلام اور اُس کے واعظ کی نسبت بہت سی کتابیں لکھیں۔ مگر افسوس ہے کہ ابتدائے زمانہ کی تصنیف شدہ کتابیں

مثل کتب مصنفہ وئیل - لوتھر - ملانک تھن - سیپال ہیم - دی ہربی لاٹ - مجھ کو دستیاب نہیں ہوئیں - مگر جو کچھ اور کتابوں سے اُن کا حال معلوم ہوا - وہ اسی قدر ہے کہ اُن کتابوں میں بجز سخت کلامی اور بدزبانی کے اور کچھ نہیں ہے -

ان مصنفوں کے سوا مراکشی صاحب کا ذکر نہایت حیرت انگیز ہے - وہ ایک ایسا سخت متعصب ہے کہ اُس کا دل اپنے بغض و کینہ کے اظہار اور نفرت انگیز جھوٹے طعن و تشنیع اور بدزبانی سے کبھی نہیں بھرا - مگر مجھ کو جو حیرت ہوئی وہ اس بات سے ہوئی کہ "کوارٹرلے ریویو" کے ایک آرٹیکل کے مصنف نے اس کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "مراکشی پر جو یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ باطن میں اسلام کا معتقد ہو گیا تھا وہ الزام کچھ بے وجہ نہ تھا" کیا مراکشی باوصف اس قدر تعصب کے مثل "برہرخورد" صاحب کے آخر کو مسلمان ہو گیا تھا - اگر ایسا ہوا ہو تو میں ذمہ دار ہوں کہ اُس سے پہلے جو کچھ اُس نے اسلام اور واعظ اسلام کی نسبت کہا سنا سب نسیاً منسیاً ہو گیا - لان الاسلام یھدم ما کان قبلہ من معصیۃ اللہ -

ڈین پریڈی صاحب بھی اُن ہی مورخوں میں سے ہیں جن پر مذہب اسلام نہایت شاق گذرتا تھا - جب کوئی مسلمان اتفاقاً اُن صاحب کی کتاب کو پڑھتا ہے تو مذہب اسلام سے اُن کی ناواقفیت پر جو اُن کی کتاب کے ہر ورق سے ٹپکتی ہے بن ہنسے رہ نہیں سکتا -

ان مورخوں کے سوا ہاتنجر، گیگیزری لنڈ اوکلی صاحب نے بھی مذہب اسلام اور آنحضرت کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں مگر افسوس ہے کہ میں اُن کی محنتوں سے مستفید نہ ہو سکا -

گوتھ صاحب اور اماری صاحب اور نالڈ انک صاحب اور دواری صاحب نے جو کتابیں اس مضمون پر لکھی ہیں - اُن کی نسبت مذہب اسلام کے آرٹیکل کا مصنف جو کوارٹرلے ریویو میں چھپا ہے - یہ لکھتا ہے کہ "اُن مورخوں نے بہت سی دنیا کو یہ بات سکھلا دی کہ مذہب اسلام ایک شگفتہ اور تروتازہ چیز ہے اور ہزاروں ثمر ور جوہروں سے بھرپور ہے اور محمد (ص) نے گو اُن کی خصلت کو کیسا ہی سمجھا جاوے انسانیت کی سنہری کتاب میں اپنے لئے جگہ حاصل کی ہے -

نہایت مشہور عیسائی مورخوں میں جنھوں نے آنحضرتؐ کے حالات لکھے ہیں ڈاکٹر اسپرنگر صاحب ہیں اُن کی کتاب انگریزی زبان میں بمقام الہ آباد ۱۸۵۱ء میں چھپی ہے - مگر وہ کتاب بسبب غلطیوں کے جو اُس کے مضمون کی صحت میں ہیں کچھ اعتبار کے لائق نہیں ہے - علاوہ اس کے ایک اور خرابی اُنھوں نے اس کتاب میں یہ کی ہے کہ اُس کا طرز بیان نہایت مبالغہ آمیز

اختیار کیا ہے۔ ان کی طبیعت پہلے ہی سے ایسے تعصبات اور ایک طرفہ راستے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو کسی قسم کے مصنف کو اور بالتخصیص ایک مورخ کو کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ اپنے اس کلام کی تصدیق کے لئے اُن کی کتاب میں سے ایک فقرہ نقل کرتا ہوں جس سے اُن کے تعصب کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس فن میں اُنھوں نے کتاب لکھی ہے۔ اُس سے بھی ماشاءاللہ وہ بہت ہی خوب واقف تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام محمد (ص) کا ایجاد نہیں ہے وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس مکار نے اپنی بداخلاقی اور طبیعت کی بُرائی سے اُس کو بگاڑا اور بہت سے مسائل اس میں قابل اعتراض ہیں وہ اسی کے ایجاد ہیں" نعوذ باللہ من ھذہ الاقاویل کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

اسی کتاب کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ لکھتے ہیں کہ "ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کی کتاب ایسے وقت میں میرے پاس پہنچی جب کہ میں اسی مضمون کی تحصیل اور تلاش کر رہا تھا۔ اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب کے بعض مقامات میں ثابت کیا ہے اُس کے مضامین کی بنیاد غلطی پر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے محمد (ص) کے ماقبل زمانہ کے عرب کا اور خاص محمد کا اور اُن کی خصلت کا جو حال لکھا ہے وہ سب غلط راویوں پر مبنی ہے"

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے ایک اور کتاب جرمنی زبان میں آنحضرت کے حالات میں لکھی ہے۔ جو چھ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ جرمنی زبان نہ جاننے کے سبب اُس کتاب سے جس قدر قدرے قلیل فائدہ حاصل کر سکتا اُس سے بھی محروم رہا۔ صرف اس قدر ہوا۔ کہ میرے ایک جرمن دوست نے مجھ کو اطلاع دی کہ اُس کے مصنف نے ابن اسحاق اور واقدی سے زیادہ تر مطالب اخذ کئے ہیں اور چونکہ میں اُن مصنفوں کی کتابوں سے واقف ہوں۔ جن سے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مطالب اخذ کئے اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ کتاب بھی مثل اور کتابوں کے جن کو عیسائی مورخوں نے تصنیف کیا ہے اُس تحقیق اور تلاش سے معرا ہوگی۔ جو صفائی دل سے کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب اُن ہی کتابوں سے لکھی ہے جن میں صحیح اور غلط اور مشتبہ اور لغو روایتیں سب گڈمڈ ہیں۔

مگر کوارٹرلے ریویو[1] کے آرٹیکل کا مصنف جو غالباً جرمن ہے اس کتاب کی نسبت یہ رائے لکھتا

---

[1] یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے جو لندن میں چھپتا ہے اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے عالمانہ مضمون لکھتے ہیں۔

ہے کہ " جن لوگوں نے اسلام کی نسبت لکھا ہے اُن میں سے ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب کو جو مصنفوں میں اوّل درجہ رکھتا ہے ہم نے اس لئے سب سے افضل قرار دیا ہے کہ وہ بہ نسبت اور سب کے نہایت جامع ہے اور بڑی قابلیّت سے لکھی گئی ہے اس لئے کہ اس کتاب میں وہ تمام مطالب ناظرین کے سامنے موجود کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے پڑھنے والا اپنی رائے آپ قائم کر سکے "۔

عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ وہ کتاب ہے جو سر ولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت اور قابلیت اور کمال خوبی کے ساتھ لکھی ہے یہ کتاب چار موٹی موٹی جلدوں میں ہے اور بہت خوبصورت ٹائپ اور خوش وضع تقطیع میں چھپی ہے۔ اس لائق اور فائق مصنف کو مثل مغربی علوم کے مشرقی علموں میں بھی بڑی واقفیت حاصل ہے اور اس لئے اِن کی یہ کتاب تمام تربیت یافتہ یورپ کے ملکوں میں بڑی قدر و منزلت کی ہے جو اسی قدر و منزلت کے لائق ہے اور یورپ کے عالموں اور عالموں کی مجلسوں نے بھی اس کتاب کے سبب اُن کی ایسی قدر کی ہے۔ جس کے درحقیقت وہ مستحق تھے مگر قطع نظر اس نقص کے جو اس کتاب میں ہے کہ اُس کی بنیاد گویا بالکل واقدی پر ہے۔ جو مسلمانوں میں درجہ اعتبار نہیں رکھتا اور اُس کی روایتیں زیادہ معتبر اور ایسی محقق نہیں ہیں کہ مسلمان ان پر یقین لادیں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں ایک اور بڑا نقص یہ ہے کہ جس منشاء اور مطلب سے سر ولیم میور صاحب نے یہ کتاب لکھی وہ اس لئے پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ منشاء اس کتاب میں نقصان رہ جانے کا اور واقعات کا اصلی تحقیقات تک نہ پہنچنے کا بہت بڑا سبب ہوا ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور صاحب خود ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس کتاب کا لکھنا اور مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کی تحصیل اوّل اس غرض سے اختیار کی گئی کہ پادری پی فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثہ میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیرووں کے پڑھنے کے لئے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جاوے۔ جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہیں۔ چنانچہ اسی منشاء سے مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کو پڑھا اور اس کتاب کو لکھا "۔

لیکن میں نہایت افسوس سے یہ بات کہتا ہوں کہ باوجودیکہ سر ولیم میور صاحب نہایت نیک طبیعت ہیں اور بڑی قابل توصیف لیاقتیں رکھتے ہیں۔ اس پر بھی اُن کی طبیعت پر اُس غرض و منشاء کا جس سے وہ کتاب لکھنی شروع کی ایسا اثر پیدا ہوا جیسا کہ ایسی حالت میں اور دل کی طبیعت پر

پیدا ہونا قیاس کا مقتضا ہے۔ اور اسی سبب سے اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی اُن کو بُری اور بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں اور یہ اثر اُن کی طبیعت کا ایسا تھا کہ اُس کے سبب سے اُن کی کتاب پڑھنے والے اپنے ذہن میں ان کی تحریر کو ایک زیادتی سمجھتے تھے لیکن جیسا اکثر ہوتا ہے ویسا ہی اس میں بھی ہوا کہ اُس حدِ اعتدال سے متجاوز تحریر نے خود اپنے مقصود کو کھودیا۔ اور وہ مطلب حاصل نہ ہوا۔ جس کے لئے پادری پی فنڈر صاحب نے سر ولیم میور صاحب سے اس کتاب کے لکھنے کی خواہش کی تھی، بلکہ برعکس اس کے یہ نتیجہ ہوا کہ جس شخص کو پادری پی فنڈر صاحب نے تاریکی کا فرشتہ بنانا چاہا تھا وہ روشنی کا فرشتہ نکل آیا۔

جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی۔ تو لوگوں نے اس کو نہایت شوق و ذوق سے پڑھا۔ مگر جب اُن کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آنحضرتؐ کے حالات کی نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے ہی سے اس کتاب کا اس طرح لکھنا مقصود اور مرکوزِ خاطر تھا تو اُن کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہوگیا۔ مگر جو نوجوان مسلمان طالب علم انگریزی علم کی تحصیل کرتے تھے اور اپنے دینیات اور الٰہیات سے محض ناواقف تھے اُن میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگر سر ولیم میور صاحب نے سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی برے پہلو پر جاکر لکھا ہے تو فی الواقع اُن کی اصلیت کیا ہے؟

میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اُسی زمانہ میں میں نے ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کے متعلق حالات میں ایک کتاب اُس طرح پر لکھی جاوے کہ جو جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں اُن کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کر ترتیب سے لکھا جائے، اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور اُن کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے اُن کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا جائے اور جو محض جھوٹ اور افترا و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور جمقار کو دام تزویر میں پھنسانے والے لوگوں یا احمق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں اُن کو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جائے اور ان ہی کے ساتھ اُن کے غلط اور اُن کے نامعتبر ہونے کا ثبوت اور اُن کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جاویں۔ مگر میں اپنے اس ارادہ کو بہت سے موانعات کے سبب سے جن میں سب سے بڑا اپنی فکرِ معاش میں مبتلا رہنا اور اس سے بھی بڑا کسی کا میرے ارادہ کے ممد و معاون نہ ہونا تھا، پورا نہ کرسکا اور علاوہ اس کے اس کام کے لئے بہت سی پُرانی کتابیں جن کو قدیم مصنفوں نے تصنیف کیا ہے درکار تھیں، جو مجھ کو بہ سبب

برباد ہو جانے، قدیم کتب خانوں کے دستیاب نہ ہوسکیں، اور یہ بھی ایک قوی سبب اس ارادہ کے پورا نہ ہونے کا ہوا۔ مگر اس پر بھی مختلف اوقات میں مختصر طور سے مختلف مضامین اور مسائلِ مذہب اسلام اور آنحضرت کے حالات پر کچھ کچھ لکھتا رہا۔ چنانچہ ان ہی تحریروں میں یہ بارہ مضمون، ہیں جو بعنوان بارہ خطبوں کے لکھے گئے ہیں اور جن کو اس ایک جلد میں جمع کر دیا ہے۔ اور انشاءاللہ تعالےٰ باقی مضامین اور جلدوں میں جمع کئے جائیں گے۔

اگرچہ میں نے اس دیباچہ میں چند ایسے عیسائی مورخوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے آنحضرتؐ کے حالات اور اصول مذہب اسلام کا انصاف سے فیصلہ نہیں کیا۔ مگر اُن لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مورخوں کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جنھوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرتؐ کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے۔ بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات میں اُنھوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کئے ہیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اُن کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے۔ پس یہ ایک غلطی سمجھ کی تو ہے۔ الاّ وہ عیب جو تعصب اور تنگ حوصلہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے وہ نہیں ہے بہرحال یہ قابلِ ادب شخص ایڈورڈ گبن قدیم روم کی سلطنت کا مشہور مورخ اور گاڈفری ہیگنز...... اور ٹامس کارلیل اور جان ڈیون پورٹ سلمہا اللہ تعالیٰ ہیں۔ جن کے عِلم اور لیاقتوں کی تعظیم و قدر ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ اب میں اُن صاحبوں میں سے تین صاحبوں کی رائے جو اُنھوں نے آنحضرتِ اور مذہب اسلام کی نسبت لکھی ہے اپنے اس دیباچہ میں لکھتا ہوں اور گاڈفری ہیگنز کی رائے خطبات میں متعدد جگہ لکھی گئی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ لکھتے ہیں۔ کیا یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس شخص نے اُس نہایت ناپسند اور حقیر بُت پرستی کے بدلہ جس میں اُس کے ہم وطن (یعنی اہل عرب) مدت سے ڈوبے ہوئے تھے خدائے برحق کی پرستش قائم کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں کیں۔ مثلاً اولادکشی کو موقوف کیا نشے کی چیزوں کے استعمال کو اور قماربازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچتا ہے منع کیا۔ بہتات سے کثرت ازدواج کا اُس وقت میں رواج تھا اُس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا۔ غرضیکہ ایسے بڑے اور سرگرم مُصلح کو ہم فریبی ٹھیرا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی تھی۔ نہیں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بے شک محمد (ص)، بجز دلی نیک نیتی اور ایمانداری کے اور کسی سبب سے

ایسے استقلال کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتدائے نزول وحی سے جو خدیجہ سے بیان کی، اخیر دم تک جب کہ عائشہ کے گود میں شدت مرض میں وفات پائی، مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور جو اُن سے بہت ربط وضبط رکھتے تھے ان کو کبھی کبھی اُن کی ریاکاری کا شُبہ نہیں ہوا اور کبھی اُنھوں نے اپنے نیک برتاوٗ سے تجاوز نہیں کیا۔

بے شک ایک نیک اور صادق طبیعت شخص جس کو اپنے خالق پر بھروسہ ہو اور جو ایمان اور رسم رواج میں بہت بڑی اصلاح کرے۔ حقیقت میں صاف صاف خدا کا ایک آلہ ہوتا ہے۔ اُس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہے۔ جس طرح خداتعالےٰ کے اور وفادار خادم گذرے ہیں۔ اگرچہ اُن کی خدمتیں کامل نہ تھیں۔ اسی طرح محمدؐ کو بھی ہم خدا کا ایسا سچا خادم کیوں نہ سمجھیں جس نے خداتعالیٰ کی خدمت ایسی ہی وفاداری سے کی۔ جیسی اوروں نے جو مثل اوروں کی خدمت کے پوری اور کامل نہ تھی۔ اس بات پر کیوں یقین نہ کیا جائے کہ اُس کو زمانہ اور اپنے ملک میں اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت اور تعظیم سکھلانے کے لئے اور اُن کی حالت کے مناسب اُن کو ملکی اور اخلاقی امور میں نصیحت کرنے کے لئے خدا نے بھیجا تھا۔ اور وہ راست بازی اور نیک کرداری کا واعظ تھا۔

ایڈورڈ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ "محمدؐ کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک صاف ہے۔ قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عُمدہ شہادت ہے مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی۔ انسانوں کی۔ ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رَد کیا کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہوتی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ اُس نے اپنی معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی۔ نہ ابتدا ہے، نہ انتہا نہ وہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اُس کا ثانی موجود ہے جس سے اُس کو تشبیہ دے سکیں وہ ہمارے نہایت خفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے۔ بغیر کسی اسباب کے موجود ہے۔ اخلاق اور عقل کا کمال جو اس کو حاصل ہے وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے۔ اُن بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا اور اُس کے پیرووں نے اُن کو نہایت مستحکم طور سے قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے بہت درستی کے ساتھ اُن کی تشریح اور تصریح کی۔ ایک حکیم جو خداتعالےٰ کے وجود اور اُس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے۔ جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ جب ہم نے اُس نامعلوم چیز (یعنی خدا) کو زمان اور مکان اور حرکت مادہ اور حس اور تفکر کے اوصاف

سے مبرا کردیا۔ تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لئے کیا چیز باقی رہی وہ اصل اول یعنی ذات باری تعالیٰ، جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے محمد کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔ چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے۔

مسٹر ٹامس کارلیل صاحب لکھتے ہیں کہ "ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہے۔ کہ محمد ایک پُرفن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار تھے اور ان کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہے۔ اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھیرتی جاتی ہیں۔ جو جو جھوٹ باتیں دُور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں (یعنی عیسائیوں) نے اُس انسان (یعنی محمد صلعم) کی نسبت قائم کی تھیں اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں۔ چنانچہ ایک یہ بات مشہور ہے کہ پاکرک صاحب نے جب گروٹیس صاحب سے پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہے کہ محمد نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا کہ وہ اُن کے کان میں سے مَیل نکالا کرتا تھا، اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہے جو اُن کے پاس وحی لایا کرتا ہے تو اس قصہ کی کیا سند ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ "اس قصہ کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں" حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ایسے ایسے قصوں کو بالکل چھوڑ دیا جاوے۔ جو جو باتیں اس انسان (یعنی محمد صلعم) نے اپنی زبان سے نکالیں بارہ سَو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لئے بمنزلہ ہدایت کے قائم ہیں ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو بھی اُسی طرح خدا نے پیدا کیا ہے۔ جس طرح ہم کو پیدا کیا۔ اس وقت جتنے آدمی محمد کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اُس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے۔ پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں۔ کہ جس کلام پر خدائے قادر مطلق کی اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور اُسی پر مر گئی۔ کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے۔ جیسا ایک بازی گر کا ہوتا ہے[1]۔ میں اپنے نزدیک ہرگز

---

[1] میں اس قدر اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کروڑوں آدمی اس وقت بھی اُسی پر نہایت مستحکم اعتقاد سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور جن ملکوں میں اسلامی سلطنت کبھی نہیں گئی اُن ملکوں کے لوگوں نے بھی اُن کی باتیں سُن کر اُن کو قبول کیا۔ اور اب بھی کہ اُس کے بانی کو دُنیا سے گئے ہوئے بارہ سو برس ہو گئے۔ ہر ایک ملک میں اور اُن ملکوں میں بھی جہاں اسلامی سلطنت نہیں ہے ہزاروں نئے لوگ اس پر بغیر کسی لالچ اور دھوکے کے اور بغیر کسی تدبیر کرنے والوں کی تدبیر و حکمت کے ایمان لاتے جاتے ہیں اور اسلام کو قبول کرتے ہیں۔ تو کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے۔ جیسا کہ ایک بازیگر کا ہوتا ہے نہیں بلکہ اُس کے سچ ہونے کا ہر ایک کے دل پر یقین ہوتا ہے۔ سید احمد۔

ایسا خیال نہیں کر سکتا بلکہ میں بہ نسبت اور چیزوں کے اُس پر جلد یقین کرتا ہوں اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دُنیا میں اس قدر زور آور ہوں اور رواج پکڑ جاتیں اور مسلّم ٹھیر جائیں تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی کیا سمجھے گا۔ اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں، بہت ہی افسوس کے قابل ہیں۔ اگر ہم کو خدا کی سچی مخلوقات کا علم کچھ حاصل کرنا منظور ہو تو ہم کو ایسی باتوں پر یقین کرنا ہرگز نہیں چاہیئے۔ وہ باتیں ایسے زمانہ میں پھیلی تھیں۔ جب کہ توہمات کو بہت دخل تھا اور اُنھیں توہمات کے سبب خیال تھا کہ آدمی کی روحیں غمگین خرابی میں پڑی ہوئی ہیں جو اُن کی ہلاکت کا سبب ہے۔ میرے نزدیک اس خیال سے کہ ایک جھوٹے آدمی نے ایک مذہب قائم کیا اور کوئی اس سے زیادہ بد اور ناخدا پرست خیال دنیا میں نہیں پھیلا۔ بھلا یہ کب ہو سکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چونہ اور اینٹ اور اَور مصالحہ کی حقیقت کو بیچ نہ جانے اور پختہ مکان بنائے وہ پختہ مکان کاہے کو ہوگا۔ بلکہ خاک کا ایک ڈھیر ہوگا۔ بارہ سو برس تک اس کو کب قیام ہو سکتا ہے، اور اٹھارہ کروڑ آدمی اس میں کب رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اب تک وہ مکان کبھی کا سر کے بل گر پڑا ہوتا۔ ضرور ہے کہ ایک آدمی اپنے طریقوں کو قانون قدرت کے مطابق کرے اور قدرت کے سامانوں کی حقیقت کو سمجھے اور اُس پر عمل کرے، ورنہ قدرت سے اس کو یہ جواب ملے گا کہ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جو جو قانون اور قاعدے خاص ہیں وہ خاص ہی رہتے ہیں، عام نہیں ہو جاتے۔ افسوس ہے کہ کوئی شخص مثل کاک لسٹرو یا اَور ایسے ہی بہت سے دنیا کے سربر آوردہ لوگوں کے چند روز کے لئے اپنے فند فطرت سے کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اُن کی کامیابی ایک جعلی ہُنڈوی کی مانند ہوتی ہے۔ جس کو وہ اپنے نالائق ہاتوں سے جاری کرتے ہیں اور خود الگ تھلگ رہتے ہیں اور اَوروں کو اُس کے سبب سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مگر قدرت آگ کے شعلوں اور فرانسیسی ہنگاموں اور اسی قسم کے اور غضب ناک ظہور سے ظاہر ہو کر یہ بات بہت غضب اور قہر سے دنیا پر ظاہر کر دیتی ہے کہ جعلی ہنڈویاں جعلی ہی ہیں۔

راقم

سید احمد

بمقام لنڈن محلہ میکلن برگ اسکوئیر مکان نمبر ۲۱

۱۸۷۰ء

خُطبۂ اوّل

جُغرافیۃ جزیرۃ العربہ وامم العرب العاربہ و المستعربہ

جغرافیہ جزیرۂ عرب مع نقشۂ عرب

رَبِّ اجعَلُ ھذا البلدَ امناً واجنُبنِی وَبنِیَّ اَن نعبُدَ الاَصنام

عرب یا وہ جزیرہ نما جو جزیرۃ العرب کہلاتا ہے بحر احمر کے مشرق کی طرف واقع ہے اور یہاں سے خلیج فارس تک منتہی ہوتا ہے۔ اس بات کا ٹھیک متحقق ہونا کہ اس ملک کا نام عرب کیونکر اور کس زمانہ میں رکھا گیا نہایت مشکل ہے۔ لیکن کتاب اول ملوک باب (۱۰) ورس ۱۵ میں جہاں ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کی ملاقات کا ذکر ہے اس کو ملک کو ערב عرب کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ۳۰۰۰ سنہ دنیوی یا ۱۰۰۵ سنہ قبل حضرت مسیح کے گذرا تھا۔ مگر ہماری رائے میں یہ جزیرہ حضرت سلیمان کے زمانہ کے بہت پہلے سے عرب کے نام سے کہلایا جاتا تھا کیونکہ اس کا ذکر کتاب ملوک میں اس طرح پر کیا گیا ہے کہ گویا ایک بہت معروف اور مشہور ملک کا نام ہے۔ کتاب توریہ مثنی باب (۱) ورس (۷) و باب (۲) ورس (۸) میں لفظ ערבה عربہ پایا جاتا ہے۔ مگر جو باتیں[۱] کہ اس جزیرہ نما کی وجہ تسمیہ میں

---

[۱] بعض لوگ عرب کے نام کو لفظ عربہ کی طرف جس کے معنی ہموار بیابان کے ہیں اور جو صوبہ تہامہ کا ایک ضلع ہے منسوب کرتے ہیں اور بعض لوگ لفظ عیبر کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کے معنی خانہ بدوش کے ہیں کیونکہ زمانہ سابق میں عرب خانہ بدوش تھے۔ اس صورت میں اس کا اشتقاق لفظ عبرانی سے جس کی یہی وجہ تسمیہ ہے ثابت ہوتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ لفظ عبری مصدر عرب سے نکلا ہے جس کے معنے نیچے جانے کے ہیں اور اس سے وہ ملک مراد ہے۔ جس میں سمٹک یعنی اولاد سام بن نوح کو جو دریائے فرات کے کنارہ پر رہتی تھی آفتاب غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بوکارٹ صاحب کے نزدیک لفظ عرب ایک فنی شین لفظ ہے جس کے معنی اناج کے بالوں کے ہیں مشتق ہوا ہے۔ لفظ عربہ ایک عبری لفظ بھی ہے جس کے معنی بنجر زمین کے ہیں اور توریت میں شام اور عرب کی حد فاصل کے طور پر بارہا بولا گیا ہے (چیمبرز ائن سائیکلو پیڈیا صفحہ ۳۴۴)

بیان کی گئی ہیں اُن میں سے وہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے جو خود اس لفظ سے نکلتی ہے اور جو اس ملک کی طبعی بناوٹ کی طرف اشارہ کرتی ہے لفظ لا! بہ عربہ کے معنی وادی یا بیابان کے ہیں اور جو کہ ایک بڑا حصہ جزیرہ عرب کا بالکل بیابان ہے اور وادی کے نام سے مشہور ہے اسی وجہ سے کل جزیرہ کا نام عرب ہو گیا۔ لفظ عربہ کا ہر قصبہ کے نام کے پہلے بطور ایک عام صفت کے لگایا جاتا تھا اور اسی طرح لا! بہ عربات[۱] جو اُس کی جمع ہے اس جزیرہ کے ایک حصہ پر بولا جاتا تھا جیسا کہ کتاب توریہ مثنی باب (۴۲) ورس (۱ و ۸) میں آیا ہے۔ بعض مؤرخ ازراہ جرأت یہ رائے دیتے ہیں کہ ایک گاؤں[۲] موسوم کی وجہ سے جو تہامہ کے نزدیک واقع ہے اس تمام جزیرہ کا یہ نام پڑ گیا مگر یہ رائے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے کہ لفظ عربہ جو کسی گاؤں کے نام کے پہلے محض بحیثیت ایک جزو ممیزہ کے استعمال کیا جاتا ہو اور رفتہ رفتہ اُس کے اصلی نام کے قائم مقام ہو گیا ہو۔

عرب کی حدود اربعہ یہ ہیں۔ مغرب میں بحر احمر۔ مشرق میں خلیج فارس و خلیج عمان۔ جنوب میں بحر ہند شمال کی جانب اُس کی سرحد بابل اور شام سے ملی ہوئی ہے۔ اور اُس کو آبنائے سویس مصر سے علیحدہ کرتی ہے۔ یہ جزیرہ نما شمال اور مغرب کی جانب کنعان سے ملا ہوا ہے۔ جو بنی اسرائیل کا وطن ہے۔ اور جس کو متقدمین یونانی فنشیا اور متوسط زمانہ کے لوگ فلسطین یا ارض مقدس کہتے تھے اور بالفعل بسریا یعنی شلم کے نام سے مشہور ہے۔ اسی زمین کی نسبت خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد سے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ لیکن جو کہ اِن دونوں ملکوں کی اس سمت میں بیابان حائل ہیں اس لئے قبل اس کے کہ عرب کی شمالی اور مغربی حد معین کرنے کی کوشش کی جاوے " ارض موعود " کی جنوبی اور مشرقی حد کو محقق کرنا چاہیے۔ جب کہ خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھاری اولاد کو ایک ملک عطا کروں گا اُس وقت حضرت ابراہیم اُس مقام پر رہتے تھے جو درمیان (بیت۔ ایل۔ اور۔ عی) کے واقع ہے۔ جیسا کہ سفر تکوین باب (۱۳) ورس (۲) میں مذکور ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت ابراہیم کو وہ ملک جس کے دینے کا وعدہ کیا تھا دکھلا دیا تھا۔ لیکن اُس کی ٹھیک ٹھیک حدیں نہیں بتائی تھیں جیسا کہ سفر تکوین باب (۱۳) ورس (۱۴ و ۱۵) سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جب خدا تعالیٰ نے دوبارہ اپنے وعدے کی تجدید کی اُس وقت حضرت ابراہیم کو صرف اُس کی دو حدیں بتلائیں جیسا کہ سفر تکوین باب (۱۵) ورس (۱۸) میں لکھا ہے کہ خدا نے ابراہیم سے کہا کہ اس

---

[۱] عربات بالتحریک جمع عربۃ وھی بلاد العرب (مراصد الاطلاع جلد ۲ صفحہ ۲۴۵)

[۲] عربۃ فی اول وادی نخلۃ من جھۃ مکۃ (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

زمین کو نہر مصر سے نہر بزرگ تک جو نہر فرات ہے تیری ذریت کو دوں گا۔

مگر تعجب ہے کہ اُس کے بعد کتاب ہائے مقدس کے کسی لکھنے والے نے دریائے مصر کو "ارض موعود" کی سرحد نہیں قرار دیا جس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ برخلاف اس کے بیر شبع[۱] کو [illegible] ہر جگہ اُس کی حد جنوبی قرار دیا ہے۔ اور جب کہ خدا تعالےٰ نے حضرت موسےٰ کو بیابان مواب میں "ارض موعود" دکھلائی تو اُنھوں نے دیکھا کہ [illegible] صوعر[۲] اُس کی جنوبی سرحد ہے۔ صوعر اور بیر شبع قریب قریب ایک ہی خط میں واقع ہیں اس واسطے ان دونوں میں سے کوئی جگہ بلا تفرقہ "ارض موعود" کی جنوبی سرحد قرار پا سکتی ہے۔

مگر یہ بات بالتخصیص جاننی چاہیے کہ بیر شبع[۳] دو تھے ایک کا نام صرف بیر شبع[۴] [illegible] تھا اور دوسرے کا نام قریہ بیر شبع [illegible] یا شبعہ[۵] [illegible] کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ جگہ جہاں بیابان جرار میں حضرت اسحاق کے نوکروں نے اُس وقت جب کہ حضرت اسحاق اور ابی ملک کے باہم عہد و پیمان اور حلف ہوا تھا ایک کنواں کھودا تھا۔ چنانچہ سفر تکوین باب ۲۶ ورس ۳۲، ۳۳ میں لکھا ہے "اور ایسا ہوا تھا کہ اُسی دن اسحاق کے نوکر آئے اور اُس کنوئیں کا حال جو انھوں نے کھودا تھا بیان کیا اور اُن سے کہا کہ ہم کو پانی مل گیا اور اُنھوں نے اُس کا نام شبع رکھا۔ اسی واسطے اُس شہر کا نام آج تک بیر شبع ہے"۔ اور یہ وہی[۶] جگہ ہے جہاں سے کہ حضرت یعقوب حاران کو روانہ ہوتے تھے۔ اور اُسی[۷] جگہ حضرت یعقوب کے بیٹے جب کہ وہ مصر کو غلہ لینے جاتے تھے ٹھیرے تھے۔ اور ایک زمانہ میں یہ شہر گرد و نواح کے ملک کا پایہ تخت تھا اور شموئیل کے لڑکے وہاں[۸] حاکم تھے۔ عاموص[۹] نبی نے بھی اس

---

[۱] کتاب قضاۃ باب ۲۰ ورس ۱۔ شموئیل اول باب ۳ ورس ۲۰۔ شموئیل دوم باب ۳ ورس ۱۰ و باب ۱۷ ورس ۱۱ و باب ۲۴ ورس ۲ و ۱۵۔ ملوک اول باب ۴ ورس ۲۵۔ ملوک دوم باب ۲۳ ورس ۸۔ تواریخ اول باب ۲۱ ورس ۲۔ تواریخ دوم باب ۳۰ ورس ۵۔

[۲] توریہ مثنیٰ باب ۳۴ ورس ۳۔

[۳] ہم کو صاف اور صریح خبر ملی ہے (شموئیل دوم باب ۲۴ ورس ۷ و ۱۵) سے کہ بیر شبع یہودیہ کے جنوب میں ادومیہ کی جانب واقع تھا۔ اور اس واسطے اُس کو وہ بیر شبع نہ سمجھ لینا چاہیے۔ جو گلیلی کے اوپر کے حصہ میں واقع ہے۔ اور جس کا ذکر جوسیفس نے اور حال میں ڈاکٹر رچرڈسن نے کیا ہے (بائبل سائکلوپیڈیا مولفہ جے۔ ٹی۔ لاسن ایم۔ اے جلد اصفحہ ۳۰۷)۔ [۴] سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۳۱ و ۳۲۔ [۵] یوشع باب ۱۹ ورس ۲۔

[۶] سفر تکوین باب ۲۸ ورس ۱۰۔ [۷] سفر تکوین باب ۲۶ ورس ۱ و ۵۔ [۸] شموئیل اول باب ۸ ورس ۲۔

[۹] کتاب عاموص باب ۵ ورس ۵ و باب ۸ ورس ۱۴ و باب ۷ ورس ۹۔

مقام کا ذکر کیا ہے کہ یہاں بُت پرستی بہت شائع تھی۔ اور ضبیاہ[1] مادر یہویہواش اسی جگہ پیدا ہوئی تھی۔ اور ایلیاہ[2] ملکہ ایزبل کے خوف سے یہاں بھاگ آئی تھی۔ یہ شہر[3] بابل والوں کی گرفتاری تک ویران نہیں ہوا تھا۔ بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ اب ایک نہایت چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے اور ایک وسیع ریگستان کے قرب وجوار میں واقع ہے جہاں کہ بجز اطراف سمندر کے آبادی کا نام ونشان نہیں ہے۔ بیر شبع جبران سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر تھا اور یوسی بیس کے زمانہ میں جو چوتھی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اُس میں ایک رومی فوج رہتی تھی۔ یہ بیر شبع اکتیس درجہ سترہ دقیقہ عرض شمالی پر واقع تھا اور طول شرقی اُس کا چونتیس درجہ اور چون دقیقہ کا تھا پہلا بیر شبع قادیش [illegible] اور شور [illegible] کے بیابانوں کے بیچ میں تھا اور حضرت ابراہیم نے اُس کو بنایا تھا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کلدانیوں کے شہر کو جس کا نام "اور کلدانیاں[4]" تھا چھوڑ کر حاران کو چلے گئے۔ اور وہاں چند روز ٹھہر کر مصر کی طرف چلے گئے اور جب مصر سے واپس ہوتے تو اُسی[5] جگہ پر ٹھہرے۔ جہاںکہ پہلے ٹھیرے تھے اور وہاں سے حضرت لوط اُن کے ساتھ سے جُدا ہو کر وادی[6] اردن کو روانہ ہو گئے اور حضرت ابراہیم نے قادیش اور شور[7] کے بیابانوں میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک[8] کنواں کھودا۔ حضرت ابراہیم[9] مدت تک یہاں رہے اور ایک باغ[10] لگایا۔ اور جب حضرت[11] ہاجرہ حضرت ابراہیم کی پہلی بی بی حضرت سارہ سے ناراض ہو کر نکل گئی تھیں تو اسی جگہ پر آئی تھیں۔ اور اسی کنویں کے پاس اُن کو خدا کا فرشتہ دکھائی دیا تھا۔ اور اس لئے اُنھوں نے اس کنویں کا نام بیر لحی روئی [illegible] یعنی "بیر الحی المرئی" رکھا تھا اس کے بعد ایک قحط سالی کے ایام میں حضرت اسحاق نے اُس مقام کی سکونت چھوڑ دی اور جرار[12] [illegible] کو چلے گئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ قادیش ایک اور جگہ ہے اور جرار اس سے بہت دُور ہے۔

---

[1] ملوک دوم باب ۱۲ ورس ۱۔ تواریخ دوم باب ۲۴ ورس ۱۔

[2] ملوک اول باب ۱۹ ورس ۳۔

[3] نحمیاہ باب ۱۱ ورس ۲۷ و ۳۰۔

[4] سفر تکوین باب ۱۱ ورس ۳۱۔

[5] سفر تکوین باب ۱۳ ورس ۳۔

[6] سفر تکوین باب ۱۳ ورس ۱۰ و ۱۱۔

[7] سفر تکوین باب ۲۰ ورس ۱۔

[8] سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۱۴ و ۱۵ و ۳۰۔

[9] سفر تکوین باب ۲۲ ورس ۱۹۔

[10] سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۳۳۔

[11] سفر تکرین باب ۱۶ ورس ۸ لغایت ۱۴۔

[12] سفر تکوین باب ۲۶ ورس ۶۔

وہاں کے باشندے حضرت اسحاق سے واقف نہ تھے اور غالباً بدطینت اور بدخصلت آدمی تھے۔ اس لئے حضرت اسحٰق نے جیسا کہ توریت میں لکھا ہے اُن لوگوں سے اپنی بی بی کی نسبت کہا کہ یہ میری بہن[1] ہے۔ مگر جب ابی مُلک نے حضرت اسحاق کو جرار سے نکال دیا تب انھوں نے بیابان جرار میں بود و باش اختیار کی اور وہاں ایک کنواں کھودا جس کا نام شبع رکھا اور جس مقام پر سکونت اختیار کی تھی۔ اُس کا نام قریہ[2] بیر شبع رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ جگہ وہ جگہ ہرگز نہیں ہوسکتی جہاں حضرت ابراہیم نے کنواں کھودا تھا۔

ان باتوں کی اس قدر تفصیل کرنے سے ہمارا منشاء دو چیزوں کے ثابت کرنے کا ہے اول یہ کہ عرب کی شمالی حد ملکِ شام یا "ارض موعود" سے ملحق ہوتی ہے اور "ارض موعود" کی جنوبی حد حضرت اسحاق والا بیر شبع یا صوعر جس کو بلع[3] بھی کہتے ہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع قادیش میں ہے جو ملک عرب میں واقع ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع اور حضرت اسحاق والا بیر شبع دونوں ایک ہی ہیں اُن واقعات پر مبنی ہے جن کو کہ میں ابھی ثابت کروں گا کہ اُن پر کسی طرح اعتبار نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلا واقعہ جو اُن کی رائے کا موید ہے۔ یہ ہے کہ جب حضرت اسحاق قادیش سے چلے گئے۔ تو فلسطین والوں نے حضرت ابراہیم کے کھودے ہوئے کنویں کو مٹی سے بھر کر بند کر دیا اور جب کہ ابی ملک نے حضرت اسحاق کو جرار سے نکال دیا تو حضرت اسحاق نے انھیں کنووں کو از سرِ نو کھودا جو اُن کے والد حضرت ابراہیم کے زمانہ میں کھودے گئے تھے۔ اور جن کو فلسطین والوں نے روک دیا تھا۔ اور اُنھوں نے اُن کنووں کے وہی نام رکھے جو اُن کے والد نے رکھے تھے مفسرین توریت کا یہ استدلال ابتدائی یا سرسری نظر میں ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور خیال میں آتا ہے کہ بیر شبع ایک ہی ہوگا مگر ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا۔ سفر تکوین کے چھبیسویں باب کی اٹھارھویں آیت تک توریت میں حضرت ابراہیم کے صرف اُنھیں کنووں کا بیان ہے۔ جن کو حضرت اسحاق نے پھر کھُدوایا تھا۔ مگر اُسی باب کی اُنیسویں آیت سے لے کر آخر باب تک اُن قدیم کنووں کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ بلکہ نئے کنووں کا ذکر ہے۔ اِن نئے کنووں کے نام بھی حضرت اسحاق نے نئے رکھے تھے۔ اوّل کا نام بیر عسق באר עשק! دوسرے کا نام سطنہ שטנה تیسرے کا نام رحوبوث

---

[1] سفر تکوین باب ۲۶ درس ۷۔

[2] سفر تکوین باب ۲۶ درس ۲۳۔

[3] سفر تکوین باب ۱۴ درس۔

רְחֹבוֹת اور چوتھے کا نام سبعہ שִׁבְעָה رکھا تھا۔ اس سے صریح واضح ہے۔ کہ یہ کنویں حضرت ابراہیم کے کنوؤں میں سے نہیں تھے۔ پھر اُسی باب کی سترھویں آیت کا صاف صاف مضمون یہ ہے کہ حضرت اسحاق نے جرار کی وادی میں اپنا خیمہ نصب کیا اور وہاں آباد ہوئے۔ اور انیسویں اور بیسویں درس میں بیان ہے کہ حضرت اسحاق کے آدمیوں نے وادی میں کنواں کھودا اور وہاں ایک کنواں جاری پانی کا برآمد ہوا اور جرار کے چرواہوں نے حضرت اسحاق کے چرواہوں سے تکرار کی اور پانی پر اپنا دعویٰ کیا۔ پس جب کہ ان سب آیتوں کا ایک دوسری سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کنویں وادی جرار میں کھودے گئے تھے، نہ وادیِ قادیش میں۔ ایک اور امر جو مذکورہ بالا لوگوں کی رائے کی تائید کرتا ہے تیئسویں آیت کا یہ مضمون ہے کہ حضرت اسحاق ابی ملک کو چھوڑ کر بیر شبع کو چلے گئے جس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بیر شبع سے مراد حضرت ابراہیم والا بیر شبع ہے کیونکہ اُس وقت تک حضرت اسحاق والے بیر شبع کا وجود بھی نہ تھا لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جس بیر شبع کا اُس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع نہیں ہے بلکہ حضرت اسحاق والا بیر شبع ہے۔ کتبِ مقدسہ لکھنے والوں کا یہ قاعدہ ہے کہ پچھلے زمانہ کے حالات لکھنے میں جب کسی مقام کا ذکر آتا ہے۔ تو وہ اُس مقام کا وہی نام لکھ دیتے ہیں جو زمانۂ تحریر میں اُس کا نام ہوتا ہے۔ گو کہ اس زمانہ میں جس کا وہ حال لکھتے ہیں اُس مقام کا وہ نام نہ تھا بلکہ وجود بھی نہ تھا۔ چنانچہ اکثر مقامات میں اُنھوں نے بہت سے شہروں اور قصبوں کا جو اُس زمانہ کے عرصۂ دراز کے بعد وجود میں آئے تھے نام لے کر ذکر کیا ہے۔ اکیسویں باب کی چودھویں آیت میں حضرت ابراہیم والے بیر شبع کا نام مذکور ہے۔ اگرچہ اُس وقت تک اس کنویں نے وہ لقب حاصل نہیں کیا تھا۔

عرب علی العموم ایک وسیع سطح اور ویران ملک ہے۔ مگر جا بجا چند بے انتہا سرسبز و شاداب اقطاع بھی واقع ہیں اور بعض عظیم الشان پہاڑ بھی ہیں جن کی گھاٹیاں تازگی اور خوش نمائی کے لئے مشہور ہیں۔ اُس میں جو سب سے بڑے نقصانات ہیں وہ کثرت سے وادیوں کا ہونا اور پانی کا نہ ہونا ہے۔ میوے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں جن میں کھجور نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ ہوتی ہے، جو عرب کے ملک سے مخصوص ہے اور درحقیقت عرب کے لوگوں کی زندگی کا بہت بڑا ذریعہ ہے عرب کے گھوڑے تمام دنیا کے گھوڑوں سے عمدہ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن عرب کے لئے سب سے زیادہ مفید جانور اونٹ ہے جس کو ریگستان کا جہاز لکھنا بے جا نہیں ہے۔

عرب ٹھیک طور سے دو حصوں میں منقسم ہوسکتا ہے ایک عربُ الحجر یعنی کوہستانی عرب جو خاکنائے سوئیس سے لے کر بحر احمر اور بحر عرب تک پھیل رہا ہے۔ دوسرا عرب الوادی یعنی عرب کا مشرقی حصہ۔ مگر بطلیموس[1] پرانے جغرافیہ دان نے عرب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عربُ الحجر یعنی پتھریلا عرب۔ عربُ المعمور یعنی عرب آبادان۔ عرب الوادی یعنی ریگستانی عرب۔ آج کل کے نقشوں میں عربُ الحجر میں صرف وہ حصہ ملک کا شامل رکھا گیا ہے جو خلیج سوئیس اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے مگر اس تقسیم کے لئے کوئی معتبر سند نہیں۔ بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق عربُ الحجر کو خلیج سوئیس سے لے کر یمن یا عربُ المعمور کی حد تک شمار کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ جن کے نزدیک بطلیموس نے عربُ المعمور لفظ یمن کا ترجمہ کیا ہے بلاشک غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اُس پرانے جغرافیہ داں کے زمانہ میں عربُ الحجر کا جنوبی حصہ گنجان آباد تھا۔ اور تجارت کے لئے مشہور تھا۔ جس کی وجہ سے اُس نے تمام جزیرہ کے اُس حصہ کا عربُ المعمور نام رکھ دیا۔ عربی جغرافیہ دانوں نے جزیرہ عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ تہامہ۔ حجاز۔ نجد۔ عروض۔ یمن۔ غیر ملکوں کے مؤرخ اور جغرافیہ دان جو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اس ملک کو حجاز اس سبب سے کہتے ہیں کہ حاجی اور زائروں کا عام مرجع ہے وہ بڑی غلطی پر ہیں کیونکہ لفظی معنی حجاز کے اُس چیز کے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان میں واقع ہو۔ تمام ملک کا یہ نام اُس پہاڑ کی وجہ سے پڑ گیا ہے جو شام اور یمن کے درمیان بطور حجاب کے واقع ہے۔

عرب بلحاظ اُن مختلف قوموں کے جو اس زمانہ میں آباد ہیں۔ اور اُن آبادیوں کے ناموں کے اور اُن آبادیوں کے ملکی حالات کے اور اُن کے باشندوں کے اعتبار سے بے شمار حصوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ مگر اس بات کا کہنا کہ یہ حصے ٹھیک کس طرح پر ہیں بغیر اس بات کے اوّل جان لینے کے کہ یہ قومیں جو اُن میں آباد ہیں کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں اور کہاں کہاں آباد ہوئیں اگر محال نہیں تو غیر ممکن تو ضرور ہے۔ اس لئے ہم حتی الامکان ان امور کی تنقیح کی کوشش کریں گے۔ ان امور کی نسبت کتب مقدسہ یا عرب کے قرب وجوار کی قوموں کی کتابوں میں بہت کم تذکرہ پایا جاتا ہے اس

---

[1] جزیرہ عرب کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا موجد بطلیموس خیال کیا جاتا ہے اور وہ تین حصے یہ ہیں۔ عربُ الحجر۔ عربُ المعمور۔ عربُ الوادی۔ عربُ الحجر میں تمام شمالی۔ غربی حصہ شامل تھا۔ عربُ المعمور میں غربی اور جنوبی کنارہ۔ عربُ الوادی میں تمام اندرونی حصہ جو اچھی طرح معلوم نہ تھا۔ مگر اس تقسیم کو عرب کے لوگ تسلیم نہیں کرتے اور حال کی تحقیقات کی رُو سے بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ چیمبرز انسائکلوپیڈیا صفحہ ۳۴۴۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بطلیموس نے ملک کو اُس کی طبعی حالت کے لحاظ سے تقسیم کیا تھا نہ کہ حدبندی کے لحاظ سے۔

کی وجہ یہ ہے کہ کتب مقدسہ کے لکھنے والے صرف "ارض موعود" کے حالات لکھنے اور تلاش کرنے میں مصروف رہے اور اُن کی تمام ہمت صرف بنی اسرائیل کے حالات لکھنے پر منحصر تھی اور غیر قوموں نے اس ویران اور بے ثمر ملک کی طرف کچھ توجہ نہیں کی۔

اس کتاب کے لکھنے میں جہاں تک کہ ہو سکے گا ہم اُن دونوں ذریعوں سے گو کہ اُن سے بہت ہی کم حالات معلوم ہوتے ہیں فائدہ حاصل کریں گے اور اُس کی تائید میں عرب کی مُلکی روایتوں سے جو قابل اعتبار معلوم ہوتی ہیں غفلت نہ کریں گے۔

جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے باب میں ہیں وہ نہایت معتبر ہیں کیونکہ عرب کے لوگ اپنی آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجہ غایت پابند تھے اور اُن کو کبھی ترک کرنا یا تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا قریباً قریباً اپنا فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا اپنا جُدا جدا نام رکھتا تھا اور اُس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلہ کو بخوبی جانتا تھا اور اپنے حسب نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا اور جس طرح کہ پُرانی قوموں "سکنڈنیوین" اور "سلٹک" کے ہاں کڑکیٹ ہوتی تھی اسی طرح عرب کی قوموں میں بھی ہوتی تھی جن کا لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کو اُن کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا[۱]۔

جو کچھ کہ میں نے عرب کی ملکی روایتوں کی نسبت بیان کیا ہے اُس کی تائید رورنڈ مسٹر فارسٹر کے بیان سے ہوتی ہے۔ اُنھوں نے عرب کا ایک جغرافیہ لکھا ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ "عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے۔ تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے۔ کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے۔ ایک اور تعجب انگیز مثال عرب کی اس پابندی کی قدامت اور رفاقت کی کرنیل چسنی نے اس طرح بیان کی ہے کہ عجل عربوں کا ایک گروہ بغداد کے

---

[۱] ہمارے ملک میں جو ہندو قومیں آباد ہیں اُن کے حالات پر غور کرنے سے اور اس بات کے دیکھنے سے کہ باوجود اس کے کہ ہزارہا برس اور مختلف حکومتیں اُن پر گذر گئیں ہیں مگر اُن کی جُدا جُدا قومیں آج تک ممکن طرح پر محفوظ ہیں اور ہر ایک شخص اپنی قوم اور اپنی گوت یعنی قبیلہ سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے اور آج تک اُن کے معزز لوگوں کے ہاں بھاٹ اور کڑکیت موجود ہیں۔ عرب کی قدیم قوموں کے حالات کا نقشہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے اور ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اسی طرح انھوں نے اپنی قوم اور قبیلہ کو علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھا تھا۔

قریب خیمہ زن ہوا۔ میں اُن کے خیمہ گاہ کی سیر کے واسطے گیا۔ اُن خیموں کے بیچ میں شاہی نشان اسپین کا لہراتا ہوا دیکھ کر مجھ کو کمال حیرت ہوئی اور ایک عربی خیمہ میں تین دھاریوں کی علامتوں کو دیکھ کر میں نے اُن کا حال دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ایک نہایت بڈھے آدمی نے مجھ سے کہا کہ جب کہ ان کے آبا واجداد بربر کے ملک میں گئے تھے اور وہاں سے اسپین کی فتح کے واسطے روانہ ہوئے اُس وقت خلیفہ نے اُن کی خدمات کے جلدو (صلہ) میں قبیلہ عجل کو شاہی نشان اسپین کا بطور جھنڈے کے عطا فرمایا تھا۔ ڈین پریڈو نے عرب کی رسم ورواج کی نسبت اس طرح پر لکھا ہے۔ کہ قوم عرب دنیا میں سب سے زیادہ قدیم قوم ہے جو اپنے مورثان اعلےٰ کے زمانہ سے آج تک نسلاً بعد نسلٍ اپنے ملک میں رہتی چلی آئی ہے اور جس قدر کہ عرب اپنی رسم ورواج میں تغیر و تبدّل کو ناپسند کرتے ہیں اُسی قدر ملک کے ناموں کے بدلنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر مقاموں کے وہی نام بدستور چلے آتے ہیں جو ابتدا۔ میں رکھے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ملک مصر کے قدیمی دارالسلطنت کے رہنے والے جو مصری کہلاتے تھے اور بعد کو زمانہ دراز تک بنام ممفس مشہور رہے۔ عربوں کے تسلط کے زمانہ سے پھر مصری کہلانے لگے اور جب سے برابر یہ نام چلا آتا ہے۔ یہ مثالیں منجملہ اُن بے شمار مثالوں کے ہیں جو علامہ ڈین نے بیان کی ہیں۔ پروفیسر رالنسن کا بیان ہے کہ فلسطین میں ایک اور قسم کی قدیمی روایت ہے۔ جس سے کہ کنیسوں کو کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یعنی عوام الناس میں مقاموں کے قدیمی ناموں کا بجنسہٖ چلا آنا۔ فی الحقیقت یہ قومی اور دیسی روایت ہے جو کسی طرح پر اجنبی کنیسوں اور اجنبی حکام کے اثر سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ اس کو پیا ہے اور سمٹک زبانوں کی طبیعت میں استحکام کے ساتھ گھر پکڑ گئے ہیں مقامات کے عبری نام انجیل کے زمانہ کے بہت عرصہ بعد تک اپنی آرمنیں شکل میں مروّج رہے اور باوجود اس کے کہ یونانی اور رومیوں نے اپنی اپنی زبانوں کے ناموں کی ترویج کے لئے کوششیں کیں مگر عوام الناس کی زبان پر وہی پُرانے نام جاری رہے۔"

غرضکہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے۔ اُن کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل امور سے معلوم ہوسکتا ہے۔ میدانِ جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب ولنسب بآواز بلند بیان کرے تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا۔

کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا۔

بعض اوقات جب کہ کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا جو اب شرع میں بلفظ الدیت علی العائلہ مستعمل ہے۔

اس قسم کی رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر کما حقہ اعتبار قائم ہوا اور برقرار رہا۔ اب ہم عربوں کی اُس مشہور و معروف پابندی کو جو اپنی قومی اطوار اور عادات اور اپنے بزرگوں کی رسوم کے ساتھ رکھتے ہیں بیان کر کے سوال کرتے ہیں کہ اس بات کا یقین کرنا کس طرح سے ممکن ہے کہ ایسی قوم پر جو تغیر و تبدل کے اس قدر برخلاف ہو اور مزید براں قبیلوں کے سخت اختلافات کی نسبت اس قدر محتاط ہوں مندرجہ ذیل شبہات کرنے کے لیے کافی وجوہ ہیں، یعنی ایسے شبہات کے جن کی تائید کے واسطے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرف دار مصنف کے خیالی تشوشے ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ بنی عملیق اور بنی بنات میں ہم کو الیسو اور اسمعیل کی اولاد صاف صاف نظر آتی ہے۔ اور اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضرور نہیں ہے کہ اُن کے انساب کا علم یا روایت خود اُن قوموں میں بجنسہٖ چلی آتی ہے بلکہ فتح کے انقلابات اور دوسری قوموں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جن کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے اُن کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو۔ مگر اس معترض کو ہمارے اوپر کے بیان سے ثابت ہو گیا ہو گا کہ یہ امر ناممکن نہ تھا، بلکہ درحقیقت اسی طرح پر واقع ہوا جیسا کہ بیان ہوا ہے۔

اب یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کی سکونت کے باب میں ملکی اور قومی دونوں طرح کی روائتیں نہایت معتبر ذریعہ سے ہمارے زمانہ تک پہنچی ہیں اور وہ ایسی روایتیں ہیں کہ جن کو تمام قوم نے بلا تامل صحیح مان لیا ہے پھر ہم کس طرح کسی عیسائی طرف دار مصنف (مسٹر ولیم میور) کے محض بے دلیل بیانات کو صحیح اور معتبر تصور کر سکتے ہیں جس کا یہ بیان ہے کہ یہ "روایت ایک کہانی ہے یا توریت سے اخذ کر کے تحریر کر دی گئی ہے" مگر جس وقت کہ اس عالی رتبہ مصنف نے یہ بیان کیا اُن کو معلوم نہ ہو گا کہ خود توریت ہی سے حضرت ابراہیم کے نسب کی بابت اُس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مصنف موصوف نے کم سن اسمٰعیل اور اُن کی بیکس ماں کی سکونت کی اصلیت کی نسبت اس طرح پر قیاس دوڑایا ہے کہ۔ بنی اسمٰعیل اور عمالیق کی قومیں جزیرہ عرب کے شمال اور وسط میں پھیلی ہوئی تھیں۔ غالباً یہی لوگ مکہ کے اصلی

متوطن ہوں گے یا زمانۂ سابق میں یمن کے لوگوں کے شمول میں وہاں آبسے ہوں گے۔ اُس کے بعد ایک فرقہ بنی اسمٰعیل خواہ نباتی خواہ کسی ہم نسل خاندان کا وہاں کے کنوؤں اور کاروانی تجارت کے دل پسند موقع کے لالچ میں وہاں چلا گیا ہوگا۔ اور بہت ذی اختیار ہوگیا ہوگا۔ یہ فرقہ اپنی ابراہیمی نسب کی پُرانی روایتوں کو اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ اور مقامی اوہام اور اعتقادات پر خواہ وہ اُسی ملک کے ہوں یا یمن سے لائے گئے ہوں۔ اُن کو منقش کردیا ہوگا۔

ان قیاسی باتوں کی غلطی اس طرح پر ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی عمر جب کہ اُن کے باپ نے اُن کو گھر سے نکالا تھا توریت کے مطابق سولہ برس کی تھی۔ اور یہ عمر ایسی تھی کہ جو روایتیں انھوں نے اپنے والد سے سُنی تھیں اُن کے سمجھنے اور تمیز کرنے اور یاد رکھنے کے قابل تھے۔ اس کے سوا وہ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے رہے اور حضرت ابراہیم بھی اکثر اُن کے پاس آتے جاتے تھے ۔ الجام کار سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ حضرت اسمٰعیل جن کی عمر اُس وقت نواسی برس کی تھی بر وقت وفات حضرت ابراہیم اپنے والد کے اُن کے پاس موجود تھے۔ یہ سب باتیں ہر ذی فہم اور غیر متعصب شخص کے ذہن نشین کرنے کو کافی ہوں گی کہ یہ تمام روایتیں جو مختلف اقوام عرب میں اس قدر شائع ہیں۔ لوگوں کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل سے پہنچی ہیں اور یہ امور ایسے بدیہی اور ذہن نشین ہونے کے لائق ہیں۔ کہ اگر پھر کوئی شخص براہ جرأت یہ کہے کہ یہ روایتیں یہودیوں کی وساطت سے پہنچی ہیں۔ تو اُس کو سُن کر کچھ کم تعجب نہ ہوگا۔ مگر تعجب اس بات پر آتا ہے کہ مصنف موصوف نے اپنے قیاسی خیال کے ثابت کرنے کا ادعا کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "مگر اُن بنی اسرائیل کو جو توریت پڑھتے ہیں صرف نام اور مقام ہی سے اس نسب کا احتمال عائد ہوتا ہے اور یہودی مصنفوں میں "الہامی ہوں خواہ غیر الہامی ہم کافی اظہار اس امر کا پاتے ہیں کہ ایسا خیال درحقیقت کیا گیا تھا۔ یہ قدرتی استنباط خود اُن قوموں میں جن سے وہ علاقہ رکھتا تھا قرب وجوار کے۔ یہودیوں کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً شائع ہوگیا ہوگا۔ اور اُن بے جوڑ روایتوں کے غیر مکمل آثار کو جو ہنوز اُن کے تخیلات اور اُن کی عادات اور اُن کی زبان میں موجود تھے

---

[1] جب اسمٰعیل پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی برس کی تھی (سفر تکوین باب ۱۶ ورس ۱۶) اور جب حضرت اسحاق پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم کی عمر سو برس کی تھی (سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۵) اور حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کو حضرت اسحاق کے دُودھ چھٹنے کے زمانہ میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اس حساب سے حضرت اسمٰعیل جب کہ جلاوطن ہوئے تھے سولہ برس کے تھے حضرت ابراہیم کا ایک سو پچھتر برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق دونو نے مل کر مکپیلاہ کے غار میں دفن کیا تھا (سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۹) اس لئے حضرت اسمٰعیل کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی۔

تقویت دے دی ہوگی۔"

اگرچہ اس رائے کی غلطی اوپر کے بیان سے بخوبی ظاہر ہوگئی ہے مگر عرب کی قوموں کی عادت پر خیال کرنے سے اُس رائے کی اور زیادہ غلطی ظاہر ہوتی ہے۔ عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت کے موافق اپنی اصلی روایتوں میں کوئی نئی روایت اضافہ نہیں کی تھی۔ اور تمام غیر قوموں سے بالکل علیحدہ رہتے رہے یہاں تک کہ جب حضرت اسمٰعیل اور اُن کے ہمراہی وہاں آکر آباد ہوئے تو قدیمی عرب اُن کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل لقب "مستعربہ" سے اُن کو ملقب کیا تھا۔ آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل اور خصوصاً اہل عرب بنی اسمٰعیل کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے رہے اور قدیم عرب نے اپنی قدیمی روایتوں کا اُن سے مبادلہ نہیں کیا اور بنی اسرائیل کے پاس عرب کی قوموں اور عرب کے انبیاء کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہ تھی۔

آنحضرت صلعم نے جب یہ بات فرمائی کہ جمیع انبیاء بنی اسرائیل برحق نبی تھے اور اُن پر ایمان لانا چاہیے۔ اُس وقت بنی اسرائیل کی اور اُن کے نبیوں کی روایتیں اور قصے عرب کی روایتوں اور قصوں میں مخلوط ہوگئے۔ لیکن چونکہ بنی اسرائیل کے ہاں عرب کی کچھ روایتیں نہ تھیں اس وجہ سے عرب کی روایتیں بجائے خود بجنسہ برقرار رہیں۔

تمام نئے آباد ہونے والے جو وقتاً فوقتاً عرب میں آباد ہوئے اور قدیم متوطنان عرب نے تین نام حاصل کئے تھے۔ اول عرب البائدہ یعنی صحرائی عرب۔ دوم عرب العاربہ یعنی قدیمی عرب۔ سوم عرب المستعربہ یعنی عرب میں نئے آباد ہونے والے۔ جو بہ سبب زمانہ دراز کی سکونت کے عرب بن گئے تھے۔ یہ تین بڑی تقسیمیں قریب قریب تمام باشندگان عرب پر حاوی ہیں۔ خانہ بدوش بدّوؤں سے لے کر اُن قدرے شائستہ قوموں تک جو کنارہ کے برابر برابر آباد ہیں اور ہمذا قدیم باشندگانِ عرب اور جدید باشندگانِ عرب کے درمیان تمیز بھی قائم رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ عرب کے باشندوں کا ان مذکورہ بالا تین عام قسموں کے مطابق علیحدہ علیحدہ بیان کریں۔

اَوّل

عرب البائدہ یا خانہ بدوش صحرائی عرب کی قومیں

عرب البائدہ میں سات شخصوں کی اولاد کی سات مختلف گروہیں شامل ہیں۔ (۱) کوش پسر حام پسر نوح کی اولاد (۲) عیلام پسر سام پسر نوح کی اولاد (۳) لود پسر سام پسر نوح کی اولاد (۴) عوص پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد (۵) حول پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد (۶) جدیس پسر گثر پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد (۷) ثمود پسر گثر پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد۔

کوش کی اولاد خلیج فارس کے کنارہ پر اور اُس کے قرب وجوار کے میدانوں میں آباد ہوئی۔

جرہم پسر عیلام بھی اُسی طرف جاکر رودِ فرات کے جنوبی کناروں پر سکونت پذیر ہوا۔

لود کے جوان میں سے تیسرا مورث اعلیٰ ہے تین بیٹے مسمّیان طسم۔ عملیق۔ امیم تھے جنھوں نے اپنے آپ کو تمام مشرقی حصہ عرب میں یا یہ سے لے کر بحرین اور اُس کے گرد لواح تک پھیلا دیا۔

عوص پسر عاد اور حول دونوں نے ایک ہی سمت اختیار کی اور جنوب میں بہت دُور جاکر حضرموت اور اُس کے قرب وجوار کے میدانوں میں اقامت اختیار کی۔

جدیس پسر گثر پسر ارم پسر سام عرب الوادی میں آباد ہوا۔

ثمود پسر گثر پسر ارم پسر سام نے عرب الحجر میں اور اُس میدان میں جو وادی القری کے نام سے مشہور ہے اور ملک شام کی جنوبی اور ملک عرب کی شمالی حد ہے رہنا اور قبضہ کرنا پسند کیا۔

عربی جغرافیہ والوں نے جو کچھ اپنی تصنیفات میں نسبت عرب البائدہ اور اُن کے مقامات سکونت کے لکھا ہے اُس کا انتخاب ذیل میں لکھتے ہیں۔ جن سے اُن امور کی جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں تصدیق ہوتی ہے۔

قال القاضی صاعد ابن احمد الاندلسی صاحب قضاء مدینۃ طیطلۃ ......

ان العرب البائدۃ فکانت امما ضخمۃ کعاد وثمود وطسم وجدیس ولتقادم انقراضھم ذھبت ان حقایق اخبارھم وانقطعت عنا اسباب العلم باٰثارھم۔

اما جرھم فھم صنفان جرھم الاولی وکانوا علےٰ عھد عاد فبادوا ودرست اخبارھم وھم من عرب البائدۃ۔ (ابو الفدا)۔

سکنت بنو طسم الیمامة الی البحرین (ابوالفدا)

سکنت بنو عاد الرمل الیٰ حضرموت (ابوالفدا)

وبلاد عاد یقال لها الاحقاف وهی بلاد متصلة بالیمن وبلاد عمان (ابو الفدا)

والی عاد اخاهم هوداً وهو عاد بن عوص بن ارام بن سام وهم عاد الاولیٰ کانت منازل قوم عاد بالاحقاف وهی رمال بین عمان وحضرموت (معالم التنزیل)

سکنت ثمود الحجر بین الحجاز والشام (ابوالفدا)

کانت مساکنهم بالحجر بین الحجاز والشام الی وادی القری (معالم التنزیل)

الحجر بالکسر ثم السکون والراء اسم دیار ثمود بوادی القریٰ بین المدینة والشام کانت مساکن ثمود وهی بیوت منحوتة فی الجبال مثل المغایر تسمی تلک الجبال الاثالیب کل جبل منقطع عن الاخر یطاف حوله وقد نقر فیه بیوت ونقر علےٰ قدر الجبال التی تنقر فیها وهی بیوت فی غایة الحسن فیها نقوش وطیقان محکمة الصنعة وفی وسطها بیر التی کانت تردها الناقة - مراصد الاطلاع علےٰ اسماء الامکنة والبقاع -

الحجر بکسر الحاء وسکون الجیم والراء دیار ثمود بوادالقریٰ بین المدینة والشام مشترک (یاقوت الحموی)-

قال ابن حوقل والحجر بین جبال علیٰ یوم من وادی القری اقول لم یحصل ذلک فان بینهما اکثر من خمسة ایام قال وکانت دیار ثمود الذین قال الله عنهم وثمود الذین جابوا الصخر بالواد قال رایت تلک الجبال وما تحت منها کما اخبر الله تعالےٰ وتنحتون من الجبال بیوتا فارهین وتسمیٰ تلک الجبال الاثالیب اقول وهی التی ینزلها حجاج الشام وهی عن العلی علی نحو نصف مرحلة من جهة الشام (تقویم البلدان)

ووادی القری فهو بادیة الجزیرة وما کان من بالس الی ایله مواجها للحجاز معارضا لارض بتوک فهو بادیة الشام (تقویم البلدان)

اب کہ ہم نے اس مقام پر ایک کامل فہرست سات مختلف اقوام عرب البائدہ کے مورثان اعلیٰ کی لکھ دی ہے اور اُن مقامات کو بھی بیان کر دیا ہے جہاں جہاں یہ مختلف قومیں آباد ہوئیں۔ تو اب ہم حتی المقدور ان شعبوں اور شاخوں کی تفصیل بیان کریں گے جو اُن قوموں سے پیدا ہوئی ہیں -

اوّلاً - بنی کوشش کسی عرب کے مؤرخ نے بنی کوشش کا کچھ حال نہیں بیان کیا سب کے سب خاموش ہیں اور اس سبب سے اُن کے حالات کچھ دریافت نہیں ہوئے - اسی بنار پر جارج سیل اور اُنھیں کی مانند اور انگریزی مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ "کوش کی اولاد عرب میں آباد نہیں ہوئی تھی"۔ نویری نے اپنے جغرافیہ میں ایک یہ فقرہ لکھا ہے "وملک شرجیل علی تلیس وتمیم" اس فقرہ میں نویری نے بنی کوشش کا ذکر بشمول بنی تیم کے کیا ہے جس سے وہ حصہ سلطنت کا مراد ہے جو الحارث نے اپنے دوسرے بیٹے شرجیل کو بخشا تھا - نویری کے اس فقرہ پر ریورنڈ مسٹر فارسٹر یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشرقی مؤرخ بنی کوشش کو عرب کے رہنے والوں میں شمار کرنے سے خاموش نہیں ہیں - مگر ریورنڈ مسٹر فارسٹر کو اس میں کسی قدر دھوکا ہوا ہے - کیونکہ نویری کے فقرہ سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ بنی قیس اور بنی کوشش ایک ہی خاندان میں یعنی حام کی اولاد میں ہیں - مشرقی مورخوں نے جو بنی کوشش کا کچھ ذکر نہیں کیا اس کی وجہ ظاہرا یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود مشرقی مؤرخ دھوکے میں پڑ گئے ہیں کیونکہ کوشش کی اولاد جو مشرق میں آباد ہوئی تھی اور یقطان کی اولاد جو جنوب کی طرف یمن اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہوئے تھے - اُن دونوں کے ناموں میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے اور اس سبب سے مشرقی مورخوں نے دھوکے کھاکر تمام واقعات وحوادث کو جو بنی کوش سے متعلق تھے بنی یقطان سے متعلق سمجھ لیا اور اُن تمام واقعات اور حوادث کو بنی یقطان کی طرف منسوب کر دیا۔

مگر ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے بڑی کوشش اور تلاش سے اور بڑی صحت اور قابلیت سے نہایت

لے یہ ایک عام اور مسلّم رائے ہے کہ سبا پسر کلاں کوش نے پہلے وہ حصہ وادی القری کا آباد کیا جو دریائے فرات کے ملحق ہے اور یہ رائے بظاہر وجوہات ذیل پر مبنی ہے - ضلع مذکور کا "خوزستان" یعنی کوش کے اصلی وطن کے قریب واقع ہونا - زمانہ مابعد میں شہر "سبی" اور قوم سبا کا سرحد "خالدیہ" پر موجود ہونا - کوشی ناموں اور خاندانوں - جو بلاد یستہاد دراہ. دودان کا خلیج فارس کے کنارہ پر مسلسل سلسلہ میں واقع ہونا اور سب سے اخیر یہ کہ اشعیاہ نبی کی کتاب کے دو مقاموں میں کوش اور "سبا" کا ساتھ ساتھ بیان ہونا جس سے پایا جاتا ہے کہ "سبا" "خوزستان" سے ملحق ہے - "راس مسندم" کے قریب جس کو بطلیموس نے "راس اسابی" کر کے لکھا ہے ہم مسٹر سیل کے نقشہ میں شہر "کشکان" جو توریت کے "کشام" کے مرادف ہے پاتے ہیں - بحر عمان کے اسی کنارہ پر "عمنان" یا "عمان" اور "تلمر" یا "سیب" اور "موبار" شہروں کے درمیان میں ہم ایک ساحل پاتے ہیں جس کو "پلینی" نے "سواحل حام جو بالفعل" ماحام" کہلاتا ہے اس خاکنائے کے مقابل کی اطراف پر جو "راس مسندم" میں منتہی ہوتی ہے اور "خلیج فارس" کے دہانہ کے اندر شہر اور ضلع "رعماہ" جس کو (باقی اگلے صفحہ پر)

معتبر اور مستند حوالوں سے اس امر کو بیان کیا ہے کہ بنی کوشس درحقیقت عرب میں خلیج فارس کے کنارہ کے برابر برابر آباد ہوئے تھے اور مشرقی کنارہ کے مختلف شہروں کے ناموں کا ان ناموں سے مقابلہ کرکے جو بطلیموس نے لکھے ہیں اپنے دعوے میں قطعی کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن مصنف موصوف نے جب کہ بنی کوشس کو تمام جزیرہ عرب میں اور خصوصاً یمن اور خلیج عرب کے کناروں پر پھیلا دینے کی کوشش کی ہے تو اُس کی دلیلوں میں ضعف آجاتا ہے اور اُسی دھوکے میں پڑ جاتا ہے جس میں مشرقی مورخ پڑ گئے تھے اور اسی سبب سے یمن تک پہنچنے پر اُس کی بحث بدرجۂ غایت مہمل اور بے معنی ہو گئی ہے اور صرف ایک ناکارہ سلسلہ خیالی اور وہمی استنباطوں کا خیال کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ "نمرود" کے سوا جس کا ذکر تنہا کتاب مقدس میں کیا گیا ہے۔ اور اس سبب سے ہم کو یہ مستنبط کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ آباد نہ ہوا تھا باقی اولاد کوشس کی جن کے نام۔ سبا۔ حویلاہ۔ سبتاہ۔ رعماہ۔ سبتکا۔ تھے اور رعما کے بیٹے یعنی شبا اور دوان سب خلیج فارس کے کنارہ کنارہ آباد ہوئے تھے۔ ہم اس امر سے انکار کرنا نہیں چاہتے۔ کہ کوشس کی اولاد میں سے کوئی جزیرہ عرب کے اور اقطاع کی جانب بھی چلے گئے ہوں اور وہاں سکونت اختیار کی ہو۔ مگر ہم نے مسٹر رورنڈ فارسٹر کی جن دلیلوں کو لغو اور مہمل اور وہمی اور خیالی بیان کیا ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ مصنف موصوف کو بنی کوشس کے مقامات سکونت کی تحقیق میں کوئی ایسا مقام مل جاتا ہے جس میں ذرا سی بھی مشابہت کوشی ناموں سے ہجوں میں یا صرف ایک حرف ہی کی مطابقت پائی جاتی ہے تو وہ اُس مقام کو کوشس کی اولاد کے متعلق کر دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتا حالانکہ بنی کوشس کے اکثر نام ایسے ہیں جو بنی یقطان کے ناموں سے جو یمن میں رہتے تھے مشابہت تامہ رکھتے ہیں

کتب مقدسہ کے لکھنے والوں نے بنی کوشس کی وجہ سے تمام ملک عرب کو بنام ارض کوش یا اتھوپیا کے موسوم کیا ہے اور اس امر کے ثابت کرنے کو مسٹر رورنڈ فارسٹر نے نہایت مضبوط اور قابلانہ دلیلیں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "توریت اور انجیل کے تاریخی جغرافیہ کے انگریزی ترجمہ میں الفاظ "اتھوپیا" اور باشندگانِ اتھوپیا" اکثر مستعمل ہوئے ہیں اور اُن کی جگہ عبرانی توریت میں اسم معرفہ کوشس واقع ہوا ہے۔ اور یہ لفظ کوشس جبکہ کتاب مقدس میں اس طرح مستعمل ہوا ہے تو اس سے ہمیشہ ایشیائی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ یونانی ترجمہ توریت میں "رعمہ" اور بطلیموس نے "رغامہ" لکھا ہے پایا جاتا ہے۔ خلیج کے باہر شہر اور ضلع "دوان" یا "دوانہ" کا پتہ لگتا ہے اور توریت میں جو "دوان" چھوٹے بیٹے "رعماہ" کا ذکر ہے اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ (فارسٹر صاحب کا جغرافیہ عرب صفحہ ۷۸)

اتھوپیا یعنی عرب مراد لیا گیا ہے نہ کہ افریقی اتھوپیا۔ چند مصرح درسوں کے مقابلہ کرنے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کتاب اعداد باب ۱۲ درس ا میں لکھا ہے کہ مریام اور ہارون نے حضرت موسٰے سے اُس اتھوپین (عبرانی میں ہے کوشی) عورت کی وجہ سے جس کے ساتھ اُنھوں نے شادی کی تھی گفتگو کی۔ ....

.... - اور کتاب خروج باب ۲ درس ۱۵ اور ۲۱ سے یہ امر محقق ہے (اور ہم حضرت موسٰی کے دوسرے نکاح کے فرض کرنے کے واسطے کوئی دلیل نہیں پاتے) کہ ایک مدیانی عورت تھی یعنی حضرت ابراہیم کی اولاد میں بنی قطورہ کے سلسلہ میں تھی۔ اور یہ امر بھی متحقق ہے کہ "مدیان" یا "مادیان" عرب میں بحر احمر کے کنارہ پر ایک شہر یا ملک تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسٰی کی بی بی ایک عرب کی عورت تھی اور اسی وجہ سے عبرانی لفظ کوشی کا ترجمہ لفظ اتھوپین کے ساتھ ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ تاوقتیکہ اس سے ایشیائی اتھوپیا یا عرب مراد نہ لیا جاوے۔ کیونکہ افریقی اتھوپیا اس سے کسی طرح مراد نہیں لیا جا سکتا" (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ ۱۲)

ان دلیلوں سے کسی طرح شک اور شبہ نہیں رہتا کہ کتاب مقدس کے انگریزی ترجمہ میں جو لفظ کوش کا اتھوپیا ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہ دو مختلف مقاموں پر مستعمل ہوا ہے۔ افریقی اتھوپیا پر اور ایشیائی اتھوپیا یعنی عرب کے ایک حصہ پر یا خود ملک عرب پر اور یہ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اس سے کتب مقدسہ کے بہت سے مشکل مقامات کے حل ہونے میں مدد ملے گی۔

ثانیاً۔ عیلام ب ۵۶ یا جرہم الاولے۔ جو کہ یہ قوم بنی کوش کے مقابلہ میں کچھ نام آور نہیں ہوئی اس لئے اُس کی نسبت بجز اس کے کہ بنی کوش سے قرابت رکھتی تھی اور انھیں کے ساتھ رہتی تھی اور کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہوا۔

ثالثاً۔ لود ؟؟؟ اُس کے تین بیٹے تھے۔ طسم۔ عملیق۔ امیم۔ یہ لوگ بھی عیلام کی اولاد کی مانند کچھ اولوالعزم اور نام آور نہ تھے۔ اس لئے ان کا حال بھی بہت کم معلوم ہے۔ مگر اُن کے آثار ساحل خلیج فارس کے بعض مقاموں کے ناموں میں پائے جاتے ہیں مثلاً دریائے عمنان (جس کو پلینی نے عمان لکھا ہے) اور "ہمائیم" جو امیم کے نام سے جو لود کا تیسرا بیٹا تھا ماخوذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ الف ہائے ہوز سے بدل جاتا ہے جیسے اود سے ہود اور اجرہ سے ہاجرہ ہو گیا جو حضرت اسمٰعیل کی ماں کا نام تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش میں کہ عمنان یا ہمنان زمانہ حال کے عمان سے علاقہ رکھتا ہے غلطی کی ہے کیونکہ سفر تکوین باب ۱۹ درس ۳۸ سے پایا جاتا ہے

کہ حضرت لود کی چھوٹی بیٹی نے ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جن پر بیٹیوں کا لفظ اطلاق کیا گیا ہے وہ حضرت لود کی بیٹیاں نہ تھیں، بلکہ لونڈیاں تھیں، بیٹا جنا اور اس کا نام "بن عمی" رکھا گیا جس سے بنی عمون کی قوم مشہور ہوئی، حال کا عمان ہمارے نزدیک اسی نام سے علاقہ رکھتا ہے۔

رابعًا۔ عوص ۲۰۲ اور خامسًا۔ حول ۴۰۱۱۶ ارم کے بیٹے تھے۔ ہم ان دونوں کا بیان بالاشتراک کریں گے ان کے آثار بھی آج تک اُن مقامات کے ناموں میں پائے جاتے ہیں، جو خلیج فارس کے کنارہ پر یا قرب وجوار کے میدانوں میں واقع ہیں۔ مثلاً عول اور حول ایک ہی نام ہیں مسٹر رورنڈ فارسٹر نے عول کے اشتقاق میں بھی مغالطہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کا بیان ہے کہ یہ لفظ حویلاہ نام کی ایک مختلف شکل ہے۔

عاداولیٰ۔ پسر" عوص "نے بہت شہرت حاصل کی اور اس کی اولاد ایک نامی قوم ہوگئی اور تمام شرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی۔ انھوں نے عالی شان مکان بھی بنائے۔ اور اور قوموں پر حکم بھی حاصل کیا۔ اس قوم کے آدمی اپنی جسامت اور قوت اور شان میں اور قوموں پر فوق لے گئے تھے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

عرب کے جنوب اور مشرق کے باشندے بہ نسبت اور لوگوں کے تنومند اور قد آور ہوتے تھے۔ اُن کی نسبت مسٹر رورنڈر فارسٹر نے ولسٹڈ صاحب کے سفرنامہ ملک عرب سے یہ بیان نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے حجاز کے عربوں اور ان عربوں کی وضع جسمانی میں جو خلیج فارس کے کنارہ جانب غرب پر آباد ہیں۔ ایک بڑا فرق مشاہدہ کیا۔ اعراب سکنائے ساحل خلیج کا حلیہ یہ ہے کہ اُن کے چہرے قریب قریب بیضوی کے ہیں۔ سر کے بال عمومًا سیاہ بالکل منڈے ہوئے ہوتے ہیں۔ بھنویں بھی سیاہ ہیں اور کھال چمکتی ہوئی ہے اور ہندوستان کے باشندوں کی نسبت اُن کا رنگ کسی قدر کھلا ہوا ہے۔ سواحل بحر احمر کے قریب کے باشندے لاغر اندام اور پستہ قد ہوتے ہیں، مگر قوی ہیں۔ چہرہ کسی قدر لمبا رخسارے بے گوشت کے اور سر کے بالوں کو دو لمبی زلفوں کے سوا جو دونوں طرف ہوتی ہیں اور جن کی وہ نہایت درجہ خبرداری کرتے ہیں اس قدر بڑھاتے جاتے ہیں کہ کمر تک آجاتی ہیں اُن کا رنگ کسی قدر کھلا ہوا ہوتا ہے۔

"جبیبی" سے چار پانچ منزل جنوب اور مشرق کی جانب سرما کے موسم میں اعراب "دوائر" رہتے ہیں۔ اور گرمیوں کے موسم میں نجد کے سرسبز چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں جس کے سبب

سے قریب سرحد صرف آٹھ منزل ہے۔ یہ لوگ گھوڑے نہیں رکھتے مگر لڑائی میں وہابیوں کی کمک کے لئے تین ہزار شتر سوار بھیجتے ہیں۔ اعراب "دواسر" طویل القامت اور قریب قریب سیہ فام ہوتے ہیں (سفرنامہ ملک عرب ضمیمہ جلد۲ صفحہ ۳۸۵) مگر یہ عجیب اختلاف درازی اور رنگ میں گردونواح کی قوموں سے کچھ اعراب "دواسر" ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ خلیج فارس کے عربوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے اور اُن اطراف میں بھی جہاں کہ علماء کے نزدیک شہر سبا آباد تھا۔ کرنیل چینی کا بیان ہے کہ خلیج فارس کے عرب خوش ہیئت ہوتے ہیں۔ اور طویل القامت اور سیہ فام ہونے میں مشہور ہیں اور اُن دونوں باتوں میں اقوام خلیج عرب سے بدرجہا اختلاف رکھتے ہیں (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ ۳۱) مگر مسٹر رورنڈ فارسٹر نے اس بات کے خیال کرنے میں کہ صرف بنی کوش ہی طویل القامت تھے غلطی کی ہے کیونکہ تمام قومیں جو خلیج فارس کے کنارہ پر رہتی تھیں اور جن کو ہم نے عرب البایدہ کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ نہایت بلند قامت تھیں۔ زمانہ حال تک بھی خلیج فارس پر ہم دو قسم کے آدمی پاتے ہیں جو درازی قد میں برابر ہیں مگر رنگ میں مختلف ہیں ایک تو سیاہ رنگ کے ہیں اور دوسرے ذرا اُجلے رنگ کے ہیں۔

مسٹر رورنڈ فارسٹر کتاب اشعیاہ نبی کی باب ۴۵ ورس ۱۴ کی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں لکھا ہے کہ "خداوند چنیں می فرماید کہ معمول مصر و تجارت حبش و اہل سبا کہ مردمانِ بلند قد اند بتو عبور نمودہ از آن تو خواہند بود" اور اس بات کو کہ بنی کوش سب دراز قد تھے۔ اسی ورس پر مبنی کرتے ہیں۔ مگر صاحبِ موصوف نے اس میں دو وجہ سے غلطی کی ہے۔ اول اس وجہ سے کہ جملہ "مردمانِ بلند قد" سے خواہ نخواہ یہ مراد لینی کہ وہ لوگ طویل القامت تھے محض غلط ہے بلکہ ان لفظوں سے یہ مراد ہے کہ وہ لوگ معزز اور اشراف تھے۔ چنانچہ عربی ترجمہ جو اشعیاہ نبی کی کتاب کا ہے اُس میں یہی معنی لئے گئے ہیں۔ اور اُس کی عبارت یہ ہے "ھٰذا یقول الرب تعب مصر و تجارت الحبش و سبا یم رجال اشراف بیرون الیک" دوم اس وجہ سے کہ باشندگان سبا متذکرہ عبارت مذکور کا کوش کی اولاد میں ہونا ضرور نہیں ہے کیونکہ کتب مقدسہ میں بنی سبا کا اطلاق اور قوموں پر بھی ہوا ہے مثلاً بنی سبا جن کا ذکر کتاب ایوب باب ۱ ورس ۱۵ میں آیا ہے اور جو وہ پائے فرات کے بنی سبا سے ہر طرح مشابہت رکھتے ہیں اور بلحاظ اپنے آبائی نام کے ہجوں کے قاعدہ کے موافق سبا پسر کلاں کوش کی اولاد نہیں ہے بلکہ اُن تین سباؤں میں سے کسی نہ کسی کی اولاد بیان کئے گئے ہیں جن کو حضرت موسیٰ نے منجملہ اُن سو خیلوں کے بیان کیا ہے۔ جنھوں نے ملک عرب کو یکے بعد دیگرے آباد کیا تھا:

اس قوم کی ہدایت کے لئے خدا تعالےٰ نے ایک نبی جن کا نام ہود تھا اور جن کا لقب مفسرکوین باب ۱۱ ورس ۱۴ میں عیبر لکھا آیا ہے مبعوث کیا تاکہ خدائے برحق کی عبادت کی ترویج اور بتوں کی پرستش کا استیصال کریں۔ لیکن جب کہ اُن لوگوں نے اُن کے احکام اور ہدایت سے سرتابی کی تو خدا تعالےٰ کا قہر جوش میں آیا اور تین برس کا قحط اُن پر پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس بات سے آگاہ ہو گئے کہ خدا کے پیغمبر کے احکام سے سرتابی کی یہ سزا ہے۔ اس پریشانی کی حالت میں حضرت ہود پھر تشریف لائے اور بُت پرستی ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی ازسرنو ہدایت کی اور اُس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خدائے رحیم بارانِ رحمت نازل کرے گا۔ مگر وہ اپنی گمراہی پر ثابت قدم رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت طوفان آندھی کا جو اُس کے عذاب کی نشانی تھی۔ نازل کیا یہ طوفان آندھی کا سات رات اور آٹھ دن تک تمام اُس ملک میں ایسے زور شور سے جاری رہا کہ ہزارہا آدمی ہلاک ہو گئے۔ اور تمام قوم کا باستثنائے ان چند اشخاص کے جنھوں نے حضرت ہود کا کہنا مان لیا تھا قریبًا استیصال کلی ہو گیا اور جو لوگ بچے آخر کو حضرت ہود پر ایمان لے آئے یہ واقعہ سنہ دنیوی کی اٹھارھویں صدی میں یا بائیسویں صدی قبل حضرت عیسٰی کی پیدائش کے واقع ہوا تھا۔

جھوٹی روایتیں جو قوم عاد کی نسبت مشہور ہیں

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ قوم عاد کے ہر شخص کا قد بارہ ارش لمبا تھا یعنی اس زمانہ کے جو لوگ ہیں اگر اپنے دونوں ہاتھوں کو سیدھا پھیلا دیں تو اُن کی لمبائی سے بارہ گنا زیادہ لمبا قد قوم عاد کا تھا بعض کتابوں میں اُن کے قد کے لمبان کا اُس سے بھی زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اُن کی قوت کا یہ حال تھا کہ چلنے میں اُن کے پاؤں زانو تک زمین میں دھنس جاتے تھے۔

انھوں نے جو اُس ریگستان میں کوئی محل بنایا تھا اُس کی نسبت بھی بہت زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور عاد ثانی کی اولاد کے قصہ کو اس قوم کے ساتھ جو عاد اولیٰ کی قوم ہے خلط ملط کر کے اُس خیالی باغ کو جس کا نام ایشیائی مورخوں نے "ارم" قرار دیا ہے اسی قوم کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اُس محل اور باغ کی زمین میں لعل اور یاقوت بچھے ہوئے تھے۔ اور اُس کی دیواریں سونے اور چاندی کی تھیں اور درخت زمرد اور یاقوت اور نیلم اور ہر قسم کے بیش بہا جواہروں سے بنائے گئے تھے اور زعفران بجائے گھاس اور عنبر بجائے مٹی کے تھا۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان کے زمانۂ خلافت میں ایک شخص اپنا

اونٹ ڈھونڈھتا ہوا وہاں چلا گیا اور بے شمار جواہرات وہاں سے رول کر اپنی جھولی میں بھر لایا۔ اور جب معاویہ ابن ابی سفیان نے اُس جگہ دوبارہ جانے کا اور اُس جگہ کے تلاش کرنے کا حکم دیا تو بہت سی تلاش کرنے کے بعد بھی وہ جگہ پھر نہ ملی۔ خلیفہ نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اُس کو انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ کر لیا ہے۔

بعض کتابوں میں حضرت علی مرتضیٰ کی نسبت اور بعض معتبر اشخاص کی نسبت ایک جھوٹا اتہام کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُنھوں نے یہ بات کہی کہ خدا تعالیٰ نے اُس باغ اور محل کو جو قومِ عاد نے تعمیر کیا تھا دُنیا سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے اور قیامت کے دن وہ بھی منجملہ اور آسمانی بہشتوں کے ایک بہشت ہوگی۔

عاد اولیٰ کی قوم کی بنائی ہوئی عمارات کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس قوم نے کوئی عمارت قابل شہرت نہیں بنائی تھی۔ اُن کی عمارتیں مثل اور معمولی عمارتوں کے بڑی اور چھوٹی ہر قسم کی تھیں۔

بہت سے مصنفوں اور مورخوں نے جو تمام عاد اولے کی طرف عمارات عالی شان بنانا منسوب کرنے میں غلطی کی ہے اُس کی وجہ ظاہرا یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ انھوں نے قرآن مجید کی اس آیت کے جو ذیل میں مندرج ہے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اور وہ آیت یہ ہے:۔

"الم تر کیف فعل ربك بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلها فی البلاد"۔

یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کس طرح پر کیا تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ جو "ارم" کی اولاد تھے اور ایسے قد آور تھے کہ اُن کی مانند شہروں میں پیدا نہیں کئے گئے تھے۔

لفظ "ذات عماد" سے جو اُن کا قد آور ہونا مراد لیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسری آیت سے ہوتا ہے جو ذیل میں لکھی جاتی ہے اور جس میں اُن کے مردہ پڑے ہوئے جسموں کو درختوں کے اُکھڑے ہوئے تنوں سے مشابہت دی ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

واما عاد فاهلکوا بریح صرصر عاتیة سخرها علیهم سبع لیال وثمانیة ایام حسوما فتری القوم فیها صرعیٰ کانهم اعجاز نخل خاویة۔

تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے دو امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ ایک یہ کہ "ارم" سے مراد "بنی ارم" ہے اور "ارم" عاد کا دادا تھا جس طرح کہ بنی ہاشم اپنے دادا ہاشم کے نام سے مشہور ہیں اسی طرح قوم عاد اپنے دادا ارم کے نام سے مشہور تھی اور عاد ارم کہلاتی

تھی۔ دوسرے یہ کہ لفظ "ذات العماد" سے اُن کا دراز قد اور قوی ہونا مراد ہے۔ جس طرح کہ بعض ملکوں کے لوگ دراز قد او قوی ہوتے ہیں۔ کوئی خاص عجیب بات اُن میں نہیں تھی۔ چنانچہ تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی میں اس طرح پر لکھا ہے:۔

"الم تر" تعلم یا محمد "کیف فعل ربك بعاد ارم" ھی عاد الاولی فارم عطف بیان او بدل منع الصرف للعلمیۃ والتانیث "ذات العماد" ای الطوال ..... "التی لم یخلق مثلھا فی البلاد" فی بطشھم وقوتھم (جلالین)"۔

"الم تر کیف فعل ربك بعاد" یعنی اولاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح قوم ھود سموا باسم ابیھم کما سمی بنو ھاشم باسمہ "ارم" عطف بیان لعاد علی تقدیر مضاف ای سبط ارم ... "ذات العماد" ای ذات البناء الرفیع القد ود والطوال والرفعۃ والثبات ("بیضاوی)"۔

زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ اس قسم کے پُرانے قصوں کو ایک مذہبی قصہ بنا لیتے ہیں اور اُس میں عجیب وغریب باتیں ملا کر اُس کو تعجب انگیز اور حیرت خیز کر لیتے ہیں جس طرح کہ ملٹن شاعر نے اپنی کتاب "پیرڈائز لاسٹ" کو ایک عجیب قسم کا مذہبی قصہ بنا لیا ہے اسی طرح زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے بھی قوم عاد کا ایک قصہ گڑھ لیا ہے۔ جس میں بیان کیا ہے کہ قحط کے دنوں میں قوم عاد نے تین شخص مکہ میں اس غرض سے بھیجے تھے کہ خدائے تعالیٰ سے مینہ برسنے کی دعا مانگیں۔ اُن تینوں میں سے ایک کا نام لقمان تھا وہ تو مسلمان تھا اور باقی دو کافر تھے۔ لقمان کی عمر سات گدّوں کی عمروں کے مجموعہ کے برابر عمر تھی اور اسی سبب سے لقمان بڑی عمر ہونے میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ گدھ کی عمر ہزار برس کی ہوتی ہے اور اس لئے لقمان کی عمر اُس وقت سات ہزار برس کی تھی۔ اسی قسم کے اور بہت سے لغو اور بیہودہ قصے عاد کی قوم کی نسبت جاہلوں نے بنا لئے ہیں۔ جن پر اہل علم کو متوجہ ہونا یا مذہبی اعتراضات کی بنا اُن قصوں کو قرار دینا نہایت لغو اور بیہودہ بات ہے۔

سادسًا۔ جدیس۔ سابعًا۔ ثمود جس کو عاد ثانی کہتے ہیں یہ لوگ ۱۶۲ ۷ پسر "ارم" ۳ ۵۶ بن سام بن نوح کی اولاد تھے جن کا بیان ہم ایک ساتھ کرتے ہیں۔

جدیس کا حال بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوا۔ کہ بیابان میں آباد ہوا تھا اور اُس کی اولاد بعد انقضائے عرصہ دراز کے مثل دیگر اقوام صحرائی کے معدوم ہو گئی۔

اولاد ثمود نے بہت بڑا نام پیدا کیا اور جلد ایک زبردست قوم ہو گئی اور اُس حصۂ ملک پر جو "الحجر" کے نام سے مشہور ہے اور اُس میدان پر جو وادی القریٰ کہلاتا ہے اور جو ملک شام کی جنوبی اور عرب کی شمالی حد بناتا ہے قبضہ کر لیا ہے۔ قرآن مجید میں اس قوم کا بھی چند جگہ ذکر آیا ہے۔ اُنھوں نے پہاڑیوں کو کھود کر اُن کے اندر اپنے گھر بنائے تھے اور نقش و نگار سے مرتب کئے تھے جو اثالیب کے نام سے مشہور ہیں۔ عرب کے لوگ اور چند غیر قوم کے لوگ جنھوں نے عرب میں سفر کیا ہے اُن پہاڑی گھروں کی جو پُرانے زمانہ کی باتوں کی تلاش کرنے والوں کو تشفی دیتے ہیں اور ان قوموں کے حالات جنھوں نے ان کو بنایا ہے بتلانے کو موجود ہیں شہادت دے سکتے ہیں۔ اسی طرح ان پہاڑی گھروں سے قومِ ثمود کی تاریخ کے اُس حصہ کی جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ بخوبی صداقت پائی جاتی ہے کچھ زمانہ کے بعد یہ قوم بھی بُت پرستی کی طرف مائل ہوئی۔ اس واسطے اُن کی فہمائش و ہدایت کے واسطے خدا تعالیٰ نے حضرت صالح بن عبید بن اُسف بن ماشج بن عبید بن جادر بن ثمود کو مبعوث کیا۔ بعض لوگ اُن پر ایمان لائے اور بہتوں نے اُن کا یقین نہیں کیا اُن لوگوں نے حضرت صالح سے کہا اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی بتلا۔ حضرت صالح نے جواب دیا کہ اے میری قوم یہ خدا کی اونٹنی تمھارے لئے نشانی ہے اُس کو چھوٹا پھرنے دو، تاکہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے اور اُس کو کچھ ایذا مت پہنچاؤ مبادا تم پر اُس کے عوض عذاب نازل ہو اس فہمائش کے سبب کچھ عرصہ تک اُن لوگوں نے اونٹنی کو پھرنے دیا اور کچھ ایذا انھیں پہنچائی۔

کچھ عرصہ کے بعد وہاں قحط واقع ہوا۔ اور اُس خشک سالی میں پانی کا بھی قحط ہو گیا، پانی نہیں ملتا تھا اور جہاں کہیں تھوڑا سا بھی پانی ہوتا تھا تو اونٹنی اپنی طبعی خاصیت سے جو خدا نے اونٹ میں پیدا کی ہے پانی کو تلاش کر لیتی تھی اور پی لیتی تھی یا خراب کر دیتی تھی اور لوگ اُس کو روک نہ سکتے تھے۔ حضرت صالح نے کہا کہ ایک دن اونٹنی کو پانی پی لینے دیا کرو اور کوئی اس کا مزاحم نہ ہو اور دوسرے دن تم لوگ پانی لیا کرو۔ اور اونٹنی کو وہاں نہ جانے دیا کرو۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد مختلف نو فرقوں کے سرداروں نے جو اُس زمانہ کے کافروں کے فرقے تھے حضرت صالح کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا، مگر جب وہ اپنے اس بدمنصوبہ پر کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے غصہ میں آکر اُس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اُس وقت حضرت صالح نے اُن سے کہا کہ تین دن تک تم اپنے مکانوں میں چین کر لو۔ بعد اس کے تم ہلاک ہو گے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ جب ہمارے حکم کی تعمیل ہونے کو ہوئی تو ہم نے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اُن پر ایمان لائے تھے بسبب

اپنے رحم کے اُس روز کی ذلّت سے بچا لیا۔ آفت جو اُن پر آئی تھی وہ یہ تھی کہ آسمان سے ایک خوفناک آواز آئی جو غالباً رعد اور زلزلوں کی اور اُسی قسم کی آفت ارضی و سماوی کی آواز تھی۔ صبح کو وہ لوگ اپنے مکانوں میں مُردہ اور سرنگون پڑے ہوئے ملے گویا کہ اُن مکانوں میں رہتے ہی نہ تھے۔ یہ واقعہ اُسی زمانہ میں واقع ہوا تھا۔ جب کہ سدوم اور گمارہ اور اداماب اور زہائین شہر آسمانی آگ سے جلائے گئے تھے۔ یعنی ۲۱۰۷ سنہ دنیوی یا ۱۸۹۷ قبل حضرت مسیح کے۔

جھوٹی روایتیں جو قوم ثمود کی نسبت مشہور ہیں

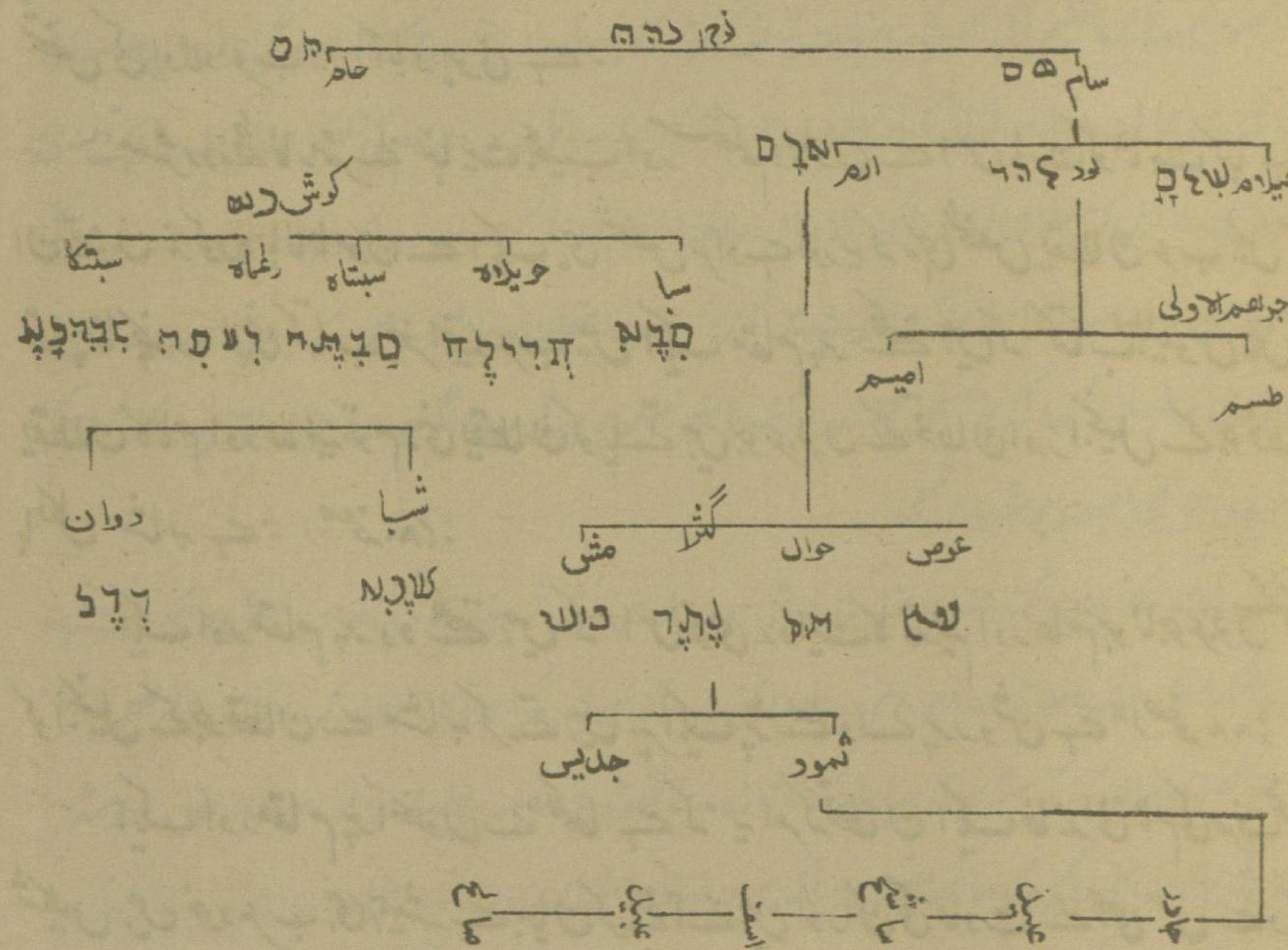
مفسرین اور مؤرخین کا بیان ہے کہ کفار نے حضرت صالح سے اُن کی رسالت کے ثبوت میں اس معجزہ کی درخواست کی تھی کہ اگر اس پہاڑی میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو اور بمجرد پیدا ہونے کے ایک سرخ بالوں کا بچہ جنے اور وہ بچہ اُسی وقت ہمارے سامنے بڑی اونٹنی کے برابر ہو کر چرتا پھرے اور ہم اُس اونٹنی کا دودھ پییں تب ہم ایمان لاویں گے۔

یہ روایت محض ساختہ اور مصنوعی ہے۔ اِس روایت کے موضوع کہنے سے اس وقت ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم امکان معجزہ سے انکار کریں اور اس پر بحث شروع کریں۔ بلکہ ہم اس وقت صرف سادی طرح سے اس روایت کو اس لئے موضوع کہتے ہیں کہ اُس کی صحت پر کوئی سند نہیں ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو ایسے عجیب واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ہوتا یا کسی مستند حدیث سے اُس کا ثبوت پایا جاتا۔ اسی طرح یہ بھی مصنوعی بات ہے کہ اُس اونٹنی سے انسان اور حیوان دونوں ڈرتے تھے اور وہ اونٹنی قوم ثمود کے تمام چشموں اور حوضوں کا پانی ایک گھونٹ میں پی کر سب کو سکھا دیتی تھی۔ کیونکہ وہ ملک ایسا تھا جہاں کثرت سے پانی میسر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح یہ ایک لغو روایت ہے کہ اگرچہ قوم ثمود کو تبلا دیا گیا تھا کہ اونٹنی کا قتل کرنا اُن کی ہلاکت کا باعث ہوگا لیکن حضرت صالح نے اُن سے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ تمھاری قوم کا ایک لڑکا جس کا حلیہ ایسا ایسا ہوگا اس اونٹنی کو مار ڈالے گا۔ اور اس طرح پر تمھاری ساری قوم پر تباہی اور بربادی آئے گی۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے جس کی پیشین گوئی حضرت صالح نے کی تھی لڑکوں کو مار ڈالنا شروع کیا جو لڑکا پیدا ہوتا تھا اور اُس میں اُس نشانی کا شبہ ہوتا تھا جو حضرت صالح نے تبلائی تھی تو اُس لڑکے کو مار ڈالتے تھے۔ مگر وہ لڑکا جس کے ہاتھ سے اُس قوم کا برباد ہونا مقدر میں تھا کسی نہ کسی طور سے بچ گیا اور مارا نہیں گیا جب کہ وہ جوان ہوا تو آخرکار اُس نے اُس اونٹنی کو مار ڈالا۔

اسی طرح حضرت صالح کے مخالفوں کے مارے جانے کی نسبت ایک بیہودہ روایت آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت صالح کے مخالفوں نے جب اُن کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ اُن پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گئے جہاں حضرت صالح آیا جایا کرتے تھے اس غرض سے کہ کوئی عمدہ کمیں گاہ تلاش کرکے اختیار کریں۔ خدا تعالےٰ نے ایک پہاڑ کو زمین پر سے بہت اونچا اٹھا لیا اور جہاں سے وہ پہاڑ اٹھا تھا وہاں ایک غار ہو گیا۔ حضرت صالح کے مخالفوں نے اُس غار کو اپنی کمیں گاہ کے لئے پسند کیا اور جب کہ وہ اس غار کے اندر جاکر چھپے تو خدا تعالےٰ نے اوپر سے اُن کے سروں پر اُس پہاڑ کو چھوڑ دیا اور سب کے سب ایک لمحہ میں کچل کر مر گئے۔

اگرچہ ہم نے اس مقام پر عرب البائدہ کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر اُن کا ایک شجرہ بھی اس مقام پر لکھتے ہیں جس سے تمام بیانات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔



دوم

عرب العاربہ یعنی ٹھیٹ عرب

عرب العاربہ یقطان יקטן بن عبیر עבר بن شالح שלח بن ارفخشد ארפכשד بن شام שם بن نوح נח کی اولادیں ہیں - بعض مؤرخوں کا یہ قول ہے کہ عرب البایدہ اور عرب العاربہ دونوں یقطان کی اولاد ہیں اور اس لئے عربوں کو وہ بجائے تین قوموں کے صرف دو قوموں پر منقسم کرتے ہیں یعنی عرب العاربہ اور عرب المستعربہ -

قریباً تمام مورخوں کی رائے ہے کہ کتب خمسہ موسٰی میں جو یقطان نام آیا ہے وہی ایک نام ہے جس کو عرب قحطان کہتے ہیں اور یونانی انجیلوں میں اُس کو "جوقطان" کر کے لکھا ہے اور اسی شخص کی اولاد عرب میں آباد ہوئی ہے -

مسٹر رورنڈ فارسٹر نے نہایت عجیب اور مستحکم دلیلوں سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان تینوں مذکورہ بالا ناموں سے ایک ہی شخص مراد ہے اور یہ کہ یہی شخص یقطان عرب میں آباد ہوا تھا چنانچہ وہ اپنی کتاب جغرافیہ عرب میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "کتاب بطلیموس میں بھی ہم یقطان کا نام اور علانیہ قوم بنی یقطان کو پاتے ہیں جو عربوں کے قحطان اور انجیل کے جوقطان کے بالکل مشابہ ہے" (صفحہ ۸۰)-

ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "اس قومی روایت کا قدیم اور عام ہونا جو عربوں کے قحطان کو انجیل کے جوقطان سے مشابہ کرتے ہیں ہر ایک پڑھنے والے پر روشن ہے" (صفحہ ۸۸)

ایک اور مقام پر اُنھوں نے لکھا ہے کہ "یہ امر کہ قحطان ایک خاندانی نام کی صرف مختلف شکلیں ہیں خود عرب ہی ہمیشہ سے بیان کرتے آئے ہیں اور اُن کی عادت سے بھی جس سے وہ حرفوں کو تبدیل کر لینے میں (معرب کر لیتے ہیں)، نہایت درجہ میلان رکھتے ہیں یہ نتیجہ قرار واقعی نکل سکتا ہے" (صفحہ ۸۸)

ایک اور مقام پر یہ لکھا ہے کہ "قدیمی قوم سبا کی دارالسلطنت مشہور بہ مارب میں اعراب یقطان سے جس کی مشابہت توریت کے یقطان کے ساتھ ہی یقطانی نام حویلاہ کے وقوع سے ازسرنو ثابت اور مسلّم ہوگئی ہے" (صفحہ ۹۰)

رورنڈ فارسٹر نے مسعودی کے اس قول پر کہ بنی سعد اور بنی قحطان بہت قدیم زمانہ سے

عرب کی قوموں میں مشہور چلے آتے ہیں یہ لکھا ہے کہ "تاریخ عرب قوم عظیم قحطان کی قدامت کے باب میں آواز دے رہی ہے اور یہ ایک ایسی آواز ہے کہ ایک طرف قدیمی عام قومی روایت اس کی تائید کرتی ہے اور دوسری طرف شاید اس سے بھی زیادہ مضبوط شہادت متوسط اور جنوبی عرب کے موجودہ مقاموں اور آبادیوں کے ناموں سے اُس کی حامی ہے" (صفحہ ۹)

بہرحال امر مذکورہ سے نہ تو مشہور اور معروف سیاح مسٹر برق ہروط[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا بیان ہے کہ آسی یقطان کی اولاد عرب میں آباد ہوئی تھی اور نہ سر ولیم میور انکار کرتے ہیں۔

[1] اس کتاب کے پڑھنے والے الفاظ "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کو دیکھ کر جو مسٹر برق ہروط کے نام کے بعد لائے گئے ہیں بلاشک متحیر ہوں گے اور اس حیرت کے رفع کرنے کے واسطے میری دانست میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ نہایت ذی فہم و ذی علم گاڈفری ہگنس صاحب کی کتاب کی کسی قدر عبارت کا ترجمہ اس جگہ لکھ دیا جائے "مشہور و معروف سیاح برق ہروط جس نے دار العلوم کیمبرج میں تعلیم پائی تھی ایک نہایت پُرغور تحقیق کے بعد اور خوب سوچ کر مسلمان ہو گیا۔ اور اپنے عیسائی دوستوں کے مجمع میں بحالت اسلام انتقال کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو مسائل دین اسلام کی تلقین بمقام حلب ایک آفندی نے کی تھی اور اسی نے اُس کو مسلمان کیا اور اُس نے وہاں علانیہ اسلام کا اقرار کیا۔ اور جب کہ بہ نیت حج روانہ ہوا تو مکہ کے قریب اپنے مذہب اور مسائل اسلام کی واقفیت میں اُس کو سخت امتحان دینا پڑا۔ جس کے باعث وہ ہمیشہ حاجی کے لقب کا دعویٰ کرتا رہا۔ اُس کی نومسلمی سچی اور صاف باطن معلوم ہوتی ہے اگرچہ میں خیال کرتا ہوں کہ اُس کے عیسائی دوستوں سے علی العموم پوشیدہ تھی۔

میں اس بات کے بیان کرنے سے نہایت خوش ہوں کہ میں ایک شریف آدمی سے جو بالفعل (مئی ۱۸۲۹ء) سے برٹش گورنمنٹ میں ایک معزز عہدہ پر مامور ہے واقفیت رکھتا ہوں مگر اس کا نام ظاہر کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں ان صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مسٹر برق ہروط کے انتقال سے تھوڑے عرصہ پہلے میں وہاں موجود تھا۔ اور مسٹر برق ہروط نے مجھے نہایت سنجیدگی کے ساتھ یقین دلایا کہ میں درحقیقت مسلمان ہوں اور اسی حالت میں مرنے کی آرزو ہے اس کا گمنام سوانح عمری لکھنے والا اپنی کتاب میں جو بعد اُس کے مشتہر ہوئی اس کی موت کا حال بیان کرتا ہے مگر اُس کے مذہب کے بارے میں کوئی لفظ منہ سے نکالنے سے احتیاطاً پرہیز کرتا ہے۔ غالباً اس کو معلوم ہوگا کہ اگر حق بات زبان سے نکلی تو پادریوں کے بدنام اور رسوا کرنے کی وجہ سے میری کتابوں کے فروخت میں ہرج واقع ہوگا لیکن ایک فقرہ جو میرے بیان کی تائید کے واسطے کافی ہے اُس کی زبان سے نکل گیا ہے۔ وہ اُسی شب کو پونے بارہ بجے بغیر افسوس دواویلا کرنے کے مرگیا۔ تجہیز و تکفین اُس کی وصیت کے موافق بطریق اسلام کی گئی اور اُس معزز رتبہ کا جو وہ دیسی لوگوں کی آنکھوں میں رکھتا تھا کماحقہٗ لحاظ کیا گیا۔ اگر وہ فی الحقیقت مسلمان تھا تو ضرور اُس نے مسلمانوں کی شرع کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

یقطان کی اولاد کے آباد ہونے کی جگہ کی نسبت توریت میں یہ لکھا ہے کہ "اُن کی آبادی میشا משא سے لے کر جہاں تک کہ توسفارہ ספרה تک جو مشرق میں ایک پہاڑی ہے چلا جائے تو وہاں تک تھی"۔ مسٹر برق ہروط کے نزدیک میشا اور "موزہ" جو یقطانی قوم سبا کا خلیج عرب کے دہانے کے نزدیک ایک بندرگاہ تھا۔ ایک ہی مقام ہے۔ اور سفارہ سے جبلی یعنی پہاڑی حصہ یمن کا جہانکہ بقول بطلیموس شہر سفار اور قوم سفاریہ آباد تھی مراد ہے۔ لیکن ریورنڈ فارسٹر اس مقام کو جس کو مسٹر برق ہروط صاحب نے بیان کیا ہے اور جو وسعت میں قریب ڈیڑھ سو میل کے ہے ایک نہایت کثیر قدیمی خاندان کی حدود کے ایک نہایت متبدلانہ معقول اندازہ کے واسطے محض غیر مکتفی خیال کرتے ہیں اور نہایت ضعیف دلائل سے ان کو نجد کے پہاڑوں تک پھیلا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ مقدس کاتب توریت نے یقطان کی اولاد کی آبادی کی کچھ حد مقرر نہیں کی ہے بلکہ وہ سمت تبلائی ہے جہاں وہ جا کر آباد ہوتی تھی۔

یقطان کے تیرہ بیٹے پیدا ہوئے۔ الموداد אלמודד شلف שלף حضرماوت חצרמות یارح ירח ہدورام הדורם اوزال אוזל دقلاہ דקלה عوبال עובל ابیمائیل אבימאל شبا שבא اوفر אופר حویلاہ חוילה یوباب יובב تمام قوم عرب العاربہ کی مع اپنی مختلف شاخوں اور شعبوں کے اشخاص مذکورہ بالا کی اولاد میں ہیں جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

الموداد۔ اس شخص کا خاندان یمن یا عرب المعمور میں اور اُس ضلع میں جو بحرین تک چلا گیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بموافق تجہیز و تکفین کی استدعا کی ہوگی اور یقیناً اگر عیسائی اس کی وصیت پر لحاظ نہ کرتے تو حکام مجبوری ان سے کراتے یہ بعید از قیاس ہے کہ وہ عیسائیوں کا مسلمانوں کو ایک ایسے نو مسلم کے شرف سے محروم رکھنا گوارا کرتے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے اُس کو بلا تکلف قنصل انگریزی کی نگرانی میں اور اُس کے ہم وطنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جن کو کہ پورا پورا موقع اُس کی تجدید مذہب کے واسطے اپنی لیاقتیں صرف کرنے کا ملا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کی بلا وجہ تقلید و تائید کرنے میں اس کو کوئی غرض مضمون نہ تھی۔ بلکہ برخلاف اس کے اُن عیسائیوں سے جن کی طرف سے وہ مامور تھا اور جن کی وجہ سے اُس کا گذارہ ہوتا تھا اُس کو مخفی رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

"الراس کی سوانح عمری لکھنے کا اعتبار کیا جاوے تو وہ اعلیٰ اصول اور بہترین چال وچلن کا آدمی معلوم ہوتا ہے منجملہ اور پسندیدہ کیفیتوں کے جو اس مرتد کافر کی بابت جس طرح کہ اُس کو عیسائی لوگ کہیں گے مرقوم ہوئی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنی موروثی جائداد قیمتی دس ہزار روپیہ کو اپنی ماں کے نان و نفقہ کے واسطے دے کر اپنے آپ کو محض مفلس و قلاش بنا دیا تھا" (ہیگنس اپالوجی صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء)

آباد ہوا اور اُس المودائی سے مطابقت رکھتا ہے جس کو بطلیموس نے یمن کی درمیانی قوم لکھا ہے۔

شلف۔ یہ شخص کوہ ذامس کے مغربی حصہ میں یا اُس وسیع میدان میں جو کاظم اور مدینہ کے مابین واقع ہے آباد ہوا۔ یہ قوم بطلیموس کی بیان کی ہوئی سالفنی قوموں سے مطابقت رکھتی ہے۔ عربوں میں یہ قوم بنام بنی سالف مشہور ہے۔ جو عبرانی نام شلف کی یونانی شکل ہے۔

حضرماوث۔ اس قوم نے اپنی سکونت کے واسطے وہ زرخیز قطع جو خلیج عرب کے برابر برابر پھیلا ہوا ہے اور جو اس قوم کے نام (حضرموت) سے آج تک مشہور ہے اختیار کیا۔ اس قوم کے لوگ یونانی اور رومیوں کے ہاں اپنی وسیع تجارت اور فن جہازرانی اور لڑائی میں جرأت اور بہادری کے لئے مشہور تھے۔

ہدورام۔ یرح کا حال یہاں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہم اس کو اخیر پر ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ہدورام کی اولاد نے مشرق کی سمت اختیار کی اور اُسی نواح میں آباد ہوئی قصبہ ہدرمہ اس قوم کی بہت سی یادگاروں میں سے موجود ہے۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ صوبہ مارقرامطاب کی بنا اسی قوم سے ہوئی ہے۔

اوزال۔ یہ خاندان اوزال میں جس کو اب صنعا کہتے ہیں اور جو سرسبز اور شاداب صوبہ یمن میں واقع ہے آباد ہوا (حزقیل باب ۲۷ درس ۱۹)

دقلاہ۔ یہ قوم بھی یمن میں آباد ہوئی اور ذوالخلاعہ جو یمن کی ایک قوم ہے اور جس کا ذکر پوکاک صاحب نے کیا ہے اسی کی اولاد میں سے ہے۔

عوبال۔ اس کا نشان عرب میں نہیں پایا جاتا مگر رورنڈ فارسٹر صاحب کا بیان ہے کہ یہ قوم افریقہ کو چلی گئی۔

ابیمائیل۔ بہت سے آثار جو مختلف اشخاص نے بیان کئے ہیں اس قوم کے بنی سالف اور حجاز کے قرب وجوار میں متوطن ہونے کے شاہد ہیں۔

شبا۔ اگرچہ یہ بھی جنوب کی جانب گیا اور یمن میں سکونت پذیر ہوا مگر یہ وہ شبا نہیں ہے جس نے یمن میں خاندان شبا کی سلطنت قائم کی تھی اور شہر مارب اور شہر سبا کو بنایا تھا۔ اکثر مؤرخ عرصہ دراز تک اس غلطی میں پڑے رہے کیونکہ وہ دوسرا شبا عرف عبدالشمس تھا کہ جس نے سلطنت خاندان شبا قائم کی تھی اور شہرہائے مارب اور سبا کو بنایا تھا اور جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اوفر۔ یہ قوم صوبہ عمان میں سبا کے مشرق میں آباد ہوئی جہاں کہ شہر اوفر میں اُن کے نشانات اب

تک پائے جاتے ہیں (ملوک اول باب ۹ ورس ۲۸)


حویلاہ۔ یہ شخص مارب کے ٹھیک شمال میں بسا تھا۔


یوباب۔ یہ بھی مارب کی جانب روانہ ہو کر اسی نواح میں آباد ہوا۔ قوم جوبارٹی جس کا بطلیموس نے ذکر کیا ہے اور جس کو عرب بنی جوبار کہتے ہیں اُسی کی اولاد میں ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

ان قوموں کے مختلف شعبوں اور شاخوں نے جو عرب میں ایک ہی اصل سے پیدا ہوئی تھیں صرف دو وجہ سے علیحدہ علیحدہ نام حاصل کئے تھے۔ یا تو بہ ہئیت مجموعی اپنی بڑی قوت اور تعداد کی وجہ سے یا قوم کے کسی شخص کی شہرت اور کارہائے نمایاں کے باعث سے۔ پس ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص میں سے کسی نے کوئی کارنمایاں جس سے وہ اپنے لئے کوئی مخصوص نام اختیار کرنے کے مستحق ہوتے، نہیں کیا اور اسی سبب سے شعبوں میں منقسم نہیں ہوئے۔ مگر یرح کا حال ایسا نہیں ہے جس کا بیان ہم اب کسی قدر طوالت کے ساتھ کرتے ہیں۔

عرب کے جغرافیہ دان یقطان کے بے شمار لڑکوں میں سے صرف دو شخص کا ذکر کرتے ہیں یعنی یعرب اور جرہم کا۔ چند مؤرخوں کی یہ رائے ہے کہ یعرب اور یرح سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ اور اگرچہ یہ قاعدہ ہے کہ (ج) اور (ی) کا باہم تبادلہ ہو جاتا ہے مگر جرہم کے باب میں رائیں مختلف ہیں بعضے کچھ کہتے ہیں۔ اور بعضے کچھ۔ مگر جمہور کی یہ رائے ہے کہ یعرب اور جرہم دونوں یرح کے بیٹے تھے اور اسٹربو اور جارج سیل کی بھی یہی رائے ہے لیکن ابوالفدا اپنی کتاب کے ایک مقام میں یعرب اور جرہم کو دو مختلف اشخاص بیان کرتا ہے اور دوسرے مقام پر جہاں کہ وہ مختلف اقوام عرب کے متفرق شعبوں کا ذکر کرتا ہے تو جرہم کو تنہا مورث اعلیٰ تمام فرقوں کا بتلاتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یعرب اور جرہم سے ایک ہی شخص مراد ہے اور اولاد یعرب کی مختلف شاخیں بنی جرہم میں شامل ہیں۔

مشرقی مورخوں نے اس اختلاف کو غیر منفصل چھوڑ دیا ہے مگر ریورنڈ فارسٹر صاحب نے نہایت لیاقت سے ثابت کیا ہے کہ جرہم اور یعرب ایک ہی شخص تھے اور جس جگہ کہ انھوں نے اس نام کی چند قدیم وجدید مسلّم شکلیں بیان کی ہیں اُس جگہ بیان کیا ہے کہ ستر مترجموں نے اس نام کو جرح لکھا ہے اور سینٹ جردم نے جیر اور حال کے عربوں نے جرح اور سرح اور شرح اور زہران لکھا ہے۔ جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ ان فرضی مختلف ناموں کی مطابقت حسب قواعد بھی بیان کر کے صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "علے العموم جو شہادت کہ خود عرب بھی اپنے جرہم کو جرہ پسر یقطان کے ساتھ مطابقت کرنے میں زمانہ دراز سے دیتے آئے ہیں۔ اُس کی تصحیح و تصدیق کتاب بطلیموس میں غیر مبدل توریتی نام کے





واقع ہونے سے ہوگئی ہے اور یہ ایک ایسی مثال ہے جس کا ہم کو بارہا حوالہ دینا پڑا ہے یعنی بطلیموس کے اس جملہ کا "انسیولا جراچیوری" جس کا ترجمہ ہے جزیرہ بنی جرہم جو اسی حصہ حجاز کے کنارہ کے پرے ایک جزیرہ ہے"

جرہم یا جرہم کی مطابقت تسلیم کرلینے میں ہمیں کچھ بھی کلام نہیں ہے اور عرب العاربہ کے شجرۂ انساب میں ہم اُن کو ایک شخص قرار دے کر یعنی یرح یا یعرب یا جرہہ یا جرہم اُن کا شجرہ لکھیں گے۔

تاریخ عرب العاربہ میں اس شخص کی اولاد کا حال بہت مذکور ہے یہ اسی کی اولاد تھی جس نے مختلف فرقوں میں منقسم ہو کر بڑے بڑے کام کئے اور زبردست سلطنتوں کے بانی ہوتے مگر عرب العاربہ کی تاریخ لکھتے وقت اُن کے کاموں اور اُن سلطنتوں کے قائم ہونے کے زمانہ کا متعین کرنا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ زبانی روایتوں میں جو زمانہ بیان ہوتا ہے وہ کبھی غلطیوں سے خالی نہیں ہوتا اور اس کو معتبر نہیں مانا جاسکتا۔ دوسرے اس سبب سے کہ مورخان عرب نے ان واقعات کی تاریخیں سیپٹو ایجنٹ یعنی یونانی ترجمہ توریت سے اخذ کی ہیں۔ توریت کے یونانی ترجمہ میں اور اصل عبرانی توریت میں جو اب موجود ہے زمانوں کا بہت سا اختلاف ہے مگر قریبًا قریبًا تمام عیسائی ملکوں میں عبرانی توریت کے زمانے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ گو اُس کے مندرجہ زمانے بھی نہایت مشتبہ اور ناقابل اعتبار ہیں۔ تیسرے اس باعث سے کہ عرب کے مورخوں نے دو قسم کی تاریخوں کو یعنی اُس کو جو زبانی روایتوں سے عرب میں چلی آتی تھی اور اُس کو جسے یونانی توریت سے اخذ کیا تھا خلط ملط کردیا ہے۔ اور اس سبب سے بڑی ابتری اُن کی تاریخ میں پڑگئی ہے بعض واقعات کا زمانہ تو زبانی روایتوں کے بموجب متعین کرتے ہیں اور بعض کا یونانی توریت کے موافق۔ پس ان مشکلات پر غالب آنا جن سے تاریخ عرب بھری پڑی ہے کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس پیچیدہ اور مشکل کام کے حل کرنے کے لئے ہم نے تین ذریعے اختیار کئے ہیں۔

اول۔ اصل عبری توریت جس کو اُس زمانہ میں قریبًا قریبًا ہر ایک ذی علم قوم نے تسلیم کرلیا ہے اور علم تواریخ کو اسی کی مندرجہ تاریخ پر مبنی کیا ہے۔ اُنھوں نے عبری توریت کو اصل اصول فرض کرکے اور اُس کے مندرجہ زمانوں کو تسلیم کرکے بہت سی کتابیں تاریخ کی تصنیف کی ہیں۔ اور ہر قسم کے مباحثوں میں خواہ مذہب سے متعلق ہو خواہ علم تواریخ سے خواہ علم الارض سے خواہ علم حیوانات سے خواہ کسی اور علم سے اُسی کے مندرجہ زمانوں پر استدلال کرتے ہیں۔ اس واسطے ہم نے بھی اپنی اس کتاب میں انھیں کی تقلید کو قرین مصلحت سمجھا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے متعدد واقعات کو جو عرب میں واقع ہوئے اُن کے ہم عصر

واقعوں سے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے اور جن کا حال توریت میں مندرج ہے مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور اس طرح پر ہم عرب کے واقعات کا صحیح زمانہ متعین کرنے میں کسی قدر کامیاب ہوئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ بعض تواریخی واقعات جو عرب میں واقع ہوئے وہ ایسے ہیں کہ اور ملکوں مثلاً فارس اطالیہ اور مصر کے واقعات سے علاقہ رکھتے ہیں اور یہ ایسے ملک ہیں جن کی تواریخ اور اُن واقعات کا زمانہ جو وہاں واقع ہوئے دُنیا میں بخوبی مشہور ہے۔ علاوہ اس کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو عرب میں واقع ہوتے ہیں اور اُن کے وقوع کا زمانہ قریب بہ صحت معلوم ہے اس لئے ہم نے اپنی تحقیقات میں اُن دونوں تاریخوں کو بطور رہنما کے اختیار کیا ہے۔

قحطان اول شخص تھا جو عرب میں بادشاہ ہوا اور اپنی دارالسلطنت زرخیز اور شاداب صوبہ یمن میں مقرر کی جو کہ قحطان فالغ کا بھائی تھا اس واسطے اُس کی تاریخ ولادت فالغ کی تاریخ ولادت سے بہت بعید نہ ہوگی اور اس لئے وہ تاریخ قریب سنہ ۱۷۵۵ دنیوی یا سنہ ۲۲۰۰ قبل حضرت مسیح کے قرار پاتی ہے سنہ زبانوں کے اختلاف کے بعد جو بابل میں مینار کی تعمیر کی وجہ سے عارض ہوگئیں۔ نمرود پسر کوش ملک بابل یا اشور کا بادشاہ ہوا اور حام پسر مصریم مصر کا، اُسی زمانہ میں قحطان بھی یمن کا بادشاہ ہوا یعنی سنہ ۱۷۸۱ دنیوی یا سنہ ۲۲۲۴ قبل مسیح میں۔

> اول من نزل الیمن قحطان بن عابر بن شالح وقحطان المذکور اول من ملک ارض الیمن ولبس التاج (ابوالفدا)

اس کے مرنے پر یعرب یا جرہم اپنے باپ کا جانشین ہوا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس کے قبضہ میں یمن اور حجاز کے صوبے تھے جو اُس وقت میں بنی جرہم کے نام سے مشہور تھے۔ ریورنڈ فارسٹر صاحب اور اور مورخ اس باب میں متفق الرائے ہیں اور اتفاق کی صحت اکثر مقامات کے ناموں کی مطابقت سے جو اُن صوبجات میں پائے جاتے ہیں ہوتی ہے۔ جرہم کے یمن میں آباد ہونے کے باب میں مصنف موصوف نے ایک بہت معقول وجہ ثبوت پیش کی ہے یعنی یہ کہ جرہم ابو یمن کے نام سے ملقب ہوا تھا۔

> ثم مات قحطان وملک بعدہ ابنہ یعرب بن قحطان (ابوالفدا)

جرہم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یشجب تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد اُس کا بیٹا عبدالشمس ملقب بہ سبا اکبر تخت نشین ہوا۔ یہ شہزادہ یمن میں شہد سلطنت سبا کا بانی ہوا اور اسی نے شہر سبا اور شہر مارب بنایا۔ اور اس کے بعد اُس کے بیٹے حمیر نے تخت سلطنت پر

> ثم ملک بعدہ ابنہ یشجب بن یعرب ثم ملک بعدہ ابنہ عبد شمس بن یشجب ... وسمی سبا وھو الذی

بنا السد بارض مارب ۔۔۔۔۔ وبنی مدینۃ مارب وعرفت مدینۃ سبا ۔۔۔۔۔ وخلف سبا المذکور عدۃ اولاد منہم حمیر وعمرو وکہلان واشعر وغیرہم ۔۔۔ ولما مات سبا ملک الیمن بعدہ ابنہ حمیر ابن سبا (ابی الفدا)

پر جلوس کیا۔

اب چونکہ حمیر یقطان سے چوتھی پشت میں تھا اور ترح بھی فالغ سے چوتھی پشت میں تھا اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے بہت دور نہیں ہوگی یعنی ١٨٧٨ سنہ دنیوی یا ٢١٢٦ سنہ قبل حضرت مسیح میں اُس کی ولادت ہوئی ہوگی۔

ترح کے تین بیٹے تھے ابرام، ناحور، حاران۔ اور حمیر کے بیٹے بھی تین تھے۔ واثل۔ عوف۔ مالک۔ اس لئے ترح اور حمیر کی اولاد کو بھی ہم عصر خیال کرنا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ وہ ٩٤٨ سنہ دنیوی یا ٢٠٥٦ سنہ قبل حضرت مسیح کے تھے۔

واثل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا۔ اب اول اُس مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً دی گئی ہے لحاظ کر کے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط پسر حاران پر غور کر کے سکسک اور فاران کی ولادت کی تاریخ قرار دینی چاہیئے جو ١٨٧٨ سنہ دنیوی یا ٢١٢٦ سنہ قبل حضرت مسیح میں یعنی تیس برس قبل ولادت حضرت ابراہیم کے قرار پاتی ہے۔

واثل اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اور عوف کسی جگہ حجاز اور نجد کے مابین آباد ہوا۔ یہ امر

ثم ملک بعدہ (ای بعد حمیر) ابنہ واثل ابن حمیر ثم ملک بعدہ ابنہ السکسک بن واثل ثم ملک بعدہ یعفر بن السکسک ثم وثب علی ملک الیمن ذو ریاش وھو عامر بن باران (فاران) (پاران، باران) بن عوف بن حمیر (ابو الفدا)

عوف بفتح اولہ وسکون ثانیہ واخرہ فاء جبل یحل ۔۔۔۔ وعوق

اس بات سے ثابت ہے کہ پہاڑ جو نجد کی جانب مغرب واقع ہے۔ آج تک جبل عوف کے نام سے مشہور ہے۔ فاران ابن عوف اپنے باپ کے پڑوس میں آباد ہوا۔ یعنی اُس وادی غیر ذی زرع میں جہاں بالفعل مکہ معظمہ موجود ہے۔ فاران کا اطلاق صرف اُس وسیع شمالی بیابان پر نہیں ہوتا جو قادیش تک چلا گیا ہے بلکہ اُن پہاڑوں پر ہوتا ہے جو اس میں واقع ہیں اور اُن پہاڑوں ہی کے نام کی وجہ سے اس وسیع میدان کو فاران کا میدان کہہ سکتے ہیں۔

تمام مشرقی مورخ اور نیز وہ لوگ جو قدیم روایتوں کے معتقد ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور توریت مقدس میں بھی

بالفتح ارض فی دیار غطفان بین نجد وخیبر (مراصد الاطلاع علی اسماء الا مکنۃ والبقاع) صاف صاف مذکور ہے کہ یہی نواح بنام فاران موسوم تھا چونکہ ہم اس مضمون کو زیادہ تر تفصیل سے عرب المستعربہ کے ذکر میں بیان کریں گے اس لئے کچھ حال فاران بن عوف کا بیان کرتے ہیں۔

ابوالفدا اپنی تاریخ عرب میں بیان کرتا ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا۔ یہ تاریخ مع اپنے لاطینی ترجمہ کے ۱۸۳۱ء میں از سرنو چھاپی گئی تھی اور اُس کا لاطینی زبان میں یہ نام ہے (ابوالفدا ہسٹوریا انٹی اسلام کا اربیس) یعنی تاریخ ابوالفدا درباب عرب ایام جاہلیت اور اس کا ایڈیٹر "ہنرکیس آرتھوبیس فلیچر" تھا۔ لفظ فاران اصل کتاب کے صفحہ ۱۱۴ میں اس شکل سے چھپا ہے۔ (ماراں) یعنی حرف اول پر کوئی نقطہ نہیں ہے۔ اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ پہلا حرف کیا ہے ن ہے یا ب ہے یا پ ہے اور اس موقع پر یہی تین صورتیں ہونی ممکن ہیں۔ مگر باوجود اس نقطہ کی غلطی کے یہ متحقق ہے کہ یہ لفظ بجز فاران کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

عربی مصنفوں کا دستور ہے کہ جب کسی لفظ کا تلفظ ف سے ہوتا ہے تو اُس کو ف کے حرف سے لکھتے ہیں۔ بعض یہودی حرف ف کا تلفظ مثل حرف پ کے کرتے ہیں۔ مگر عربی مصنف پ کی جگہ ب کا تلفظ کرتے ہیں اور ب ہی سے اُس لفظ کو لکھتے ہیں کیونکہ اُن کی الف بے میں پ کا حرف نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ابوالفدا نے لفظ فاران کو جس کا یہودی تلفظ پاران سے تھا۔ باران ب کے ساتھ لکھا ہے۔ جس کا نقطہ چھپنے میں رہ گیا ہے اور اس کا ثبوت لاطینی ترجمہ سے ہوتا ہے کہ اُس میں اُس کا ترجمہ "بارانی" ب سے کیا گیا ہے۔ پس اب اس بات میں کہ عوف کا بیٹا فاران تھا۔ کچھ شک باقی نہیں رہا۔

جس مقام پر کہ عوف نے سکونت اختیار کی تھی وہاں کوئی ایسا ربانی کرشمہ واقع نہیں ہوا۔ جو اُس کی شہرت کو جو اُس نے عوف کے نام سے حاصل کی تھی گھٹا دیتی یا مٹا دیتی اور اس لئے وہ مقام اور وہ پہاڑ عوف ہی کے نام سے مشہور رہا۔ مگر جس جگہ کہ فاران آباد ہوا تھا اُس کا حال ایسا نہیں ہوا کیونکہ وہاں ایک ربانی کرشمہ کے واقع ہونے کا وعدہ کیا گیا تھا اور جب وہ ربانی کرشمہ واقع ہوا جو تمام چیزوں پر جن کی عرب تعظیم اور حرمت کرتے تھے سبقت لے گیا اور اُن کی شہرت کے چاند کو گہن لگا دیا۔ فاران کی شہرت مدھم پڑ گئی اور اُس کی جگہ خدائے مقدس کے نام کی شہرت قائم ہوئی۔ فاران کا نام نسیاً منسیاً ہوگیا اور بیت اللہ الحرام کے نام سے اُس مقام

نے شہرت پائی جو اُمید ہے کہ قیامت تک اسی طرح مشہور اور معزز رہے گا۔

واثل کے بعد اُس کا بیٹا سکسک اور اس کے بعد اس کا بیٹا یعفر جانشین ہوا۔ اس کا چچازاد بھائی عامر ذوریاش پسر فاران پسر عوف نے جو حجاز میں آباد ہوا تھا یعفر کی سلطنت پر حملہ کیا اور فتح کر لیا لیکن نعمان بن یعفر نے اُس کو نکال دیا اور وہ حجاز کی طرف چلا گیا اور نعمان نے اپنی سلطنت واپس لے لی۔ اس کارنمایاں کی وجہ سے اُس کا لقب المعافر ہو گیا۔ اسی قاعدہ کے بموجب جس سے کہ ہم نے اس قدر اشخاص کی ولادت کی تاریخیں معین کی ہیں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یعفر بن سکسک اور عامر بن فاران اور حضرت ابراہیم کے تولد کی تاریخ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہے۔ یعنی ۲۰۰۸ سنہ دنیوی میں یا ۱۹۹۶ سنہ قبل حضرت مسیح میں۔ اب جو قدرتی قاعدہ پشتوں کے توالد وتناسل کا ہے اُس کے مطابق ہم نعمان کے زمانۂ پیدائش کو دریافت کر سکتے ہیں جس کا وقوع ۲۰۳۸ سنہ دنیوی میں یا ۱۹۶۶ سنہ قبل حضرت مسیح میں واقع ہوتا ہے۔

ثم نهض من بني وائل النعمان بن يعفر بن السكسك بن وائل بن حمير واجتمع عليه الناس وطرد عامر بن باران عن الملك واستقل النعمان المذكور بملك اليمن ولقب نعمان المذكور بالمعافر۔

ثم ملك بعده ابنه اشمح بن المعافر المذكور ثم ملك بعده شداد بن عاد بن الملطاط بن سبا واجتمع له الملك وغزا البلاد ان بلغ اقصى المغرب وبنى المدائن والمصانع وابقى الآثار العظيم (ابوالفدا)

اس پچھلے زمانہ کے پینتالیس برس بعد حضرت ابراہیم مقام "اور" سے جو قوم کالدی سے متعلق تھا حاران کو جو عراق عرب میں واقع ہے بلائے گئے تھے اور یہ ایک ایسا زمانہ ہے جس کے متعلق جمیع واقعات ہم کو اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ عامر اور نعمان کی جنگ اسی زمانہ میں ہوئی ہوگی۔ اس لئے یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ یہی وقت تھا جب کہ نعمان نے عامر کو بھگا کر اپنے آبائی تخت کو حاصل کیا تھا یعنی ۲۰۸۳ سنہ دنیوی یا ۱۹۲۱ سنہ قبل حضرت مسیح میں۔ نعمان کے بعد اس کا بیٹا اشمح تخت پر بیٹھا اس کی سلطنت پر شداد نے حملہ کیا اور اشمح کو شکست دے کر جلاوطن کر دیا۔ شداد نے بڑی عظمت اور شہرت حاصل کی اور اپنی حکومت استحکام کے ساتھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اُس نے بہت سی عالی شان عمارتیں بنائیں[1] جن کے نشان اب بھی پائے جاتے ہیں۔

---

[1] مسٹر ورنڈ فارسٹر صاحب بوقت بیان کتبات قوم عام کے جو مختلف اقطاع عرب میں ظاہر ہوئے ہیں بقب الحجبے کے
(باقی اگلے صفحہ پر)

شداد کا نام ایسا مشہور ہے کہ قریب قریب ہر مشرقی باشندہ اُس سے واقف ہے اور اُس کی عظمت وشوکت کی نسبت بہت سے عجیب وغریب قصے اور روایتیں مشہور ہیں یہ شخص ملطاط بن عبدالشمس عرف سبا اکبر کی اولاد میں تھا اُس کے باپ کا نام عاد ہے مؤرخوں نے اس عاد کو پہلے عاد کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے اور اس طرح پر مختلف روایتیں جو درحقیقت پہلے عاد سے متعلق تھیں اس کی طرف منسوب کی ہیں اور اس کی روایتیں پہلے عاد کی طرف۔

ان دونوں عادوں کے باہم تمیز کرنے کے لئے ہم نے اس پچھلے عاد کو جس کا ابھی ذکر ہوا بنام عاد ثالث موسوم کیا ہے کیونکہ اس نام کا یہ تیسرا شخص ہے۔

مشرقی تاریخوں میں ہم شداد اور سبا اکبر کے مابین صرف دو نام ایک عاد اور دوسرا ملطاط پاتے ہیں حالانکہ اُن کے مابین کم سے کم پانچ نام ہونے چاہئیں۔ مشرقی تاریخوں میں جو سلسلہ انساب میں اس طرح ناموں کی کمی پائی جاتی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی مورخوں نے سلسلہ انساب کو پرانے عربی شعرا کے اشعار اور تحریروں سے اخذ کیا ہے اُن شاعروں کا قاعدہ تھا کہ اپنے اشعار میں اُنھیں لوگوں کا ذکر کیا کرتے تھے جنھوں نے کسی بڑے بڑے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہو اور جن لوگوں نے ایسی شہرت نہیں حاصل کی اُن کے نام اُن اشعار میں نہیں پائے جاتے تھے اور یہی سبب ہے کہ مشرقی مؤرخوں نے جو سلسلہ انساب قائم کیا ہے اس میں سے وہ نام چھوٹ گئے ہیں۔

عرب العاربہ کا شجرہ انساب ہم اپنے اس مضمون کے اخیر میں شامل کریں گے اس شجرہ میں جہاں کہیں ہم کو اس طرح پر ناموں کے رہ جانے کا شبہ ہوا ہے یا جہاں کہیں خود مشرقی مؤرخوں نے ناموں کے رہ جانے کا اقرار کیا ہے وہاں ہم نے ایک نشانی ستارہ کی بنا دی ہے۔ جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ کس قدر نام ہماری دانست میں اُس سلسلہ میں سے چھوٹ گئے ہیں۔

جس زمانہ میں کہ شداد نے یمن والوں پر غلبہ حاصل کیا اور سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اس کا صحت کے ساتھ متعین کرنا کسی قدر غیر ممکن ہے باایں ہمہ کہہ سکتے ہیں کہ لقمان کی تخت نشینی سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ قدیمی آثار کا جو حضرموت میں ہیں ذکر کرتے ہیں حصن غراب کے آثار بھی کچھ کم مشہور نہیں ہیں عدن میں بعض عمارتوں کے آثار بڑی قدامت کا دعوٰی کرتے ہیں اور لوگوں کو بہت شوق دلاتے ہیں اور قوم عاد سے منسوب ہیں۔ بعض نشانات حوضوں کے جو عموماً تالاب کہتے ہیں۔ عدن میں اب تک پائے جاتے ہیں، اور جن کی قدامت کی وجہ سے ہر سیاح کی توجہ واشتیاق کو کشش ہوتی ہے۔ ان کا بانی شداد کو کہتے ہیں۔ علاوہ اُن آثار کے جن کا ذکر ہو چکا ہے بہت سے اور بھی دریافت ہوئے ہیں جو خود ان عمارات اور نیز اُن کے بانی کی قدامت کے شاہد ہیں۔

چند سال بعد یا اُس کی وفات سے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں شام کے پانچ بادشاہوں کے باہم لڑائی شروع ہوئی توریت مقدس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی کا اثر عرب میں بھی پہنچا تھا۔ کیونکہ اُس میں لکھا ہے کہ "پس در سال چہاردہم کدرلاعومر و ملوکے کہ ہمراہش بودند آمدہ رفائیان را در عشتروث قرنیم و زوزیان را در ہام و ایمیان را در شاہ قریاتایم شکست دادند و نیز حوریان را در کوہ خودشان سعیر تا ایل پاران کہ در نزدیک صحراست و برگشتہ بعین مشپاط کہ قادیش است آمدند و تمامی مرز و بوم عمالقیان و اہم اموریانی کہ در حصصون تامار ساکن بودند شکست دادند۔"

(سفر تکوین باب ۱۴ درس ۵ و ۶ و ۷)

ظاہر ہے کہ یہ حملہ آور قادیش کے شمال سے آئے ہوں گے کیونکہ سعیر کے پہاڑ اُس جگہ سے شمال میں واقع ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قادیش کے جنوب میں دور جا کر فاران میں چلے گئے جس سے آج تک حجاز مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس بیان کے کہ حملہ آور پاران سے قادیش کو لوٹ گئے، کچھ بھی معنی نہ ہوتے۔ اگر یہ کہیں کہ یہ لوگ مغرب کی جانب گئے ہوں گے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اُس طرف بنی عملیق رہتے تھے جن سے کہ ان حملہ آوروں نے اپنی پہلی مہم سے قادیش کو واپس آنے کے بعد جنگ کی تھی۔

اس وقت اشمح کی حکومت اور عملداری صوبہ یمن اور حجاز پر پھیل گئی، جو کہ یہ زمانہ اُس کے عہد حکومت کی ابتدا کا تھا اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا حملے کی وجہ سے اُس کی طاقت میں کسی قدر ضعف آ گیا ہو۔ جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سلطنت یمن کی اس ضعف اور شکست حالت کو دیکھ کر شداد نے جو ہمیشہ ایسے موقع کا منتظر رہتا تھا اشمح پر حملہ کیا ہو اور اس کو حکومت سے بے دخل کر کے تخت چھین لیا ہو۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ کہ اشمح سنہ ۲۰۹۱ دینوی یا سنہ ۱۹۱۳ قبل حضرت مسیح میں تخت پر بیٹھا تھا اور شداد نے سنہ ۲۰۹۲ دینوی یا سنہ ۱۹۱۲ قبل حضرت مسیح میں اُس کی سلطنت کو چھین لیا تھا۔ اور یہ زمانہ اُس عام قاعدہ سے جو علم انساب میں پشتوں کے پیدا ہونے کے لئے قرار دیا گیا ہے بالکل مطابق ہوتا ہے۔

شداد کے بعد اُس کے دو بھائی لقمان اور ذوشدو یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور ذوشدو کے بعد اُس کا بیٹا الحارث بادشاہ ہوا۔ اُس زمانہ تک اور اُس کے بہت عرصہ بعد تک وہاں دو خود مختار سلطنتیں رہیں ایک یمن کی اور دوسری حضرموت کی، آخر کو ایک

ثم ملك بعده اخوه لقمان بن عاد ثم ملك بعده اخوه ذو شدد بن عاد ثم ملك بعده ابنه

الحرث بن ذی شد دو یقال للحارث الرایش (ابو الفدا)

دوسرا شخص مسمی الحارث جس کا لقب رائش ہوا تخت پر بیٹھا اُس نے ان دونوں سلطنتوں کو ملا کر ایک کر دیا اس لئے بعض مؤرخوں نے غلطی سے پہلے الحارث اور دوسرے الحارث کو ایک ہی شخص سمجھا اور اُسی کی طرف دونوں سلطنتوں کا ملانا منسوب کیا۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن بادشاہوں کے نام جو اُن دونوں الحارثوں کے مابین فرماں روا ہوئے تھے۔ ہر ایک مؤرخ نے چھوڑ دیئے اور اُن کے نام معدوم ہو گئے۔ اس غلطی کا ثبوت اس طرح پر ہوتا ہے کہ جو زمانہ ان بادشاہوں کا گذرا ہے اور جو تعداد بادشاہوں کی لکھی ہے وہ بلحاظ امتداد زمانہ کے نہایت کم ہے۔

حمزہ اصفہانی اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ الحارث الرایش ذو شدد کا بیٹا اور جانشین

الحارث الرائش ھو الحارث بن قیس بن صیفی بن سبا الاصغر الحمیری وکان الرائش اول غزاتھم فاصاب الغنائم وادخلھا ارض الیمن فارتاشت حمیر فی ایامہ وکان ھو الذی راشھم فبذالک سمی الرائش وبین الرائش وبین حمیر خمسۃ عشر اباً (تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء لحمزۃ اصفہانی)

نہ تھا بلکہ حضرموت کے خاندان میں سے تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ مصنف اُن بادشاہوں کی تعداد بھی نہیں بتلاتا۔ جن کے نام معدوم ہو گئے ہیں لیکن اس کا یہ بیان کہ حمیر اور الحارث الرائش کے مابین پندرہ پشتیں گذری تھیں۔ ہم کو کسی قدر ٹھیک وقت کے معین کرنے پر قادر کرتا ہے۔

اگر ہم بیان صدر پر اعتماد کریں تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ الحارث ابن شدد کے اور الحارث الرائش کے مابین سات یا آٹھ اور بادشاہ ہوئے ہوں گے۔

الحارث الرائش قیس بن صیفی بن سبا الاصغر کا جو حمیر کی اولاد میں ہے بیٹا تھا۔ اور جیسا

ثم ملک بعدہ ابنہ ذو القرنین الصعب بن الرائش ثم ملک بعدہ ابنہ ذو المنار ابرھہ بن ذی القرنین ثم ملک بعدہ ابنہ افریقش بن ابرھہ ثم ملک بعدہ ذو الاذعار عمرو بن ذو المنار ثم ملک بعدہ شرجیل بن عمرو بن غالب بن المنتاب

کہ اوپر مذکور ہوا وہ یمن اور حضرموت دونوں سلطنتوں کو ملانے میں کامیاب ہوا اور اسی سبب سے رایش یا تبع الاول کا لقب پایا۔

اس کے بعد صعب ملقب بہ ذو القرنین اور ابرہہ ملقب بہ ذو المنار اور افریقش اور عمرو ملقب بہ ذو الاذعار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔

عمر ذو الاذعار کی عہد حکومت میں شرجیل نے اُس پر حملہ

بن زید بن یعفر بن السکسک بن واثل بن حمیر.... ثم ملك بعده ابنه الهدهاد بن شرحبیل ثم ملك بعده بنته بلقیس بنت الهدهاد وبقیت فی ملك الیمن عشرین سنة وتزوجها سلیمان بن داؤد (ابو الفدا)

وقد نقل ابن سعید المغربی ان ابن عباس سئل عن ذی القرنین الذی ذکره الله تعالیٰ فی کتابه العزیز فقال هو من حمیر وهو الصعب المذکور فیکون ذوالقرنین المذکور فی الکتاب العزیز هو الصعب (بن) الرائش المذکور لا الاسکندر الرومی (ابو الفدا)

وکان اول من اسس السد سبا الاکبر واسمه عامر وقیل عبد شمس بن یشجب بن یعرب بن قحطان ثم بناه حمیر ابن سبا بعد موت ابیه ثم اتمه بعد ذلك ذوالقرنین الحمیری وهو الصعب بن ابی مراید وکان السد من جبل مارب الی جبل الابلق وهما جبلان منیفان علی الجبال الشامخة الممتد من یمین السد وشماله (العقود اللؤلؤیہ فی اخبار دولة الرسولیه یمنی)

کیا اور بے شمار خوں ریز لڑائیوں کے بعد عمرو ذوالاذعار کو شکست دی اور اُس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ شرحبیل کے بعد اُس کا بیٹا الہدہاد جانشین ہوا اور اُس کے بعد ملکہ بلقیس تخت پر بیٹھی جس نے بیس برس سلطنت کرکے حضرت سلیمان بادشاہ یہود سے نکاح کر لیا۔ اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے سنہ ۳۰۰۰ دنیوی یا سنہ ۱۰۰۵ قبل حضرت مسیح میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے نسلوں کے پیدا ہونے کے معینہ قاعدہ کے مطابق الحارث الرائش اور صعب ذوالقرنین یا تو اٹھا ئیسویں صدی دنیا کے آخر میں یا اُنیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہوں گے۔ یعنی سنہ ۱۲۰۰ قبل حضرت مسیح کے۔

ابن سعید مغربی کا بیان ہے کہ جب حضرت ابن عباس سے اُس ذوالقرنین کی نسبت جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ پوچھا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ وہ صعب حمیری تھا۔ اس دلیل پر ابوالفدا نے بیان کیا ہے کہ اسی ذوالقرنین کا ذکر قرآن مجید میں ہے نہ کہ سکندر اعظم کا۔

ایک مشہور و معروف کام سد کی تعمیر کا اسی ذوالقرنین کے عہد میں اختتام کو پہنچا۔ شاہان یمن کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سد کی بنا سبا اکبر نے شروع کی تھی۔ اُس کے بیٹے اور جانشین حمیر نے اُس کو جاری رکھا اور ذوالقرنین نے اُسے اختتام کو پہنچایا۔ وہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تھی۔ ایک پہاڑ کا نام مارب اور دوسرے کا نام ابلق تھا۔

بلقیس کے بعد اُس کا چچا زاد بھائی مالک ملقب بہ ناشر النعم تخت نشین ہوا اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا شمر برعش اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا ابو مالک تخت پر بیٹھا اس بادشاہ

ثم ملك بعدها عمها ناشر النعم بن شرحبيل ... ثم ملك بعده شمر يرعش بن ناشر النعم ... ثم ملك بعده ابنه ابو مالك بن شمر ثم ملك بعده عمران بن عامر الازدی ... ثم ملك بعده اخوه مزيقيا (ابو الفدا)

ملك الاقرن بن ابی مالك ثم ملك بعده ذو حبشان بن الاقرن ... ثم ملك بعده اخوه تبع بن الاقرن ثم ملك بعده ابنه كليكرب تبع ثم ملك بعده ابو كرب اسعد وهو تبع اوسط وقتل ثم ملك بعده ابنه حسان بن تبع ... ثم قتله اخوه عمرو بن تبع وملك ... فسمی ذا الاعواد ثم ملك بعده عبد كلال ابن ذوی الاعواد ثم ملك بعده تبع بن حسان كليكرب وهو تبع الاصغر ثم ملك بعده ابن اخته الحارث بن عمرو وتهود الحارث المذكور ثم ملك بعده مرثد ابن كلال ... ثم ملك بعده وكيعه ابن مرثد (ابو الفدا)

ثم ملك ابرهه بن الصباح ثم ملك صهبان بن محرث ثم ملك

کی سلطنت میں عمران نے جو خاندان ازد سے تھا اُس پر حملہ کیا اور شکست دے کر تخت چھین لیا اور سلطنت بنی حمیر کے خاندان سے بنی کہلان کے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ عمران کے بعد اُس کا بھائی عمر مزیقیا تخت نشین ہوا۔

اُس کے زمانہ میں الاقرن بن ابو مالک نے اپنے باپ کی سلطنت کا دعویٰ کیا اور مزیقیا سے لڑ کر اُس کو شکست دی اور سلطنت چھین لی اور حمیر کے خاندان میں دوبارہ سلطنت لوٹ آئی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا ذو حبشان مالک تاج و تخت ہوا اُس کے بعد اُس کا بھائی تبع اکبر اُس کے بعد اُس کا بیٹا کلیکرب اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا ابو کرب اسعد تبع اوسط اُس کے بعد اُس کا بیٹا حسان اُس کے بعد اُس کا بھائی عمر ذو الاعواد اُس کے بعد اُس کا بیٹا عبد کلال تخت نشین ہوا۔ تبع اصغر پسر حسان نے اس بادشاہ سے سلطنت چھین لی اور خود بادشاہ ہو گیا اُس کے بعد اُس کا بھتیجا حارث بن عمر تخت پر بیٹھا۔ تمام مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ حارث نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اُس کے بعد مرثد ابن کلال اور اس کے بعد وکیعہ ابن مرثد تخت نشین ہوئے۔

ان بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ حارث بن عمر کے یہودی مذہب اختیار کرنے کی وجہ سے کسی قدر صحت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ جب کہ بخت نصر فلسطین کو فتح کر کے اور بیت المقدس کو مسمار کر کے حضرت دانیال اور اُن کے دوستوں کو قیدی بنا کر بابل کو لے گیا اُس وقت کچھ یہودی بچ کر یمن کو بھاگ گئے تھے اُس زمانہ میں حضرت یرمیاہ اور دانیال پیغمبر تھے اس لئے یہ بات نہایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان مفرور

عمر بن تبع ثم ملك بعده ذو نواس وكان من لا يتهود القاه في اخدود مضطرمنارا فقيل له صاحب الاخدود ثم ملك بعده ذو جدن وهو اخر ملوك الحمير (ابو الفدا)

من كتاب ابن سعيد المغربي ان الحبشة استولوا على اليمن بعد ذي جدن الحميري الملك وكان اول ملك اليمن من الحبشة ارباط ثم ملك بعده ابرهة الاشرم صاحب الفيل الذي قصد مكة ثم ملك بعده يكسوم ثم ملك بعده مسروق بن ابرهه وهو اخر من ملك اليمن من الحبشة ثم عاد ملك اليمن الى حمير وملكها سيف بن ذي يزن الحميري (ابو الفدا)

یہودیوں کی وجہ سے الحارث نے خدائے واحد کا اقرار کیا ہوگا اور یہودی مذہب کو قبول کیا ہوگا اور یہ امر واقعی ہے کہ الحارث اور وکیعہ اُس زمانہ میں حکمران تھے یعنی ۳۳۰۰ سنہ دنیوی میں یا ۷۰۴ سنہ قبل حضرت مسیح میں۔ اس امر کا واقعی ہونا زیادہ تر اس لئے قابل اعتبار ہے کہ نسلوں کے پیدا ہونے کے قدرتی قاعدہ کے مطابق بھی یہ زمانہ ٹھیک صحیح آتا ہے کیونکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ مالک ناشر النعم ۳۰۰۰ سنہ دنیوی میں تخت پر بیٹھا تھا۔ مالک اور وکیعہ کے درمیان گیارہ اور بادشاہ گذرے ہیں جن کا زمانہ مجموعاً چار سو برس خیال کرنا قرین عقل ہے۔ وکیعہ کے بعد چھ اور بادشاہ خاندان حمیر میں سے تخت نشین ہوئے۔ یعنی ابرہہ بن الصباح۔ صہبان بن محرث۔ عمر ابن تبع۔ ذو شناتر۔ ذو نواس ملقب بہ ذو الاخدود و ذو جدن جو کہ اس بادشاہوں کا خاندانی سلسلہ صاف صاف تحقیق نہیں ہوا۔ اس لئے ہم نے اُن کے ناموں کو شجرہ انساب عرب العاربہ میں شامل کر دینے کی جرأت نہیں کی بلکہ اُن کے ناموں کو شجرہ کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔ ان لوگوں کی سلطنت کا ٹھیک زمانہ بھی تحقیق نہیں ہوا ہے۔

ذو نواس ایک متعصب یہودی تھا اور یہودی مذہب والوں کے سوا ہر مذہب کے معتقدوں اور پیرووں کو آگ میں زندہ جلوا دیا کرتا تھا۔ اس بات کے خیال کرنے کے واسطے ایک عمدہ وجہ یہ ہے کہ یہ ہی وہ زمانہ تھا جب کہ آرٹازرکسیز اوکس نے چند یہودیوں کو جو مصر میں قید ہوئے تھے کیونکہ اُن کا ملک مصر سے ملا ہوا تھا ہرقانیہ (مازندران) کو بھیج دیا۔ اور چونکہ یہ بادشاہ بھی یہودی تھا اُس کی سلطنت کو بھی سخت صدمہ پہنچا اور حبشیوں نے اُس پر غلبہ کر لیا اور اُس کو سلطنت سے خارج کر دیا۔ پس یہ زمانہ اس خاندان کا آخری زمانہ معلوم ہوتا ہے اور ۳۲۶۵ سنہ دنیوی یا ۷۵۴ سنہ قبل حضرت مسیح کے مطابق ہوتا ہے۔

اس زمانہ سے ہمارے جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت تک نو سو بیس برس

ہوتے ہیں۔ اس درمیان میں افریقہ کے لوگوں کی جو ارباط حبشہ کہلاتے تھے اور نیز بعض عرب المستعربہ اور ابرہوں کی حکومت رہی۔

مشرقی مورخوں نے اس بات کے غلط خیال سے کہ ارباط حبشہ اور ابرہہ دو شخص تھے بیان کیا ہے کہ اُس زمانہ میں صرف دو ہی بادشاہ ہوئے حالانکہ ارباط حبشہ اور ابرہہ خاندانی لقب ہیں اور ان خاندانوں کے بادشاہ اپنے اصلی نام کے ساتھ خاندانی نام کو شامل کر لیتے تھے۔

اس خاندان ابرہہ میں ایک بادشاہ کا نام اشرم تھا جو ابرہہ اشرم صاحب الفیل کہلاتا ہے اور جس نے مکہ معظمہ پر ۲۵۷۵ دنیوی یا ۵۷۰ عیسوی میں چڑھائی کی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے ہاتھی اس نیت سے لے گیا تھا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابرہہ مسروق تخت نشین ہوا۔ مگر سیف بن ذی یزن حمیری نے اُس کو سلطنت سے بے دخل کر دیا جس کو کسریٰ نوشیرواں والی ایران نے بہت مدد دی تھی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ اُس کے بعد سے خاندان ابرہہ کی حکومت منقطع ہو گئی۔

سیف بن ذی یزن جو حمیر کے شاہی خاندان سے تھا اپنے آپ کو سلطنت یمن کا وارث اور حق دار سمجھتا تھا اُس نے روم کے بادشاہ وقت سے مدد چاہی اور شہر روم میں اسی غرض سے دس برس تک پڑا رہا مگر جب کہ اُس کی اُمید منقطع ہو گئی تو وہاں سے کسرے نوشیرواں کے پاس گیا اور اس سے کمک کی استدعا کی۔

اس بادشاہ نے اُس کی درخواست کو منظور کیا اور بہت بڑا لشکر اُس کی کمک کو دیا اور اس نے اُس لشکر کی مدد سے اپنے دشمن کو شکست دی اور خاندان ابرہہ کا خاتمہ ہو گیا اور سیف بن ذی یزن از سر نو تخت پر بیٹھا۔

اُس نے اپنی سکونت شاہی محل غمدان میں اختیار کی اور عیش و عشرت میں محو ہو گیا۔ اس بادشاہ کے عہد کے شعرا نے اس کی بہت تعریف و توصیف کی ہے اور جو کہ ان اشعار میں بعض تاریخی واقعات ملتے ہیں۔ اس لئے ہم چند شعر اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

لا تقصد الناس الا کابن ذی یزن	اذ خیم البحر للاعداء احوالا
واتی ھرقل وقد شالت نعامته	فلم یجد عنده النصر الذی سالا
ثم انتحی نحو کسریٰ بعد عاشرۃ	من السنین یھین النفس والمالا
حتی اتی ببنی الاحرار یقدمھم	تخالھم فوق متن الارض اجبالا
للہ درھم من فتیۃ صبر	ما ان رایت لھم فی الناس امثالا

بیض مرازبۃ غلب اساورۃ — اسد تربت فی الغیضات اشبالا
فاشرب ھنیا علیک التاج مرتفقا — براس غمدان دارا منک محلالا
تلک المکارم لا قعبان من لبن — شیبا بماء فعادا بعد ابوالا

سیف بن ذی یزن کو ایک اُس کے درباری حبشی مصاحب نے قتل کیا۔ اُس کے بعد اُس صوبہ کو نوشیرواں نے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا اور اپنی جانب سے وہاں عامل مقرر کرتا رہا۔ اُن عاملوں میں سے اخیر عامل باذان تھا۔ اس کا زمانہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ متحد تھا چنانچہ وہ آنحضرتؐ پر ایمان لایا اور مسلمان ہوگیا۔

وکان سیف بن ذی یزن المذکور قدام مصطفی جماعۃ من الحبشان وجعلھم من خاصتہ فاغتالوہ وقتلوہ فارسل کسریٰ عاملا علی الیمن واستمرت عمال کسریٰ علی الیمن الی ان کان آخرھم باذان الذی کان علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم واسلم (ابوالفدا)

عرب العاربہ میں خاندان قحطان نے بڑی طاقت اور شہرت حاصل کی اور صوبہ حیرہ میں ایک بڑی زبردست سلطنت قائم کی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ مالک بن فہم تھا اس کے بعد اُس کے بھائی عمرو کو تخت ملا۔

اس کے بعد جذیمہ بن مالک تخت پر بیٹھا۔ یہ جری مگر طامع بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنی سلطنت کو بہت قوی اور مستحکم کرلیا تھا ایک طرف تو دریائے فرات اُس کی سلطنت کی حد تھی اور دوسری طرف حدود شام تک پھیل گئی تھی۔ شام تک سلطنت پھیلانے میں اُس کو عملیق سے لڑنا پڑا۔ اور ایک سخت اور خوں ریز لڑائی کے بعد اُن کو شکست دی۔ اس بادشاہ کی بہن نے جس کا نام رقاش تھا ایک شخص مسمے عدی سے جو بنی لخم میں سے تھا شادی کی تھی۔

خذیمہ کے بعد اُس کا بھانجا عمرو بن عدی تخت نشین ہوا اُس کے بعد اُس کا بیٹا امرو القیس اور اس کے بعد اُس کا بیٹا عمرو بادشاہ ہوا مگر اُس کو ”اوس“ بن قلام عملیقی نے تخت

اول من ملک علی العرب بارض الحیرۃ مالک بن فھم ... ثم ملک بعدہ اخوہ عمرو بن فھم ثم ملک بعدہ ابن اخیہ جذیمہ بن مالک بن فھم... وکانت لہ اخت تسمی رقاش (ابوالفدا) لما قتل جذیمہ ملک بعدہ ابن اختہ عمرو بن عدی بن نصر بن ربیعہ ...ثم مات و ملک بعدہ ابنہ امرو القیس... وکان یقال لامرو القیس البدا الاول ثم ملک بعد امرؤ القیس ابنہ عمرو بن امرؤ القیس ... ثم ملک بعدہ اوس بن قلام العملیقی ثم ملک اخر من العمالیق ثم رجع الملک الی بنی عمرو بن عدی

بن نصر بن ربیعہ اللخمیین المنذر بن
وملک منهم امرؤ القیس بن ولد عمرو بن
امرؤ القیس المذکور ویعرف هذا
امرؤ القیس الثانی بالمحرق لانه اول من
عاقب بالنار ثم ملک بعده ابنه النعمان
الاعور بن امرؤ القیس ... ثم تزهد
وخرج من الملک ... ملک بعده ابنه
المنذر بن نعمان ... ثم ملک بعده
ابنه الاسود بن المنذر (ابو الفداء)
ثم ملک بعده اخوه المنذر بن
المنذر بن نعمان الاعور ثم ملک
بعده علقمة الذمیلی ذو میل بطن
من لخم ثم ملک بعده امرؤ القیس
بن النعمان بن امرؤ القیس المحرق...
ثم ملک بعده ابنه المنذر بن
امرؤ القیس ... لقب بماء السماء...
وطرد کسری قباذ المنذر (المنذر کو ر
عن ملک الحیرة وملک موضعه
الحرث بن عمرو بن حجر الکندی.. ثم
لما تمکن کسری نوشیروان بن قباد
المنذر کو رفی الملک طرد الحارث واعاد
المنذر بن ماء السماء الی ملک الحیرة
(ابو الفداء)
ثم ملک بعد المنذر عمرو وعمرو مضرط
الحجارة ... ثم ملک بعده اخوه

سے اتار دیا۔ اس کے بعد ایک یا دو اور بادشاہ اسی خاندان کے فرماں روا ہوئے جن کے نام معلوم نہیں لیکن اس قدر محقق ہے کہ امرؤالقیس ثانی بن عمرو نے بہت جلد اپنے بھائی کی کھوئی ہوئی سلطنت کو لے لیا اور دوبارہ سلطنت کو اپنے خاندان میں منتقل کر لیا۔ یہ اول شخص تھا جس نے کہ انسانوں کو زندہ جلانے کی وحشیانہ رسم کو رواج دیا تھا اور اس سبب سے اس نے المحرق کا لقب حاصل کیا تھا اس کے بعد نعمان جانشین ہوا۔ مگر دنیا کے ترددات اور جھگڑوں سے کبیدہ خاطر ہو کر تیس برس تک سلطنت کرنے کے بعد بادشاہت کو چھوڑ دیا اور عبادت میں مصروف ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر الاول تخت پر بیٹھا اس کے بعد اس کا بیٹا اسود تخت نشین ہوا جس کو غسانی بادشاہوں سے چند لڑائیاں لڑنی پڑیں اس کے بعد اس کا بھائی المنذر الثانی تاج و تخت کا مالک ہوا۔ اس کے بعد علقمہ ذمیلی اور اس کے بعد امرؤالقیس ثالث بن نعمان نے زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر الثالث ملقب بہ ماء السماء جانشین ہوا۔ مگر اس بادشاہ کو کسریٰ قباد نے سلطنت سے خارج کر کے الحرث کو جو "کندی" خاندان میں سے تھا اور جس نے ایران کے بادشاہ کا مذہب اختیار کر لیا تھا مقرر کیا جبکہ کسریٰ نوشیروان تخت پر بیٹھا اس نے الحرث کو حکومت سے علیحدہ کر دیا اور المنذر الثالث کو پھر حکومت دی۔
اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو اور اس کے بعد اس کا بھائی قابوس اور اس کے بعد اس کا بھائی المنذر الرابع اور اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان ابو قابوس تخت پر بیٹھا۔ اس نعمان نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور خسرو پرویز کے زمانہ میں ایک

قابوس ... ثم ملك بعده اخوهما المنذر بن المنذر ثم ملك بعده ابنه النعمان بن المنذر بن المنذر بن ماء السماء وكنيته ابو قابوس وهو الذي تنصر... ثم انتقل الى اياس بن قبيصة الطائي ... ثم ملك بعد اياس زادويه بن ماهان الهمذاني ثم عاد الملك الى اللخميين فملك بعد زادويه المنذر بن النعمان بن المنذر بن المنذر بن ماء السماء سمته العرب المغرور واستمر ملكهم بالحيرة الى ان قدم لها خالد بن الوليد واستولى على الحيرة (ابو الفدا)

اول من ملك غسان جفنة بن عمرو بن ثعلبة بن عمرو بن مزيقيا... ثم هلك وملك بعده ابنه عمرو بن جفنة ... ثم ملك بعده ابنه ثعلبة بن عمرو ... ثم ملك بعده ابنه الحارث بن ثعلبة ثم ملك ابنه جبلة بن الحارث ثم ملك ابنه الحارث... ثم ملك بعده ابنه المنذر الاكبر (ابو الفدا)

ثم هلك المنذر الاكبر المذكور وملك بعده اخوه النعمان ابن الحارث ثم ملك بعده اخوه جبلة بن الحارث ثم ملك بعده اخوهم عمرو بن

مشہور لڑائی میں جو ایرانیوں کے ساتھ ہوئی تھی مارا گیا۔ اس کے بعد ایاس ابن قبیصۃ الطائی اور اُس کے بعد زادویہ اور اُس کے بعد المنذر الخامس بن نعمان ابو قابوس بادشاہ ہوا۔ اس بادشاہ کو خالد بن ولید سردار لشکر اسلام نے شکست دے کر سلطنت کو چھین لیا۔

جس زمانہ میں یہ سب بادشاہ حکمراں ہوئے اُس زمانہ کا ٹھیک ٹھیک معین کرنا اگر غیر ممکن نہیں تو مشکل تو بے شک ہے مگر اخیر بادشاہوں میں سے کم سے کم دو بادشاہوں کی فرماں روائی کا زمانہ ٹھیک ٹھیک بدرجہ یقین معلوم ہے اور اگر نسلوں کے ہونے کے معمولی قاعدہ پر غور کیا جاوے تو بعض اور بادشاہوں کے عہد سلطنت کے زمانہ کے محقق ہونے کے لئے کافی پتہ لگ جائے گا۔

عمرو بن المنذر ماء السماء کی حکومت کے آٹھویں سال میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزمان پیدا ہوئے تھے اس واسطے یہ بادشاہ ۵۶۲ء دنیوی یا ۵۶۲ء عیسوی میں تخت پر بیٹھا ہوگا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے پہل وحی ایاس کی حکومت کے چھٹے مہینے میں نازل ہوئی تھی اس واسطے ایاس ۶۱۰ء دنیوی یا ۶۱۰ء عیسوی میں تخت نشین ہوا ہوگا عمرو کی تخت نشینی سے پہلے اُنیس بادشاہ ہو چکے تھے اور اُن کی سلطنتوں کے زمانوں کے مجموعہ کا بطرز معقول پانسو پچاس برس بیان کیا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلا بادشاہ مالک بن فہم اکتالیسویں صدی دنیوی کے آغاز میں یا حضرت مسیح کے زمانہ ولادت کے قریب تخت پر بیٹھا ہوگا۔

الحارث ثم ملك جفنة الاصغر
... ثم ملك بعده اخوه النعمان
الاصغر ثم ملك نعمان بن عمرو بن
المنذر ... ثم ملك بعده النعمان
المذكور ابنه جبلة بن النعمان ..
ثم ملك بعده النعمان بن الايهم
... ثم ملك اخوه الحرث ابن الايهم
ثم ملك ابنه النعمان ابن الحرث
... ثم ملك بعده ابنه المنذر
بن النعمان ثم ملك اخوه عمرو بن
النعمان ثم ملك اخوهما حجر ابن النعمان
ثم ملك ابنه الحارث بن حجر ثم
ملك ابنه جبلة بن الحرث ثم ملك
ابنه الحارث ابن جبلة ثم ملك
ابنه النعمان بن الحارث وكنية
ابوكرب ولقبه قطام ثم ملك بعده
الايهم بن جبلة ... ثم ملك بعده اخوه
المنذر بن جبلة ثم ملك اخوهما
شراحيل بن جبلة ثم ملك اخوهم
عمرو بن جبلة ثم ملك بعده ابن اخيه
جبلة بن الحرث بن جبلة ثم ملك
بعده جبلة بن الايهم بن جبلة
وهو اخر ملوك لغسان وهو الذي
اسلم في خلافة عمر ثم عاد الى الروم
وتنصر (ابوالفدا)

عرب العاربہ نے ایک اور سلطنت صوبہ غسان میں قائم کی تھی اور اس سلطنت کے حاکم عرب الشام کے نام سے مشہور تھے ۔ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو یہ حاکم قیصر روم کی طرف سے بطور عمال کے تھے مگر شاہی لقب اختیار کرنے کی وجہ سے تاریخ عرب میں بادشاہوں کے ذیل میں بیان ہوتے ہیں ۔ چونکہ بعض امور ان لوگوں سے ایسے متعلق ہیں جن سے ہم کو بعض امور کی تحقیقات اور تجسس میں آسانی ہوگی ۔ اس لئے اُن سلطنتوں کا ایک مختصر حال اس مقام پر لکھتے ہیں ۔

اس سلطنت کی بنا چار سو برس قبل ظہور اسلام کے ہوئی اور یہ زمانہ تینتالیسویں صدی دنیوی یا تیسری صدی عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے ۔

جفنہ بن عمرو اس خاندان کا پہلا شخص تھا ۔ جس نے لقب شاہی اختیار کیا ۔ یہ شخص " ازو " کی اولاد میں سے تھا جو خاندان کہلان سے علاقہ رکھتا تھا وہ عرب جو اس سے پیشتر غسان میں رہتے تھے ضجاعمہ کہلاتے تھے اُن لوگوں نے عرصہ دراز تک مستعدی کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا مگر آخر کار جفنہ نے اُن پر فتح پائی اور اُن کو مطیع کرلیا ۔

اُس کے بعد اُس کا بیٹا عمرو تخت پر بیٹھا اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا ثعلبہ تخت نشین ہوا ۔ ایک عرصہ تک اختیارات شاہی یکے بعد دیگرے ۔ الحارث ۔ جبلہ ۔ الحرث ۔ المنذر الاکبر کے ہاتھوں میں رہے ۔ اس اخیر بادشاہ کا جانشین اُس کا بھائی نعمان ہوا اُس کے بعد اُس کا بھائی جبلہ اور اُس کے بعد اس کا بھائی ایہم اور اس کے بعد اس کا بھائی عمرو تخت نشین ہوا اُس کے بعد جفنۃ الاصغر بن المنذر الاکبر کی باری آئی اُس کے بعد نعمان الاصغر اور اُس کے

فلمّا ملك حجر سد دامور هم
وساسهم احسن سياسة وانتزع
من اللخميين ما كان بايديهم من
ارض بكر ابن وايل ... وملك بعد الحجر
المذكور ابنه عمرو بن حجر ... ثم ملك
بعده ابنه الحرث بن عمرو (ابو الفدا)
وملك اخوه (اي خالي عرب)
جرهم الحجاز ثم ملك بعد جرهم
ابنه عبد يا ليل بن جرهم ثم ابنه
جرشم بن عبد يا ليل ثم ابنه عبد
المدان بن جرشم ثم ابنه ثعلبة بن
عبد المدان ثم ابنه عبد المسيح
بن ثعلبة ثم ابنه مضاض ثم بن عبد المسيح
ثم ابنه عمرو بن مضاض ثم اخوه الحرث
بن مضاض ثم ابنه عمرو بن الحارث
ثم اخوه بشر بن الحارث ثم مضاض
بن عمرو بن مضاض (ابو الفدا)

من ملوك العرب زهير ابن جياب
بن حبل ... وكان زهير المذكور قد
اجتمع بابرهة الاشرم صاحب
الفيل (ابو الفدا)

بعد اس کا بھتیجا نعمان ثالث بن عمرو بادشاہ ہوا۔ اُس کے بعد جبلہ بن نعمان ثالث کے ہاتھ سلطنت لگی۔ یہ بادشاہ خاندان حیرہ کے بادشاہ المنذر ماءالسماء کا ہم عصر تھا اور اس سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا۔ اُس کے بعد نعمان رابع بن الایہم اور اُس کے بعد الحرث الثانی اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا نعمان الخامس اور اس کے بعد اُس کا بیٹا المنذر تخت نشین ہوا۔ اُس کے بعد عمرو برادر المنذر اور حجر برادر عمرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ اُس کے بعد الحارث بن حجر اور جبلہ بن الحارث اور الحارث بن جبلہ باری باری سے بادشاہ ہوئے۔ پھر نعمان ابوکرب بن الحارث اور ایہم عم نعمان تخت پر بیٹھے۔ الایہم کے بعد اُس کے تین بھائی المنذر۔ سراحیل۔ عمرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے عمرو کے بعد اُس کے بھتیجے جبلہ بن الایہم بن جبلہ کو سلطنت نصیب ہوئی۔ یہ بادشاہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ تک زندہ تھا پہلے مسلمان ہو گیا۔ اور اُس کے بعد روم کو بھاگ کر عیسائی ہو گیا۔ اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ تقریب سنہ ٤٦٣٣ دنیوی یا سنہ ٦٣٨ عیسوی میں ہو گیا۔

عرب العاربہ کی ایک اور چھوٹی اور چند روزہ سلطنت کی بنیاد "کندہ" کی اولاد نے جو خاندان کہلان سے تھا ڈالی تھی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ حجر بن عمرو ہوا۔ جس نے کہ مملکت حیرہ کے ایک حصہ کو دبا کر ایک نئی سلطنت قائم کی تھی اُس کے بعد اُس کا بیٹا عمرو اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا الحرث تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے کسریٰ قباد کا مذہب اختیار کرکے اُس کی اعانت سے سلطنت حیرہ کو فتح کیا تھا۔ مگر جب نوشیرواں نے اُس سے المنذر کو سلطنت واپس دلادی تب الحارث دیار کلب کو بھاگ گیا۔ مگر اُس کے بیٹے چند روز تک چند مقامات پر حکومت کرتے رہے۔ حجر بنی اسد پر

حکمران رہا۔ سراجیل بکر ابن وائل پر۔ معدی کرب قیس عیلان پر۔ سلمہ تغلب اور نمر پر حاکم رہا۔
حجر کے بعد جو مارا گیا تھا اُس کے بیٹے امرو القیس نے از سرِ نو بنی اسد کو مطیع کر لیا۔ یہ امرو القیس وہی بہت بڑا مشہور شاعر عرب کا ہے۔ جبکہ منذر ما، السماء از سرِ نو تخت سلطنت پر بیٹھا تو امر والقیس اُس کے خوف سے بھاگا اور کہیں روپوش ہو گیا۔ ان سب بادشاہوں نے پینتالیسویں یا چھیالیسویں صدی دنیوی یا پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں حکومت کی تھی۔

ایک اور سلطنت حجاز میں قائم ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں یمن اور حیرہ کی سلطنتیں اندرونی جھگڑوں سے ضعیف ہو گئی تھیں اُس زمانہ میں اولاد یعرب یا جرہم نے ایک نئی اور خودمختار سلطنت حجاز میں قائم کی تھی۔ ابو الفدا کے نزدیک اس سلطنت کا پہلا بادشاہ جرہم تھا جس کا بھائی یعرب یمن میں حکمران تھا۔ مگر یہ غلطی ہے اور اس وجہ سے عارض ہوئی ہے کہ ابو الفدا نے غلطی سے یعرب اور جرہم کو دو شخص خیال کیا تھا حالانکہ یہ دونوں نام ایک شخص کے ہیں اور یہی ایک شخص یمن اور حجاز دونوں پر حاکم تھا۔ ابو الفدا نے مندرجہ ذیل نام بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ بھی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے تھے اور وہ نام یہ ہیں۔ یالیل۔ جرشم بن یالیل۔ عبدالمدان بن جرشم۔ ثعلبہ بن عبدالمدان۔ عبدالمسیح بن ثعلبہ۔ مضاض بن عبدالمسیح۔ عمرو بن مضاض۔ الحرث برادر مضاض۔ عمرو بن الحرث۔ لبشر بن الحرث۔ مضاض بن عمرو بن مضاض۔

اگر ابو الفدا کے نزدیک یہ بادشاہ حضرت اسمٰعیل بن حضرت ابراہیم سے پیشتر گذرے ہیں تو وہ بڑی غلطی پر ہے کیونکہ عبدالمسیح کے نام سے بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ وہ عیسائی تھا اور اس لئے ممکن نہیں کہ وہ حضرت اسمٰعیل سے پیشتر گذرا ہو یا اُن کا ہم عصر ہو۔ کچھ شک نہیں کہ یہ سلطنت اُس وقت قائم ہوئی تھی۔ جب کہ یمن اور حیرہ اور کندہ کی سلطنتیں زوال کی حالت میں تھیں اور اس لئے ہم کو یقین ہے کہ اس سلطنت کے بادشاہ پینتالیسویں اور چھیالیسویں صدی دنیوی یا پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں گذرے ہیں۔

یہ بھی واضح ہو کہ عمرو بن لاحی ۴۲۱۰ء دنیوی یا تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں اسی سلطنت پر حکمراں تھا۔ ابو الفدا کا بیان ہے کہ اسی شخص نے بت پرستی کو عرب حجاز میں رواج دیا تھا۔ اور کعبہ میں تین بت۔ ہُبل کعبہ کی چھت پر اور اساف اور نائلہ اور مقاموں پر رکھے تھے۔

مثل دیگر عرب العاربہ کے جو حجاز میں متوطن ہوئے اور پھر وہیں کے بادشاہ ہوئے۔ زہیر ابن حباب نے بھی لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ بات اُس وقت کی ہے جب کہ ابرہہ اشرم نے مکہ معظمہ

پر حملہ کیا تھا۔ کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ زہیر بھی ابرہہ اشرم کے ساتھ اُس مہم میں شریک تھا اس لئے بآسانی محقق ہو سکتا ہے کہ اُس کا عہد حکومت چھیالیسویں صدی دنیوی یا چھٹی صدی عیسوی کے آخری حصہ میں ہوگا۔ سب سے مشہور واقعہ اُن کے عہد حکومت کا یہ تھا کہ اُس نے بنی غطفان کے اُس مقدس معبد کو جو اُنھوں نے کعبہ کے مقابلہ کے لئے بنایا تھا بالکل برباد کر دیا تھا۔

اب ہم اس مقام پر عرب العاربہ کے انساب کا شجرہ لکھتے ہیں۔ تمام قوم کا شجرہ لکھنا تو محالات سے ہے مگر یہ شجرہ انھیں لوگوں کا ہے جن کا ذکر ہم نے اس مقام پر کیا ہے۔ اس شجرہ سے اُن مطالب کے سمجھنے میں جو اس جگہ بیان ہوئے ہیں آسانی ہوگی۔

تمام عرب العاربہ کا جن کا ہم نے اوپر مفصل ذکر کیا ہے۔ بنی جرہم کے خاندان سے علاقہ رکھتے ہیں مگر وقتاً فوقتاً بلحاظ اپنے مورثوں کے متعدد قبیلوں میں منقسم ہوتے گئے ہیں۔ اُن قبیلوں میں سے جو نامی قبیلے گذرے ہیں اور جن کا ذکر اکثر کتابوں میں آتا ہے۔ اُن کا بیان ہم اس مقام پر کرتے ہیں کہ قبیلوں کی تقسیم کرنے میں ہم نے ابوالفدا اور معارف ابن قتیبہ سے استفادہ کیا ہے۔

۱۔ یعرب یا جرہم سے۔ بنو جرہم۔	۲۔ عبدالشمس بن یشجب سے۔ بنو سبا۔
۳۔ حمیر ابن سبا سے۔ بنو حمیر۔	۴۔ کہلان ابن سبا سے۔ بنو کہلان۔
۵۔ اشعر ابن سبا سے۔ اشعری۔	۶۔ انمار ابن سبا سے۔ بنو انمار۔
۷۔ عاملہ بن سبا سے۔ عاملی۔	۸۔ عدی بن انمار بن سبا سے۔ بنو عدی۔
۹۔ لخم بن عدی سے۔ لخمی۔	۱۰۔ جذام ابن عدی سے۔ بنو جذام۔
۱۱۔ حدس ابن لخم سے۔ بنو حدس۔	۱۲۔ غنم ابن لخم سے۔ بنو غنم۔
۱۳۔ بنو الدار بن ہانی بن لخم سے۔ داری۔	۱۴۔ غطفان ابن حیرام ابن جذام سے۔ بنو غطفان۔

قبائل ذیل بنو غطفان کی نسل میں ہیں

۱۵۔ بنو نفلۃ۔ ۱۶۔ بنو احنف۔	۱۷۔ بنو الضبیب۔ ۱۸۔ بنو ہدالہ۔
۱۹۔ بنو نفاثہ۔ ۲۰۔ بنو ضلیع	۲۱۔ بنو اعایزہ۔ ۲۲۔ بنو شیرہ۔
۲۳۔ بنو عبداللہ۔ ۲۴۔ بنو الحفرہ۔	۲۵۔ بنو سلیم ۲۶۔ بنو بحالہ۔
۲۷۔ بنو غنم۔	۲۸۔ بنو الفالہ۔
۲۹۔ سعد بن مالک بن حیرام سے۔ بنو سعد۔	۳۰۔ وائل بن مالک سے۔ بنو وائل۔

قبائل ذیل بنوسعد کی نسل میں ہیں

۳۱۔ بنو عوف۔ ۳۲۔ بنو عایزہ۔ ۳۳۔ بنو نہیرہ۔ ۳۴۔ بنو صبحہ۔

۳۵۔ بنوالاخنس۔ ۳۶۔ بنو حی۔

۳۷۔ حشم بن جذام سے۔ حشمی۔ ۳۸۔ حطمہ بن جذام سے۔ بنو حطمہ۔

قبائل ذیل بنوانمار کی نسل میں ہیں

۳۹۔ خثعمی۔ ۴۰۔ بجیلی۔ ۴۱۔ قسبری۔ ۴۲۔ بنواحمس۔

۴۳۔ دہمان بن عامر بن حمیر سے۔ دہمانی۔ ۴۴۔ یحصب بن دہمان سے یحصبی۔

۴۵۔ اسلف بن سعد بن حمیر سے۔ سلفی۔ ۴۶۔ اسلم بن سعد سے۔ اسلمی۔

۴۷۔ رعین بن حرث بن عمرو بن حمیر سے آل ذی رعین۔ ۴۸۔ قضاعہ بن مالک بن حمیر سے۔ بنو قضاعہ۔

قبائل ذیل قضاعہ کی نسل میں ہیں

۴۹۔ کلب ابن دبرہ سے۔ بنو کلب۔ ۵۰۔ عدی ابن حیاب سے۔ بنو عدی۔

۵۱۔ علیم ابن حیاب سے۔ بنو علیم۔ ۵۲۔ بنوالعبید۔ ۵۳۔ بنو رفیدہ۔

۵۴۔ بنو مصر۔ ۵۵۔ بنوالقین۔ ۵۶۔ بنو سلیح۔ ۵۷۔ بنو تنوخ۔

۵۸۔ جرم ابن ربان سے۔ بنو جرم۔ ۵۹۔ راسب ابن جرم سے۔ راسبی۔

۶۰۔ بنو بہرا۔ ۶۱۔ بنو بلی۔ ۶۲۔ بنو جہرہ۔ ۶۳ بنو عذرہ۔

۶۴۔ بنو سعد۔ ۶۵۔ بنو ہذیم عبد حبشی۔ ۶۶۔ خنہ ابن سعد سے۔ خنی۔

۶۷۔ سلامان ابن سعد سے۔ سلامانی۔ ۶۸۔ بنو جہینہ۔ ۶۹۔ بنو نہد۔ ۷۰۔ التبابعہ۔

قبائل ذیل التبابعہ کی نسل میں ہیں

۷۱۔ ذو قطاع۔ ۷۲۔ ذو لنواس۔ ۷۳۔ ذو اصبح۔ ۷۴۔ ذو جدن۔ ۷۵۔ ذو قایش۔

۷۶۔ ذو یزن۔ ۷۷۔ ذو جوش ۷۸۔ بنواشحول۔

۷۹۔ وائلہ ابن حمیر سے۔ بنو وائل۔ ۸۰۔ سکاسک بن وائلہ سے۔ بنو سکاسک۔

۸۱۔ عوف بن حمیر سے ۔بنوعوف۔
۸۲۔ فاران ابن عوف سے ۔ بنو فاران۔
۸۳۔ طے بن ادو کہلانی سے ۔طائی۔
۸۴۔غوث بن ادو سے ۔غوثی

قبائل ذیل طائی کی نسل میں ہیں

۸۵۔ بنو نبہان ۔۸۶۔بنو ثعل ۔ ۸۷ ۔ حاتمی۔
۸۸۔بنو النبس ۔ ۸۹ بنو تیم۔
۹۰ ۔ ثور بن مالک بن مرتہ کہلانی سے ۔ثوری۔
۹۱ ۔ کندہ بن ثور سے ۔ کندی۔
۹۲۔ سکون بن کندہ سے ۔سکونی۔
۹۳۔اوسلہ بن ربیعہ بن نیار بن مالک کہلانی سے ۔اوسلی۔
۹۴۔ ہمدانی ۔۹۵ سبیعی ۔۹۶۔ وداعہ
۹۷۔ مذحج بن یہابر بن مالک کہلانی سے مذحج۔
۹۸۔ مراد بن مذحج سے ۔مرادی۔
۹۹۔ سعد بن مذحج سے ۔سعدی یا سعد العشیرہ۔
۱۰۰۔ خالد بن مذحج سے ۔بنو خالد۔
۱۰۱۔عنس بن مذحج سے عنسی۔
۱۰۲۔ جعفی بن سعد سے ۔جعفی۔
۱۰۳۔جنب بن سعد سے جنبی۔
۱۰۴۔ حکم بن سعد سے ۔حکمی۔
۱۰۵۔ عایذاللہ بن سعد سے ۔ عایذی۔
۱۰۶۔ جمل بن سعد سے ۔جملی۔
۱۰۷۔مروان بن جعفی سے ۔مرانی۔
۱۰۸۔ حریم بن جعفی سے ۔حریمی۔
۱۰۹ زبید بن سعد سے ۔زبیدی۔
۱۱۰ ۔ جدیلہ بن حارجہ بن سعد سے ۔ جدیلی۔
۱۱۱۔ ابوخولان بن عمرو بن سعد سے خولانی۔
۱۱۲۔ النخم بن مراد بن مزحج سے ۔ النخمی۔
۱۱۳۔ نخع بن جسر بن اولہ بن خالد بن مرحج سے نخعی۔
۱۱۴۔ کعب بن عمرو سے ۔ بنو النار۔
۱۱۵۔ کعب بن عمرو سے ۔بنو لحماس۔
۱۱۶۔ بنو قنان۔
۱۱۷۔الازد بن غوث کہلانی سے ۔ ازدی۔
۱۱۸ ۔ مازد بن ازد سے ۔مازنی یا غسانی۔
۱۱۹۔ دوس بن ازد سے ۔ دوسی۔
۱۲۰۔ ہنو بن ازد سے ۔ ہنوئی۔
۱۲۱۔جفنہ بن ازد مازنی سے ۔جفنی۔
۱۲۲۔ آل عنقا ۔۱۲۳۔ آل محرق۔
۱۲۴۔جبلی۔
۱۲۵۔ سلامان ابن میدعن بن ازد سے ۔سلامانی۔
۱۲۶۔دوس بن عدثان بن ہران الازدی سے دوس عدثی۔
۱۲۷۔ جذیمہ بن مالک بن فہم بن غنم بن دوس سے ۔جذیمی۔
۱۲۸۔جہاضم بن مالک سے جہاضمی۔
۱۲۹۔ سلیمہ بن مالک سے ۔سلیمی۔
۱۳۰۔ ہنابہ مالک سے ۔ بنو ہنابہ۔
۱۳۱۔ معین بن مالک سے ۔معینی
۱۳۲۔یحمد بن معین سے ۔بنو یحمد۔

قبائل ذیل ازد کی نسل میں ہیں

۱۳۳۔ المعظر یف۔ ۱۳۴۔ بنو یشکر۔ ۱۳۵۔ بنو المجدرہ۔

۱۳۶۔ لہب بن عامر سے۔ بنو لہب۔ ۱۳۷۔ غامد بن عامر سے۔ غامدی

قبائل ذیل عبداللہ بن ازد کی نسل میں ہیں

۱۳۸۔ قسا ملی۔ ۱۳۹۔ بنو عتیک۔ ۱۴۰۔ بنو بارق۔ ۱۴۱ بنو عوف۔

۱۴۲۔ شہران بن عوف سے۔ بنو شہران۔ ۱۴۳۔ طاحیہ بن سود سے۔ بنو طاحیہ۔

۱۴۴۔ بنو ہداد۔ ۱۴۵۔ خزاعی۔ ۱۴۶۔ تمیری۔ ۱۴۷۔ بنو حلیل۔

۱۴۸۔ بنو المصطلق۔ ۱۴۹۔ بنو الکعب۔ ۱۵۰۔ بنو الملیح۔ ۱۵۱۔ بنو عدی۔

۱۵۲۔ بنو سعد۔ ۱۵۳۔ اسلمی۔ ۱۵۴۔ جشمی۔

۱۵۵۔ خزرج بن ساۓبۃ العنقا سے خزرجی۔

قبائل ذیل خزرج کی نسل میں ہیں

۱۵۶۔ جشمی۔ ۱۵۷۔ بنو تزید۔ ۱۵۸۔ سلمی۔ ۱۵۹۔ بنو بیاضہ۔ ۱۶۰۔ بنو سالم۔

۱۶۱۔ بنو الجبلی۔ ۱۶۲۔ القراقل ۱۶۳۔ بنو النجار۔ ۱۶۴۔ بنو ساعدہ۔

قبائل ذیل اوس کی نسل میں ہیں

۱۶۵۔ اشہلی۔ ۱۶۶۔ بنو ظفر۔ ۱۶۷۔ بنو الحارثہ۔ ۱۶۸۔ اہل قبا۔

۱۶۹۔ جحجبی۔ ۱۷۰۔ جعادرہ۔ ۱۷۱۔ بنو واقف۔

۱۷۲۔ سلمی۔ ۱۷۱۔ بنو خطمہ۔

ہم اس مقام پر عرب العاربہ کے قبائل کا ایک شجرہ لکھتے ہیں۔ جس سے مذکورہ بالا بیان کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اور ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاوے گا کہ کونسا قبیلہ کس قبیلہ سے نکلا۔

سوم

عرب المستعربہ یعنی پردیسی عرب

عرب المستعربہ کے تمام قبیلے ایک ہی اصل سے نکلے ہیں۔ ان کا نسب ترح بن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عیبر بن شالح بن ارفخشد بن سام تک پہنچتا ہے۔ ترح کی اولاد جو عرب میں آباد ہوئی پانچ شاخوں میں منقسم تھی اور اسی وجہ سے عرب المستعربہ بھی پانچ شاخوں میں منقسم ہیں

اول:- اسمٰعیلی (בני ישמעאל) یا بنی اسمٰعیل بن ابراہیم بن ترح۔ (سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۲ و باب ۱۶ ورس ۱۵)

دوم۔ ابراہیمی یا بنی قطورہ (בני קטורה) یعنی ابراہیم بن ترح کی اولاد قطورہ کے سلسلہ سے (سفر تکوین باب ۱۱ ورس ۲۸ و باب ۲۵ ورس ۱)

سوم۔ ادومی یا بنی عیسو (בני עשו) یعنی اولاد ادوم بن اسحاق بن ابراہیم بن ترح۔ (سفر تکوین باب ۱۱ ورس ۲۸ و باب ۲۱ ورس ۳ و باب ۲۵ ورس ۲۵)

چہارم۔ ناحوری یا بنی ناحور (בני נחור) یعنی اولاد ناحور برادر ابراہیم بن ترح۔ (سفر تکوین باب ۱۱ ورس ۲۸، ۲۹)

پنجم۔ ہارانی یا بنی ہاران (בני הרן) یعنی اولاد مواب (מואב) و عمان (עמון) بن لود بن ہاران بن ترح۔ یہ اخیر قبیلہ کبھی تو موابی کہا جاتا ہے اور کبھی عمانی مگر ہم نے اُس کو ہارانی اس واسطے لکھا ہے کہ ہاران اُن دونوں کے مورث کا نام ہے اور دونوں پر حاوی ہے (سفر تکوین باب ۱۱ ورس ۲۸ و ۲۹ و باب ۱۹ ورس ۳۰ و ۲۸)

اب ہم اس مقام پر ہر ایک مذکورہ بالا قبیلہ کا علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے اور اسی درمیان میں یہ بھی ثابت کریں گے کہ "فاران" جہاں سے ربانی ہدایت کے چمکنے کی توریت مقدس میں پیشین گوئی کی گئی تھی وہ حجاز اور بالخصوص مکہ کے متصل کے پہاڑ ہیں۔ اور اس خطبہ میں اسی امر کا ثابت کرنا مقصود اصلی ہے۔

اوّل اسمٰعیلی یا بنی اسمٰعیل

تمام مورخ مسلمان اور غیر مسلمان سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد

عرب میں آباد ہوئی اور ملک عرب کا ایک بڑا حصہ حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کی نسل سے معمور ہو گیا۔ اُن میں جو کچھ اختلاف ہے وہ اُن کے مقام سکونت میں ہے اس لئے ہم اُن کے مقام سکونت کی اس مقام پر تحقیقات کریں گے۔

توریت مقدس میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے نکالے جانے کے واقعہ کو اس طرح پر بیان کیا ہے "و سارہ پسر ہاجر مصری را کہ بجہت ابراہیم زائیدہ شدہ بود دید کہ استہزا می نماید۔ و با ابراہیم گفت کہ ایں کنیزک و پسر اورا اخراج نما زیرا کہ پسر ایں کنیزک با پسر من اسحٰق وارث نخواہد شد۔ و ایں سخن در نظر ابراہیم بسیار ناخوش آمد بسبب پسرش۔ و خدا با ابراہیم گفت بجہت ایں جوان و کنیزکت در نظرت ناخوش نیاید ہر چہ کہ سارہ بتو گفتہ باشد قولش را استماع نما زیرا کہ ذریعہ تو از اسحٰق خواندہ می شود و از پسر کنیزک نیز اُمتے خواہم گردانید۔ زیرا کہ از نسل تست۔ و ابراہیم در صبح دم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ بہاجر دادہ بدوشش گذاشت و ہم پسرش۔ (با و دادہ) و اورا روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیرشبع سرگرداں شد۔ و آبے کہ در مطہرہ بود تمام شد، و پسر را در زیر بوتہ از بوتہا گذاشت۔ و روانہ شدہ در برابرش بمسافت یک تیر پرتاب نشست و گفت کہ مرگ پسر را نہ بنیم و در برابرش نشستہ آواز خود را بلند کردہ گریست۔ و خدا آواز پسر را شنید و مَلک خدا ہاجر را از آسمان آواز دادہ باو گفت کہ اے ہاجر ترا چہ واقع شد مترس زیرا کہ خدا آواز پسر را در جائے بودنش شنیدہ است۔ برخیز و پسر را بردار و بدستت اورا بگیر زیرا کہ اورا امت عظیمے خواہم کرد۔ و خدا چشمان اورا کشادہ کرد و چاہ آبے دید و روانہ شدہ مطہرہ را از آب پُر کرد و بہ پسر نوشانید۔ و خدا با پسر بود کہ نشو و نما نمود و در بیابان ساکن شدہ تیر انداز گردید۔ و در بیابان پاران ساکن شد و مادرش از برائش از دیار مصر زنے گرفت" (سفر تکوین باب ۲۱ درس ۹ لغایت ۲۱)

اس عبرانی חֵמֶת لفظ کا انگریزی میں بوتل ترجمہ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ قدیم عربی ترجمہ میں "سقاء" ترجمہ کیا گیا ہے اور فارسی ترجمہ میں "مطہرہ" اُردو میں اُس کا ترجمہ "مشکیزہ" یا "چھاگل" صحیح ترجمہ ہے جو مشرقی ملکوں میں مروّج ہے اور جس میں چند روز کے پینے کے لائق پانی سما سکتا ہے۔

اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کی متبرک کتابوں میں بھی چند روایتیں آئی ہیں۔ اور جو کہ صحیح بخاری مسلمانوں میں سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے اُس میں دو روایتیں اس واقعہ کی نسبت آئی ہیں۔ اس لئے اُن دونوں کو اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے۔

ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے۔ ایک میں ایک مضمون ہے اور ایک میں نہیں ایک

میں کچھ بیان ہوا ہے اور ایک میں کچھ۔ اس لئے ہم دونوں روایتوں کو دو مقابل کے کالموں میں اس طرح پر لکھیں گے کہ جو اختلاف اُن دونوں میں ہے وہ بمجرد دیکھنے کے معلوم ہو جاوے۔

یہ بات کہنی کہ یہ حدیثیں بخاری میں ہیں اور ضرور ہے کہ ان کو صحیح مانا جائے۔ صرف ایک فرضی بات ہے ورنہ جو اصول کہ حدیث کے ثبوت کے لئے قرار پائے ہیں اُن کے مطابق اُس روایت کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا جانا ثابت نہیں ہے۔ یہ دونوں روایتیں ابن عباس نے بیان کی ہیں اور یہ نہیں بیان کیا کہ انھوں نے کس سے سُنیں اور اس لئے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو فرمایا تھا بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں یہودیوں میں مشہور تھیں۔ انھیں کو ابن عباس نے بیان کیا ہے پس وہ روایتیں ایک مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ بخاری میں اس طرح پر روایتیں مندرج ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت وہ پیغمبر کی حدیث ہے بلکہ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بخاری نے جس شخص سے اُس کو سُنا اُس نے اسی طرح بیان کیا تھا۔

پہلی روایت	دوسری روایت
۱۔ عن ابن عباس قال لما کان بین ابراھیم وبین اھلہ ما کان خرج باسمٰعیل وام اسمعیل۔	۱۔ قال ابن عباس اول ما اتخذ النساء المنطق من قبل ام اسمٰعیل اتخذت منطقا لتعفی اثرھا علی سارۃ ثم جاء بھا ابراھیم وبابنھا اسمعیل۔
۲۔ ومعھم شنۃ فیھا ماء۔	۲۔
۳۔ فجعلت ام اسمعیل تشرب من الشنۃ فیدر لبنھا علی صبیھا۔	۳۔ وھی ترضعہ۔
۴۔ حتی قدم مکۃ فوضعھا تحت دوحۃ۔	۴۔ حتی وضعھما عند البیت عند دوحۃ۔
۵۔	۵۔ فوق زمزم فی اعلی المسجد ولیس بمکۃ یومئذ احد ولیس بھا ماء فوضعھما ھناک۔
۶۔	۶۔ ووضع عندھما جرابًا فیہ تمر۔
۷۔	۷۔ وسقاء فیہ ماء۔

	پہلی روایت	دوسری روایت
۸	ثم رجع ابراهيم الى اهله فاتبعته ام اسمعيل۔	ثم قفا ابراهيم منطلقا فتبعته ام اسمعيل۔
۹	حتى لما بلغوا كداء	. . .
۱۰	نادته من ورائه يا ابراهيم الى من تتركنا۔	فقالت يا ابراهيم اين تذهب وتتركنا۔
۱۱	. . . .	في هذا الوادي الذي ليس فيه انيس ولا شي فقالت له ذلك اوجعل لا يلتفت اليها فقالت آلله امرك بهذا۔
۱۲	قال الى الله۔	قال نعم۔
۱۳	قالت رضيت بالله۔	قالت اذن لا يضيعنا۔
۱۴	قال فرجعت۔	ثم رجعت۔
۱۵	. . .	فانطلق ابراهيم حتى اذا كان عند الثنية حيث لا يرونه استقبل بوجهه البيت ثم دعا بهولاء الدعوات ورفع يديه فقال رب اني اسكنت من ذريتي بواد غير ذي زرع عند بيتك المحرم حتى بلغ يشكرون۔
۱۶	فجعلت تشرب من الشنة ويدر لبنها على صبيها حتى لما فنى الماء۔	وجعلت ام اسمعيل ترضع اسمعيل وتشرب من ذلك الماء حتى اذا نفد ما في السقاء۔
۱۷	. . . .	عطشت وعطش ابنها وجعلت تنظر اليه يتلوى او قال يتلبط فانطلقت كراهية ان تنظر اليه۔
۱۸	قالت لو ذهبت فنظرت لعلى	. . . .

	پہلی روایت	دوسری روایت
	احس احدا قال فذهبت	
۱۹-	فصعدت الصفا فنظرت ونظرت هل تحس احدا۔	فوجدت الصفا اقرب جبل فی الارض یلیها فقامت علیه ثم استقبلت الوادی تنظر هل تری احدا فلم ترا احدا فهبطت من الصفا۔
۲۰-	فلما بلغت الوادی سعت اتت المروة وفعلت ذلك اشراطاً۔	حتی اذا بلغت الوادی رفعت طرف درعها ثم سعت سعی الانسان المجهود حتی جاوزت الوادی ثم اتت المروة فقامت علیها۔
۲۱-	. . . .	فنظرت هل تری احدا فلم ترا احدا۔
۲۲-	ثم قالت لو ذهبت فنظرت ما فعل تعنی الصبی فذهبت فنظرت فاذا هو علی حاله کانه ینشغ للموت فلم تقرها نفسها فقالت لو ذهبت فنظرت لعلی احس احدا فذهبت فصعدت الصفا فنظرت ونظرت فلم تحس احدا۔	. . . .
۲۳-	حتی اتممت سبعًا۔	ففعلت ذلك سبع مرات۔
۲۴-		قال ابن عباس قال النبی صلی الله علیه وسلم فذلك سعی الناس بینهما۔
۲۵-	ثم قالت لو ذهبت فنظرت ما فعل فاذا هی بصوت۔	فلما اشرفت علی المروة سمعت صوتا۔
۲۶-	. . . .	فقالت صه ترید نفسها ثم تسمعت ایضا فقالت قد اسمعت۔
۲۷-	فقالت اغث ان کان عندك خیر۔	ان کان عندك غواث

دوسری روایت	پہلی روایت
۲۸- فاذا ھی بالملک عند موضع زمزم-	۲۸- فاذا ھو جبریل-
۲۹- فبحث بعقبہ او قال بجناحہ حتی ظہر الماء فجعلت تحوضہ وتقول بیدھا ھکذا	۲۹- قال فقال بعقبہ ھکذا وغمز عقبہ علی الارض قال فانبثق الماء فدھشت ام اسمعیل فجعلت تحفز-
۳۰- وجعلت تغرف من الماء فی سقائھا وھو یفور بعد ما تغرف-	۳۰- . . .
۳۱- قال ابن عباس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرحم اللہ ام اسمٰعیل لو ترکت زمزم او قال لو لم تغرف من الماء لکانت زمزم عیناً معیناً-	۳۱- قال فقال ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم لو ترکتہ کان الماء ظاھرا-
۳۲- قال فشربت وارضعت الی آخر الحدیث (بخاری کتاب الانبیاء)	۳۲- قال فجعلت تشرب من الماء ویدار لبنھا علی صبیھا الی اخر الحدیث (بخاری کتاب الانبیاء)

مذکورہ بالا روایتوں سے ظاہر ہے کہ وہ مستند نہیں ہیں یعنی حضرت ابن عباس نے اُن کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مستند نہیں کیا۔ پس معلوم نہیں کہ ابن عباس نے وہ روایت کس سے سُنی اور کس بنیاد پر انھوں نے اُس کو بیان کیا۔ بخاری کا ادب صرف اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ ابن عباس نے سعید ابن جبیر سے یہ روایت بیان کی اور سعید ابن جبیر نے اور لوگوں سے جن سے بخاری تک یہ روایت پہنچی۔ مگر اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ابن عباس نے درحقیقت اُس کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا۔

ان روایتوں میں دو فقرے (۳۱،۲۸) ایسے ہیں جن سے کہ بادی النظر میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابن عباس نے یہ روایتیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہوں گی۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں فقروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں فقرے ان روایتوں کے نہیں ہیں۔ اور کسی مقام کے ہیں۔ کیونکہ خود راوی نے اُن دونوں فقروں کو سلسلہ بیان روایت سے علیٰحدہ کرکے اور بالتخصیص اُنھیں دونوں فقروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بیان کیا ہے اور یہ ثبوت اس بات کا ہے۔ کہ راوی نے باقی مضمون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب

نہیں سمجھا ہے۔

ایک اور امر جو ان روایتوں کی صحت پر شبہ ڈالتا ہے یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت ابراہیم کی یہ دعا "رب انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتك المحرم" بیان ہوئی ہے۔ اور راوی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت ابراہیم نے اپنی بی بی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسمٰعیل کو نکالا تھا اُسی زمانہ میں وہ خود مکہ میں اُن کے بسانے کو آئے تھے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے نہ اُس زمانہ میں حضرت ابراہیم اُن کو یہاں بسانے کے لئے آئے اور نہ اس زمانہ میں بیت اللہ الحرام بنایا گیا تھا۔ راوی نے دو مختلف زمانوں کے واقعہ کو ملا دیا ہے ایک اُس زمانہ کے واقعہ کو جب کہ حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو بیابان بیرشبع میں بے سہارے چھوڑ دیا تھا اور دوسرے اُس زمانہ کے واقعہ کو جب کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل نے زمزم کے پاس سکونت اختیار کرلی تھی اور دوبارہ حضرت ابراہیم ان کے پاس آئے تھے اور بیت اللہ الحرام بنایا تھا اور جاتے وقت یہ دعا مانگی تھی کہ "رب انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم۔

قرآن مجید میں حضرت اسمٰعیل کی عمر کا جب کہ اُن کو حضرت ابراہیم نے نکال دیا کچھ ذکر نہیں۔ بخاری کی اُن روایتوں سے جن کا مشتبہ ہونا بخوبی ثابت ہو گیا ہے اگر حضرت اسمٰعیل کی عمر کا کچھ اندازہ ظاہر بھی ہوتا ہو تو بھی مذہب اسلام پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ روایتیں اگر مشتبہ ثابت نہ ہوتیں تو بھی بمنزلہ وحی کے متصور نہیں ہو سکتیں۔

اصل یہ ہے کہ خود توریت مقدس میں حضرت اسمٰعیل کی عمر کی نسبت جب کہ وہ نکالے گئے نہایت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ورسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت بچے تھے اور بعض سے پایا جاتا ہے کہ وہ سولہ سترہ برس کے تھے۔ اس اختلاف کی بنا پر عرب کے یہودیوں میں اُن کا بچہ ہونا مشہور تھا اسی یہودی روایت کو ابن عباس نے بیان کیا ہوگا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کو منسوب نہیں کیا۔

توریت مقدس میں جو حضرت اسمٰعیل کی عمر کے باب میں اختلاف ہے وہ اس طرح پایا جاتا ہے۔ سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۱۴ کا فارسی ترجمہ جو ہم نے اوپر لکھا ہے وہ یہ ہے "و ابراہیم در صبح دم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ و بہ ہاجرہ دادہ بہ دوشش گذاشت و ہم پسرش را (باو دادہ) اورا روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیرشبع سرگردان شد" اس ترجمہ میں لفظ "باو دادہ" دو

ہالانی خطوط میں لکھا ہے جس کا یہ اشارہ ہے کہ یہ لفظ اصل عبری توریت میں نہیں ہے درحقیقت یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح ترجمہ عبری لفظوں کا یہ ہے کہ "پانی کے مشکیزے اور اُس کے بیٹے کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھ کر اُس کو روانہ کر دیا"۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اُن کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ اور اسی وجہ سے لوگوں نے دودھ پیتا ہوا خیال کیا تھا۔ حالانکہ اسی باب کی چودھویں آیت اس کے برخلاف ہے۔

عیسائی عالموں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس چودھویں آیت سے بلاشبہ حضرت اسمٰعیل کی اس زمانہ میں بہت چھوٹی عمر ہونا پایا جاتا ہے جو توریت کی بہت سی آیتوں کے برخلاف ہے۔ اس لئے اُنھوں نے اُس کی نسبت بہت کچھ بحث کی ہے۔

مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ "اگر ہم حضرت اسمعیل کی عمر پر غور کریں تو رنج آگیں شوق اور بھی دوبالا ہوتا ہے۔ یہ لڑکا اب کچھ بچہ نہیں تھا بلکہ کم ازکم پندرھویں برس میں تھا مگر تکلیف کی وجہ سے بچہ کی طرح مضمحل سا ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں اُس کی بچاری ماں جب تک کہ اُس کو طاقت رہی ہوگی، اُس کو ہاتھوں میں اٹھائے رہی ہوگی۔ اور جب وہ تھک گئی ہوگی تو اس کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ہوگا (مگر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ تاویل کیسی لغو اور بیہودہ ہے) اس کے بعد مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ ٹھیک ٹھیک عمر حضرت اسمٰعیل کی بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں اُن کا ختنہ ہوا تھا حضرت اسحاق اُس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اُس کے اگلے سال پیدا ہوئے ہیں اور حضرت ہاجرہ اور اُن کے بیٹے کے بیابان میں بھیجے جانے سے پیشتر اُن کا یعنی حضرت اسحاق کا دودھ چھوٹ چکا تھا" (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ ۱۷۶)

توریت اور انجیل کے اکثر محققین اور علی الخصوص "جیروم لی کلوک" اور "روزن ملر" خیال کرتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی۔ اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت ہاجرہ نے ان کو اپنے کندھے پر رکھ لیا ہو۔

جیسی بیہودہ تاویل مسٹر فارسٹر نے کی ہے اُس سے زیادہ عجیب تاویل "بشپ ہارسلی" نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عبرانی توریت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کو اُس کی ماں نے مع روٹی اور پانی کے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ یہی معنے یونانی ترجمہ میں بھی سمجھے گئے ہیں اور یہ جملہ بھی کہ بچہ کو جھاڑی میں ڈال دیا جو پندرھویں آیت میں ہے اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر چودہ برس سے کم نہ تھی اس واسطے اُن کی ولادت کے وقت کم سے کم وہ پندرہ

سال کے ہوں گے ۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حیاتِ انسانی گو اس زمانہ میں بہت مختصر رہ گئی ہے تاہم زمانۂ حال کی مدت عمر سے زیادہ دراز ہوتی ہوگی ۔ اور جو کہ طفولیت اور ہر ایک درمیانی زمانہ عمر کی حالت تمام عمر کے مجموعہ کے ساتھ جب کہ آدمی ڈیڑھ سو برس یا زیادہ عمر کے ہوتے تھے ۔ ہمیشہ کوئی متعین مناسبت رکھتی ہوگی اس لئے قرین قیاس ہے کہ اُس زمانہ میں چودہ یا سولہ برس کی عمر تک ضعیف اور ناتوان رہتے ہوں گے اور میرے نزدیک اُس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹوں کے زمانہ میں یہی صورت ہوگی ۔ جوسفس کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کیونکہ اُس کا صریح بیان ہے کہ حضرت اسمٰعیل اُس وقت تنہا نہیں جا سکتے تھے ۔ مگر یہ دلیل کیسی بیہودہ ہے کیونکہ تین ہی پشتوں کے بعد یہ سب باتیں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ حضرت یوسف حضرت ابراہیم کے پوتے کے بیٹے سترہ برس کی عمر میں عزیز مصر کے خواب کی تعبیر بیان کی تھی اور اُس کے وزیر ہو گئے تھے ۔

اسی مضمون پر ایک اور مصنف یہ لکھتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل گو بچہ کہلاتے تھے مگر سولہ سترہ برس کے ہوں گے اور اس لئے اپنی والدہ کی اعانت اور مدد کرنے کے قابل ہوں گے جس طرح کہ انھوں نے بعد کو کی ۔

ایک اور مصنف کہتا ہے کہ اس جملہ کو "کندھے پر رکھ دیا" خطوط ہلالی کے اندر رکھ دیا جاتا جیسا کہ بشپ کڈیر اور اسٹیک ہوس اور بایل نے کیا ہے (جس سے اشارہ ہوتا کہ یہ لفظ توریت میں نہیں ہیں)، تو یہ آیت مشتبہ نہ ہوتی ۔

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنی پہلی بی بی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بی بی ہاجرہ اور اُن کے بیٹے اسمٰعیل کو جو ہوشیار اور بڑے ہو گئے تھے گھر سے نکال دیا ۔ اور وہ دونوں بیابان بیر شبع میں چلے گئے ۔ چلتے چلتے اور منزلیں طے کرتے ہوئے وہ اُس مقام پر پہنچے جہاں اب مکہ ہے ۔ پیاس کی شدت سے حضرت اسمٰعیل کی حالت خراب ہوگئی اور مرنے کی نوبت پہنچ گئی ۔ حضرت ہاجرہ جو اُن کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر پانی کی تلاش کو اِدھر اُدھر دوڑتی پھریں اور بمشکل پانی ملا اور جہاں پانی ملا تھا اُسی جگہ انھوں نے سکونت اختیار کرلی ۔ کیونکہ عرب میں اُسی جگہ لوگ سکونت اختیار کرتے تھے جہاں پانی دستیاب ہوتا تھا ۔

قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اُس میں یہ آیت ہے "ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم" ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت اسمعیل اُس مقام کے پاس سکونت پذیر ہوئے تھے ۔ جہاں کہ بالفعل خانہ کعبہ واقع ہے اور جہاں کہ اب شہر مکہ آباد ہے ۔

عبرانی لفظ مدبر מדבר اور عربی لفظ وادی اور الفاظ "غیر ذی زرع" جو قرآن مجید میں آئے ہیں ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ لفظ فاران פארן اور لفظ ایل فاران איל פארן جو سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۲۱ اور باب ۱۴ ورس ۶ میں آیا ہے اُن دونوں سے ایک ہی مقام مراد ہے۔ اور لفظ ایل پاران سے بالتخصیص وہ پہاڑ مراد ہیں جو کعبہ کے گرد واقع ہیں اور صفا اور مروہ اور ابوقبیس اور حرا وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ عبرانی زبان میں "ایل" کے معنی خدا کے ہیں فاران کے پہلے "ایل" کا لفظ لگانے سے انسان کا دل اُس کی وجہ سے کی تفتیش پر متوجہ ہوتا ہے۔ اور اس پر قرار پاتا ہے کہ اُس جگہ ضرور کوئی ربانی کرشمہ ظاہر ہوا ہے یا ظاہر ہونے والا ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد جو پہاڑ ہیں اور جہاں کہ مسلمان حج ادا کرتے ہیں۔ علی العموم بنام "الال" مشہور ہیں۔ بعض صرف و نحو کے عالموں نے "الال" کو واحد لکھا ہے اور بعضوں کے نزدیک جمع کا صیغہ ہے۔ اس لفظ کے صحیح اشتقاق کی نسبت بہت بحث ہے۔ بعض کچھ کہتے ہیں اور بعض کچھ مگر کوئی بات اطمینان کے قابل نہیں ہے۔ ہماری رائے میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ اسی لفظ "ایل" سے مشتق ہوا ہے۔ ابتدا میں پہاڑ کے نام کے ساتھ اس کا استعمال تھا بمعنی کوہ خدا۔ پھر جو کہ ایل فاران خاص حجاز میں تھا۔ عربوں نے اُس نواح کے تمام پہاڑوں کے لیے "ایل" کی جمع "الال" بنالی اور مکہ کے پہاڑوں پر اُس کا اطلاق کرنے لگے۔

اگرچہ واقعات مندرجہ توریت مقدس اور قرآن مجید جن کا ہم نے اوپر بیان کیا آپس میں مطابقت رکھتے ہیں تاہم تین بڑے بڑے سوالات ہیں جو حضرت اسمٰعیل کی سکونت سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اول یہ کہ۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل اور اُن کی والدہ کو گھر سے نکال دینے کے بعد کہاں چھوڑا تھا۔

دوم یہ کہ۔ حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ نے بیابان میں آوارگی کے بعد کس جگہ سکونت اختیار کی۔

سوم یہ کہ آیا وہ اُسی جگہ متوطن ہوئیں جہاں کہ پہلے پہل ٹھیری تھیں یا کسی اور جگہ۔

قرآن مجید میں ان امور کی بابت کچھ تذکرہ نہیں ہے لیکن بعض ملکی روایتوں اور چند حدیثوں میں اس کا بیان ہے۔ وہ حدیثیں غیر مستند ہیں اور اس وجہ سے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا اور جو کہ مقامی روایتوں میں اُن واقعات کو جو مختلف موقعوں پر واقع ہوئے تھے خلط ملط کر دیا ہے اس لئے اُن پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔ پس ہمارے نزدیک اول سوال

کی نسبت جو کچھ توریت مقدس میں لکھا ہے اُس سے زیادہ بحث کرنی فضول ہے۔ توریت میں لکھا ہے۔ کہ "اُس نے یعنی ابراہیم نے اس کو یعنی ہاجرہ کو روانہ کردیا اور وہ چلی گئی اور بیابان بیرشبع میں پھرتی رہی" (سفر تکوین باب ۲۱ درس ۱۴)

دو باقی ماندہ سوالوں کے باب میں توریت مقدس کی عبارت اس طرح پر ہے کہ ایک جگہ لکھا ہے "اور وہ یعنی اسمٰعیل بڑا ہوا اور بیابان میں سکونت پذیر ہوا۔ اور ایک تیرانداز ہوگیا" (سفر تکوین باب ۲۱ درس ۲۰) اور دوسری جگہ لکھا ہے کہ "اُس نے یعنی اسمٰعیل نے بیابان فاران میں سکونت اختیار کی" (سفر تکوین باب ۲۱ درس ۲۱)۔ توریت کا کوئی مفسر نہیں بیان کرتا اور نہ ملکی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل پہلے کسی ملک میں آباد ہوئے ہوں اور پھر کسی اور ملک میں چلے گئے ہوں اس لئے یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور اُن کی والدہ جس حصہ ملک میں آباد ہوئی تھیں اُسی میں آباد رہیں پس توریت میں جہاں صرف بیابان میں آباد ہونے کا ذکر ہے اُس سے بیابان فاران ہی مراد ہے جس کی تصریح دوسرے درس کی گئی ہے۔ پس ان سوالوں کا حل کرنا اس بات کی تحقیق پر منحصر ہے کہ بیابان فاران جہاں کہ حضرت اسمٰعیل کا سکونت پذیر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ کونسی جگہ ہے۔

مشرقی جغرافیہ والوں کا بیان ہے کہ تین مقام بنام فاران موسوم ہیں اول وہ مقام اور اُس کے گرد و نواح کے پہاڑ جہاں اب شہر مکہ واقع ہے کیونکہ اس زمانہ میں وہ بیابان تھا۔ دوم وہ پہاڑ اور گاؤں جو مشرقی حصہ مصر یا عرب الحجر میں واقع ہے۔ سوم ایک ضلع جو سمرقند کی نواح میں واقع ہے۔

مشرقی جغرافیہ والوں نے جو کچھ فاران کی نسبت لکھا ہے اُس کو ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔

فاران المذکور فی التوراۃ فی قولہ جاء اللہ من سینا واشرف من ساعیر واستعلن من فاران فساعیر جبال فلسطین وھو انزالہ الانجیل علی عیسیٰ وفاران مکۃ اوجبالھا علی ماتشھد بہ التوراۃ واستعلائہ منھا انزالہ القرآن علے رسولہ محمد صلعم وفاران قریۃ من نواحی سغد من اعمال سمرقند وقیل فاران والطور کورتان من کور مصر قبلہ۔ مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع۔ ومعجم البلدان یاقوت حمری۔

والطور جبل بارض مصر عند کورۃ تشتمل علی عدۃ قوی قبلھا وبالقرب منھا جبل فاران۔

مراصد الاطلاع و معجم البلدان ۔

فاران ثلثۃ مواضع فاران اسم جبال مکۃ وقیل لہا اسم جبال الحجاز و لہا ذکر فی التوراۃ یجی فی اعلام نبوۃ النبی صلعم قال الامیر ابو نصر ابن ماکولا ابوبکر نصر بن القاسم بن قضاعۃ القضاعی الفارانی الاسکندری سمعت ان ذلک نسبۃ الی جبال فاران وھی الحجاز و فاران قال ابوعبد اللہ القضاعی فی کتاب خطط مصر فاران والطور کورتان من کور مصر القبلیۃ وفاران من قری سمرقند ۔ مشترک یاقوت الحموی ۔

الطور سبعۃ مواضع والطور ایضا علم لجبل بعینہ عند کورۃ تشتمل علے عدۃ قری بارض مصر من جھتہ القبلیۃ بینھا وبین جبل الفاران ۔ مشترک ۔

وطریق اخر علی ساحل البحر القلزمی ... من مصر الی عین شمس ... ثم الی بطن مغیرہ ... ثم الی جرن فاران ... وبالقرب من فاران موضع صعب اذا سلک والریح ایضا معز باوالدبور مشرقا دیسمی جبلان من جبلان الی جبل الطور الی ایلہ الخ ۔ نزھۃ المشتاق شریف الادریسی ۔

مجھے معلوم نہیں ہے کہ کسی غیر ملک اور مذہب کے مؤرخ نے فاران اور حجاز کو جہاں اب مکہ معظمہ واقع ہے ایک ہی قرار دیا ہو ۔ لیکن عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگڈنی بنا ورم چھپوایا ہے اُس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے ۔ اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے:۔

"وسکن فی بریۃ فران (الحجاز) واخذت لہ امہ

امراۃ من ارض مصر" (عربی ترجمہ توراۃ سامری)

عموماً عیسائی مؤرخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز ایک ہی جگہ سے مراد ہے تسلیم نہیں کرتے اس تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کرلیں تو اس بات کی تسلیم بھی لازم آتی ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے بلاشبہ اُس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا مراد ہے ۔

بہرحال اُن مصنفوں کا فاران کی نسبت مختلف طرح کا بیان ہے ۔

اول ۔ یہ کہ بعض کہتے ہیں کہ فاران وہ وسیع قطعہ زمین ہے جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے اور فاران کے نام سے مشہور ہے ۔ اُس کی حدود اربع عموماً یہ تبلاتے

ہیں شمال میں کنعان - جنوب میں کوہ سینا - مغرب میں مصر - اور مشرق میں کوہ سعیر - اُس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کُل بیابان بنتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں مثلاً شور - بیر شبع - ایثام بسین - زین - عیدام وغیرہ -

دوم - بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیم نے ایک کنواں موسوم بہ بیر شبع کھودا تھا اور فاران ایک ہی مقام ہے -

سوم - بعضوں کی یہ رائے ہے کہ فاران اُس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی[1] ڈھلاؤ پر واقع ہے - بے شمار عمارتوں اور پُرانی قبروں اور مناروں وغیرہ کے آثار وہاں اب بھی پائے جاتے ہیں مسٹر روپر کا بیان ہے کہ میں نے ایک کلیسا کے نشانات جو پانچویں صدی عیسوی میں بنایا گیا ہوگا، دریافت کئے - اور اُن کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں اس مقام پر عیسائی آباد تھے اور

---

[1] یہ ایک ایسا نام ہے جس کا اطلاق توریت میں اُس سارے صحرا پر معلوم ہوتا ہے جو کہ یہودیہ کی سرحد سے لے کر حوالی سینا تک پھیلتا ہے - چونکہ ہم فاران کو حوالی سینا کے جنوب کے قطع میں (سفر اعداد باب ۱ ورس ۱۲) اور شمالی جانب قادیش سے (سفر اعداد باب ۱۳ ورس ۲۶) ملحق اور جگہ بھی پاتے ہیں اس لئے اس بات کا فرض کر لینا کہ فاران اس تمام قطعہ کا نام تھا جو ان حدود سے محدود ہے آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ متقابل کے دو قطعوں کا ایک ہی نام قرار دیں اِس لحاظ سے وہ دقت جو اس نام کی صحیح صحیح تطبیق میں عارض ہوتی تھی ظاہر ہو گئی ہے جب کہ دیکھا جائے کہ سب جداگانہ مقامات جو مختلف مصنفوں نے اُس کے واسطے قرار دیئے ہیں اُس قدرے وسیع قطع میں مجتمع ہوتے ہیں جو کہ ہمارے نزدیک اس کا مصداق ہے یہ نام وادی فاران میں بھی بخوبی موجود ہے جو سینائے اسفل کی ایک وادی ہے اور جس میں ہو کر بنی اسرائیل ہنگام کوچ بجانب مالک؟ علیا گذرتے تھے (کیٹوز سائیکلو پیڈیا آف بائیبل)

ایک بیابان فلسطین کے جنوب کی جانب جہاں کہ حضرت اسمٰعیل سکونت پذیر ہوئے تھے (سفر تکوین باب ۲۱ ورس ۲۱) جس کے مغرب میں ہلال اور ریتی شمال میں یہودیہ کے جنوبی پہاڑ اور مشرق میں قادیش کا بیابان اور اُس کے پہاڑ یہ ایل پاران یا بیابان پاران ہے (سفر تکوین باب ۱۴ ورس ۶) نیز وہ مُلک جس کے بعض اقطاع میں موسم برشکال میں گھاس اور سبزہ بہت ہوتا ہے - جہاں کہ حضرت ابراہیم نے بودوباش اختیار کی تھی قادیش اور شور کے مابین اور جہاں کہ بنی اسرائیل کا قادیش کو جاتے وقت گذر ہوا تھا - (سفر اعداد باب ۱۲ ورس ۱۶ و باب ۱۳ ورس ۲۸) بیان فاران سے مراد اُن پہاڑوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس میدان کے مشرق کی جانب اور بیابان قادیش کے جنوب کی طرف واقع ہیں - یا بیابان قادیش یا بیابان فاران بھی میدان ملحق کی وجہ سے کہلاتا تھا - جس طرح وہ بھی قادیش کے نام سے بوجہ چشمہ قادیش کے مشہور تھا - (ریلیجز بائیبل ڈکشنری)

ایک بطریق بھی وہاں رہتا تھا۔ان بیانات کی تصدیق کرنے میں اس بات کے خیال میں کہ یہ شہر اُس شہر سے مطابقت رکھتا ہے جس کا مشرقی مؤرخوں نے مشرقی کنارہ مصر پر موجود ہونا بیان کیا ہے ہمیں کچھ بھی کلام نہیں ہے۔

مگر یہ سب بیانات درست نہیں ہیں۔جن کی غلطی ہم ثابت کریں گے۔اگرچہ پہلے دو بیانات کی تائید میں کسی قسم کی شہادت موجود نہیں ہے اور اس لئے اُن کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ وہ ثابت نہیں ہیں کافی تھا۔لیکن ہم اس غرض سے کہ اُن کے غلط ہونے میں کچھ شبہ باقی نہ رہے۔ ہم اُن کی تردید کرتے ہیں۔

اول بیان کی تردید کے لئے یعنی اُس بیان کی تردید کے لئے جس میں فاران کو ایک وسیع بیابان قرار دیا ہے اور اُس میں اور چھوٹے چھوٹے بیابان مثل شور اور سینا وغیرہ کے شامل کئے ہیں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ اُس کی تردید میں توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کردیں کیونکہ اُن سے صاف منکشف ہوتا ہے۔کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے اور گردنواح کے بیابان اُس میں شامل نہیں۔

(الف) "و بنی اسرائیل از بیابان سینی کوچ نمودند و ابر در بیابان پاران ساکن شد"۔ (سفر اعداد باب ۱۰ ورس ۱۲)۔اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا اور بیابان فاران میں مقام کیا اور قرار واقعی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جداگانہ بیابان تھے۔

(ب) "پس در سال چہاردہم کدر لاعومر و ملوکے کہ بہمراہش بودند آمدہ رفائیان را کہ در عشترو ث قرنیم و زوزیان را در ہام و ایمیان را در شاوہ قریاتایم شکست دادند و نیز حوریان را در کوہ خودشان سیعیر تا ایل پاران کہ در نزدیک صحراست"۔ (سفر تکوین باب ۱۴ ورس ۵ و ۶)
پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جاوے۔اس ورس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔

(ج) "و خداوند موسیٰ را خطاب کردہ گفت۔کہ مردمانے بہ سفرست تا آنکہ زمین کنعن را کہ بنی اسرائیل می دہم تجسس نمایند از ہر سبط آبائے ایشاں یک نفرے کہ در میان ایشاں سرور باشد بفرستید۔پس موسٰے ایشاں را بہ فرمان خداوند از بیابان پاران فرستاد و آں مرداں ہمگی روسائے بنی اسرائیل بودند"۔ (سفر اعداد باب ۱۳ ورس اور ۲ و ۳)

(د) "در روانہ شدہ پیش موسے و ہارون و تمامی جماعت بنی اسرائیل در بیابان پاران بہ قادیش

رسیدند و بہ ایشاں و ہم بتمامی جماعت خبر رساندند و ہم با ایشاں میوۂ زمین را نمودند" (سفر اعداد باب ۱۳ ورس ۲۶)

(ھ) "کہ گفت۔ خداوند از سینی برآمد و از سیعیر بر ایشاں تجلی کرد از کوہ پاران درخشندہ شد و با ہزار ہزاراں مقدساں ورود نمود و از دست راستش با ایشاں شریعتے آتشین رسید" (سفر توریہ مثنیٰ باب ۳۳ ورس ۲)

(و) "خداوند از تیمان و قدوس از کوہ پاران آمد۔ سلاہ۔ جلالش آسمان ہارا مستور کرد و زمین از حمد شش پر شد" (کتاب جوق باب ۳ ورس ۳)

(ز) "و از مدیان برخاستند بہ پاران آمدند و مردمان چندے از پاران بہ ہمراہ خود شاں گرفتند و بہ مصر بخدمت فرعون بادشاہ مصر آمدند" (کتاب اول ملوک باب ۱۱ ورس ۱۸)

اور دوسرے بیان کی یعنی اس کی کہ قادیش اور فاران ایک ہی مقام ہے توریت مقدس کے مندرجہ ذیل ورسوں سے تکذیب ہوتی ہے۔

(الف) "و نیز حوریاں را در کوہ خود شاں سیعیر تا ایل پاراں کہ در نزدیک صحرا است۔ و برگشتہ بہ عین مشپاط کہ قادیش است آمدند و تمامی مرز و بوم عمالیقاں و ہم اموریانی کہ در حصصون تامار ساکن بودند شکست دادند" (سفر تکوین باب ۱۴ ورس ۶ و ۷)

یہ ظاہر ہے کہ جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیے جاویں ورس مذکورہ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔

(ب) "و روانہ شدہ پیش موسے و ہارون و تمامی جماعت بنی اسرائیل در بیابانِ پاران بہ قادیش رسیدند و بہ ایشاں و ہم بتمامی جماعت خبر رساندند و ہم بہ ایشاں میوۂ زمیں را نمودند" (سفر اعداد باب ۱۳ ورس ۲۶)

اس ورس میں جن لفظوں کے نیچے ہم نے لکیر کر دی ہے اُن کے ترجمہ میں ہم کو شبہ ہے اس لئے ہم اصلی عبری عبارت اور اس کا ایک نہایت قدیم ترجمہ عربی کا جو ۱۶۷۱ء عیسوی میں مع لیٹن ترجمہ کے چھپا ہے۔ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

וילכו ויבאו אל- משה ואל- אהרן ואל כל- עדת בני ישראל

ישראל אל- מדבר פארן קדשה:

وقدموا الى موسى وهارون وجماعة بنى اسرائيل الى برية فاران الى قادس سفر العدد

الاصحاح ۱۳ + ۲۶ -

اصل عبری عبارت میں صرف یہ لفظ ہیں "ال مدبر فاران قادیش" عربی زبان میں جو قاعدہ بدل اور مبدل منہ کا ہے وہ عبری زبان میں نہیں ہے اور اس لئے فاران اور قادیش بدل اور مبدل منہ نہیں ہو سکتے اور ضرور ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی لفظ مقدر مانا جاوے فارسی مترجم نے حرف ب کو مقدر مانا ہے اور "بہ قادیس" ترجمہ کیا ہے۔ اور عربی مترجم نے "الی" مقدر مانا ہے اور "الی قادیش" ترجمہ کیا ہے۔ اور لیٹن کے مترجم نے جو لفظ مقدر مانا ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے "جو کہ ہے بیچ قادیش کے" مگر عربی قدیم ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ فاران کے ماقبل بھی ال یعنی "الی" کا لفظ آیا ہے اور وہی لفظ آیا ہے اور وہی لفظ قادیش پر سے محذوف کر دیا ہے۔ پس اس ترجمہ کے مطابق معنی یہ ہوتے ہیں کہ "آئے بیابان فاران کی طرف قادیش کی طرف سے یعنی قادیش کے رستہ سے" اس صورت میں صریح ظاہر ہوتا ہے کہ فاران اور قادیش دو مختلف مقاموں کے نام ہیں اور اسی کی تائید سفر تکوین کے درسوں سے ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہوتے ہیں۔

اب ہم کو تیسرے فاران پر غور کرنا چاہئے جس کو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہونا بیان ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین میں آیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل صحرائے بیرشبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آکر ٹھیرے تھے اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسمٰعیل فی الحقیقت متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے لازم آتے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر سفر تکوین میں آیا ہے۔

کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ حضرت اسمٰعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسمٰعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں اور جس قدر دلائل اُس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں۔ مگر ہم اس غرض سے کہ اُن کے غلط ہونے میں کچھ شبہ باقی نہ رہے، اُن دلیلوں کی غلطی بیان کرتے ہیں۔

مصنف موصوف نے سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ پر جس کی یہ عبارت ہے۔ "وایشان از حویلاہ تا شور کہ ہنگام رفتن تو بہ اشور در برابر مصر ست ساکن بودند و مسکن او در حضور تمامی برادرانش افتاد" استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ "خدائے تعالیٰ کے وعدے اسی میں ایفا ہوگئے

تھے۔ جب کہ اسمٰعیلیوں کی آبادی شور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں یعنی سرحد مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی۔

اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے فرات پر قرار دیا ہے۔ در حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ اور س ۲۹ میں مذکور ہے لواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقع ہے اور اُس کی کامل تصدیق عرب کے اُس نقشہ کے معاینہ سے ہو سکتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے۔ واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے اور اُسی کے ساتھ شام اور مصر کے اُن اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے۔ جن کا نقشہ رورنڈ کارٹرٹ پی کیرے۔ ایم۔ اے۔ نے مرتب کیا ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید اختیار کر کے "شور" کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں کہ صحرائے ایتام واقع ہے اور یہ قطعی غلطی ہے کیونکہ صحرائے "شور" سے توریت مقدس میں مراد تمام اُس وسیع میدان سے ہے جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے۔

اصل عبری توریت میں صرف دو نام ہیں۔ شور שור اور۔ اشورہ אשורה بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں۔ ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسریا ہے

اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسمٰعیل اُس وسیع قطعہ میں آباد ہوئے تھے۔ جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے۔ یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت

سلہ رورنڈ مسٹر فارسٹر صاحب حویلاہ کی سکونت کی نسبت لکھتے ہیں کہ "ارض حویلاہ سے جو حضرت موسیٰ کے پہلے صحیفہ میں مذکور ہے' وہ حصہ عرب کا مراد ہے جو دہانہائے فرات سے ملحق ہے اور جنوب کی جانب ساحل خلیج فارس کے برابر چلا گیا ہے"۔ یہ بیان (اس بنا پر ہے (اگرچہ ہمارے نزدیک قابل وقعت نہیں ہے) کہ جزائر بحرین میں سب سے مشہور جزیرے "اوال" کے نام میں اصلی نام حویلاہ کے آثار پائے جاتے ہیں اس دلیل کے استحکام میں صاحب موصوف یہ بیان کرتے ہیں کہ "آگے آنے والی مثالوں سے عربی زبان کے استعمال میں جو مختلف تصرفات اس نام میں ہوتے ہیں معلوم ہوں گے۔ جیسے اوال۔ اوآل جویل۔ حویلاہ خرخط خولان۔ چول۔ چولان۔ ان لفظوں میں سے بعضے لفظ ایک ہی جگہ یا ضلع کے مختلف نام ہیں"۔ ایسے عظیم سوالات کا اس طرح پر حل کرنا اور اُن سے نتائج کا استنباط کرنا کامل اور ناطرفدارانہ تحقیقات کے قواعد معینہ کے مطابق صحیح نہیں ہے اور اسی لیے وہ قابل وقعت نہیں ہیں اور اسی باعث سے ہم نے کہا ہے کہ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بیان میں غلطی کی ہے۔ علی الخصوص اس وجہ سے کہ یہی نام پورا پورا عرب کے دوسرے حصہ میں موجود ہے۔

رکھتی ہے ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص وہاں سے اسریا کی جانب عزیمت کرے تو توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے "جو کہ سامنے مصر کے ہے اگر تو اسریا کی طرف روانہ ہو" یعنی مصر کے سامنے ہے اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسریا تک کھینچو۔

فاران کی حدود اربعہ جو ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے بہ حوالہ ڈاکٹر ولز کے قرار دی ہیں کہ اس کے مغرب میں بیابان شور ہے اور مشرق میں کوہ سیعیر اور شمال میں ارض کنعان اور جنوب میں بحراحمر یہ حدود بھی بالکل غلط ہیں۔

سینٹ پال حواری نے جو خط گلاٹیوں کے نام لکھا ہے اُس کے چوتھے باب میں بائیسویں ورس سے چھبیسویں ورس تک یہ عبارت مندرج ہے "یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ ایک لونڈی سے دوسرا آزاد سے، وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا سو وعدے کے طور پر پیدا ہوا۔ اس کے یہ معنی ظاہر ہیں کہ یہ عورتیں دو عہدنامے ہیں ایک تو کوہ سینی کی جو صرف غلام جنتی ہے۔ ہاجرہ ہے کہ وہ ہاجرہ عرب کوہ سینی ہے اور یہاں کے یروشلم کی ہم جنس ہے اور اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کی یروشلم آزاد ہے، سو ہم سبھوں کی ماں ہے"۔ اس پر ریورنڈ مسٹر فارسٹر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوہ سینا اور ہاجرہ ایک ہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول خود مصنف موصوف ہی کا قول ہے کیونکہ جہاں تک ہم کو واقفیت ہے۔ ہم کسی عیسائی مصنف کا قول اس کے مطابق نہیں پاتے ہیں۔ کوئی مشرقی مؤرخ یا جغرافیہ دان ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے کوہ سینا اور ہاجرہ کو ایک ہی سمجھا ہو اور نہ انجیل مقدس کی کسی آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کوہ سینا اور ہاجرہ سے ایک شے مراد ہے۔ سنٹ پال حواری کا اصلی منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کوہ سینا پر دو معاہدے کیے گئے تھے۔ ایک حضرت اسحاق کے ساتھ اور دوسرا حضرت اسمٰعیل پسر ہاجرہ کے ساتھ۔ سنٹ پال حواری نے کنایتاً فرمایا کہ "یہ ہاجرہ کوہ سینا ملک عرب میں ہے" یعنی یہ ہاجرہ یعنی بنی ہاجرہ وہ معاہدہ ہے جو کوہ سینا پر بھی کیا گیا تھا اور شلیم کا ہم پایہ ہے۔ جو بالفعل موجود ہے اور اس کی اولاد کے ساتھ غلامی میں ہے۔ عبارت مذکورہ بالا کو اس طرح پر پھیرنا کہ اس کے معنی سے ہاجرہ اور سینا کا مقام واحد ہونا ثابت ہو جائے بالکل غیر ممکن ہے۔

کتاب اول تواریخ ایام باب ۵ ورس ۹ اور ۱۰ میں بعض اقوام بنی اسرائیل کے آباد

ہونے کے ذکر کے ساتھ یہ عبارت مندرج ہے "و بہ طرف شرقی تا مدحل بیابان کہ بہ کنارہ نہر فرات باشد ساکن می شدند زیرا کہ در زمین گلعاد گلہ ہائے ایشاں زیاد می شدند۔ و در زمان شاول ایشاں با ہگریاں دعوئے کردند کہ آنہا بدست ایشاں افتادند و در چادرہائے ایشاں در تمامی مرز و بومے کہ بہ طرف گلعاد باشد ساکن شدند" ان ورسوں پر استدلال کرکے رورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ گلعاد کے شرقی نواح۔ جو رود فرات اور خلیج فارس کی سمت میں ہے حضرت اسمٰعیل کے ابتدائی مقام سکونت سے مطابق ہوتا ہے ایک عرصہ کے بعد حضرت اسمٰعیل کی اولاد قریب قریب سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی اور انھیں سے بعض لوگ مقام متذکرہ بالا کو قدیمی باشندوں سے چھین کر وہاں جا بسے۔

مگر ان ورسوں سے جو مقصد رورنڈ مسٹر فارسٹر کا ہے وہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اُن سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی ہاجرہ نے سواحل خلیج فارس پر شکست کھائی اور یہ شکست آٹھ سو برس بعد حضرت اسمٰعیل کے واقع ہوئی تھی۔ ان ورسوں سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی، کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں خود حضرت اسمٰعیل متوطن ہوئے تھے۔

رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد نے خلیج فارس کے شمالی سمت سے لے کر یمن تک تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ مختلف مقامات کے ناموں کی بنی ہاجرہ کے ناموں کے ساتھ مطابقت کرنے میں ازحد کوشش کی ہے۔ بعض مطابقتیں اس طرح پر کی ہیں۔ جن پر اعتبار نہیں ہو سکتا اور بعض میں اپنے معمولی قاعدہ کے مطابق صرف ایک حرف کے مطابق ہو جانے کو کافی سمجھا ہے اور بعض ناموں کے مطابق کرنے میں ان کو کامیابی بھی ہوئی ہے۔ لیکن جس امر کے قائم کرنے میں رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس قدر جاں فشانی سے ناکام کوشش کی ہے دو وجہ سے قابل التفات اور لائق توجہ نہیں ہے۔

اول اس لئے کہ ہمارے نزدیک بھی حضرت اسمٰعیل کی اولاد یعنی اُن کے بارہ نامور بیٹے اور اُن بیٹوں کی اولاد صرف اُس تنگ قطعہ زمین میں محصور نہیں رہی جو مکہ معظمہ کے گرد اگرد ہے۔ بلکہ امتداد زمانہ میں اُن کی اولاد قریب قریب تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی۔ مسلمان مؤرخ بھی اس کے قائل ہیں جیسا کہ عبارت مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔ پس یہ امر متنازعہ فیہ نہیں ہے۔

"ولما کثر ولد اسمعیل صلی اللہ علیہ وسلم ضاقت علیھم مکۃ فانتشروا فی البلاد فکانوا لا یدخلون بلداً الا اظہرھم اللہ علی اہلہ وھم نفوا العمالیق" معارف ابن قتیبہ۔

دوم اس لئے کہ اس مقام پر یہ امر بحث طلب نہیں ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد حضرت اسمٰعیل کی اولاد کہاں کہاں پھیل گئی تھی۔ بلکہ اس بات پر بحث ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد ابتدا میں کس جگہ آباد ہوئی تھی۔ پس جو کچھ کہ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے لکھا ہے اُس سے امر بحث طلب کو کچھ علاقہ نہیں ہے۔

اب ہم اس امر کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کتب خمسہ حضرت موسےٰ میں اُس فاران کا جو مشرقی مصر میں کوہ سینا کے مغربی "ڈھلاو" پر واقع ہے کچھ بھی ذکر نہیں ہے اور یہ امر اُس وقت بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ جب کہ حضرت موسیٰ اور اُن کے ہمراہیان بنی اسرائیل کی صحرانوردیوں کے مقامات پر لحاظ کیا جاوے۔ سفر خروج باب ۱۵ ورس ۲۲ میں لکھا ہے۔ "پس موسےٰ اسرائیل را از دریائے احمر کوچانید و بہ بیابان شور رفتند و سہ روز در بیابان راہی شدہ آب نیافتند" اور جب کہ اُنھوں نے بیابان سین کو طے کیا۔ تب عمالیق کی قوم آئی اور رفیدیم میں بنی اسرائیل سے لڑی۔ دیکھو (سفر خروج باب ۱۷ ورس ۸)

بنی عملیق قدیم رہنے والے رفیدیم کے نہیں تھے بلکہ اُس وادی کے رہنے والے تھے جس کا ذکر سفر اعداد باب ۱۴ ورس ۲۵ میں ہے اور اس ورس میں بھی جو لفظ "آئے" کا استعمال ہوا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رفیدیم کے رہنے والے نہ تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رفیدیم سینا کے جانب مغرب یعنی مشرقی مصر میں واقع ہے اور یہ وہی جگہ ہے۔ جہاں حضرت مُوسےٰ نے اپنے اعجاز سے ایک چٹان میں سے پانی کا چشمہ نکالا تھا اور اس کا نام "مساہ" اور "مریبا" رکھا تھا (دیکھو سفر خروج باب ۱۷ ورس ۶ و ۷) اور اسی جگہ حضرت موسیٰ نے ایک قربان گاہ بنائی تھی اور اس کا نام "یہوانسی" رکھا تھا (دیکھو سفر خروج باب ۱۷ ورس ۱۵)

حضرت موسےٰ اب آگے کو مشرق کی طرف بڑھے اور صحرائے سینا میں پہنچ کر کوہ خدا کے پاس ڈیرے ڈالے اور اسی مقام پر اُن کے خسر مسمی یثرو کاہن اُن سے ملنے کو آئے (دیکھو سفر خروج باب ۱۸ ورس ۵ و باب ۱۹ ورس ۲)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یثرو کاہن حضرت موسیٰ کے خسر کوہ سینا کے مشرق کی جانب سے آئے تھے۔ کیونکہ مدیان جہاں کہ وہ کاہن تھے اُس کے مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ اس تمام سفر میں جو حضرت موسیٰ نے مصر سے سینا تک کیا فاران کا کچھ ذکر نہیں آیا۔

سیناسے بنی اسرائیل کا کوچ شمالی مشرق کی سمت میں تھا۔ اس سفر کے باب میں سفراعداد باب ۱۰ ورس ۱۲ میں یہ لکھا ہے" و بنی اسرائیل از بیابان سینی کوچ نمودند وابر در بیابان پاران ساکن شد" حضرت موسٰے نے اس سفر میں پہلی منزل اس مقام پر کی تھی جس کا نام "تبعراہ" تھا (دیکھو سفراعداد باب ۱۱ ورس ۳)۔ پھر وہاں سے "قبروث ہتاواہ" کو روانہ ہوئے اور وہاں سے "حصیروث" کو کوچ کیا (دیکھو سفراعداد باب ۱۱ ورس ۳۴ و ۳۵) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے (دیکھو سفراعداد باب ۱۲ ورس ۱۶) جو کہ یہ پاران وہی جگہ ہے جہاں ابر کا ٹھیرنا بیان کیا گیا ہے اس لئے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسٰی کا کوچ شمالی اور مشرقی سمت میں تھا یعنی قادیش کی طرف (دیکھو سفراعداد باب ۱۳ ورس ۲۶) اور اس لئے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسٰی نے کیا ہے سینا کے مغرب کی جانب نہیں ہوسکتا۔

پس بآسانی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ شہر فاران جس کو روپر صاحب نے بیان کیا ہے اور جس کے آثار انھوں نے پائے ہیں اور جو مشرقی مؤرخوں کی نظر سے چھپا ہوا نہ تھا۔ حضرت موسٰی کے زمانہ میں موجود نہ تھا اور یہ کب خیال میں آسکتا ہے کہ ایسے بیابان میں جس کی نسبت حضرت موسٰی نے بیان کیا ہے کہ" بیابان وسیع و ہولناک کہ دراں مارسوزندہ وعقرب و زمین خشک بے آب بود" اُس زمانہ میں کوئی شہر موجود ہو (دیکھو سفر توریہ ثنی باب ۸ ورس ۱۵)

عیسائی مصنفوں نے بیابان فاران کا جو مقام قرار دیا ہے اُس پر اعتبار کرنا حضرت موسٰی اور بنی اسرائیل کی صحرائے نوردی کے بیان کی صحت پر منحصر ہے اور اس امر کی نسبت کہ حضرت موسٰی اور بنی اسرائیل صحرانوردی کی حالت میں کن کن مقاموں پر ہو کر گذرے تھے خود عیسائی علماء اور فضلا میں اس قدر اختلاف ہے کہ اس قدر اختلاف شاید ہی کسی اور اَمر کی نسبت ہو ہم اس مقام پر حضرت موسٰی اور بنی اسرائیل کی صحرانوردی کا ایک نقشہ شامل کرتے ہیں اُس سے ظاہر ہوگا کہ خود علماء عیسائی نے پانچ مختلف رستے صحرانوردی کے بیان کئے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی نسبت بطور یقین کے بیان کیا جاسکے کہ درحقیقت ان پانچوں میں سے صحرانوردی کا کونسا صحیح رستہ ہے۔

فاران پسر عوف کی اولاد بنی فاران کے نام سے مشہور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰی کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں کچھ لوگ اس قبیلہ کے یمن والوں اور قرب وجوار کی قوموں کے ساتھ دائمی جھگڑوں اور قصوں کے سبب سے شمال اور مشرقی سمت کو چلے گئے ہوں گے

اور کوہ سینا کی مغرب کی جانب مشرقی مصر میں قیام کیا ہوگا. جہاں رفتہ رفتہ ایک گاؤں یا قصبہ اُسی قوم فاران کے نام سے آباد ہو گیا ہوگا۔ جس کا ذکر روپر صاحب اور اور مشرقی مؤرخوں نے کیا ہے مگر حضرت موسٰی کے وقت میں اُس کا کچھ وجود نہ تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے ہم نام بیابان یا پہاڑ سے جس کا ذکر توریت میں ہے بالکل علیحدہ ہے۔

اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا ہے. جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے اور صرف ملکی روایتیں ہی اُس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مؤرخ بھی اُس کے مؤید ہیں تب حضرت موسٰی کے کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہو جاتی ہے اور اُس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

اس تمام وسیع میدان پر جو شام کے جنوب میں واقع ہے کاتبین مقدس عموماً ارض شور کا اطلاق کرتے ہیں مگر بعض مقام میں اُس کو صرف "بیابان" سے تعبیر کیا ہے (دیکھو سفر خروج باب ۱۳ ورس ۱۸) اور بعض جگہ "بیابان عظیم" سے (دیکھو سفر توریہ مثنی باب ۸ ورس ۱۵) اور اس بیابان میں ایثام۔ سین۔ سینا۔ سن۔ قادیش۔ عیدام جو چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں۔ اور نیز ایک فاران کا شامل ہے۔

جو کچھ کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے شور اور شام کو ایک ہی ملک قرار دیا ہے۔ سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ میں دو نام آئے ہیں ایک شور اور دوسرا اشورہ۔ تمام عیسائی مصنف اشورہ کو "اسریا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ شور سے شام مراد ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرے تو اُس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس تطبیق کا تسلیم کرنا اسلام کے مفید مطلب ہے کیونکہ سفر توریہ مثنی باب ۳۳ ورس ۲ اور کتاب حبقوق باب ۳ ورس ۳ میں جو پیشین گوئی ہے وہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صادق آتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاران کی شمالی حد پر قادیش اور مغربی حد پر صحرائے "سن" اور خلیج عرب واقع ہے۔

جب کہ حضرت موسٰی سینا سے روانہ ہوئے تو ابر قادیش کے نزدیک فاران میں ٹھیرا (دیکھو سفر اعداد باب ۱۰ ورس ۱۲) اور حضرت موسٰی "تبعیراہ" "قبروث ہتاواہ" اور "حصیروث" ہو کر فاران میں آئے جو قادیش کے نواح میں ہے۔ اس جگہ سے اُنھوں نے ایلچی روانہ کئے۔ جو واپس

آتے وقت اول قادیش میں پہنچے اور اُس کے بعد فاران میں۔ یہ ایک سیدھا اور صاف بیان ہے جس سے حضرت موسٰی کے فاران میں سفر کرنے کا معمہ بخوبی حل ہو جاتا ہے۔

اب ہم توریت مقدس کے اُن درسوں پر غور کریں گے جو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے نکال دینے کے باب میں ہیں۔ سفر تکوین باب ۲۱ درس ۱۴ و ۱۵ میں لکھا ہے کہ "ابراہیم در صبح دم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ و بہ ہاجرہ دادہ بہ دوشش گزاشت و ہم پسرش را با و دادہ اورا روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیر شبع سرگرداں شدہ۔ و آبے کہ در مطہرہ بود تمام شد۔ و پسر را در زیر بوتہ از بوتہا گذاشت" جس عبارت کے نیچے ہم نے خط کھینچ دیا ہے اُس کے خواہ نخواہ یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیم نے اُن کو دیا تھا اُن کے پاس تھا اور وہی ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں اول اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیم نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا حضرت ہاجرہ سے پوشیدہ نہ تھا۔ دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیم ہی کے بنائے ہوئے کنوئیں نہیں تھے بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کئے ہوئے بھی موجود تھے (دیکھو سفر تکوین باب ۲۶ درس ۱۸ لغایت ۲۲) ہمارے نزدیک اُس عبارت کے معنی جو عیسائی مصنفوں نے قرار دیئے ہیں اُن سے زیادہ ترجیح اور صاف یہ ہیں کہ مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا کیونکہ بیر شبع کے اردگرد ایسی قومیں رہتی تھیں جو لڑاکا اور جھگڑالو تھیں اور ذرا سا رحم بھی ان کے دل میں نہ تھا۔ اس لئے حضرت ہاجرہ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہو گا جہاں اُن کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں اور ایسا مقام بلاشبہ وہ تھا جہاں عرب العاربہ کی قومیں رہتی تھیں۔ اور اس لئے کچھ شک نہیں رہتا کہ حضرت ہاجرہ نے اُس نواح میں جانے کا قصد کیا۔

جو ایک چھاگل پانی حضرت ابراہیم نے اُن کے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہو گا اور رستہ میں متعدد جگہ سے جہاں کہیں پانی دستیاب ہوا ہو گا۔ حضرت ہاجرہ نے بھر لیا ہو گا۔ لیکن جب وہ بیابانِ فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہو گی۔ کیونکہ اُس بیابان میں پانی نہایت کمیاب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ اُس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے تو اُن کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا اور حضرت اسمٰعیل تشنگی کے سبب سے ضعیف اور قریب

مرگ ہو گئے ہوں گے اور حضرت ہاجرہ نہایت تشویش اور اضطراب کی حالت میں اِدھر اُدھر پانی تلاش کرنے کو دوڑتی پھرتی ہوں گی۔ یہ بیان ایسا صاف ہے جس میں کوئی امر خلاف قیاس یا خلاف فطرت انسانی نہیں ہے۔

خانہ بدوش عرب پانی کے چشمہ کو جو اُن کو جنگل میں ملتا تھا جھانکڑ وغیرہ ڈال کر مٹی سے چھپا دیتے تھے تاکہ اُن کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ ملے اور یہ رسم پانی کے کمیاب ہونے سے اُن میں جاری تھی اور اب تک جاری ہے۔

یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ اسی طرح عربوں نے اُس چشمہ کو جو اُس مقام پر تھا۔ جہاں اب چاہ زمزم واقع ہے چھپا دیا ہوگا۔ کیونکہ لفظ "بیر" عبری میں چشمہ آب کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ان تمام حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ہاجرہ مضطربانہ اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں تو اُن کو وہ چشمہ مل گیا۔ توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے " وخدا چشمان اورا کشادہ کرد و چاہ آبے وید ورروانہ شدہ مطہرہ را از آب پرکردہ وپسر نوشانید" (سفر تکوین باب ۲۱ درس ۱۹) عربی روایتوں میں اس واقعہ کو اس طرح پر تعبیر کیا ہے کہ ایک فرشتہ نے اُس مقام پر اپنے بازو یا پاؤں سے ایک گڑھا کر دیا جس میں سے پانی نکل آیا۔ یہ بیان اُسی قسم کا ہے جیسا کہ مذہبی روایتوں کو ایک عظمت دینے کے لئے ہوتا ہے مگر جو اصلی واقعہ ہے وہ اس سے صاف پایا جاتا ہے۔

بخاری کی حدیث ہم نے اوپر نقل کی ہے اور اُس کو بجائے پیغمبر کی حدیث ہونے کے ایک قومی اور ملکی روایت کا درجہ دیا ہے اُس سے بھی اُتنی بات کہ حضرت ہاجرہ جب اُس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ ہے تو پانی ختم ہو چکا اور حضرت اسمٰعیل تشنگی سے قریب المرگ ہو گئے تو وہاں اُن کو چشمہ مل گیا۔ بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ پس یہ ایک ایسی روایت ہے جس کو ایام جاہلیت کے عربوں نے ہمیشہ مستند تسلیم کیا ہے اور باوجودیکہ وہ لوگ بے شمار قوموں اور فرقوں میں جو ایک دوسرے کے مخالف تھے اور ہر ایک کا مذہب اور اعتقاد بھی جُداگانہ تھا منقسم ہو گئے تھے۔ اس پر بھی مذکورہ بالا امر میں سب متفق تھے۔ اس لیے ہم اُس روایت کو جھوٹی اور موضوع نہیں خیال کرتے خصوصاً اس صورت میں کہ توریت مقدس کے متعدد مقامات سے بھی اُس کی تصدیق ہوتی ہے۔

بہرحال حضرت ہاجرہ نے اُس مقام پر جہاں اُن کو پانی کا چشمہ ملا تھا رہنا شروع کیا جب اور لوگوں کو اس چشمہ کی خبر ہوئی تو بنی جرہم کے بہت سے لوگ اُس کے قرب وجوار میں آکر آباد ہوئے۔

بخاری نے حضرت اسمٰعیل کے نکاح کرنے کی بابت ایک روایت لکھی ہے جس کو ہم بجنسہ ذیل میں لکھتے ہیں۔

(قال ای ابن عباس) فمر ناس من جرھم ببطن الوادی فاذا ھم بطیر کانھم انکروا ذلک وقالوا ما یکون الطیر الا علی ماء فبعثوا رسولھم فنظر فاذا ھو بالماء فاخبرھم فاتوا الیھا فقالوا یا ام اسمٰعیل اتاذنین لنا ان نکون معک او نسکن معک فبلغ ابنھا فنکح فیھم امراۃ قال ثم انہ بدا لابراھیم فقال لاھلہ انی مطلع ترکتی قال فجاء فسلم فقال این اسمٰعیل فقالت امرتہ ذھب یصید قال قولی لہ اذا جاء غیر عتبۃ بیتک فلما جاء اخبرتہ فقال انت ذلک فاذھبی الی اھلک قال ثم انہ بدا لابراھیم فقال لاھلہ انی مطلع ترکتی فجاء فقال این اسمٰعیل فقالت امرتہ ذھب یصید فقالت الا تنزل فتطعم وتشرب فقال وما طعامکم وما شرابکم قالت طعامنا اللحم وشرابنا الماء قال اللھم بارک لھم فی طعامھم وشرابھم قال فقال ابو القاسم برکۃ بدعوۃ ابراھیم (صلی اللہ علیھما وسلم) قال ثم انہ بدا لابراھیم فقال لاھلہ انی مطلع ترکتی فجاء فوافق اسمٰعیل من وراء زمزم یصلح نبلا لہ فقال یا اسمٰعیل ان ربک امرنی ان ابنی لہ بیتًا قال اطع ربک قال امرنی ان تعیننی علیہ قال اذا فعل او کما قال فقاما فجعل ابراھیم یبنی واسمٰعیل ینا ولہ الحجارۃ ویقولان ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم قال حتّٰی ارتفع البناء وضعف الشیخ عن نقل الحجارۃ فقام علی حجر المقام فجعل ینا ولہ الحجارۃ ویقولان ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم + بخاری کتاب الانبیاء۔

یہ روایت بھی اُنھیں وجوہات سے جو ہم نے بخاری کی پہلی حدیث کی نسبت بیان کی ہیں ایک ملکی روایت کی مانند ہے نہ کہ پیغمبر صاحب کی فرمائی ہوئی حدیث کی مانند۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل نے ایک عورت سے نکاح کر لیا اور اُس کے بعد جب حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل سے ملنے کو آئے تو اُس عورت سے نکاح کرنے کو ناپسند کیا اور طلاق دے دینے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل نے اُس کو طلاق دیدی اور وہاں کے نو آباد لوگوں

میں سے ایک اور عورت سے نکاح کر لیا۔ اُس کے بعد جب دوسری دفعہ حضرت ابراہیم اُن سے ملنے کو آئے تو اس عورت سے نکاح کرنے کو پسند کیا۔

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی دونوں بیبیاں بنی جرہم کی قوم سے تھیں مگر توریت مقدس سے پایا جاتا ہے کہ اُنھوں نے پہلی دفعہ ایک مصری عورت سے نکاح کیا تھا۔

ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں جو پہلی بیوی کا بنی جرہم سے ہونا بیان کیا گیا ہے صحیح نہیں ہے۔ غالباً پہلی بیوی ایک مصری عورت تھی اور یہی وجہ ہوگی کہ حضرت ابراہیم نے اُس عورت سے نکاح کرنا ناپسند کیا ہوگا۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بنی جرہم نے ابتدا میں اپنی قوم کی بیٹی کو حضرت اسمٰعیل کے نکاح میں دینے سے تامل کیا ہوگا کیونکہ وہ حضرت اسمٰعیل کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے۔ مگر باہم سکونت پذیر ہونے سے وہ خیال جاتا رہا ہوگا اور اس لیے یقین ہوتا ہے کہ اُن کی دوسری بیوی بنی جرہم کی قوم سے تھیں۔

قرآن مجید میں بنسبت تعمیر خانہ کعبہ کے یہ آیت موجود ہے: "واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم" (سورۃ البقرہ آیت ۱۲۱) اور اس سے ثابت ہوتا ہے اور تمام قومی روایتوں سے یقیناً متحقق ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے خانہ کعبہ کو بنایا تھا۔

قرآن مجید کی رو سے بغیر کسی شک کے ہم مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل پیغمبر تھے اور خدا نے اُن کو مثل حضرت ابراہیم ان کے باپ کے وحی بھیجی اور اپنی مرضی ظاہر کرنے کے لئے مبعوث کیا تھا تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت کی طرف ہدایت کریں۔ توریت مقدس میں جو وعدہ کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسمٰعیل کی بنسبت کیا تھا۔ وہ اس طرح پر مندرج ہے "و در حق اسمٰعیل ترا شنیدم اینک اورا برکت دادہ ام و اورا بارور گردانیدہ بغایت زیاد خواہم نمود و دوازدہ سرور تولید خواہد نمود و اورا امت عظمٰی خواہم نمود" (سفر تکوین باب ۱۷ ورس ۲۰) یہ وعدہ پورا ہوا اور آخیر تک پورا ہوتا چلا آیا۔

عیسائی مصنف اس وعدہ کے ہونے کی بنسبت تو کچھ کلام نہیں کر سکتے۔ مگر از راہ مکابرہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ جسمانی یعنی دنیوی طرز کا وعدہ تھا نہ روحانی طرز کا۔ اگرچہ یہ اُن کا کہنا صریح غلط ہے مگر اس مقام پر ہم اس مسئلہ پر بحث نہیں کرنے کے بلکہ آئندہ خطبہ میں جس میں کہ محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے معبوث ہونے کی بشارات کا توریت اور انجیل میں موجود ہونا بیان کریں گے اسی خطبہ میں اس امر پر بھی بحث کریں گے۔

ایک اور روایت عموماً لوگوں میں مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسمٰعیل کی قربانی کر ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے زیادہ تر تقویت اُس روایت کو ہوتی ہے جس میں حضرت اسحٰق کی قربانی کرنے کے حکم ہونے کا ذکر ہے اور اس اختلاف کا جو سبب ہے وہ ہم آگے بیان کریں گے۔

حضرت ابراہیم نے جو اپنے بیٹے کی قربانی کرنے کا ارادہ کیا اُس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے۔ ”قال یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری قال یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین ہ فلما اسلما وتلہ للجبین و نادیناہ ان یا ابراہیم ٭ قد صدقت الرویا انا کذالک نجزی المحسنین ہ ان ھذا لھو البلاء المبین ہ و فدیناہ بذبح عظیم ہ (سورہ الصافات آیت ۱۰۱ لغایت ۱۰۷)

قرآن مجید میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم تھا یا حضرت اسمٰعیل کی نسبت اور نہ کسی معتبر اور مستند حدیث سے اس کی تفصیل پائی جاتی ہے۔

بعض مسلمان مؤرخوں کا قول ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم تھا اور بعض کا قول ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیل کی نسبت تھا۔ یہ اختلاف توریت مقدس کی اُس آیت کے مبہم اور غیر مصرح ہونے کی وجہ سے ہے۔ جس میں اُس مقام کا ذکر ہے۔ جہاں مذکورہ بالا قربانی کا عمل میں آنا تجویز ہوا تھا اور وہ آیت یہ ہے ”خدا ابراہیم را امتحان نمود و با و گفت اے ابراہیم وا و گفت اینک حاضرم و خداوند گفت کہ حال پسر یگانہ خود اسحٰق را کہ دوست می داری بگیر و بزمین موریا[1] برو (عربی ترجمہ

[1] موریا کے معنی ہیں تلخئے خدا یا حکم خدا یا خوف خدا اور نیز اور شلیم کے اُس پہاڑ کا نام ہے جس پر بیت المقدس تعمیر ہوا تھا اور جس پر بالفعل حضرت عمر کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے۔ اسی مقام کو عموماً وہ مقام خیال کرتے ہیں جہاں کہ حضرت ابراہیم کو اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسحٰق کی قربانی کرنے کا حکم ہوا تھا گو کہ اس بات کے فرض کرنے میں بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ توریت سامری سفر تکوین باب ۲۲ ورس ۲ میں بجائے موریا کے سرزمین مرہ لکھا ہے جیسا کہ انگریزی ترجمہ میں ہے اور مرہ کی نسبت لوگوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ وہی مرہ ہے جو شکم کے قریب تھا اور جہاں حضرت ابراہیم پہلے رہا کرتے تھے (سفر تکوین باب ۱۲ ورس ۷) اور وہ پہاڑ جس پر ان کا معبد بنا تھا ”جزیم“ تھا اور یہ اخیر رائے کسی قدر لحاظ کے قابل ہے۔ اگر یہ متحقق ہو جائے کہ قوم سامری نے اس مقام کو اپنی حدود کے اندر لانے کے واسطے اس ورس میں کچھ تحریف نہیں کی ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں بجائے لفظ "موریاہ" کے "ارض الرویا" لکھا ہے اور توریت سامری کے عربی ترجمہ میں "ارض المختار المرشدہ" لکھا ہے) دوراں جا او را دریکے از کوہ ہائے کہ بہ تو می گویم از برائے قربانی وسوختنی تقریب نما" (سفر تکوین باب ۲۲ ورس او ۲) بعض مسلمان مصنفوں نے اس گم نام جگہ کو بیت المقدس اور اُس کے پہاڑ قرار دیئے ہیں اور بعض نے مکہ معظمہ کے قریب کے پہاڑ۔ جو لوگ اُس مقام کو مکہ معظمہ کے پہاڑ قرار دیتے ہیں وہ اپنی رائے کی تائید میں بیان کرتے ہیں کہ عبری لفظ "ہریم" ۱٦٦ جس کے معنی جبال کے ہیں تثنیہ اور جمع دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس لئے وہ استدلال کرتے ہیں کہ اُس نے مکہ معظمہ کے مشہور دو پہاڑوں صفا اور مروہ میں سے ایک مراد ہے۔

توریت مقدس میں اسی باب کی چودھویں آیت میں یہ لکھا ہے "ابراہیم اسم آں مکان را یہواہ یراہ گذاشت کہ تا امروز ش چنیں ہم ہی خانند در کوہ خداوند نمایاں است" مسلمان مورخوں کے نزدیک یہ مقام وہ ہے جو مکہ معظمہ کے پاس واقع ہے اور آج تک عرفات کے نام سے مشہور ہے۔ پس جو لوگ اُس قربان گاہ کو مکہ معظمہ میں قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قربانی کا حکم حضرت اسمٰعیل کی نسبت ہوا تھا۔ اور جو لوگ اس قربان گاہ کو بیت المقدس میں قرار دیتے ہیں وہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم ہونا کہتے ہیں جیسے کہ مسعودی نے لکھا ہے جس کی عبارت یہ ہے۔

وقد تنازع الناس فی الذبیح فمنهم من ذهب الی انه اسحٰق ومنهم من رأی انه اسمٰعیل فان کان الامر بالذبح وقع بمنی فالذبیح اسمٰعیل لان اسحٰق لم یدخل الحجاز وان کان الامر بالذبح وقع بالشام فالذبیح اسحٰق لان اسمٰعیل لم یدخل الشام بعد ان حمل منه۔ مروج الذهب مسعودی۔

مگر ذی علم مسلمان عالموں کا صاف بیان ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم ہوا تھا نہ کہ حضرت اسمٰعیل کی نسبت اور یہی امر مندرجہ ذیل حدیث سے بھی پایا جاتا ہے۔

عن محمد ابن المنتشر قال ان رجلا نذر ان ینحر نفسه ... (فقال له مسروق) لا تنحر ...

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: بیر شبع سے اس مقام کا فاصلہ ترجمہ سامری کا کسی قدر موید ہے کیونکہ بیر شبع مرہ تک پورا تین روز کا رستہ ہے مگر بیر شبع اور بیت المقدس کے درمیان فاصلہ بہت قلیل ہے بشرطیکہ راستہ میں کوئی امر حارج نہ ہو گیا ہو مسلمان دعوی ہیں کہ اس واقعہ کا موقعہ وہ ہے جہاں کہ زمانہ مابعد میں ان کا مشہور و معروف معبد بمقام مکہ بنایا گیا تھا اور اس معاملہ میں اور نیز دیگر معاملات میں وہ حضرت اسحاق کی جگہ حضرت اسمٰعیل کو بتلاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہودی، سامری، مسلمان سب اپنے اپنے معبدوں کے موقعوں کو حضرت ابراہیم کے ایمان کی آزمائش یا امتحان کے مقام ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ (بائبل سائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۲۴۰)

واشتر کبشا فاذبحه للمساکین فان اسحٰق خیر منك وفدی بکبش ... (رواہ ابن رزین مشکوٰۃ)

اس حدیث میں مسروق کا صاف قول ہے کہ حضرت اسحٰق قربان ہونے والے تھے۔

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے تھے۔ نبایوث נביות قیدار קדר ادبئیل אדבאל و یسام מבשם مشماع משמע دوماہ דומה مسا משא حدر חדד تیما תימא یطور יטור نافیش נפיש قیدماہ קדמה۔

نبایوث۔ یہ شخص شمالی مغربی حصۂ عرب میں آباد ہوا۔ ٹھیک مقام اس قوم کے آباد ہونے کا نقشہ مرتبہ ریورنڈ کاٹیری پی کیری ایم۔ اے میں مابین ۲۸ و ۳۰ درجات عرض بلد شمالی، ۳۶ و ۳۸ درجات طول بلد شرقی میں واقع ہے۔ ریورنڈ فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ قوم عرب الحجر کے وسط سے لے کر مشرق کی جانب اور وادی القریٰ کے اندر تک اور جنوب کی طرف کم از کم منتہائے خلیج عیلام اور حدود حجاز تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسطرابو اس سے بھی زیادہ وسیع قطعہ اُن کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ وہ دو مقاموں کا ذکر کرتا ہے جو خلیج عرب پر واقع ہیں اور جن سے صریح ظاہر ہے کہ ان کی مملکت کی وسعت جنوبی اور غربی سمت میں مدینہ کی عرض بلد پر منتہی ہوتی تھی اور یہ دو مقام شہر و بندرگاہ تھیں۔ بندرگاہ سفید جو ینبوع کی شمال میں ہے اور خود بندرگاہ ینبوع ہیں۔ ریورنڈ فارسٹر کہتے ہیں کہ اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم صرف پتھریلے بیابان عرب ہی میں نہیں بلکہ صوبجات عظیم حجاز اور نجد کے اندر تک بھی پھیلی ہوئی تھی۔

ممکن ہے کہ یہ قوم وقتاً فوقتاً اس وسیع ملک میں پھیل گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ کتاب اشعیاہ نبی کے مندرجہ ذیل ورس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک نامی اور زبردست قوم تھی اور ورس یہ ہے "تمامی گوسفنداں قیداز نزد تو گرد آمدہ تو جہاے نبایوث بکارت خواہند آمد و برند بحم برضامندی برخواہند آمد و خانۂ جلال خود را جلیل خواہم کرد" (کتاب اشعیاہ باب ۶۰ ورس ۷)

قیدار۔ یہ شخص بنی بنت کی جنوب کی طرف گیا اور حجاز میں آباد ہوا۔ زبور داؤد۔ کتاب اشعیاہ۔ ارمیاہ۔ حزقیل وغیرہ میں اس قوم کی عظمت و شوکت کی بے شمار شہادتیں ہیں اسی قوم میں سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اُن کی بعثت سے خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر ظاہر ہوئی۔ اُن کی ذات پاک کے سود مند اثروں سے رفتہ رفتہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر خدا کی برکت اور خدائے واحد کی عبادت پھیل گئی اور اب تک پھیلتی جاتی ہے۔ عربوں اور مشرقی اقوام کے ہاں بے شمار روایتیں اس قوم کے باب میں موجود ہیں۔

مگر ہم اس مقام پر اس روایت کا بیان کرنا چاہتے ہیں جس کو رورنڈ مسٹر فارسٹر نے مستند تسلیم کیا ہے۔

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ "اشعیاہ نبی کے کلام سے (جو اوپر مذکور ہے) جو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قیدار کی خیمہ گاہ اس اخیر حصہ ملک میں تلاش کرنی چاہیئے۔ اس کی کماحقہ تصدیق اسی نبی کے کلام کے ایک اور مقام سے بھی ہوتی ہے یعنی ارض قیدار کے بیان سے جس کو ہر شخص جو جغرافیۂ عرب سے واقف ہوگا پہچان لے گا کہ اس قطعہ حجاز کا نہایت صحیح بیان ہے جس میں نامی شہر مکہ اور مدینہ واقع ہیں۔ جس شخص کو زیادہ ثبوت اس مشابہت کا درکار ہو تو اس کو حجاز کا جغرافیہ جدیدہ معائنہ کرنا چاہیئے۔ جہاں کہ ینبوع کے قریب شہرہائے الخیبر اور بنت جو اسمائے معرفہ قیدار اور نبایوث کی باقاعدہ عربی شکلیں ہیں خط حد کنندہ آج تک چلا آتا ہے اور کسی قدر معنی رکھتا ہے۔

اس کے بعد رورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ یہاں تک تو ہم نے قیدار کے آثار جغرافیۂ قدیمہ کی استعانت سے دریافت کئے ہیں اب یہ دیکھنا رہا ہے کہ یونانی اور رومی بیانات کا عربی روایتوں سے مقابلہ کرنے میں کس قدر ثبوت کی زیادتی حاصل ہوتی ہے کیونکہ محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر موید شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے اُن کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریح غیر ممکن ہے۔ خود عربوں کے ہاں زمانہ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیدار اور اُس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے تھے اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے۔ ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور خود محمد (صلعم) نے ۔۔۔۔ اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعووں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسمٰعیل کی اولاد میں قیدار کے سلسلہ سے تھے۔ ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایہ کو پہنچ جاتا ہے جب کہ اُس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے اُن بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کا اسی حصہ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری جانب۔ اریانوس بطلیموس پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیدری۔ درائی۔ کدرون تائی یا کدیتی کی موجودگی کی غیر مشتبہ اور ناقابل اشتباہ امر سے اُس کی تصدیق ہوتی ہے (جغرافیہ تاریخی جلد اول صفحہ ۲۴۸)۔

ادبیل۔ مشرقی مؤرخوں نے اس شخص کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر کا بیان

ہے کہ کتب مقدسہ میں صرف ایک مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور اُنھوں نے جوسفس کی سند پر بیان کیا ہے کہ ادبئیل کا ابتدائی مقام سکونت اُس کے بھائیوں کے قرب وجوار میں تھا۔ اس قدر بیان کے صحیح ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب وہ اُس کے آثار دریافت کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں اور مقاموں کے ناموں میں صرف چند حرف کی مشابہت ہونے سے اُس کے آثار قرار دیتے ہیں تو اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

مبسام۔ حال کے جغرافیہ اور عرب کی تاریخ میں اس شخص کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر کا بھی بیان ہے کہ اس اسمٰعیلی کے نام ونسل کے آثار بہ نسبت اس کے اور بھائیوں کے کمتر اور ضعیف تر ہیں۔ پورا نام نہ قدیم جغرافیہ عرب میں پایا جاتا ہے اور نہ جدید جغرافیہ میں۔

مشماع۔ مشرقی تاریخوں میں اس شخص کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اگر رورنڈ مسٹر فارسٹر کی یہ بات تسلیم کی جائے کہ سفر تکوین اور تواریخ الایام کا مشماع اور یونانی توریت کا مسما اور جوسفس نے جس کو مسماوس اور بطلیموس نے مسی مانیس اور عربوں نے بنی مسما لکھا ہے اس سے ایک ہی شخص مشماع مراد ہے تو یہ کسی قدر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کا ابتدائی مقام سکونت نواح نجد میں تھا۔

دوماہ۔ اس شخص کی اولاد اول تہامہ کے جنوب میں مدینہ کے قرب وجوار میں آباد ہوئی مگر جب کہ اُس کی اولاد بڑھ گئی تو نقل مکان کرنے کے لئے مجبور ہوئی۔ اور اس مقام پر آباد ہوئی۔ جہاں کہ بالفعل دومۃ الجندل واقع ہے شام اور مدینہ کے درمیان اور بہت سے مقامات ہیں۔ جن کے نام اس شخص کے نام پر ہیں۔ رورنڈ فارسٹر بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور مشرقی مؤرخوں کا بھی یہی قول ہے جس کی سند ذیل میں درج ہے۔

دومۃ الجندل۔۔۔ وقد جاء فی حدیث الواقدی دوماہ الجندل وعدھا ابن السقفیہ من اعمال المدینۃ سمیت بدوم ابن اسمعیل بن ابراھیم وقال الزجاجی دومان ابن اسمٰعیل وقیل کان لاسمعیل ولد اسمہ دما لعلہ مغیرہ منہ وقال ابن الکلبی دوماہ بن اسمعیل قال ولما کثر ولد اسمعیل عمر بالتھامتہ خرج دوماہ بن اسمٰعیل حتی نزل موضع دومۃ وبنی لہ حصنا فقیل دوماہ ونسب الحصن الیہ ۔۔۔ قال ابوعبید السکرنی دومۃ جندل حصن وقری بین الشام والمدینہ قرب جبلی طی ۔۔۔ ودومۃ من القریات من وادی القری ۔۔ معجم البلدان۔

مسا۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے کہنے میں کہ اس شخص کی اولاد عراق عرب (الجزیرہ)

میں آباد ہوئی تھی بلا شبہ غلطی کی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ قوم یمن میں آباد ہوئی اور اس امر کی تائید "موسا" کے نام سے ہوتی ہے جو اب تک یمن میں موجود ہے۔ یہ مقام پی کیری صاحب کے نقشہ کے بموجب ۱۳ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۴۳ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض بلد شرقی میں واقع ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ابتداءً نواح حجاز میں متوطن ہوئی تھی مگر اُس مقام کی تنگی کے باعث بعد کو یمن میں چلی گئی جو بوجہ اپنی بے انتہا شادابی اور بکثرت پیداوار کے ملک حجاز پر بدرجہا فوقیت رکھتا تھا۔

حدر۔ تواریخ الایام میں اس کو "حدد" لکھا ہے۔ اس شخص نے جنوبی سمت اختیار کی اور حجاز میں آبسا۔ اس امر کی تصدیق بے شمار بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے ہوتی ہے۔ ایک مسلمان مورخ "الزہیری" "حدو" کو منجملہ اُن بے شمار قوموں کے جن میں عرب کے باشندے منقسم تھے بالتصریح بیان کرتا ہے۔ یمن میں شہر حدیدہ اور بنی حدو کا موجود ہونا صریح ہمارے بیان کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔

تیما۔ حضرت اسمٰعیل کے پہلے دو بیٹوں کے بعد باعتبار شہرت کے تیما کا درجہ ہے۔ اس شخص کا ابتدائی مقام سکونت صوبہ حجاز تھا لیکن کسی نہ کسی زمانہ میں اُس کی اولاد تمام وسط نجد میں پھیل گئی اور بعض اُن میں سے خلیج فارس کے ساحل کے برابر برابر منتشر ہو گئے مگر ہم کو حضرت موسیٰ کے کلام کی تصدیق جس سے حضرت اسمٰعیل کے بیٹوں کی ابتدائی آبادی کی جگہ پائی جاتی ہے منظور ہے تو ہم کو اسی مقام کی تحقیق اور تدقیق پر جہاں کہ اُن میں سے ہر ایک شخص نے ابتداءً سکونت اختیار کی تھی۔ زیادہ تر توجہ مبذول کرنی چاہیے نہ اس جگہ کی نسبت جہاں کہ اُن کی اولاد بعد کو جا بسی۔

یطور۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں۔ کہ اس بات پر یقین کرنے کے واسطے کامل دلیل ہے کہ اس قوم کا ابتدائی مقام سکونت ضلع "بدور" تھا۔ جبل نایفرن کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق اور شاہ راہ حجاج کے مغرب میں۔

نافیش۔ مشرقی مورخ کچھ نہیں بیان کرتے کہ اس شخص نے کہاں سکونت اختیار کی تھی۔ مگر ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اس کی اولاد سے ایک قوم عرب کا وادی القریٰ میں موجود ہونا حضرت موسیٰ اور مصنف تواریخ الایام اور جوسفس کی سہ گانہ شہادت سے بلاشک و اشتباہ

متحقق ہے۔

قید ماہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ملک یمن کی نواح میں آباد ہوا۔ کیونکہ مسعودی کا قول ہے کہ ایک قوم موسوم بہ "قدمان" یمن میں تھی۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے۔

اصحاب الراس کانوا من ولد اسمعیل وھم قبیلتان یقال لاحدھما قدمان وللاخری یامین وقیل رعویل وذلک بالیمن۔ مروج الذہب مسعودی۔

رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے خیال کرنے میں عجیب غلطی کی ہے کہ "کاظمہ" جو خلیج فارس پر واقع ہے اور جس کا ذکر ابوالفدا نے کیا ہے اسی قید ماہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

تمام تلاش اور تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد کے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی اُس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا۔ کہ اُن کے آثار یمن۔ (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں اور اس طرح پر حضرت موسیٰ کے اُس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ میں مندرج ہے کہ "وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے جو سامنے مصر کے ہے جب کہ تو اسریا کو روانہ ہو"۔

حضرت اسمٰعیل ۲۰۹۴ء دنیوی مطابق ۱۹۱۰ قبل حضرت مسیح کے پیدا ہوئے تھے۔ اور گھر سے نکالے جانے کے وقت اُن کی عمر سولہ برس کی تھی۔ اگر اس مدت عمر پر بیس برس اور اضافہ کئے جاویں تو ہمارے نزدیک حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کی ولادت کے واسطے کافی مُدت ہوگی۔ پس ہم اس بات کو کہہ سکتے ہیں کہ ۲۱۳۰ء دنیوی یا ۱۸۷۴ قبل مسیح تک ان کا کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔

ان بارہ بیٹوں نے کوئی اور بڑی شہرت حاصل نہیں کی بجز اس کے کہ عرب کی بارہ مختلف قوموں کے مورث ہوئے اور اسی باعث سے یہ قومیں مختلف شعبوں اور فرقوں میں منقسم نہیں ہوئیں بلکہ یکساں حالت میں رہیں۔ مگر ایک مدت مدید کے بعد عدنان کی اولاد جو قیدار ابن اسمٰعیل کی نسل میں تھا مختلف شعبوں میں متفرق ہو گئی اور کارہائے نمایاں سے شہرت حاصل کی۔

مشرقی مؤرخ متفق الرائے ہیں عدنان کے دو بیٹے تھے "معد" اور "عک"۔ عک کی نسبت اُن کا صرف اس قدر بیان ہے کہ وہ یمن کو چلا گیا۔ مگر اُن کتبوں سے جن کو رورنڈ مسٹر فارسٹر نے عاد کی قوم کے کتبوں سے موسوم کیا ہے اور جو حضر موت میں بمقام "حصن غراب" دریافت

ہوئے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے کچھ عرصہ تک اُس ملک میں بادشاہی کی تھی - یہ کتبے مذکورۃ الصدر مقام میں ۱۸۳۴ء میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز مسمی "پالی نورس" کے افسروں نے دریافت کئے تھے۔ ان کتبوں کا پورا پورا بیان مع کتبوں کی نقل کے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل کی تیسری جلد میں ملے گا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے پایا جاتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں "عک" وہاں کا فرماں روا تھا۔

اس شاعرانہ کتبہ کی ٹھیک ٹھیک تاریخ قائم کرنے کی غرض سے ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ "عک" عدنان کا بیٹا تھا اور بموجب حدیث حضرت اُم سلمہ کے جو آنحضرت صلعم کے ازواج مطہرات میں سے تھیں عدنان حضرت اسمٰعیل سے چوتھی پشت میں تھا جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کتبہ مصر کے قحط سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے لکھا گیا ہوگا۔ لیکن ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس میں بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس بات کے ثبوت میں کوئی کافی سند پیش نہیں کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے عدنان کا حضرت اسمٰعیل کی چوتھی پشت میں ہونا کبھی بیان کیا تھا۔ انساب کی معتبر روایتوں کے بموجب عدنان آنحضرت صلعم سے بائیس پشت پہلے تھا اب ایک پشت کی قدرتی میعاد پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عک انتالیسویں صدی دنیوی میں یا دوسری صدی قبل حضرت مسیح میں ہوگا۔

وائلہ ملقب بہ کلیب ابن ربیعہ بھی جو عدنان کی اولاد میں تھا بادشاہ ہوا تھا اور یمن والوں سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا۔

زہیر ابن جذیمہ اور نیز قیس ابن زہیر بھی باری باری سے حجاز کے بادشاہ ہوئے تھے مگر ان لوگوں کی تاریخیں معین کرنے کے واسطے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے اس لئے ہم کسی قدر تیقن کے ساتھ تاریخیں قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن خیال کرتے ہیں کہ یہ وہی زمانہ ہوگا جب کہ سلطنت یمن اور اور سلطنتیں حالت زوال میں تھیں۔

عدنان کی نسل میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۴۵۷۰ دنیوی یا ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور تمام جزیرہ نمائے عرب پر دینی اور دنیوی حکومت حاصل کی۔ عیسائی مصنفوں نے آنحضرت صلعم کے نسب نامہ کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اُس کو غیر ثبت قرار دینے کے لئے سعی بے حاصل کی ہے اور یہ مناسب موقع تھا کہ ہم بھی اس بحث میں شامل ہوتے اور عیسائی مصنفوں کے ہر ایک اعتراض کی تردید کرتے۔ لیکن چونکہ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مضمون پر ایک

جداگانہ خطبہ لکھیں گے۔ اس لئے بالفعل اس بحث کا ملتوی کردینا مناسب ہے۔

دوم۔ ابراہیمی یا بنی قطورہ

توریت مقدس میں لکھا ہے "ودیگر ابراہیم زنے گرفت کہ اسمش قطوراہ بود وبرایش زمران ولقشان ومدان ومدیان ویشباق وشرح رازائید ویقشان شبا ودوان را تولید نمود وپسران ددان اشوریم ولطوشیم ولومیم بودند وپسران مدیان عیفاہ وعیفروحنوک وابیداع والداعاہ بودند تمامی ایشاں پسران قطوراہ بودند۔ پس ابراہیم تمامی مایملک خودرا بہ اسحٰق داد" (سفر تکوین باب ۲۵ ورس الغایت ۵)

یہ سب لوگ عرب کو چلے گئے اور اُس قطعہ میں آباد ہوئے جو حدود حجاز سے خلیج فارس تک منتہی ہوتا ہے اور اُن کے نشانات اب تک جو اُس ملک میں واقع ہیں پائے جاتے ہیں۔

انہی ابراہیمیوں میں سے حضرت شعیب نبی کو خدا تعالیٰ نے اقوام عائکہ اور مدیان کو اپنی خالص عبادت کی تلقین اور ہدایت کرنے کے واسطے مبعوث کیا تھا۔

مگر ہم ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ یہ نبی کس زمانے میں ہوئے تھے لیکن اگر ہم یثرو کاہن مدیان کو جن کا ذکر سفر خروج باب ۱۸ ورس ۱ و ۲ میں ہے اور شعیب کو ایک ہی شخص خیال کریں جیساکہ عرصہ دراز سے لوگوں کو گمان ہے تو البتہ یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ یہ نبی اُس وقت میں تھے جب کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے تھے۔

سوم۔ ادومی یا بنی عیسو

عیسو یعنی ادوم کی تین بیویاں تھیں۔ عاداہ۔ اہلیباماہ۔ باسمث۔ دختر حضرت اسمٰعیل وخواہر نبایوث۔ پہلی بیوی سے "الی فز" پیدا ہوا۔ دوسری بیوی سے یعوشس اور یعلام اور قورح پیدا ہوئے۔ تیسری سے رعوئیل پیدا ہوا۔ الی فز کے بیٹے تیماں۔ اومر۔ سفو۔ گعتم۔ قنز۔ عمالیق تھے۔ رعوئیل کے بیٹے۔ نحث۔ زرح۔ شماہ۔ مزاہ پیدا ہوئے (سفر تکوین باب ۳۶)

عیسو کی تمام اولاد قریبًا قریبًا کوہ سیعیر کے قرب وجوار میں آباد ہوئی تھی۔ بعض نے ان میں سے اپنی سکونت عرب الحجر میں اور حجاز کی شمالی سرحد پر اختیار کی تھی۔ مگر ان لوگوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ اسی وجہ سے بعض مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ عیسو کی اولاد کبھی عرب میں آباد

نہیں ہوئی۔

چہارم۔ بنی ناحور

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ "عوض" اور "بوز" (دیکھو سفر تکوین باب ۲۲ ورس ۲۱) پسران ناحور برادر ابراہیم شمالی عرب کی بے شمار قوموں کے مورث تھے اور اس کی سند میں کتاب ایوب باب اورس ا اور نیاحات یرمیاہ باب ۴ ورس ۲۱ یرمیاہ باب ۲۵ ورس ۲۰ کا حوالہ دیتے ہیں۔

پنجم۔ بنی ہاران

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "یہ قوم بہ نسبت دیگر اقوام متذکرہ بالا کے سب سے زیادہ شمال کی جانب رہتی تھی۔ اُن کے نہایت جنوبی مقامات بحر لوط (ڈیڈ سی) کے مشرق میں واقع تھے۔ اور اُن میں عمدہ سبزہ زار "بلکار" اور "کرک" کے شامل تھے"۔

ہاران کے بیٹے حضرت لوط تھے۔ حضرت لوط کے بیٹے مواب اور بن عمی تھے۔ توریت مقدس میں اُن کے پیدا ہونے کا نہایت ناپاک واقعہ اس طرح پر لکھا ہے "ولوط از صوعر برآمد در کوہ ساکن شد و دو دختر انش بہ ہمراہش زیرا کہ از سکون در صوعر ترسید واو و دو دختر انش در مغارہ ساکن شدند۔ و دختر بزرگ بہ دختر کوچک گفت کہ پدر ما پیر شدہ و کسے در زمین نیست کہ موافق عادت کل زمین بما در آید۔ بیا پدر خود را شراب بنوشانیم و با او بخوابیم واز پدر خود نسلے را زندہ نگاہ داریم۔ پس دراں شب پدر خویشتن را شراب نوشانیدند و دختر بزرگ داخل شدہ با پدر خود خوابید واو نہ بوقت خوابیدنش و نہ بوقت برخاستنش اطلاع نام رسانید۔ و روز دیگر واقع شد کہ دختر بزرگ بہ دختر کوچک گفت کہ اینک دی شب با پدر خود خوابیدم امشب نیز اورا شراب بنوشانیم وتو داخل شدہ با او بخوابی واز پدر خود نسلے را زندہ نگاہ داریم۔ وآں شب نیز پدر خود را شراب نوشانیدند و دختر کوچک برخاستہ با او خوابید کہ او نہ بوقت خوابیدنش و نہ بوقت برخاستنش اطلاع بہم رسانید۔ و دو دختر لوط از پدر خود شان حاملہ شدند۔ و دختر بزرگ پسرے را زائید واسمش را مواب نامید کہ بحال پدر موابیان اوست۔ و دختر کوچک او نیز پسرے را زائید و اسمش را بن عمی نامید کہ تا بحال پدر بنی عموں اوست" (سفر تکوین باب ۱۹ ورس ۳۰ لغایت ۳۸)۔

حضرت لوط اور اُن کی بیٹیوں کی نسبت جو کچھ اس مقام میں لکھا ہے عیسائی اُس سب کو

قبول کرتے ہیں۔ اور یقین کرتے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنی صلبی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی۔ مگر ایسا یقین کرنا درحقیقت تضحیک کے قابل ہے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو کیا یہ ایک مقدس شخص کی تہذیب اور متانت کے متناقض نہیں ہے؟ اور کیا حضرت لوط جیسے پاک شخص کے خلاف شان نہیں ہے۔

مسلمان اس بات کو تسلیم نہیں کرتے اور قرآن مجید میں اگرچہ لوط کا قصہ ہے۔ مگر اُس میں یہ بات کہ اُنھوں نے اپنی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی مذکور نہیں ہے۔

توریت مقدس میں، جو کچھ بیان ہے اُس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں کہ جو معنی عیسائی مصنفوں نے لیے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ آٹھویں درس میں لوط کا قول لکھا ہے کہ "مرا دو دختر است کہ مردے را ندانستہ اند تمنا اینکہ ایشان را بہ شما بیروں آورم و با ایشاں آنچہ در نظر شما پسند است بکنید"۔

قرآن مجید میں اس جگہ تثنیہ کا لفظ نہیں ہے بلکہ جمع کا ہے جیسا کہ سورہ ہود میں ہے۔ "ھٰؤلاء بناتی ھن اطھر لکم" اور سورہ حجر میں ہے "قال ھٰؤلاء بناتی ان کنتم فاعلین" مسلمان عالموں کا قول مختار یہ ہے کہ لفظ "بنات" سے حضرت لوط کی صلبی بیٹیاں مراد نہیں ہیں۔ بلکہ قوم کی عورتیں مراد ہیں اور یہ بات حضرت لوط نے اس مراد سے کہی تھی۔ جیسے کہ وہ ہمیشہ اُن کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ تم اپنی خراب عادت فعل خلاف فطرت انسانی کو چھوڑ دو اور عورتوں سے نکاح کرو اور اُن کے ساتھ رہو کہ وہ تمھارے لئے پاکیزہ زندگی ہے۔

توریت مقدس میں اس مقام پر لفظ بنوث (בנות) آیا ہے جو بمعنی بنت کے ہے۔ مگر جس طرح عربی زبان میں بنت کا استعمال سوائے اصلی بیٹیوں کے اور عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عبری زبان میں بھی عام عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم اسمتھ کی عبرانی ڈکشنری میں لفظ "بث" اور "بنوث" کی نسبت لکھا ہے کہ وہ عام عورتوں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ کتاب امثال سلیمان باب ۳۱ درس ۲۹ میں استعمال ہوا ہے۔ پس اس مقام میں بھی اس لفظ سے اصلی بیٹیاں مراد نہیں ہیں عورتیں مراد ہیں بلکہ غالباً لونڈیاں۔ کیونکہ حضرت لوط کی جو بیٹیاں تھیں جیسے کہ سفر تکوین باب ۱۹ درس ۱۲ میں لکھا ہے ان کی شادیاں ہو چکی تھیں اور اُن کے شوہر موجود تھے۔

جب حضرت لوط سدوم سے فرار ہوئے تو ان کے داماد اور اُن کی بیٹیاں اُن کے ساتھ نہیں گئے صرف حضرت لوط کی بیوی اور وہی دو عورتیں جن کا اوپر ذکر ہوا نہ اور جن کو بیٹیاں

کرکے تعبیر کیا ہے اور جو غالباً لونڈیاں تھیں ساتھ گئی تھیں۔ رستہ میں اُن کی بیوی زندہ نہیں رہی صرف دو چھوکریاں اُن کے ساتھ تھیں۔

قرآن مجید میں اگرچہ اس مقاربت کا جو مغارہ کوہ میں اُن دونوں چھوکریوں نے حضرت لوط کے ساتھ کیا کچھ ذکر نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ کہ توریت مقدس میں لکھا ہے اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جاوے تو بھی اُن دونوں چھوکریوں کا حضرت لوط کی اصلی بیٹیاں ہونا اُسی وجہ سے جو ہم نے اوپر بیان کی قابل یقین نہیں ہے اور جب کہ وہ لونڈیاں تھیں تو اُن کے ساتھ مقاربت گو کہ وہ دھوکے ہی سے ہو بموجب اُس زمانہ کی شریعت کے ناجائز نہ تھی۔

سفر تکوین باب ۱۹ ورس ۳۲ و ۳۴ میں لکھا ہے کہ اُن دونوں چھوکریوں نے حضرت لوط کو باپ کہکر تعبیر کیا ہے۔ اس کہنے سے بھی اُن چھوکریوں کا اصلی بیٹیاں ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ باپ کا لفظ بہت زیادہ عام ہے۔ اور اُس کا اطلاق مالک اور بزرگ شخص پر عموماً ہوتا ہے۔

سر ولیم میور کے اِس بیان کو کہ بنی عمان عرب کے کسی حصہ میں آباد نہیں ہوئے۔ بلکہ شمال ہی میں رہے۔ ہم تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے نزدیک بنی عمان خلیج فارس کے برابر برابر بستے تھے اور ان کا نام اب تک اس حصہ عمان میں پایا جاتا ہے۔ جو تمام قطعہ کے درمیان موجود ہے۔ اگر بنی عمان عرب میں آباد نہیں ہوتے تھے جیسے کہ سر ولیم میور کی رائے ہے تو اُن کو اقوام عرب میں شمار کرنا مناسب نہ تھا۔

تمام عرب المستعربہ میں جو تارح کی نسل سے ہیں صرف بنی اسمٰعیل ہی کی کثرت ہوئی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد مختلف قوموں اور شعبوں میں منقسم ہو گئے۔ مگر اُن کے مقابل کی قومیں ایک سکون اور غیر متبدل حالت میں رہیں۔

جب کہ ہم ان قوموں کے شعبوں کا شمار اور حال بیان کریں گے تو یہ بات ظاہر ہو گی کہ ایک قوم کے کسی شخص کو اپنی قوم چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا اگر بالکل ناممکن نہ تھا تو حد سے زیادہ دشوار تو ضرور تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں تمدنی حالت نہایت محدود تھی اور لوگ اپنے مورثوں کے کارہائے نمایاں کی بڑی عظمت کرتے تھے اور اُن کو فخریہ یاد رکھتے تھے اور ہر ایک شریف قوم کا آدمی خود سرائی کا بندہ تھا۔ اور بالتخصیص عرب کی مختلف قومیں اپنی قوم کی امتیاز موجودہ کو قائم اور برقرار رکھنے اور اپنی قوم کو اور قوموں کی ملاوٹ سے علیحدہ رکھنے میں نہایت درجہ محتاط تھیں۔

مندرجہ ذیل فہرست اُن قوموں کی ہے جو سکون اور غیر مبدل حالت میں رہیں۔

۱۔ بنی ناحور ابن ترح سے۔ بنو ناحور۔ ۲۔ ہاران ابن ترح سے۔ بنو ہاران۔

۳۔ مواب ابن لوط ابن ہاران ابن ترح سے۔ بنو مواٰب۔

۴۔ عمان ابن لوط سے۔ بنو عمان۔ ۵۔ اولاد ابراہیم سوائے اولاد اسمٰعیل کے بنو ابراہیم۔

۶۔ اولاد ابراہیم بطن قطورہ سے۔ بنو قطورہ۔

۷۔ عیسو عرف اودم ابن اسحاق ابن ابراہیم سے۔ بنو اودم۔

مندرجہ ذیل قومیں اسمٰعیل کی اولاد میں ہیں جو بمقابل اور قوموں کے بہت جلد بڑھ گئیں اور عرب کے تمام ملک میں پھیل گئیں۔

۸۔ اسمٰعیل ابن ابراہیم سے۔ بنو اسمٰعیل۔ مگر اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کے نام سے علیٰحدہ علیٰحدہ بارہ قومیں چلیں۔

۹۔ بنایوث سے۔ بنو بنایوث۔ ۱۰۔ قیدار سے۔ بنو قیدار۔

۱۱۔ اوبئیل سے۔ بنو اوبئیل۔ ۱۲۔ مبسام سے۔ بنو مبسام۔

۱۳۔ مشماع سے۔ بنو مشماع۔ ۱۴۔ دوماہ سے۔ بنو دوماہ۔

۱۵۔ مسا سے۔ بنو مسا۔ ۱۶۔ حدر سے۔ بنو حدر۔

۱۷۔ تیما سے۔ بنو تیما۔ ۱۸۔ یطور سے۔ بنو یطور۔

۱۹۔ نافش سے۔ بنو نافش۔ ۲۰۔ قیدماہ سے۔ بنو قیدماہ۔

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں میں سے قیدار کی اولاد نے ایک عرصہ کے بعد شہرت حاصل کی اور مختلف شاخوں میں متفرع ہوگئی۔ مگر بہت صدیوں تک یہ بھی اپنی اصلی حالت پر رہی اور مدت تک اُن میں ایسے لئیق اور نامی اشخاص جنھوں نے اپنی لیاقتوں اور عجیب وغریب قابلیتوں کی وجہ سے نامور ہونے کا استحقاق حاصل کیا ہو، یا سلطنتوں اور قوموں کے بانی ہوتے ہوں پیدا نہیں ہوتے۔ اور اسی وجہ سے قیدار کی اولاد کی تاریخ کے سلسلہ کو مرتب کرنے میں بہت سی صدیوں کا فصل واقع ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا امر ہے جس سے عرب کی قومی اور ملکی روایت کی جو حضرت اسمٰعیل کی نسبت چلی آتی ہے کما حقہ، تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک جلاوطن ماں اور بیٹے کی اولاد کی کثرت اور ترقی کے واسطے جو ایسی بیکس اور مصیبت زدہ حالت میں خانہ بدر کی گئی تھی۔ ضرور بلکہ یقیناً ایک عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ خصوصاً ایسی ترقی کے

واسطے جس نے انجام کار اُن کو دنیا کی تاریخ میں ایک نہایت نامور اور ممتاز جگہ پر پہنچایا اور اُن کی اولاد نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں کیے جن کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ہم عرب کی تاریخ میں قیدار کی اولاد میں اُس قوم کی ابتدا سے اُس وقت تک کہ اُس کو شہرت ہوئی آٹھ نام پاتے ہیں یعنی حمل۔ نابت۔ سلامان۔ الہمیسع الیسع۔ ادو۔ او۔ عدنان۔

یہ وہی عدنان ہے جس کا بیٹا ملک یمن کا بادشاہ ہوا تھا اور جس کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں۔

مندرجہ ذیل قبائل عدنان کی اولاد میں ہیں

۲۱۔ ایاد ابن معد ابن عدنان سے۔ ایادی۔ ۲۲۔ قنص ابن معد سے۔ قنصی۔

۲۳۔ مضر ابن نضر ابن معد سے۔ بنو مضر۔ ۲۴۔ ربیع ابن نضر ابن معد سے۔ بنو ربیعہ۔

۲۵۔ اسد ابن ربیع سے۔ بنو اسد۔ ۲۶۔ ضبیعہ ابن ربیعہ سے۔ بنو ضبیعہ۔

قبائل ذیل ضبیعہ کی اولاد میں ہیں

۲۷۔ بنو ابو الکلب۔ ۲۸۔ بنو شحنہ۔ ۲۹۔ جدیلہ ابن اسد ابن ربیعہ سے۔ بنو جدیلہ۔

۳۰۔ غزہ ابن اسد سے۔ بنو عنزہ۔ ۳۱۔ عمیر ابن اسد سے۔ بنو عمیر۔

۳۲۔ عبد القیس ابن اقصیٰ ابن دومی ابن جدیلہ سے۔ عبد القیس۔ ۳۳۔ الدیل ابن شن ابن اقصیٰ ابن عبد القیس سے بنو۔ الدیل شنی۔

قبائل ذیل الدیل کی اولاد میں ہیں

۳۴۔ بنو بحشہ۔

۳۵۔ ضوحان ابن وادیہ ابن نکیرا ابن اقصی ابن عبد القیس وائلہ سے۔ بنو وائلہ۔

۳۶۔ انمار ابن عمرو ابن وادیہ سے جو انمار۔ ۳۷۔ عجل ابن عمرو سے۔ بنو عجل قیسی۔

۳۸۔ محارب ابن عمرو سے۔ بنو المحارب۔ ۳۹۔ الدیل ابن عمرو سے۔ بنو الدیل۔

قبائل ذیل الدیل کی شاخ ہیں

۴۰۔ بنو صوحان۔ ۴۱۔ العوق ابن عمرو ابن وادیہ سے بنو العوق یا عوقی۔

۴۲۔ اولاد بکر ابن ہیبت ابن عمرو ابن غنم ابن تغلب ابن وایل ابن قاست ابن حنب ابن اقصیٰ ابن دومی ابن جدیلہ سے۔ الاراقم۔ ۴۳۔ بکر ابن دایل ابن قاسط سے۔ بنو بکر۔ ۴۴۔ ثعلب ابن دایل ابن قاست سے۔ بنو ثعلب۔

قبایل ذیل ثعلب کی اولاد میں ہیں

۴۵۔ بنو عکب۔ ۴۶۔ بنو عدی۔ ۴۷۔ بنو کنانہ یا قریش ثعلب۔

۴۸۔ بنو ازہیر۔ ۴۹۔ بنو عتاب۔ ۵۰۔ غنم ابن ہبیب ابن کعب ابن یشکر ابن وائل

سے۔ بنو غنم۔

۵۱۔ لجیم ابن صعب ابن علی ابن بکر سے۔ بنو لجیم۔

قبایل ذیل لجیم کی اولاد میں ہیں

۵۲۔ بنو ہقان۔ ۵۳۔ بنو عجل۔ ۵۴۔ اولاد مالک ابن صعب سے۔ بنو ازمان۔

۵۵۔ ذہل ابن ثعلبہ ابن عقبہ ابن صعب سے بنو ذہل۔ ۵۶۔ شیبان ابن ثعلبہ سے۔ بنو شیبان۔

قبایل ذیل شیبان کی اولاد میں ہیں

۵۷۔ بنو الورثہ۔ ۵۸۔ بنو الجدرہ۔ ۵۹۔ بنو الشقیقہ۔

۶۰۔ اولاد تیم اللات ابن ثعلبہ سے۔ اللہازم۔ ۶۱۔ سدوس ابن شیبان اہل ذہل سے۔ بسدوسی۔

۶۲۔ قمعہ عرف قیس عیلان ابن الیاس ابن مضر ۶۳۔ عمرو ابن قیس عیلان سے۔ بنو عمرو

سے۔ قیس عیلانی یا بنو قیس۔

قبایل ذیل عمرو کی اولاد میں ہیں

۶۴۔ بنو اخارجہ۔ ۶۵۔ بنو اوالبش۔ ۶۶۔ بنو یشکر۔ ۶۷۔ بنو عوف۔

۶۸۔ بنو رہم۔ ۶۹۔ بنو رباح۔ ۷۰۔ سعد ابن قیس عیلان سے۔ بنو سعد۔

۷۱۔ غطفان ابن سعد سے۔ بنو غطفان۔ ۷۲۔ معن ابن عسر ابن سعد سے۔ بنو معن۔

۷۳۔ غنی ابن عسر سے۔ بنو غنی۔

قبایل ذیل غنی کی اولاد میں ہیں

۷۴۔ بنو ضبینہ۔ ۷۵۔ بنو بہثہ۔ ۷۶۔ بنو عبید۔

۷۷۔ منبہ ابن عسر سے۔ بنو منبہ۔

قبائل ذیل منبہ کی اولاد میں ہیں

۷۸۔ بنو حسر۔ ۷۹۔ بنو سنان۔ ۸۰۔ اشجع ابن غطفان ابن صعب سے۔ بنو اشجع۔

قبائل ذیل اشجع کی شاخ ہیں۔

۸۱۔ بنو دہمان۔

۸۲۔ ذبیان ابن بغیض ابن رایس ابن غطفان سے۔ بنو ذبیان۔

قبائل ذیل ذبیان کی اولادیں ہیں

۸۳- بنو فزارہ - ۸۴- بنو العشراء -

۸۵- عبس ابن بغیض سے - بنو عبس - ۸۶- سعد ابن ذبیان ابن بغیض سے - بنو سعد -

قبائل ذیل سعد کی اولاد میں ہیں

۸۷- بنو محاش - ۸۸- بنو شیح -

۸۹- بنو حشور - ۹۰- خصفہ ابن قیس عیلان سے بنو خصفہ -

قبائل ذیل خصفہ کی شاخ ہیں

۹۱- بنو جسر - ۹۲- ابو مالک بن عکرمہ ابن خصفہ سے - بنو ابو مالک

۹۳- منصور ابن عکرمہ سے - بنو سلیم -

قبائل ذیل منصور کی اولاد میں ہیں

۹۴- بنو حرام - ۹۵- بنو خفاف - ۹۶- بنو سمان - ۹۷- بنو رعل -

۹۸- بنو ذکوان - ۹۹- بنو مطرود - ۱۰۰- بنو بہز - ۱۰۱- بنو قنفذ

۱۰۲- بنو رفاعہ - ۱۰۳- بنو شرید - ۱۰۴- بنو قتیبہ -

۱۰۵- سلامان ابن عکرمہ سے - سلامانی - ۱۰۶- ہوازن ابن منصور سے - بنو ہوازن

۱۰۷- مازن ابن منصور سے - بنو مازن - ۱۰۸- سعد ابن بکر ابن ہوازن سے - بنو سعد -

۱۰۹- نصر ابن معاویہ ابن بکر سے - بنو نصر - ۱۱۰- مرہ ابن صعصعہ ابن معاویہ سے - بنو مرہ یا بنو اسلول

۱۱۱- نمیر ابن عامر ابن صعصعہ سے نمیری - ۱۱۲- ہلال ابن عامر سے - بنو ہلال -

۱۱۳- ربیعہ ابن عامر سے - بنو مجد - ۱۱۴- اولاد عمرو ابن عامر سے - بنو البکا -

۱۱۵- معاویہ ابن کلاب ابن ربیعہ سے - بنو معاویہ - ۱۱۶- جعفر ابن کلاب سے - بنو جعفر -

۱۱۷- اولاد عمرو ابن کلاب سے - بنو دوان - ۱۱۸- اولاد عبداللہ ابن کعب ابن ربیعہ سے بنو العجلان -


۱۱۹- اولاد قشیر ابن کعب سے - بنو ضمرہ - ۱۲۰- اولاد منبہ ابن ہوازن سے - ابو ثقیف -

قبائل ذیل ابو ثقیف کی اولادیں ہیں

۱۲۱- بنو مالک - ۱۲۲- بنو احلاف -

۱۲۳- طابخہ ابن الیاس ابن مضر سے - بنو طابخہ یا بنو خندف - ۱۲۴- تیم ابن عبد منات ابن عدا ابن طابخہ سے - بنو تیم -

دولت علیهٔ عثمانیه



۱۲۵ عدی ابن عبد منات سے - بنو عدی - ۱۲۶- ثور ابن عبد مناۃ سے - ثوری -

قبایل ذیل عبد منات کی اولاد میں ہیں

۱۲۷- الرباب - ۱۲۸- بنو نصر - ۱۲۹ - بنو مازن - ۱۳۰ - بنو ایسل -

۱۳۱- بنو عایذہ - ۱۳۲- بنو تیم اللات - ۱۳۳- بنو زبان - ۱۳۴- بنو عوف -

۱۳۵- بنو شیثم - ۱۳۶ - بنو الزحل - ۱۳۷- بنو بجالہ -

۱۳۸- مزینہ ابن عدابن طانجہ سے - مزنی - ۱۳۹- مرابن عد سے - بنو ظاعنہ -

قبایل ذیل ظاعنہ کی شاخ ہیں

۱۴۰- بنو صوفہ - ۱۴۱- تمیم ابن مر سے - بنو تمیم -

قبائل ذیل تمیم کی اولاد میں ہیں

۱۴۲- جبطات - ۱۴۳- بنو عصیہ - ۱۴۴- البراجم - ۱۴۵- بنو کلیب -

۱۴۶- بنو ریاح - ۱۴۷ - بنو مرہ - ۱۴۸- بنو مقرہ - ۱۴۹- بنو حمان -

۱۵۰- بنو حنظلہ - ۱۵۱- بنو دارم - ۱۵۲- بنو عدویہ - ۱۵۳- بنو لطیہ -

۱۵۴- آل صفوان - ۱۵۵- آل عطارد - ۱۵۶- بنو عوف -

۱۵۷- مدرکہ ابن الیاس ابن مضر سے بنو مدرکہ یا بنو خندف - ۱۵۸- حذیل ابن مدرکہ سے - بنو حذیل یا حذیلی -

۱۵۹- تمیم ابن سعد ابن حذیل سے - بنو تمیم - ۱۶۰- حریب ابن سعد سے - بنو حریب -

۱۶۱- مناعہ ابن سعد سے - بنو مناعہ - ۱۶۲- خناعہ ابن سعد سے - بنو خناعہ -

۱۶۳- جہم ابن سعد سے - جہمی - ۱۶۴- غنم ابن سعد سے غنمی -

۱۶۵- حرث ابن سعد سے - حرثی - ۱۶۶- خزیمہ ابن مدرکہ سے - بنو خزیمہ -

۱۶۷- الہون ابن خزیمہ سے - بنو الہون -

قبایل ذیل الہون کی اولاد میں ہیں

۱۶۸- بنو القارہ - ۱۶۹ - عضلی - ۱۷۰- الدیشی -

۱۷۱- اسد ابن خزیمہ سے - بنو اسد - ۱۷۲- دودان ابن اسد سے - دودانی -

۱۷۳- کاہل ابن اسد سے - کاہلی - ۱۷۴- حلمہ ابن اسد سے - حلمی -

۱۷۵- عمرو ابن اسد سے - عمری -

قبائل ذیل عمرو کی اولاد میں ہیں

۱۷۶۔ بنو قفعس ۔ ۱۷۷۔ بنو الصیدا۔ ۱۷۸۔ بنو نصر۔ ۱۷۹۔ بنو الزنیہ۔

۱۸۰۔ بنو عاضرہ ۔ ۱۸۱۔ بنو ثعالبہ۔ ۱۸۲۔ کنانہ ابن خزیمہ سے۔ بنو کنانہ۔

۱۸۳۔ مالک ابن کنانہ سے۔ ابو مالک۔

قبایل ذیل مالک کی اولاد میں ہیں

۱۸۴۔ بنو فقیمن ۔ ۱۸۵۔ بنو فراس ۔ ۱۸۶۔ بنو بجر۔

۱۸۷۔ ملکان ابن کنانہ سے۔ بنو ملکان۔ ۱۸۸۔ عبد منات ابن کنانہ سے۔ بنو عبد منات۔

قبایل ذیل عبد منات کی اولاد میں ہیں

۱۸۹۔ بنو مدلج ۔ ۱۹۰۔ بنو جذیمہ۔ ۱۹۱۔ بنو لیث ۔ ۱۹۲۔ بنو الدیل۔

۱۹۳۔ بنو ضمرہ ۔ ۱۹۴۔ بنو غفار۔ ۱۹۵۔ بنو عریج۔

۱۹۶۔ عمرو ابن کنانہ سے۔ عمریون۔ ۱۹۷۔ عامر ابن کنانہ سے۔ عامریوں۔

قبایل ذیل کنانہ کی شاخ ہیں

۱۹۸۔ الاحابیش۔ ۱۹۹۔ نضر ابن کنانہ سے۔ بنو النضر۔

۲۰۰۔ مالک ابن نضر سے۔ بنو مالک۔ ۲۰۱۔ الحرث ابن مالک سے۔ مطیبین۔

قبائل ذیل الحرث کی شاخ ہیں

۲۰۲۔ بنو الخلج۔ ۲۰۳۔ فہر ابن مالک سے۔ بنو فہر یا قریش۔

۲۰۴۔ محارب ابن فہر سے۔ بنو محارب۔ ۲۰۵۔ غالب ابن فہر سے۔ بنو غالب۔

۲۰۶۔ تیم ابن غالب سے۔ بنو تیم یا بنو الادرم۔ ۲۰۷۔ لوی ابن غالب سے۔ بنو لوی۔

۲۰۸۔ عامر ابن لوی سے۔ بنو عامر۔

قبایل ذیل عامر کی اولاد میں ہیں

۲۰۹۔ حسل۔ ۲۱۰۔ معیص۔ ۲۱۱۔ سامہ ابن لوی سے۔ بنو سامہ۔

۲۱۲۔ سعد ابن لوی سے۔ بنو سعد۔

قبایل ذیل سعد کی شاخ ہیں

۲۱۳۔ بنانہ۔ ۲۱۴۔ خزیمہ ابن لوی سے۔ بنو خزیمہ۔

قبایل ذیل خزیمہ کی شاخ ہیں

۲۱۵- بنوعایذہ۔ ۲۱۶- کعب ابن لوی سے۔ بنوالحرث۔

۲۱۷- عوف ابن لوی سے۔ بنوالعوف۔ ۲۱۸- کعب ابن لوی سے۔ بنو کعب۔

۲۱۹- عدی ابن کعب سے۔ بنو عدی۔ ۲۲۰- ہصیص ابن کعب سے۔ بنو ہصیص۔

قبائل ذیل ہصیص کی اولاد میں ہیں

۲۲۱- بنو سہم۔ ۲۲۲- بنو جمح۔ ۲۲۳- مرہ ابن کعب سے۔ بنو مرہ۔

۲۲۴- تیم ابن مرہ سے۔ بنو مرہ۔ ۲۲۵- مخزوم ابن مرہ سے۔ بنو مخزوم۔

۲۲۶- کلاب ابن مرہ سے۔ بنو کلاب۔ ۲۲۷- زہرہ ابن کلاب سے۔ بنو زہرہ۔

۲۲۸- قصی ابن کلاب سے۔ بنو قصی یا مجمع۔

قبایل ذیل کلاب کی اولاد میں ہیں

۲۲۹- نوطیبون۔ ۲۳۰- عبدالدار ابن قصی سے۔ داری۔

قبایل ذیل عبدالدار کی شاخ ہیں

۲۳۱- شیبی۔ ۲۳۲- امیہ ابن عبدالشمس ابن عبدمناف ابن قصی سے۔ بنو اُمیہ۔

۲۳۳- ہاشم ابن عبدمناف سے۔ بنو ہاشم۔ ۲۳۴- عبدالمطلب ابن ہاشم سے۔ بنو مطلب۔

۲۳۵- عباس ابن عبدالمطلب سے۔ عباسی۔ ۲۳۶- علی ابن ابوطالب بن عبدالمطلب سے۔ علوی۔

۲۳۷- فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ سادات بنی فاطمہ علیہم السلام۔

اس مطلب سے کہ اقوام مذکورہ بالا کا سلسلہ بخوبی ذہن نشین ہوجاتے اور آسانی سے سمجھ میں آجائے اس مقام پر ایک شجرہ عرب مستعربہ کی قوموں کا شامل کیا جاتا ہے۔

عرب کی قوموں کے بیان کو ختم کرتے وقت اس بات کا بیان کرنا مناسب ہے کہ عرب میں ایک دستور تھا کہ ایک ضعیف قوم یا وہ قوم جو زوال کی حالت میں پڑجاتی تھی۔ اکثر اپنے آپ کو کسی زبردست قوم میں ملادیتی تھی۔ اس اختلاط کے مقصد کو نہ سمجھنے سے غیرملک کے مؤرخ بڑی غلطی میں پڑے ہیں۔ کیونکہ اُن میں سے بعضوں نے یہ خیال کیا ہے اور بعض مؤرخ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ایسا اختلاط نسب کے اختلاط سے علاقہ رکھتا ہے اور اُس کے بعد وہ دونوں قومیں ایک ہی لقب یعنی زبردست قوم کے لقب نسبی سے ملقب ہوجاتی تھیں اور اسی بنا پر اُن کا مقولہ ہے کہ عرب کی قومیں انقلابات اجتماع کے ہمیشہ زیر مشق رہی ہیں۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ وہ دونوں قومیں اس طرح پر مخلوط نہیں ہوتی تھیں کہ ایک ہی مورث اعلیٰ کی نسل

سے خیال کی جاتی ہوں بلکہ اُس اختلاط کے یہ معنی تھے کہ زیردست قوم زبردست قوم کے تابع اور اُس قوم کے قوانین اور رسم ورواج کی پابند ہو جاتی تھی اور ضرورت کے وقت اور ہر ایک امر میں اُس قوم کی ساتھی اور مددگار ہوتی تھی۔ دونوں قوموں کے آدمی ایک ہی نامی سردار کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے تھے اور اگر اُن دونوں قوموں کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا۔ جس کے عوض تمام قوم سے تاوان لئے جانے کا دستور تھا۔ تو وہ تاوان برابر دونوں قوموں پر عائد ہوتا تھا۔

لفظ سراسین کی تحقیق

اس خطبہ کے ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ لفظ "سراسین" کی بابت جو یونانیوں نے زمانۂ جاہلیت کے بعض عربوں کی نسبت استعمال کیا ہے اور جس کا اطلاق انجام کار تمام جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں پر قبل ظہور اسلام اور نیز بعد ظہور اسلام ہو گیا ہے کچھ گفتگو کی جائے۔ بتعدد مؤرخوں نے اپنی ذہانت کو اس لفظ کے ماخذ کے بیان کرنے کی کوشش میں صرف کیا ہے اور ہر ایک نے ایک نیا ڈھنگ اُس کے ماخذ تلاش کرنے کا اختیار کیا ہے۔ جس نے بارہا پرانے تعصبات کو ظاہر کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بات کافی ہے کہ رورنڈ پوکاک صاحب نے اپنی کتاب تاریخ عرب میں جو کچھ اُس کی نسبت لکھا ہے بعینہٖ اُس کو اس مقام پر ترجمہ کر دیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ اُس مضمون پر ہمارے مصنفوں نے اب تک جو کچھ چھاپا ہے اس میں کسی جگہ میں اس امر کی قابل اطمینان دلیل نہیں پاتا ہوں کہ وہ لوگ جو پہلے عرب کہلاتے تھے آخر میں "سراسین" کے نام سے کیوں موسوم ہوتے۔ جن لوگوں نے کہ اس نام کو "سرح" سے مشتق کیا ہے۔ اُن کی رائے کی کماحقہ، تردید ہو گئی ہے۔ اب عموماً یہ گمان ہے کہ یہ نام "سرق" (چوری)، سے نکلا ہے جس سے ایک وحشی اور لٹیری قوم سے صریح مراد ہے۔ مگر یہ نام اُن کو کہاں سے ملا؟ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ یہ نام خود انھیں کے ہاں سے نہیں شروع ہوا ہوگا۔ بلکہ کسی اور قوم کی زبان سے یہ لفظ لیا گیا ہے۔ کیونکہ عرب ایسے نام کو جو موجب رسوائی اور ذلت کا ہے اپنے لئے کب گوارا کرتے۔ اب عالموں کو یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ آیا ان لوگوں کے نام کو جو عام طور پر اور علانیہ قزاقی اور رہزنی کے لئے مشہور ہیں۔ لفظ "سرق" سے مشتق

کرنا جائز ہو سکتا ہے ۔ جس کے معنی خفیہ چوری کرنے کے ہیں یا نہیں ۔ اب اگر کوئی "سراسین" کی تحقیق میں میری تبعیت کرنا چاہے تو اُس کو اپنی آنکھیں شرق کی طرف کھولنی چاہئیں ۔ کس واسطے کہ "سراسنیس" اور "سراسی نا ے" کی آوازیں ۔ شرقی" اور اُن کی جمع "شرقیون" اور "شرقین" کی نسبت کیا فرق ہوگا ، جس کے معنی اہل الشرق یعنی باشندگان شرقی کے ہیں ۔ جس طرح کہ سابق میں عربوں کو علی الخصوص یہودی خیال کرتے تھے ۔ کیونکہ اُس کی سرزمین کا شرقی حصہ (حسب قول طاسیطوس) عرب سے محدود ہے ۔ اسی طرح توریت مقدس (سفر تکوین باب ۱۰ ورس ۳۰) یقطان کی اولاد کو جو عرب تھی ۔ مشرق میں بیان کرتی ہے ۔ یعنی ساحل کے اُس حصہ پر جو مابین "بشام" اور "سفار" کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے واقع ہے ۔ یعنی اگر "آرسا ڈیاس" قابل اعتبار ہو "من مکۃ الی تجئی مدینۃ الجبل الشرقی" یعنی مکہ سے وہاں تک کہ تم اس مشرقی پہاڑ کے شہر تک آؤ ۔ یا جیسا کہ مسودہ "کوڈیکس" میں مرقوم ہے "ای المدینۃ الشرقی" ۔ یعنی مشرقی شہر تک (جس سے میری دانست میں مدینہ (منورہ) مراد ہے) جو جانب شرق واقع ہے ۔ حضرت سلیمان کی عقل כל בני קדם تمام اہل الشرق کی عقل سے بڑھ کر خیال کی گئی ہے ۔ یعنی (حسب بیان اُس یہودی کے گو وہ کوئی ہو ۔ جس نے کہ صحف ملوک کا عربی میں ترجمہ کیا ہے) "سراسین" یا عربوں کی عقل سے اس طرح یرمیاہ نبی (باب ۴۹ ورس ۲۸) میں اعراب بنی قیدار کو "اہل الشرق" בני קדם کہا ہے ۔ علامہ ہیو "گوگردشیس" بیان کرتا ہے کہ عیسائیان سابق کی یہ رائے تھی کہ وہ عقلا ۔ جو حسب بیان متی حواری (باب ۲) پرستش کو آتے تھے ملک عرب سے آئے تھے اور اُس کا خود بھی یہی عقیدہ تھا ۔ ننا سوس (فولیس مین) لکھتا ہے کہ میں نے اپنی سفارت کی جو بجانب بنی عثونیہ ۔ بنی حمیر ۔ اور سراسین اور دیگر اقوام پرستش کنندہ کی تھی تعمیل کر دی ۔ اس لئے "سراسنیس" کا اور مشرقی اقوام کے زمرہ میں شامل ہونا صرف اسی وجہ سے تھا کہ وہ مشرق میں آباد تھے ۔ محمد ایفرد زآبادی ۔ صفی الدین اور اور لوگوں کا بیان ہے کہ مشرق کے چند اور مقامات بھی بدیں وجہ کہ وہ مشرق کے اور حصوں میں واقع تھے بنام "شرقہ" و "شرقیہ" موسوم تھے اور ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہم نے سُنا ہے کہ ایسے مقامات کے باشندے اہل الشرق کہلاتے ہیں ایسی ہی دلیل سے اُن لوگوں کو بھی جو ایسے ملک میں بستے ہوں کہ بلحاظ اور ملکوں کے "الشرق" یعنی پورب کہلاتا ہو اُسی نام سے ملقب کیوں نہیں کرنا چاہیے ۔ ورنہ وہ اپنے اور اُن لوگوں کے درمیان جو اپنی ہی بولی میں اپنے آپ کو مغربی یعنی باشندہ جزیرہ موری تانیا کہتے ہیں کس طرح

پوری پوری تمیز کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سے جیسے کہ باشندہائے ملک مغرب "المغاربہ" کہلاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو عرب میں متوطن ہیں "مشارقہ" یا "سراسینس" کہے جا سکتے ہیں اور یہ نام اُن کی عادات واوضاع کے لحاظ سے نہیں رکھا گیا ہے۔ بلکہ باعتبار اُن کی جائے سکونت کے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح سے تم اُس مشہور ومعروف حکیم بوعلی سینا کی اُس نامی کتاب کا نام "سراسینک فلاسفی" یعنی "الفلسفہ المشرقیہ" کچھ اُس کی جاہلیت کی وجہ سے نہیں کہتے ہو، بلکہ اُس کے مشرقی ہونے کے سبب سے۔ رہی یہ بات کہ عربی حرف ش کا یونانی ﮐ کی مانند تلفظ ہوا ہے اس سے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ عبرانی حرف ﻻ کا بھی اسی طرح تلفظ کرتے تھے۔ لفظ "سراسینس" کا ایک اور مادہ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی "شرک" اس واسطے کہ وہ خدائے واحد کے شریک قرار دیتے تھے۔ لیکن یہ نام جو قدیمی عربوں کی نسبت اس قدر موزوں ہے مسلمان لوگ اُن کا اطلاق ازراہِ بے انصافی وناحق اندیشی عیسائیوں پر کرتے ہیں اور عیسائی اُس سے استغفار بھیجتے ہیں۔ مگر یہ امر ہمارے مضمون سے علاقہ نہیں رکھتا۔

ہمارے اس خطبہ کے ساتھ ملک عرب کا ایک نقشہ بھی ہو گا۔ جس سے اُمید ہے کہ اکثر متنازعہ فیہ مقامات مختلف قوموں کی سکونت گزینی کا ٹھیک مقام بہت سے بیابانوں کا صحیح صحیح موقع۔ پہاڑوں شہروں وغیرہ کی کیفیت واصلیت دریافت ہو جائے گی۔

شاید اس کے پڑھنے والے کو توقع ہو کہ نامی گرامی شہر مکہ معظمہ کا مفصل حال۔ اُس کی بنا کی کیفیت۔ سنگ اسود کی اصلیت اور اُن رسوم کی ابتدا اور اُن کی حقیقت جو بیت اللہ میں کی جاتی ہیں۔ یہ سب باتیں اس خطبہ میں دریافت ہوں گی۔ لیکن چونکہ ایسے عظیم الشان اور دلچسپ مضامین کی کامل تشریح کی اس خطبہ میں گنجائش نہ ہوتی اس لئے ہم ان کا بیان ایک اور خطبہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ کریں گے۔

نقشہ متذکرہ بالا میں ہم نے اُن مقامات کو بھی درج کیا ہے۔ جن کا حوالہ توریت مقدس سے دیا ہے۔ اور اُن کے ساتھ اُس پاک کتاب کے مخصوص بابوں اور آیتوں کا بھی حوالہ دیدیا ہے۔

اُن مقامات کی ٹھیک ٹھیک جگہوں کے متعین کرنے میں ہم نے اُس بے بہا نقشہ عرب سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جس کو رورنڈ کارٹرٹ پی۔ کیری۔ ایم۔اے۔ نے مرتب کیا ہے۔

النصوص الباھرۃ فی حریۃ الھاجرۃ علی ما یستفاد من کتب الیہود

افادھا

المولوی عنایت رسول چڑیاکوٹی سلمہ اللہ تعالیٰ

ام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا نام عبری زبان میں (ھاغار הגר) اور عربی میں (ہاجر) یہ بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

سفر الیشار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے لکھا ہے کہ "شہر بابل دار السلطنت نمرود میں جہاں تارح یعنی آذر اور ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے تمام خاندان کے لوگ رہتے تھے۔ ایک شخص حکیم ہنرمند ذکی الطبع فطین جو اکثر علوم و صنائع میں کمال رکھتا تھا، رہتا تھا اس کا نام رقیون רקיון تھا مگر وہ بہت مفلس و محتاج و مفلوک تھا۔ تنگ دستی و سختی سے وطن میں رہنا نامناسب سمجھ کر مصر کی راہ لی۔ جب وہ وہاں پہنچا اور اُس کی لیاقت و دانشمندی باشندگان مصر پر ظاہر ہوگئی تو بادشاہ مصر نے اُس کو براہ قدردانی اعیانِ سلطنت میں داخل کیا۔ رفتہ رفتہ بالکل حاوی ہوا بالآخر وہاں کا بادشاہ ہوگیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس کا لقب فرعون ہوا۔ اُسی فرعون کے زمانہ بادشاہت میں بوجہ قحط سالی کے حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے مع اپنے اہلِ بیت کے مصر میں تشریف لے گئے۔

رقیون רקיון اور ھاغار הגר دونوں عبری لفظ ہیں اور اس سے استدلال ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں عبرانی یعنی بنی عیبر تھے اور کیا عجب ہے کہ اُسی قبیلہ کے ہوں جس قبیلہ کے حضرت ابراہیم تھے اور ظاہرا اسی خیال سے کہ بادشاہ مصر اُن کا ہم وطن یا ہم قبیلہ ہے اس قحط و مصیبت میں حضرت ابراہیم نے مصر میں جانے کا قصد کیا ہو جیسا کہ ہر ایک انسان کو ایسے موقع پر اس قسم کا خیال ہوسکتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم مصر میں پہنچے اور اُنھوں نے حضرت سارہ کا اپنی بی بی ہونا ظاہر نہ کیا بلکہ بہن ہونے کا جو رشتہ تھا وہ ظاہر کیا۔ تو فرعون نے حضرت سارہ سے شادی کرنی چاہی اور حضرت ابراہیم کو بہت کچھ دے کر حضرت سارہ کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا۔

اس واقعہ سے بھی استدلال ہوسکتا ہے کہ فرعون بادشاہ مصر کو بسبب ہم قوم ہونے کے

زیادہ تر حضرت سارہ سے شادی کرنے کی رغبت ہوئی تھی۔

غرضکہ ہنوز شادی نہ ہونے پائی تھی کہ مختلف قسم کے صدمات فرعون پر واقع ہوئے اور اُن کے سبب سے فرعون نے حضرت سارہ کے حال کی زیادہ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابراہیم کی بیوی بھی ہیں اُسی وقت فرعون نے اُن کو حضرت ابراہیم کے پاس بھیج دیا اور ہاجرہ اپنی بیٹی کو بھی اُن کے سپرد کردیا۔

فرعون نے جو اپنی بیٹی ہاجر کو حضرت سارہ کے ساتھ کردیا ظاہراً اس کے کئی سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ابراہیم اور سارہ کی نیکی اور بزرگی اور اُن کا اور فرعون و ہاجر کا ہم قوم ہونا اس بات کے لئے بڑی رغبت ہوئی ہوگی کہ فرعون اپنی بیٹی کو اُن کی تعلیم اور تربیت اور صحبت میں سپرد کرے کیونکہ مصری اُس کی قوم و قبیلہ سے نہ تھے۔ علاوہ اس کے اُس زمانہ میں اور اُس خاندان میں شادی وبیاہ میں ہم کفو ہونے کا بہت خیال تھا مصر میں رقیوُن فرعون مصر کے خاندان کا کوئی شخص نہ تھا اور یہ بہت بڑی ترغیب اس بات کی تھی کہ ہاجر سارہ کے سپرد کی جائے تاکہ اُن کی تربیت میں رہے اور کہیں کفو میں اُس کی شادی ہو جائے۔ رخصت کے وقت فرعون نے اپنی بیٹی ہاجر کو سمجھایا کہ تیرا رہنا ان کے ساتھ تیرے لئے میرے پاس رہنے سے بہتر ہے۔ اس سمجھانے سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس خیال سے فرعون نے اپنی بیٹی اُن کے سپرد کی تھی۔

بعد اس کے جب حضرت ابراہیم معہ ہاجر فرعون کی بیٹی کے وہاں سے چلے تو فرعون نے اُن کے ساتھ پیادے مامور کئے۔ تاکہ بحفاظت پہنچ جائیں۔ چنانچہ یہ سب لوگ باآرام تمام معہ احمال و اثقال و لونڈی و غلام وغیرہ کے جو بادشاہ مصر نے اُن کو دیتے تھے۔ اپنے ملک میں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی بخیر و خوبی پہنچ گئے۔ اُس وقت ابراہیم ہاجر کی بدولت بہت دولتمند اور مال دار ہوگئے۔ چنانچہ توریت میں لکھا ہے۔

וַיַּעַל אַבְרָם מִמִּצְרַיִם הוּא וְאִשְׁתּוֹ וְכָל־אֲשֶׁר־לוֹ וְלוֹט עִמּוֹ

הַנֶּגְבָּה וְאַבְרָם כָּבֵד מְאֹד בַּמִּקְנֶה בַּכֶּסֶף וּבַזָּהָב׃

ان لفظوں کو اس مقام پر عربی خط کے حرفوں میں لکھتے ہیں۔

وَیَعَلْ اِبرَامْ مِمِصرِ ایم هُوَ واشتُو وخلَ اشِر لو و لُوط عِمّو هنغبا وَ ابرام کابیدِ
مئود بمقنه وبکسِف وبزَاهاب

ترجمہ عربی۔ فصعد ابرام من مصر هو و زوجته و کل ماله و لوط معه الی القبیلة و ابرام عظیم جدا

بالماشیۃ والفضۃ والذہب"۔

ترجمہ اردو۔ اور کوچ کیا ابراہیم نے مصر سے اُس نے اور اُس کی بی بی نے مع اپنے کل مال کے اور لوط کے شمال طرف کو۔ کتاب پیدائش باب ۱۳ آیت او ۲۔

غرض اس مورخ کے بیان سے ظاہر ہے کہ ہاجر بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں تعلیم تہذیب کے لئے سارہ کے سپرد کی گئی تھیں اور اُن کا ہم وطن ہونا بلکہ ادنےٰ تامل سے اہل خاندان سے ہونا پایا جاتا ہے۔

مفسرین توریت بھی حضرت ہاجر کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں۔ چنانچہ ربی شلوموسحاق نے کتاب پیدائش کے سولھویں باب کی پہلی آیت کی تفسیر میں جو لکھا ہے اُس کو بعینہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

בַּת פַּרְעֹה הָיְתָה כְּשֶׁרָאָה נִסִּים שֶׁנַּעֲשׂוּ לְשָׂרָה אָמַר מוּטָב
שֶׁתְּהֵא בִתִּי שִׁפְחָה בְּבַיִת זֶה וְלֹא גְבִירָה בְּבַיִת אַחֵר:

اس عبارت کو عربی خط کے حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

"بَتْ برعُہ ہایتا کِشِرا اَنِسّیم شِنِعسُوا اسارہ اَمَر مُوطاب شِتِّہا بتی شِفحَہ بِبِیت زِہ ولُو گِبیرہ بِبیت اَحیر"۔

(ترجمہ عربی) ھی کانت بنت فرعون لما رأی الایات التی اخرجت لسارہ قال ما اطیب ان تکون بنتی خادمۃ فی بیت ذا ولا ان تکون سیدۃ فی بیت آخر۔

(ترجمہ اردو) وہ فرعون کی بیٹی تھی جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اُس کے گھر میں خادمہ ہوکر، اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ"۔

اس عبارت کا ترجمہ اس طرح پر بھی ہوسکتا ہے کہ "میری بیٹی کا رہنا اُس کے خاندان میں خادمہ ہوکر بہتر ہے، دوسرے خاندان میں ملکہ ہوکے رہنے سے۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں بمقام کلکتہ اسی بات کا مباحثہ ہوا تھا اور اکثر یہودیوں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ حضرت ہاجر لونڈی نہیں تھیں بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجر کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے۔ نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اُس وقت کے حالات پر ہم جو نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں لونڈی و غلام دو طرح پر ہوتے تھے شرا سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے

جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے اور وہ (شیبوث حرب) یا שְׁבִית חֶרֶב کہلاتے تھے، یعنی غنیمت جنگ سیف یا وہ رنڈی اور غلام کہلاتے تھے جو خریدے جاتے تھے اور ان کو מִקְנַת כֶּסֶף مقنت کسف کہتے تھے یا اُن کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے۔ יְלִיד בַּיִת یلید بابیث ولید البیت یعنی خانہ زاد مگر حضرت ہاجرہ ان باتوں سے پاک تھیں۔ پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہودی ان کو کیوں لونڈی کہتے تھے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسمٰعیل کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں اور ضد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسمٰعیل بہ نسبت بنی اسرائیل کے حقیر سمجھے جاویں منسوب کرتے ہیں اور اسی خیال سے اُن لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے۔ مگر وہ استدلال سرتاپا غلط اور بالکل تحریف ہے جس کو بالتفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

حضرت سارہ ادھیڑ ہو گئی تھیں اور اُن کی اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس لئے انھوں نے حضرت ہاجرہ کو زوجہ بنانے کی اجازت دی کہ انھیں سے کچھ اولاد پیدا ہو، چنانچہ ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت سارہ بھی حاملہ ہو گئیں اور حضرت اسحاق پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق کئی برس کے ہو گئے تھے اُن کا دودھ بھی چھوٹ چکا تھا۔ اور حضرت اسمٰعیل اُن سے عمر میں کچھ بڑے تھے۔ دونوں میں آپس میں کچھ تکرار ہو گئی۔ جیسا کہ دو بچوں میں ہو جاتی ہے۔ حضرت سارہ کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ اور اُس لڑائی جھگڑے میں حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اُس کے لڑکے کو نکال دو۔ اس مقام پر جو حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہا اس سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ وہ حقیقت میں لونڈی تھیں۔ بلکہ جس طرح عورتیں لڑائی غصہ میں خصوصاً جب کہ دو عورتوں بلکہ دو سوکنوں میں بچوں پر تکرار ہو جاتے ایک دوسری کو ہتک اور حقارت کے کلمے کہہ اٹھتی ہیں۔ اسی طرح حضرت سارہ نے بھی یہ لفظ امہ אָמָה یعنی لونڈی کا حضرت ہاجرہ کی نسبت کہا۔ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ درحقیقت لونڈی تھیں، مگر یہودیوں کو اور جو لوگ یہودیوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اُن کو ایک موقع حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہنے کا مل گیا۔

حضرت سارہ کی اس بات سے حضرت ابراہیم نہایت ناراض ہوئے مگر خدا نے اُن کی تسلی کی اور کہا کہ اس لونڈی اور بچہ کی طرف سے رنج مت کر کہ تو ان کو نکال دے، میں اس لونڈی

کے بچہ سے ایک قوم پیدا کروں گا۔

اس مقام پر جو خدا نے لونڈی کہا وہ بعینہٖ نقل سارہ کے قول کی ہے یعنی سارہ نے جس کو حقارت سے لونڈی اور لونڈی کا بچہ کہا ہے اُسی سے بس ایک قوم پیدا کروں گا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی لائق آدمی کو کہے کہ یہ نالائق کیا کام کرتا ہے۔ پس اس دوسرے شخص کا بھی اُس کو نالائق کہنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کہ درحقیقت وہ شخص نالائق ہے۔ اور جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت ہاجر بیٹی رقیون بادشاہ مصر کی بلکہ ہم قوم وہم وطن ابراہیم کی تھیں۔ اور جو وجوہ رقیبٔث کی اُس زمانہ میں تھیں۔ اُن سے بھی حضرت ہاجر بری تھیں۔ تو ان الفاظ سے جو لڑائی جھگڑے وغصہ میں بولے گئے ہیں کسی طرح اُن کا واقعی لونڈی ہونا مراد نہیں ہو سکتا۔

علاوہ اس کے لفظ امہ אמה مجازاً محاورہ میں زوجہ پر بھی بولا جاتا ہے یہودیوں میں دستور تھا کہ دختر کا باپ بروقت شادی کے بعوض دختر کے پسر کے باپ سے کچھ روپیہ لیتے تھے تب بیٹی دیتے تھے جیسے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بعض قوموں میں دستور ہے اور اس دستور کو بیٹی کا بیچنا کہتے تھے۔ مگر وہ لونڈی نہ ہوتی تھی بلکہ زوجۂ شرعی ہوتی تھی۔ اور تمام حقوق زوجیت کے اُس کو حاصل ہوتے تھے۔ ایسی زوجہ پر بھی لونڈی کا مجازاً اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ توریت مقدس کی دوسری کتاب باب ۲۱۔ آیت ساتویں میں لکھا ہے کہ "خدا نے کہا کہ اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کو بیچے (امہ) ہونے کے لئے تو وہ لونڈیوں کی طرح نکل نہ جائے گی۔ اگر وہ اپنے مالک کی نظر میں ناپسند ہو جس سے اُس نے زفاف نہیں کیا تو فدیہ دے گا۔ بوجہ ناپسند ہونے کے اجنبی قوم کے پاس بیچ نہیں سکتا۔ اور اگر اپنے پسر کی خلوت میں دیا تو لڑکیوں کے دستور کے موافق برتاؤ ہوگا اور اگر اس کے اوپر دوسری کر لی تو حقوق زوجیت یعنی کھانا کپڑا خلوت کم نہ کرے گا اور اگر یہ تینوں امر اس کے ساتھ نہ کئے جائیں تو بلاتردد چھوٹ جائے گی۔

چونکہ ان آیتوں سے مسائل فقہیہ مستنبط ہوتے ہیں۔ اس لئے علمائے یہود نے اس میں بہت غور کی ہے۔ کل مباحثہ لکھنا طول ہے۔ مگر جس قدر کہ اس مقام کے مناسب ہے۔ مختصراً لکھا جاتا ہے۔

ان تینوں آیتوں میں لفظ امہ אָמָה سے لونڈی مراد نہیں ہو سکتی اول تو ان ہی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لونڈی سے بیوی یعنی زوجہ شرعی مراد ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ سب

آیتیں بنی اسرائیل کی شان میں ہیں۔ جیسا کہ سیاق دلالت کرتا ہے اور بموجب توریت مقدس کے لونڈیوں کی طرح بنی اسرائیل کی بیع وشرا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل توریت مقدس کی تیسری کتاب باب ۲۵ - آیت ۴۲ اور دوسری کتاب باب ۲۲ - آیت ۳ میں مندرج ہے۔ بنی اسرائیل چوری کے جرم میں یا دشمن کی قید میں سے چھڑانے کے لئے خریدے جا سکتے تھے اور صرف سات برس تک مالک کی بطور غلام کے خدمت کرتے تھے۔ حضرت یوسف کے بھائی بھی چوری کے جرم میں بطور غلام رکھ لئے گئے تھے مگر وہ غلام نہ تھے۔

اور اگر فرض کریں کہ اس آیت میں جو احکام ہیں وہ غیر بنی اسرائیل کے لئے ہیں تو بھی آیت کے معنی درست نہ ہوں گے۔ کیونکہ غیر بنی اسرائیل لونڈی و غلام پچاسویں برس از خود آزاد ہو جاتے تھے اور آیت میں حکم ہے کہ وہ آزاد نہ ہوگی۔ اس مقام پر تفسیر رشی کی عبارت نقل کی جاتی ہے جس سے مطالب مذکورہ ثابت ہوتا ہے۔

אִם רָעָה בְּעֵינֵי אֲדֹנֶיהָ: שֶׁלֹּא נָשְׂאָה חֵן בְּעֵינָיו לְכָנְסָהּ: אֲשֶׁר
לֹא יְעָדָהּ: שֶׁהָיָה לוֹ לְיַעֲדָהּ לְהַכְנִיסָהּ לוֹ לְאִשָּׁה וְכֶסֶף קִנְיָנָהּ
הוּא כֶּסֶף קִדּוּשֶׁיהָ וְכָאן רָמַז לְךָ הַכָּתוּב שֶׁמִּצְוָה בְּיִעוּד
וְרָמַז לְךָ שֶׁאֵינָהּ צְרִיכָה קִדּוּשִׁין אֲחֵרִים:

صورت اس کی عربی خط میں۔

اِم راعَه بعینی اُدونیها شّلاُ ناسئَه حِین بعینَا ولُخونسَاه : اُشرِلا یعادَاه : شهایا لولیعَادَاه لِهِغنتیاه لولا تّشاوکسِف قِنیَاه هُوکیف قِد وشیها وِکان را مَزلَاخ هَکَا تُوب شمِصوَہ بیعُود وِ رَامَزلَاخ شَاینَا صریخَه تِدُ وِشیم اَحِریم

(ترجمہ عربی) وان قبحة بعین بعلها: لانه لحز تها ماهوی الذی لم یزفها: وکان له ان یزفها و یتخلی بها للتزویج وثمن شرایها هو ثمن نکاحها وفی الایة کنایة بامر النکاح وبانه لا یجوز مع الغیر عرسها۔

اردو ترجمہ (توریت) اگر بری ہے اپنے خاوند کی نظروں میں (تفسیر) کہ اُسے غبت نہ ہوئی اُس کے ساتھ خلوت کی (توریت) جس نے زفاف نہ کیا (تفسیر) کہ اس کو مناسب تھا اس سے زفاف اُس کے ساتھ خلوت کرنا جورو کرنے کے لئے اور قیمت اُس خرید کی قیمت ہے اُس کی شادی کی اور یہاں کنایہ ہے کہ آیت میں حکم شادی کا ہے اور کنایہ ہے کہ وہ

دوسرے سے شادی کرنے کی مجاز نہیں۔

اسی موقع پر اس بات کا بھی خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح ایسی جورو پر جس کی بابت بعوض شادی روپیہ دیا گیا ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا۔ اسی طرح ایسی جورو پر بھی جو بطور ڈولہ کے آئی ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا ہے۔ جیسے کہ ابی غایل حضرت داؤد کی بیوی پر لونڈی اور خادمہ کا اطلاق ہوا ہے۔ جس کا ذکر عنقریب آتا ہے اور جو کہ یہ امر حضرت ہاجرہ کے حال سے بھی نہایت مناسب تھا۔ اس لیے مجازاً اُن کی نسبت بھی امہ یعنی لونڈی بولا گیا۔ مگر جب کہ رقیت کسی طرح ثابت نہیں ہے۔ تو اس لفظ سے حقیقی لونڈی مراد ہو نہیں سکتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان مقاموں میں بھی امہ سے جورو مراد ہے۔ مگر سریہ کا یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جب بنی اسرائیل کی لڑکیاں لونڈیاں ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ تو سریہ کیونکر ہو سکتی ہیں۔

اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جن مقاموں کا بیان ہوا وہاں قرینہ ہے جس سے امہ سے لونڈی مراد نہیں ہو سکتی مگر جہاں حضرت ہاجرہ کی نسبت امہ کا اطلاق ہوا ہے وہاں کیا قرینہ ہے جس سے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لیے جائیں اس شبہ کے رفع کرنے کو ناظرین کو ذرا توجہ کی تکلیف دی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بلکہ اُس کے بعد بھی یہ دستور تھا کہ لونڈی میراث نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے لیا اور راحیل یعقوب علیہ السلام کی بیویوں نے اُن سے کہا کہ "کیا اب ہمارے لیے اپنے باپ کے گھر میں کچھ حق میراث ہے۔ کیا ہم اجنبیہ نہیں شمار کی گئیں۔ کیونکہ بیچ ڈالا ہم کو اور قیمت بھی کھا گیا" پیدائش باب ۳۱۔ آیت ۱۴ و ۱۵۔

اور لونڈی کی اولاد جو دوسری سے ہو وہ بھی لونڈی اور غلام ہوتی تھی اُن کے لیے میراث نہ تھی۔ چنانچہ یہ حکم موسٰے کو بھی دیا گیا اور لونڈی کی اولاد جو مالک سے ہو وہ بیوی کی اولاد کے ساتھ میراث نہیں پاتی تھی جو کچھ ان کو باپ اپنی زندگی میں دے، وہی ان کو ملتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے قطورہ کی اولاد کو اپنی زندگی میں کچھ دے کر الگ کر دیا تھا جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۲۵ میں مندرج ہے۔ جب کہ یہ قاعدہ شرعی معلوم ہوگیا تو اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جب سارہ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے لڑکے کو نکال تو اُس کی وجہ یہ بیان کی کہ میراث نہ پاوے، لونڈی بچہ میرے

بیٹے اسحاق کے ساتھ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سارہ کو اندلیشہ یہی تھا کہ اسمٰعیل اسحاق کے ساتھ میراث پائیں گے۔ پس اگر ہاجرہ لونڈی ہوتیں یا اسمٰعیل لونڈی بچہ ہوتے تو میراث پانے کا خیال کیونکر ہوتا۔ بلکہ اُس وقت کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ زوجہ مطلقہ میراث نہیں پاتی تھی اور جس لڑکے کو باپ عاق یعنی ساقط المیراث کردیتا تھا وہ بھی میراث سے محروم ہو جاتا تھا۔ اس لئے حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے درخواست کی تھی کہ ہاجرہ کو اور اُس کے لڑکے کو نکال دے یعنی ایک کو طلاق دے اور ایک کو عاق کرے، تاکہ دونوں مستحق میراث نہ رہیں۔ یہ قرینہ ہے۔ کہ ان آیتوں میں امہ کا لفظ جو خلاف محل واقع ہوا ہے اُس سے اُس کے مجازی معنی مراد ہیں۔ اور حقیقی مراد نہیں ہو سکتے۔ علاوہ اس کے اور بھی قرینے تو ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

ان مقامات کے سوا کسی مقام میں حضرت ہاجرہ کی نسبت لونڈی کا لفظ توریت میں نہیں آیا ہے بلکہ شِفحَہٗ שִׁפְחָה کا لفظ آیا ہے اور شُفحہ کے معنی لونڈی کے نہیں ہیں اقلوس یہودی نے جس نے توریت کا ترجمہ کالدی زبان میں کیا ہے شُفحہ کا ترجمہ امتا جو بمعنی امۃ لکھا ہے اور اس سبب سے اکثر مترجموں نے توریت کے ترجموں میں جو اور زبانوں میں کئے اُس لفظ کا لونڈی ترجمہ کیا حالانکہ لونڈی کو عبری زبان میں (امہ) אָמָה کہتے ہیں جو عربی لفظ امۃ کا مرادف ہے اور شُفحہ کے معنی خادمہ کے ہیں۔ ہم تفرقہ بتانے کے لئے سموئیل باب ۲۵ کی ۴۱ آیت نقل کرتے ہیں اُس سے امہ اور شُفحہ کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

וַתֹּאמֶר הִנֵּה אֲמָתְךָ לְשִׁפְחָה לִרְחֹץ רַגְלֵי עַבְדֵי אֲדֹנִי׃

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

وَتُّومِرْ هِنِه اَمَاتِخَا لِشِفحہ لرحُوص رَغلی عَبدِی اَدُونی۔

(ترجمہ عربی) وقالت نعم انہ امۃ لہ خادمۃ تغسل رجل عبید سیدی۔

(ترجمہ اردو) اور کہا ہاں اُس کی لونڈی خادمہ ہے اپنے سردار کے خادمہ ہے اپنے سردار کے خادموں کا پاؤں دھونے کے لئے۔

یہ قول ابی غائیل حضرت داوٗد کی بی بی کا ہے جب کہ حضرت داوٗد نے اُس کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور وہ بطور ڈولہ کے حضرت داوٗد کے ہاں آئی تھیں۔

شُفحہ کے اصلی معنی جیسا کہ اہل لغت لکھتے ہیں قبیلہ کی عورت کے ہیں۔ مادہ اس لفظ کا

اور (مشاحہ) שִׁפְחָה کا جس کے معنے قبیلہ کے ہیں ایک ہے لیکن عرف میں اس کے معنی خادمہ کے ہیں پھر اس لفظ سے لونڈی سمجھنا یا غلطی ہے یا تعصب ہے۔

تیسرا مقام جہاں سے اُن کے لونڈی ہونے پر استدلال کرتے ہیں پیدائش باب ۲۵ پہلی آیت سے ۶۔ آیت تک جس کا ترجمہ یہ ہے اور ابراہیم نے پھر عورت کی جس کا نام قطورہ تھا اور اُس سے زمران۔ یقشان۔ مدان۔ مدیان۔ یشباق۔ شوخ پیدا ہوئے! اور یقشان کے شبا اور ددان پیدا ہوئے: ددان کی اولاد اشوریم لطوشیم لامیم: مدیان کی اولاد عیفا عیفر حنوخ ابی دع اور الداعا یہ سب قطورہ کی اولاد ہیں: اور دیا ابراہیم نے جو کچھ اُن کے تھا اسحاق کو! اور سریہ کی اولاد کو ابراہیم نے اپنی حیات میں کچھ دے کر اسحاق کے پاس سے نکال دیا پورب طرف شرقی عرب میں: یہاں چھٹی آیت میں واقع ہے۔ וְלִבְנֵי הַפִּילַגְשִׁים لبنی ھپیلغشیم جس سے استدلال کرتے ہیں פִּילֶגֶשׁ پیلغش פִּילֶגֶשׁ پیلغش جسے کلدی میں פִּלַּקְתָּא پیلقتا یا פִּלַּגְתָּא پلقتا کہتے ہیں یا לְחֵנָה لحینا بولتے ہیں اس کے معنی بے شبہ سریہ ہیں اور اس کی جمع موافق قاعدہ کے פִּילַגְשִׁים پیلغشیم آتی ہے ربی سلیمان ابن اسحاق نے لکھا ہے נָשִׁים בִּכְתֻבָּה פִּילַגְשִׁים בְּלֹא כְתֻבָּה اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کے لئے کتبہ صداق یعنی کابین نامہ ہو اُسے ناشیم کہتے ہیں اور جس کے لئے کابین نامہ نہ ہو اُسے پیلغشم کہتے ہیں بہرنوع یہ امر ثابت ہے کہ پیلغش سریہ ہے استدلال یہ ہے کہ آیت میں پیلغشیم بلفظ جمع ہے اور اس سے مراد قطورہ اور ہاجرہ ہیں کیونکہ سارہ کے سوا یہی دو بیویاں ابراہیم کی ثابت ہیں اس لئے یہ سریہ ہونگی فقط یہ شبہ پیلغیشم کے لفظ سے پیدا ہوا حال یہ ہے کہ عبری میں جمع یے اور میم سے آتی ہے۔ لہذا جمع پیلغشیم ہونا چاہیئے۔ لیکن توریت میں اُس مقام میں پیلغشم بدوں یے کے وارد ہے۔ پیلغشیم نہیں ہے اس لفظ پر مفسرین نے بحث کی ہے۔ بعض نے اس کو جمع مانا ہے اور یے کے نہ ہونے کی یہ توجیہ کی ہے کہ ابراہیم کے ایک ہی سریہ تھی۔ اس واسطے یے کو گرا دیا۔ رشی הַפִּילַגְשִׁים חָסֵר כְּתִיב שֶׁאֵין הָיְתָה אֶלָּא פִּילֶגֶשׁ אַחַת: مقصور لکھا گیا کیونکہ ایک ہی سریہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے اس مفسر نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ سریہ ہاجرہ تھیں اور وہی قطورہ ہیں۔ یعنی ہاجرہ اور قطورہ ایک ہی کا نام ہے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی جس کا بیان ہوگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ اور اسی طرح اکثر مفسرین نے تسلیم کیا ہے کہ سریہ ابراہیم کی ایک ہی تھی لہذا پیلغشم سے جمع مقصود نہیں اور نہ بصورت جمع ہے تو اسی وجہ سے اونقلوس نے جو قدیم مترجم ہے اس لفظ کے ترجمہ میں לְחֵינָתָא لحیناتا

لفظ واحد اختیار کیا ہے ایسی حالت میں اُس سے استدلال کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مدار حجت جمعیت تھی اور وہ غیر مسلّم ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ سریہ جس کی شان میں یہ آیت وارد ہے۔ ہاجر ہیں۔ اس بیان سے کہ ہاجر ہی کا نام قطورہ ہے دعوے بلا دلیل ہے سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس باب میں قطورہ اور اُن کی اولاد کا ذکر ہے اور انھیں کو آیت سریہ بتاتی ہے۔ علاوہ اس کے דִּבְרֵי הַיָּמִים سفر التواریخ اول کے پہلے باب کی ۳۲ آیت میں جہاں سب کے نسب نامے لکھے ہیں جو اہل کتاب میں معتبر لکھا ہے וּבְנֵי קְטוּרָה פִּילֶגֶשׁ אַבְרָהָם ترجمہ۔ اور بنی قطورہ سریہ ابراہیم فلاں اور فلاں یہ وہی اشخاص ہیں جنھیں پیدائش کے باب ۲۵ میں قطورہ کی اولاد گنایا ہے اور فلسطین کے پورب سکونت کی اجازت دی ہے یہاں سے قطورہ کا سریہ ہونا بخوبی ثابت ہے اور اسی مقام پر ۳۳ آیت کے آخیر میں لکھا ہے כָּל־אֵלֶּה בְּנֵי קְטוּרָה׃ یہی سب قطورہ کی اولاد ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ قطورہ ہاجر نہ تھیں ورنہ اسمٰعیل کو بھی اُن میں شمار کرتا بلکہ اس باب کی ۲۷۔ آیت میں گنایا ہے ابراہیم کے بیٹے اسحاق اور اسمٰعیل اُس وقت یہ دستور تھا یعنی اکثر یہ محاورہ تھا کہ بیان نسب میں سریہ کی اولاد کو ماں کی طرف نسبت کرتے تھے اور بیوی کی اولاد کو باپ کی طرف۔ اسی لئے نسب نامہ اسمٰعیل کو ابراہیم کی طرف منسوب کیا اور قطورہ کی اولاد کی نسبت ابراہیم کی طرف نہیں بلکہ قطورہ کی طرف کی۔ علاوہ اس کے ہاجر کی اولاد پاران میں بسی اور قطورہ کی اولاد فلسطین کے پورب جیسا توریت میں بیان ہوا ہے۔ باوجود ان سب تباین اور تغایر کے دونوں کو ایک کہنا بناوٹ ہے علاوہ اس کے ابراہیم نے ہاجر کو طلاق دی تھی اور آئمہ کو زن مطلقہ سے نکاح جائز نہیں۔ چنانچہ موسےٰ کی شریعت میں یہ حکم منصوص ہے تو اگر یہی شریعت ابراہیم کے وقت میں بھی تھی جیسا کہ یہو دعوے کرتے ہیں۔ تو یہ کہنا کہ قطورہ ہاجر ایک ہیں بالکل خلاف ہے۔ اور اگر ابراہیم کے وقت میں یہ شریعت نہ بھی رہی تو خلاف دستور انبیاء کے ہے کسی نبی کا سوائے پیغمبر آخرالزماں کے زن مطلقہ سے نکاح کرنا ثابت نہیں۔

اب ہم رجوع کرتے ہیں پیلغشم کے لفظ اور اُس آیت کے معنی کی طرف اگر تسلیم کیا جائے کہ یہ لفظ جمع ہے جیسا اب جو نسخے موجودہ مطبوعہ لندن و امسٹردام وغیرہ دیکھے گئے اُن میں פִּלַגְשִׁים پیلغشیم یے اور میم کے ساتھ لکھا ہوا خلاف بیان مفسرین کے پایا جاتا ہے۔ تو بھی مدعا مستدل کا ثابت نہ ہوگا کیونکہ جائز ہے کہ یہ جمع פִּלַגְשִׁי پیلغشی اسم منسوب کی ہو، جیسا

اسم منسوب کی جمع اس وزن پر متعارف ہے امثلہ ذیل سے واضح ہوگا دیکھو ١ ٥٠×٥٦:
חִוִּים: יְבוּסִים, עַמּוֹנִים, פְּלִשְׁתִּים وغیرہ بہت لفظ ہیں פִּלַגְשִׁים پیلغشی کے معنی سرّیہ
زا ہیں جسے اس ملک میں پرستار زادہ کہتے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں۔ کہ ابراہیم نے سرّیہ زا
لڑکوں کو کچھ دے کر وہاں سے رخصت کر دیا اور اُن کو فلسطین کے پورب بسنے کی اجازت دی۔
لیکن اُن میں اسمٰعیل نہ تھے۔ بلکہ اُسی باب کی نویں آیت میں لکھا ہے کہ دفن کیا ابراہیم کو اسمٰعیل
اور اسحاق اُن کے لڑکوں نے۔ توریت اور اُس کی تفسیر دیکھنے والوں پر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ہاجر
کا لونڈی ہونا کتب مقدسہ سے ثابت نہیں۔

خطبۂ دوم

مراسم العرب وعاداتہم قبل الاسلام

عرب کے رسومات و عادات اسلام سے پہلے

افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون ط القرآن

ایام جاہلیت کے عرب بلکہ بالعموم سب عرب بغیر کسی استثنا کے (کیونکہ زمانۂ حال کے بدو عرب بھی اپنے مورثوں سے بہت کم اختلاف رکھتے ہیں)، ایک نہایت سادہ مزاج قوم تھی اُن کی معاشرت کا سادہ اور بے تکلف طریقہ قوانین قدرت کے قریب قریب تھا یا اُس سے بالکل مطابقت رکھتا تھا۔ وجود انسانی کا سلسلہ ابتدائی اور ادنےٰ درجہ کی حالت سے رفتہ رفتہ ترقی حاصل کرتا گیا اور آخرکار گلہ بانی کے رُتبہ پر پہنچ گیا جو بمقابلہ اُس کی پہلی حالت کے نہایت عمدہ اور افضل تھا۔ اس حالت کے تبدیل ہونے سے انسانوں کو آپس میں امن اور صلح سے رہنے اور اپنی محدود اور سادہ احتیاجوں کے رفع کرنے کو بہت سا سرمایہ مل گیا۔ بھیڑوں کی اُون سے ایک قسم کا موٹا ٹاٹ بنانا سیکھ لیا جس کو بذریعہ میخوں کے زمین پر خیمہ کی طرح کھڑا کرکے اُس کے اندر رہا کرتے تھے اور جب اُن کو اپنے گلہ کو کسی دوسری عمدہ چراگاہ پر لے جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اپنے ڈیروں کو اُس جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جاکر کھڑا کرتے تھے اور وہیں رہنے لگتے تھے۔ اُن کی پوشاک صرف ایک لمبی بن سی ہوئی چادر ہوتی تھی جس کو بطور تہمت کے اپنے کمر سے لپیٹ لیتے تھے۔ اُن کا کھانا نیم برشت گوشت اور اونٹ کا دودھ اور کھجوریں ہوتا تھا۔ اُن کی تمام ملکیت اور جائداد مویشی گھوڑے اور وہ عرب کا بیش بہا جانور یعنی اونٹ اور لونڈی اور غلام ہوتی تھی اور تمام ملکیت میں لونڈی اور غلام سب سے گراں بہا خیال کیے جاتے تھے۔

بدو عرب کی معاشرت جس کو خانہ بدوش عرب کا نمونہ خیال کرنا چاہیے۔ ایک چرواہے کے طریقہ معاشرت سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ خیمہ میں رہا کرتا تھا۔ پانی اور چراگاہ کی جستجو میں پھرا کرتا

تھا۔ مگر بعض جو زیادہ تمدن پسند تھے باہم مجتمع ہو کر اپنے خیموں کی باقاعدہ ترتیب اور انتظام سے دیہات بنا لیتے تھے اور اگر اُن کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی تھی تو قصبے اور شہر پیدا ہو جاتے تھے اور وہاں کے باشندے کسی قدر مہذب زندگانی کے فوائد سے جلد متمتع ہوتے تھے۔ ان کا وقت کاشت کاری میں کھجوروں اور درختوں کے بونے میں جن کے پھلوں سے اوقات بسری ہو اور مختلف انواع کی دست کاری اور ہر قسم کی تجارت اور سوداگری میں صرف ہوتا تھا وہ ان اشیاء کی سوداگری کیا کرتے تھے۔ گرم مصالح۔ بلسان۔ مر۔ لوبان۔ دارچینی۔ سنا۔ لیڈنن۔ سونا۔ جواہرات۔ موتی۔ ہاتھی دانت۔ آبنوس اور لونڈی اور غلام۔

بہت پرانے زمانہ سے یہ لوگ مصر اور شام اور اور قرب وجوار کے ملکوں سے بذریعہ کاروان کے تجارت کرتے تھے۔ توریت سے بھی پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے وقت میں بھی یہی پیشہ رکھتے تھے۔ مگر ان دونوں قوموں یعنی خانہ بدوش اور تجارت پیشہ کا قومی چال چلن ایک ہی سا تھا۔ کھانے پینے میں کم خرچ اور کفایت شعار ہونا اور اُس پر راضی اور قانع رہنا ایک عمدہ اور بیش بہا وصف خیال کیا جاتا تھا۔ باہلی ایک نامی شاعر اپنے بھائی کے ایک مرثیہ میں جس میں اُس نے اُس کی موت کا حال لکھا تھا۔ اس طرح پر اپنے بھائی کی تعریف کرتا ہے۔

تکفیہ فلذۃ لحم ان الم بھا من الشواء ویکفی شربہ الغمر

معتدل نیند کی بھی بہت تعریف کی جاتی تھی۔ ہذلی ایک نامی شاعر اس عادت کی یوں تعریف کرتا ہے۔

قلیل غرار النوم اکبر ھمہ دم الثار او یلقی کمیا مسقعا

علی الصباح اٹھنا بھی ایک عمدہ صفت شمار ہوتی تھی اور اُس آدمی کی قوت اور مستعدی پر دلالت سمجھی جاتی تھی۔ امرء القیس خود اپنی تعریف اس طرح کرتا ہے:۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا

نہایت فیاضی سے مہمان نوازی ان کا قومی خاصہ تھا اور اُس کو جملہ حسنات اور اوصاف میں اعلےٰ اور افضل سمجھتے تھے۔ مسافروں اور مہمانوں کی خاطر داری بے انتہا فیاضی سے کرنا اور مہربانی اور اخلاق اور تعظیم کے ساتھ پیش آنا ایک پاک فرض خیال کیا جاتا تھا اور اگر کوئی اُس کو ترک کر دیتا تھا یا غفلت کرتا تو تمام لوگ اُس کو دل سے بُرا جانتے تھے اور اس کی حقارت

کرتے تھے۔ ہذلی شاعر خود اپنے پر اس شعر میں بددعا کرتا ہے اگر وہ مہمان نوازی کے طریقہ میں کچھ قصور کرے۔

لا دردری ان اطعت نازلکم قشر الحتی وعندی البر مکنوز

ہمسایہ کے حال پر مہربانی اور اس کی خبرگیری کرنا اور اُس کے مکان اور خاندان اور مال کی نگرانی اور حفاظت کرنا نیک آدمیوں کے اوصاف میں سے تھا اور اگر کوئی اس باب میں ذرا بھی بے پروائی یا سستی کرتا تھا تو اُس کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور اُس کا کوئی معیوب لقب کہہ دیتے تھے۔ بکری شاعر علقمہ کی اس طرح پر ہجو کرتا ہے۔

تبیتون فی المشتا ملاء بطونکم وجاراتکم غرثی یبتن خماصا

اور ایک اور شاعر زبیدی اس صفت میں ایک شخص کی اس طرح پر تعریف کرتا ہے۔

وجارهم احمی اذا ضیم غیرهم

قیدیوں کو چھڑانا اور محتاجوں اور بیکسوں کی مدد کرنا تمام نیکیوں میں افضل اور جمیع اوصاف میں سب سے زیادہ قابل ستایش خیال کیا جاتا تھا۔ ایک شاعر اپنی تعریف اس طرح پر کرتا ہے۔

ونفکنا غل امرء عانقیس منه بعد ماطال حبسه والعناء

ایک اور شاعر طرفہ اس صفت کا بیان اس طرح پر کرتا ہے۔

ولکن متی یسترفد القوم ارفد

ہذلی شاعر ایک صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

واحمی المصاب اذا ما دعی

ایک شریف عرب کو اپنی عزت کا لحاظ اور اپنے وعدہ کا خیال ایسا ضروری سمجھا جاتا تھا جیسے کہ مذکورہ بالا اوصاف ضروری سمجھے جاتے تھے۔ عمرو ایک مشہور شاعر اس طرح پر کہتا ہے۔

ونوجد نحن امنعهم ذمارا واوفاهم اذا عقدوا یمینا

صاف اور ستھری پوشاک اور خوشبودار چیزیں عمدہ اور پسندیدہ اشیاء میں سمجھی جاتی تھیں۔ عدوانی کی بیٹی اپنے شوہر کی تعریف میں اس طرح پر کہتی ہے:۔

حدیث الشباب طیب الثوب والعطر

بالوں کو مشک سے معطر کرنا اور خوشبودار چمڑے کی جوتیاں پہننی امارت کی نشانیاں تھیں۔

ایک شاعر اپنی ممدوحہ کی اس طرح پر مدح کرتا ہے۔

اذا التاجر الداری جاء بفارۃ   من المسك اراحت فی مفارقۃ تجری

پرہیزگاری بھی اوصاف حسنہ میں شمار کی جاتی تھی۔ حاتم طائی اس طرح پر لکھتا ہے۔

واغفر عوراء الکریم ادخارہ   واعرض عن شتم اللئیم تکرما

فصاحت و بلاغت لطافت وظرافت بھی فضیلت کے دائرہ کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں۔ عمرو شاعر اپنے بیٹے غرار کی تعریف میں کہتا ہے۔

وان غرارا ان یکن غیر واضح   فانی احب الجون ذا المنطق الدم

نابغہ شاعر کند زبان ہونے سے اس طرح خدا سے پناہ مانگتا ہے۔

اعل نی رب من حصر وعی

گھوڑے کی سواری کی اگر بچپن ہی سے مشق کی جاتی تھی تو نہایت تعریف اور توصیف ہوتی تھی اور اگر کوئی بڑا ہو کر گھوڑے کی سواری سیکھتا تھا تو ہجو اور طعنہ کا نشانہ بنتا تھا ایک شاعر نے ایک قوم کی ہجو اس طرح پر کی ہے۔

لم یرکبوا الا بعد ما کبروا   فہم ثقال علی اکنافہم میل

بھیڑیے کا شکار کرنا بہادر ہونے کا عمدہ ترین ثبوت تھا۔ شماخ شاعر اس طرح پر کہتا ہے۔

وما قد دفعت الذئب عنہ

ریگستان کے طول وعرض کا اندازہ اُس کی ریت کی ایک مٹھی بھر کر سونگھنے سے دریافت کرتے تھے۔ امراء القیس شاعر اس طرح پر بیان کرتا ہے۔

اذا الناقۃ العوذ الدیافی غرغرا

زمانۂ جاہلیت کے عرب میں شعر و شاعری نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی تھی۔

جہاں یہ خوبیاں اُن میں تھیں اُسی کے ساتھ نہایت بد اخلاقی اور فحش عرب جاہلیت میں پھیلا ہوا تھا۔ قصائد کے شروع میں جو تشبیب کے اشعار ہوتے تھے ان میں دولت مند اور امیروں کی لڑکیوں اور عورتوں اور بہنوں کا نام لے لے کر بیان کرتے تھے اور ہر طرح کے عیبوں کو علانیہ اُن کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے اختیار میں ایک جن رہتا ہے اور جس قدر بڑا شاعر ہوتا ہے اُسی قدر زبردست جن اُس کے زیر حکم رہتا ہے حسین نامی شاعر اپنی تعلّی میں اس طرح کہتا ہے۔

ومانفرت جنی ومافل مبردی

بدکاری اور زناکاری سے نادم نہیں ہوتے تھے اور ہر طرح کی غیر مہذب نظم میں از راہ بے شرمی اُس کو مشتہر کرتے تھے اور اُس پر فخر کرتے تھے۔

سب لوگ شراب اور نہایت قوی منشی عرقوں کے پینے سے بدرجۂ غایت اُنس رکھتے تھے اور مدہوشی کی حالت میں تمام لوگوں سے نہایت خراب اور معیوب باتیں سرزد ہوتی تھیں۔

قمار بازی سب لوگوں کا بلا استثنا۔ ایک ہر دل عزیز کھیل تھا اور اگر کوئی خاص مقام قمار بازی کا مشہور ہوتا تھا تو لوگ دور دراز مسافت سے وہاں جوا کھیلنے کو جایا کرتے تھے سود خواری بھی عام طور سے نہایت درجہ مروج تھی۔

لونڈیوں کو جو قینات کہلاتی تھیں گانا بجانا اور ناچنا سکھایا جاتا تھا اور وہ حرام کاری کرنے کی مجاز تھیں اور اس حرام کاری کی آمدنی اُن کے آقا اپنے تصرف میں لاتے تھے۔

رہزنی اور غارت گری اور قتل روزمرہ کی باتیں تھیں۔ انسان کا خون بلاخوف اور بغیر تاسف کے ہر روز ہوا کرتا تھا۔ لڑائی میں جو عورتیں قید ہوتی تھیں اُن کو فتح مند لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ حارث شاعر اس طرح پر کہتا ہے۔

ثم ملنا علی تمیم فاحرمنا ونینا بنات مرا ماء

ٹوٹکوں میں اور شگون لینے میں اُن کو نہاہت مضبوط اعتقاد تھا۔ جب کوئی مصیبت یا تباہی اُن پر نازل ہوتی تھی تو پتھر کی چھوٹی کنکریوں پر کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے اور ان کو پھینکتے تھے اور ایسا کرنے سے اُس مصیبت کے دُور ہونے کی توقع رکھتے تھے۔ جانوروں کے اُڑنے اور لوٹنے سے بھی نیک اور بدشگون لیا کرتے تھے۔ مثلاً اگر کوئی جانور کسی شخص کی بائیں طرف سے دائیں طرف رستہ کاٹ گیا تو اُس کو نیک شگون سمجھتے تھے اور "سانح" کہتے تھے۔ لیکن اگر دائیں جانب سے بائیں طرف رستہ کاٹ گیا تو اُس کی بدشگونی سمجھتے تھے اور "جارح" کہتے تھے۔ اس قسم کی تفاول کا عام نام "طیرہ" تھا۔

لبید ابن ربیعہ نے اسلام قبول کرنے سے پہلے اس موقع پر جب کہ اُس کا بھائی بجلی کے صدمہ سے مارا گیا یہ شعر کہا تھا۔

لعمرك ماتدری الضوارب بالحصی ولا زاجرات الطیر ما اللہ صانع

جاہلیت کے عرب کسی کام کے ہوجانے پر بھیڑ کی قربانی کرنے کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تھا تو بھیڑ کے بدلے ہرن کو مار دیتے تھے اور اُس ہرن کو عتیرہ کہتے تھے مگر بھیڑ کے بدلے ہرن کو مار دینا ایک معیوب کام خیال کیا جاتا تھا۔ کعب شاعر اپنے خاندان کی تعریف میں کہتا ہے:-

وما عتروا لظباء بنی کعب

اگر کوئی کسی کو مار ڈالتا تھا تو خون کے عوض خون ہی معزز بدلا گنا جاتا تھا۔ جو لوگ خون کے بدلے دِیت لے لیتے تھے اُن کو اُن کے ہم جنس اور ہم وطن حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ عمرو ابن معدیکرب کی بہن اپنے بھائی کے خون کا کسی شرط پر تصفیہ کرنے سے منع کرتی ہے۔

ولا تاخذ وا منہم افا لا دا بکرا

اُن کا اعتقاد تھا کہ اگر کسی آدمی کے خون کا عوض خون سے نہ لیا جائے تو ایک چھوٹا پردار کیڑا مقتول کے سر میں سے نکل کر آسمان میں چیختا پھرتا ہے۔ اس عجیب کیڑے کو "ہامہ" اور "صدی" کہتے تھے۔ لبید شاعر ایک نوحہ میں اس طرح کہتا ہے۔

فلیس الناس بعدک فی نفیر وما ھم غیر اصداء وھام

ہر شخص کے مرنے کے بعد یہ دستور تھا کہ اُس کے اونٹ کو اُس کی قبر سے باندھ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بھوک اور پیاس کے مارے وہ مرجاتا تھا اور اُس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے۔ لبید شاعر اپنے ممدوح کی سخاوت کی اس طرح تعریف کرتا ہے۔

تاوی الے الاطناب کل ذریۃ مثل البلیۃ قالص اھدامہا

جب کوئی مرجاتا تھا تو برس روز تک اُس کا سوگ رکھتے تھے اور اُس کو رویا کرتے تھے۔ لبید شاعر اپنے وارثوں کو یوں وصیت کرتا ہے۔

الی الحول ثم اسم السلام علیکما ومن یبک حولا کاملاً فقد اعتذر

لڑائی میں عورتیں مردوں کے ہمراہ ہوتی تھیں اور ہر طرح اُن کی مدد کرتی تھیں جب کہ اُن کے شوہر لڑائی میں مصروف ہوتے تھے تو وہ پکار پکار کر کہتی تھیں "آگے بڑھو آگے بڑھو اے ہمارے جری اور بہادر خاوندو اگر تم کوتاہی کرو گے تو ہم کو دشمن سے نہ بچاؤ گے تو ہم تمھاری بیویاں نہ ہوں گی۔

خشک سالی قحط اور گرانی کے زمانہ میں اپنے اونٹوں کو مجروح کر کے اُن کا خون پیا کرتے تھے۔

میں مینہ برسنے کا ٹوٹکا اس طرح پر کرتے تھے کہ پہاڑوں میں ایک گائے کو لے جاتے تھے اور اُس کی دُم میں سوکھی ہوئی گھاس اور کانٹے اور جھاڑیاں باندھ کر اُس میں آگ لگا دیتے تھے اور گائے کو پہاڑوں میں چھوڑ دیتے تھے۔

گھوڑ دوڑ اور اُس پر بازی لگانا جس کو وہ "رہان" کہتے تھے اُن میں مروّج تھی۔ دو قوموں اور فریقوں کے باہم جنگ وجدل ایک تھوڑی سی غلط فہمی کی وجہ سے قائم ہو جاتی تھی بعض اوقات یہ لڑائیاں ایک مدت مدید تک جاری رہتی تھیں جیسے کہ عبس اور ذبیان کے باہم پورے سو برس تک لڑائی جاری رہی۔

باوجودیکہ کوئی شخص اپنے غلاموں کو آزاد کر دیتا تھا تو بھی اُس کی ملکیت کا استحقاق اُس کو باقی رہتا تھا اور اُس استحقاق کو فروخت کر دینے کا بھی مجاز تھا اور مشتری اُن غلاموں پر اپنی ملکیت قائم کرتا تھا۔ اور اس طرح سے یہ بدبخت ہمیشہ کی آزادی سے بالکل محروم تھے۔

عورتیں کسی جانور کا دودھ نہیں دوہتی تھیں اور اگر کسی خاندان کی عورتوں کو دودھ دوہتے دیکھ پاتے تھے۔ تو اُس خاندان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور وہ خاندان لوگوں کی آنکھوں میں دفعتًا حقیر ہو جاتا تھا۔

مجرم کو فوجداری کی سزا میں جلتی ہوئی ریت پر بٹھا دیتے تھے۔ مُردہ جانوروں کا گوشت کھاتے تھے اور اُس کو بہت لذیذ غذا سمجھتے تھے جو اونٹنی یا بھیڑ یا بکری دس دفعہ بچہ جن لیتی تھی۔ اُس کو چھوڑ دیتے تھے اور وہ چھوٹی پھرا کرتی تھی اور جب وہ مر جاتی تھی تو اُس کا گوشت مرد کھاتے تھے اور عورتوں کو اس کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ اگر اونٹنی یا بھیڑ یا بکری پانچویں دفعہ مادہ بچہ جنتی تھی تو اس کے کان کاٹ کر اُس کو چھوڑ دیتے تھے اور اُس کو "بحیرہ" کہتے تھے اور اُس کا گوشت کھانا اور دودھ پینا منع تھا۔

کسی کام کے ہو جانے پر اونٹوں کو بطور سانڈ کے چھوڑ دینے کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تھا تو اونٹ کو بطور سانڈ کے چھوڑ دیتے تھے اور وہ جہاں چاہتا تھا پھرا کرتا تھا۔

اگر کوئی اونٹنی دس بچے دے چکتی تھی اور بکری سات بچے تو عورتوں کو اُس کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی اور صرف مرد ہی اُس کا گوشت کھا سکتے تھے۔

اگر کسی بکری کے مادہ بچہ ہوتا تھا تو مالک اُس کو اپنے لئے رہنے دیتا تھا، اور اگر نر پیدا ہوتا تھا۔ تو بتوں پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا تھا اور اگر دو بچے ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتے

تو مالک دونوں کو اپنے لئے رکھتا تھا اور وہ "وصیلہ" کہلاتی تھی۔

جو اونٹ کہ دس بچوں کا باپ ہو چکتا تھا وہ چھوڑ دیا جاتا تھا اور جہاں وہ چاہتا تھا پھرا کرتا تھا اور بنام "حامی" موسوم ہوتا تھا۔

قسم لینے کا نہایت سنجیدہ قاعدہ یہ تھا کہ آگ جلا کر اُس میں نمک اور گندھک پیس کر ڈالتے تھے۔ یہ آگ "ہولہ" کہلاتی تھی اور اُس کا جلانے والا "مہول" کہلاتا تھا۔ عوص شاعر اس طرح پر کہتا ہے۔

اذا استقبلته الشمس صد بوجھہ کما صد عن نار المھول محالف

قسم کے مستحکم کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ تھا کہ میزاب خانہ کعبہ کے نیچے چابک کمان اور جوتی رکھ دیتے تھے اور اس طرح کرنے سے قسم پختہ ہو جاتی تھی۔

اقرار اور وعدہ کے مستحکم کرنے کو اپنے بزرگوں کی اور بتوں کی قسم کھایا کرتے تھے۔

بالغ مرد اپنے والدین کی وراثت پانے کے مستحق ہوتے تھے۔ نابالغ لڑکے اور عورتیں حصہ نہیں پاتی تھیں۔

قرضہ پر سود لیتے تھے۔ ایک قاعدہ یہ تھا کہ اگر قرضہ وقت معینہ پر ادا نہ ہوتا تھا تو اُس کی تعداد کو دو چند کر دیتے تھے اور میعاد ادا کو بڑھا دیتے تھے۔

عرب جاہلیت انتقام لینا واجب سمجھتے تھے۔ لیکن مختلف قوموں میں باہم حقوق کی برابری کو نہیں مانتے تھے۔

اگر کسی شخص کے قاتل کا سُراغ نہ لگتا تھا۔ تو جس قوم کے شخص پر قتل کا شبہ ہوتا تھا پچاس معزز شخص فرداً فرداً اپنی بے گناہی کی قسم کھاتے تھے۔

ہر شخص گو وہ اجنبی ہی ہو دوسرے شخص کے گھر میں درانہ چلے آنے کا مجاز تھا اور اندر آنے سے پہلے اندر آنے کی اجازت طلب نہیں کرتے تھے۔

کسی رشتہ دار کے گھر کھانا کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

دس آدمی بشراکت ایک جانور کو خریدتے تھے اور ہر ایک شخص کے حصہ کو متعین کرنے کے واسطے دس پانسے (جس میں ایک سادہ ہوتا تھا اور باقی نو پر حصوں کے اندازہ کا نشان بنا ہوتا تھا) پھینکے جاتے تھے اور جو پانسا جس کے نام پڑتا تھا وہی اُس کا حصہ ہوتا تھا۔

خانہ کعبہ میں سات تیر رکھے ہوئے تھے اور ہر تیر پر ایک علامت بنی ہوئی تھی۔ بعضوں پر

کام کرنے کے حکم دینے کی اور بعضوں پر اُس کام کرنے سے منع کرنے کی علامت تھی۔ ہر شخص پیشتر اس سے کہ کوئی کام شروع کرے اُن تیروں سے استخارہ کرتا تھا اور اُسی کے بموجب کام کرتا تھا ان تیروں کو "ازلام" کہتے تھے۔

تمام عرب جاہلیت کا شیوہ بُت پرستی تھا اور جن بتوں کی وہ پرستش کیا کرتے تھے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ھبل۔ ایک بہت بڑا بُت تھا جو خانہ کعبہ کے اوپر رکھا ہوا تھا۔

(۲) ود۔ قبیلہ بنی کلب کا یہ بُت تھا۔ اور وہ قبیلہ اُس کی پرستش کرتا تھا۔

(۳) سواع۔ قبیلہ بنی ندحج کا یہ بت تھا اور وہ اُس کی پرستش کرتے تھے۔

(۴) یغوث:۔ قبیلہ بنی مراد کا یہ بُت تھا اور وہ اُس کی عبادت کرتے تھے۔

(۵) یعوق:۔ بنی ہمدان کے قبیلہ کا یہ بُت تھا اور وہ اس کو معبود سمجھتے تھے اور عبادت کرتے تھے۔

(۶) نسر:۔ بنی ہمدان کے قبیلہ کا یہ بُت تھا اور یمن کے لوگ اُس کی پرستش کرتے تھے۔

(۷) عُزّیٰ:۔ قبیلہ بنی غطفان کا یہ بُت تھا اور اُس کی پرستش وہ قبیلہ کیا کرتا تھا۔

(۸) لات۔ اور

(۹) مناۃ:۔ یہ بُت کسی خاص قبیلہ سے علاقہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ عرب کی تمام قومیں اُن کی پرستش کیا کرتی تھیں۔

(۱۰) دوار:۔ یہ بُت نوجوان عورتوں کی پرستش کرنے کا تھا وہ چند دفعہ اُس کے گرد طواف کرتی تھیں اور پھر اُس کو پوجتی تھیں۔

(۱۱) اساف:۔ جو کوہ صفا پر تھا اور

(۱۲) نائلہ:۔ جو کوہ مروہ پر تھا۔ ان دونوں بتوں پر ہر قسم کی قربانی ہوتی تھی اور سفر کو جانے اور سفر سے واپس آنے کے وقت اُن کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

(۱۳) عبعب:۔ ایک بڑا پتھر تھا جس پر اونٹوں کی قربانی کرتے تھے اور ذبیحہ کے خون کا اُس پر بہنا نہایت ناموری کی بات خیال کی جاتی تھی۔

کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم کی مورت بنی ہوئی تھی اور اُن کے ہاتھ میں وہی استخارہ

کے تیر تھے جو "ازلام" کہلاتے تھے اور ایک بھیڑ کا بچہ اُن کے قریب کھڑا تھا اور حضرت ابراہیم کی مورت خانہ کعبہ میں رکھی ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی تصویریں خانہ کعبہ کی دیواروں پر کھینچی ہوتی تھیں۔

حضرت مریم کی بھی ایک مورت تھی اس طرح پر کہ حضرت عیسےٰ اُن کی گود میں ہیں یا اُن کی تصویر اس طرح خانہ کعبہ کی دیواروں پر کھینچی ہوتی تھی۔

عرب کی دیسی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "ود" اور "یغوث" اور "یعوق" اور "نسر" مشہور لوگوں کے جو ایام جاہلیت میں گذرے ہیں۔ نام ہیں اُن کی تصویریں پتھروں پر منقش کرکے بطور یادگار کے خانہ کعبہ کے اندر رکھ دی تھیں۔ ایک مدت مدید کے بعد اُن کو رتبہ معبودیت دے کر پرستش کرنے لگے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عرب کے نیم وحشی باشندے ان مورتوں پر خدا ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ اُن لوگوں کو جن کی یہ مورتیں تھیں معبود سمجھتے تھے بلکہ اُن کو مقدس سمجھنے کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ عرب جاہلیت اُن مورتوں کو اُن شخصوں اور اُن کی ارواح کی یادگار سمجھتے تھے اور اُن کی تعظیم اور تکریم اس سبب سے نہیں کرتے تھے کہ اُن مورتوں میں کوئی شان الوہیت موجود ہے۔ بلکہ محض اس وجہ سے اُن کی عزت اور تعظیم کرتے تھے کہ وہ اُن مشہور اور نامور اشخاص کی یادگار ہے جن میں بموجب ان کے اعتقاد کے جملہ صفاتِ الوہیت یا کسی قسم کی شان الوہیت موجود ہے۔ اُن کے نزدیک اُن مورتوں کی پرستش سے اُن لوگوں کی ارواحیں خوش ہوتی تھیں جن کی وہ یادگاریں تھیں۔

ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ خدا تعالیٰ کی جملہ قدرتیں بیماروں کو شفا بخشنا۔ بیٹا بیٹی عطا کرنا قحط و وبا اور دیگر آفات ارضی و سماوی کا دور کرنا ان کے مشہور و معروف لوگوں کے اختیار میں بھی تھا۔ . . . .

. . . . جن کی طرف اُنھوں نے صفات الوہیت منسوب کی تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ اگر مورتوں کی تعظیم اور پرستش کی جائے گی تو اُن کی دعائیں اور منتیں قبول ہوں گی۔

اُن کا یہ بھی متحکم عقیدہ تھا کہ یہ اشخاص خدا تعالیٰ کے محبوب تھے اور اپنی مورتوں کی پرستش سے خوش ہو کر پرستش کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کے قرب حاصل کرانے کا ذریعہ

ہوں گے اور ان کو تمام روحانی خوشی عطا کریں گے اور اُن کی مغفرت کی شفاعت کریں گے۔

اُن کا قاعدہ بتوں کی پرستش کا یہ تھا کہ بتوں کو سجدہ کرتے تھے۔ اُن کے گرد طواف کرتے تھے اور نہایت ادب اور تعظیم سے بوسہ دیتے تھے۔ اونٹوں کی قربانی اُن پر کرتے تھے مویشیوں کا پہلا بچہ بتوں پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا تھا۔ اپنے کھیتوں کی سالانہ پیداوار اور مویشی کے انتفاع میں سے ایک معیّن حصہ خدا کے واسطے اور دوسرا حصہ بتوں کے واسطے اٹھا رکھتے تھے اور اگر بتوں کا حصہ کسی طرح ضائع ہو جاتا تو خدا کے حصہ میں سے اُس کو پورا کر دیتے اور اگر خدا کا حصہ کسی طرح ضائع ہوتا تو بتوں کے حصہ میں سے اُس کو پورا نہیں کرتے تھے۔

حجر اسود اور خانہ کعبہ کی تعظیم تاریخ عرب کے ابتدائی زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے اُس کی بنا کو خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر برخلاف اُن مقدس چیزوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا خانہ کعبہ کو کسی شخص کی یادگار نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ تمام عمارت ہی بہ لقب بیت اللہ ممیز اور ممتاز تھی اور اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کے واسطے مخصوص تھی۔ درحقیقت اس کو ایسا سمجھتے تھے، جیسے کہ یہودی بیت المقدس کو اور عیسائی گرجا کو اور مسلمان مسجد کو خدا کی عبادت کرنے کے لئے اس زمانہ میں سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید میں خانۂ کعبہ کو متعدد جگہ مسجد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

حجر اسود کو بھی مثل ایک بُت کے یا کسی مشہور و معروف شخص کی یادگار کے نہیں سمجھتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ ایک بہشت کا پتھر ہے مگر تحقیق نہیں ہے کہ شروع زمانہ سے یہ خیال تھا یا بعد کو پیدا ہوا۔ جو بات کہ محقق ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بنا ہونے سے پہلے یہ حجر اسود ایک میدان میں اکیلا پڑا ہوا تھا۔ کوئی عرب کی روایت ایسی نہیں ملی جس سے یہ بات تحقیق ہو کہ یہ پتھر اُس میدان میں کیوں پڑا ہوا تھا۔ اور جس زمانہ میں کہ وہ وہاں پڑا ہوا تھا اُس کے ساتھ کیا رسمیں متعلق تھیں۔ مگر یہودیوں کی تاریخ سے ہم کسی قدر صحت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ اگر حجر اسود کے ساتھ کچھ رسمیں ادا ہوتی ہوں گی۔ تو وہ اُنھیں کے مشابہ ہوں گی جن کا برتاؤ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب اس قسم کے پتھروں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ دیکھو کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷، ۸ و باب ۱۳ ورس ۱۸ و باب ۲۶ ورس ۲۵ و باب ۲۸ ورس ۱۸ و کتاب خروج باب ۲ ورس ۲۵۔

خانہ کعبہ کی تعمیر اور حجر اسود کے خانہ کعبہ کے ایک کونہ میں نصب ہونے کے بعد بھی کسی رسم کا اُس کے ساتھ بالتحقیق ہونا پایا نہیں جاتا جو رسم کہ اب تسلیم کی جاتی ہے اور جو حجر اسود کے ساتھ مخصوص خیال ہوتی ہے وہ بوسہ دینا ہے مگر یہ رسم بھی کچھ اُس کے واسطے مخصوص نہ تھی۔ خانہ کعبہ کے اور حصے بھی اسی طرح چومے جاتے تھے۔ خانہ کعبہ کا حال یہ تھا کہ سب لوگ اُس کے اندر بیٹھا کرتے تھے اور خدا تعالےٰ کی عبادت کرتے تھے اور اُس کے گرد طواف بھی کرتے تھے۔ لیکن عجیب ترین رسم یہ تھی کہ یہ عبادت و پرستش مطلق برہنگی کی حالت میں ہوتی تھی۔ عرب جاہلیت اس بات کو بُرا سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کپڑے پہن کر کریں جو ہر قسم کے گناہوں سے ملوث ہوتے ہیں۔

خانہ کعبہ کی ہمسری کے واسطے دو معبد اور یکے بعد دیگرے بنائے گئے تھے ایک تو قبیلہ غطفان نے اور دوسرا یمن میں۔ قبائل خثعم اور بجیلہ نے باشتراک بنایا تھا۔ ان دونوں معبدوں میں بُت رکھے ہوئے تھے جن کو اُن قبیلوں کے لوگ بطور معبود کے پوجتے تھے۔ ان نقلی کعبوں میں سے اول کو تو زہیر بادشاہ حجاز نے چھٹی صدی عیسوی میں بالکل غارت کر دیا تھا اور دوسرے کو جریر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یعنی اُن کے پیدا ہونے کے بعد منہدم کر دیا تھا۔

حج کی رسم کو عرب کے باشندے زمانہ دراز سے مانتے چلے آتے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے زمانہ تک اُس کا پتہ چلتا ہے۔

وقت ادائے حج کے احرام باندھنے کی رسم بھی اُن میں شائع تھی۔ اور اگر کوئی شخص احرام باندھے ہوئے اپنے گھر میں آنا چاہتا تھا تو دروازہ کی راہ سے نہیں آتا تھا، بلکہ پچھواڑے کی دیوار پھلانگ کر اندر آتا تھا۔

صفا اور مروہ کے پہاڑوں کے درمیان دوڑنے کی رسم بھی زمانۂ جاہلیت سے عرب میں رائج تھی جیسے کہ اب بھی مروج ہے۔

جو لوگ حج کرنے کو آتے تھے اُس مقدس میدان میں جمع ہوتے تھے جو عرفات کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن قوم قریش جملہ اقوام عرب میں ذی اختیار تھی اس لئے قریش مع اپنے دوستوں کے مقام مزدلفہ پر جو گرد نواح کی زمین کی نسبت زیادہ بلند اور مرتفع ہے۔ ٹھیرتے تھے اور باقی گروہ عرفات میں مقیم ہوتے تھے جہاں کہ حج کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

حج کی رسم ختم ہونے کے بعد یہ مجمع ایک مقام کو جو منا کہلاتا ہے چلا جاتا تھا اور وہاں اپنے بزرگوں کے نام اور بہادرانہ کاموں کا فخر کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے اور اُن بہادری کے حالات کو اشعار میں پڑھنے سے اور بھی جلا دیتے تھے۔

سال کے چار مہینے متبرک سمجھے جاتے تھے اور حج کی رسم جیسا کہ بالفعل دستور ہے انھیں مہینوں میں سے ایک مہینہ یعنی ذالحجہ میں ادا کی جاتی تھی۔ مگر اُن مہینوں کی حرمت بعض اوقات مبدل اور ملتوی ہو جاتی تھی۔ کس واسطے کہ اگر کوئی لڑائی ان مہینوں میں سے کسی میں واقع ہوتی تھی۔ تو لوگ اُن کی قدرتی ترتیب کو مبدل دینے سے گناہ سے بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ یعنی موجودہ مہینے کو غیر حرام فرض کر لیتے تھے اور ماہ آئندہ کو حرام کا مہینہ سمجھ لیتے تھے۔

عرب جاہلیت ایک میعاد معین تک لڑائی کے موقوف رکھنے کا عہد کر لیتے تھے اور اُس رسم کو حج کا ہم پایہ سمجھتے تھے۔

باشندگان عرب کی ایک تعداد کثیر بُت پرست تھی مگر وہاں ایک فرقہ موسوم بہ "صابئی" بھی تھا جو ثوابت اور سیاروں کی پرستش کرتا تھا۔ اُنھوں نے بے شمار ہیاکل یعنی ستاروں کی پرستش کے معبد تمام ملک میں تعمیر کیے تھے اور اُن کو اُن مقدس ستاروں کی پرستش کے واسطے مخصوص کیا تھا۔ اس وجہ سے عرب کے لوگ علی العموم یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اجرام فلکی انسان کی قسمت پر فرداً فرداً اور نیز بہ ہیئتِ مجموعی نیک یا بد اثر رکھتے ہیں اور باقی مخلوقات پر بھی مؤثر ہیں اور بالخصوص اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ مینہ کا برسنا یا امساک باراں کا ہونا انھیں اجرام فلکی کی نیک یا بد تاثیر پر بالکل منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اور مذاہب بھی عرب میں شائع تھے۔ لیکن ہم اس جگہ اُن کی بحث نہیں کرنے کے۔ کیونکہ یہ مضمون ہمارے اُس خطبہ سے جو اُس کے بعد آئے گا علاقہ رکھتا ہے۔

عورتیں حقیقت میں نہایت خراب اور ذلیل حالت میں تھیں۔ مردوں کو بالکل اختیار تھا کہ جتنی چاہیں اتنی عورتیں کریں۔ اگرچہ اس بات کے تعیُّن کرنے کے لیے کافی قانون منضبط نہ تھا کہ مرد کو کونسی قرابت مند عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے اور کونسی سے ناجائز، مگر بایں ہمہ یہ رسم شائع تھی کہ اُس عورت سے جو قریب تر رشتہ رکھتی ہو، ازدواج نہیں کرتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایسی عورت کی اولاد عموماً ضعیف اور کمزور رہتی ہے۔

ازدواج کی رسم ادا کرتے تھے اور مہر بھی باندھتے تھے۔ طلاق بھی دیتے تھے ہر شخص اپنی زوجہ کو جس طرح ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد پھر اپنی زوجیت میں لے سکتا تھا اسی طرح ہزار بار طلاق دینے کے بعد بھی پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا۔ کیونکہ تعداد طلاق کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔

طلاق کے بعد ایک میعاد مقرر تھی، جس کے اندر عورت کو کسی اور مرد کے ساتھ ازدواج کرنے کی ممانعت تھی اور اُس میعاد کے اندر اگر فریقین میں آشتی ہو جاتی تو پھر اپنی زوجیت میں لے لیتے تھے۔ مرد اس رسم سے بہت ظالمانہ اور وحشیانہ طور سے مستفید ہوتے تھے۔ وہ اپنی جورو کو کسی بہانہ سے طلاق دیدیتے تھے۔ بیچاری عورت میعاد معینہ تک منتظر رہتی تھی اور اس میعاد میں کسی دوسرے سے ازدواج نہ کرسکتی تھی۔ لیکن جب میعاد قریب الانقضا ہوتی تھی تو اُس کا شوہر پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا اور تھوڑے عرصہ بعد پھر اُس کو طلاق دیدیتا تھا اور معینہ کے اختتام کے قریب پھر اپنے ازدواج میں لے لیتا تھا۔

اور اسی طرح

بار بار کیا کرتا تھا۔ عربوں میں ایک یہ بے رحم رسم رائج تھی کہ ہر شخص اس بات کو ایک قسم کی ذلت خیال کرتا تھا کہ وہ عورت جو ایک مرتبہ اُس کی زوجہ تھی۔ دوسرے شخص کے ازدواج میں آئے۔

ایک اور قسم کی طلاق بھی زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں جاری تھی جو "ظہار" کہلاتی تھی اور وہ اس طرح پر ہوتی تھی کہ مرد اپنی زوجہ کے ایک عضو کے چھونے سے باز رہتا تھا۔ یہ کہکر کہ مجھ کو اپنی زوجہ کے جسم کے فلاں عضو کا چھونا ایسا حرام ہے جیسا کہ اپنی ماں یا کسی اور قریب رشتہ والی عورت کے جس کے ساتھ ازدواج ناجائز ہے عضو کا چھونا۔ اس کہنے سے طلاق ہوجاتی تھی۔

عرب جاہلیت کی رسموں میں سب سے زیادہ خراب رسم اور سب سے زیادہ بے رحم، لڑکیوں کا مار ڈالنا یا اُن کو زندہ دفن کردینا تھا۔

تبنیت کی رسم بھی اُن میں شائع تھی اور پسر متبنیٰ اپنے والدین کی جائداد کا حق دار اور وارث خیال کیا جاتا تھا۔

لڑکے اپنی سوتیلی ماؤں کے ساتھ ازدواج کرنے کے مجاز تھے مگر باپ اپنے بیٹے یا متبنے کی زوجہ کے ساتھ شادی کرنے کا مجاز تھا اور اُس کے خلاف عمل کرنا نہایت معیوب اور گناہ

سمجھا جاتا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد اُس کا سوتیلا بیٹا اگر وہ نہ ہو تو کوئی قریب کا رشتہ دار بیوہ کے سر پر ایک چادر ڈال دیا کرتا تھا اور وہ شخص جو اس طرح چادر ڈالتا تھا اُس سے شادی کرنے پر مجبور رہوتا تھا۔

عورتیں متوفی شوہروں کا ماتم ایک سال کامل تک کیا کرتی تھیں اور میعاد معینہ کے بعد بیوہ، اونٹ کی چند خشک مینگنیں یا تو کسی کتے پر یا کندھے پر سے خود اپنے ہی پیٹھ پر پھینک دیتی تھی۔ جس سے یہ مراد تھی کہ اب بیوہ کو اپنے متوفی شوہر کا کچھ بھی خیال نہیں رہا۔

عورتوں میں اپنے گھر سے نکلنے اور عام مجمع میں بدون پردہ اور حجاب کے آنے کا دستور تھا اور اپنے جسم کے کسی حصہ کو کھلا رکھنے اور عوام الناس کو دکھلانے میں کوئی بے حیائی اور بے شرمی کی بات خیال نہیں کرتی تھیں۔

عورتیں مصنوعی بال سر پر لگایا کرتی تھیں اور اپنے جسم کو نیل سے گودا کرتی تھیں۔

خاندان کے تمام اشخاص قسم ذکور تمام قسم کی عورتوں کو چھونے سے جب کہ وہ اپنے معمولی ایام میں ہوں پرہیز کرتے تھے اور اُن عورتوں کو باقی اشخاص خاندان کے ساتھ ملنے جُلنے کی ممانعت تھی۔

مردوں کو قبر میں دفن کرنے کا اعراب جاہلیت میں رواج تھا اور جب کسی جنازہ کو دفن کرنے کے لیے لے جاتے ہوئے دیکھتے تھے تو اور آدمی مُردہ کی تعظیم اور اُس پر افسوس ظاہر کرنے کے لئے سرو قد اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان کا خون بجز انسان کی سانس کے اور کچھ نہیں ہے اور روح محض ایک ہوا انسان کے جسم کے اندر ہے۔ مگر بعض لوگ جو کہ بہ نسبت اُن کے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ روح ایک نہایت چھوٹا سا جانور ہے جو انسان کے پیدا ہونے کے وقت اُس کے جسم میں گھس جاتا ہے اور ہمیشہ اپنے آپ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد وہ جانور جسم کو چھوڑ کر قبر کے گرد چیختا پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اُلو کے برابر ہو جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب دیوؤں اور خبیث ارواحوں کو مانتے تھے۔ تمام خیالی اور وہمی اور فرضی صورتیں جو بیابانوں یا پُرانی مسمار اور منہدم عمارتوں میں اُن کو نظر آتیں اور جن کی کہ

تنہا آدمی کے خیال میں اکثر صورت بن جاتی ہے اُن سب کو مختلف قسم کی خبیث ارواحیں تصور کرتے تھے۔

بعض لوگ ان مغالطات نظری کو مختلف بروج کی تاثیر کی طرف منسوب کرتے تھے اور اُن کی رائے اوروں کی رائے کے مقابلہ میں افضل تر معلوم ہوتی تھی۔

زمانہ جاہلیت کے عرب، نیک اور بدجنات میں عقیدہ رکھتے تھے۔ اُن کی مختلف صورتیں اور شکلیں مقرر کی تھیں اور مختلف نام رکھے تھے۔ ان کے نزدیک بعض جنات نصف جسم انسان کا سا اور نصف جسم روحانی رکھتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب اور قوتوں اور وجودوں میں بھی اعتقاد رکھتے تھے۔ جو انسان کی نظر سے غائب تھے مگر آئندہ کی خبروں کو بآوازبلند ظاہر کر دیتے تھے اور خود ہمیشہ پوشیدہ رہتے تھے۔ وہ فرشتوں کی اور اور ارواحوں کو بھی جو دکھائی نہیں دیتیں مانتے تھے اور مختلف شکلیں اُن کی طرف منسوب کرتے تھے۔

عرب کے زمانۂ جاہلیت کی رسم رواج کو اس مقام پر ہم نے نہایت سرسری طور پر بیان کیا ہے مگر ہم کو اُمید ہے کہ اُن نیم وحشی لیکن عالی دماغ اور آزادمنش باشندگانِ عرب کے خانگی اور سوشیل عام حالات معلوم ہونے سے ایک منصف مزاج شخص اگر ایسا شخص دنیا میں پایا جاتا ہے اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اسلام کے قبل عربوں کا کیا حال تھا اور بعد اسلام کے اُن کا کیا حال ہو گیا اور بالعموم اُن کے اخلاق کس طرح پر تبدیل ہو گئے۔ اُن کی اگلی اور پچھلی حالت کے مقابلہ کرنے میں ہمارا یہ سرسری بیان منصف مزاج شخص کو کافی مدد دے گا اور ایسے نتائج مستنبط کرنے کے قابل کرے گا جن کی جانب اُس کی انصاف پسندی اُس کو ہدایت کرے گی۔

خطبہ سوم

الادیان المختلفۃ التی کانت فی العرب

قبل الاسلام

عرب کے مذاہب قبل اسلام

ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین۔ (القرآن)

اس خطبہ میں ہم اس امر کی تحقیقات بھی کریں گے کہ اُن ادیان میں سے جو زمانۂ جاہلیت میں مروج تھے۔ اسلام کونسے دین سے مشابہ تر ہے اور آیا اس مشابہت اور مماثلت کی وجہ سے اسلام ایک دین حق ثابت ہوتا ہے یا ایک عیارانہ بنایا ہوا قصہ۔

توریت مقدس میں جو بیان انسان کے پیدا ہونے کا اور اُس کے بعد بابل میں زبانوں کے مختلف ہو جانے اور روئے زمین پر پراگندہ ہونے کا ذکر ہے اُسی کو ہم اپنی اس بحث کا جو اُس خطبہ میں ہے ابتدائی مقام فرض کرتے ہیں اور اُسی بناء پر یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ عبادت اور پرستش کی سادگی اور یک رنگی خودبخود اُس وقت تک جاری رہی ہوگی جب کہ انسان تعداد میں کم اور ایک محدود مقام میں تھے۔ مگر جب کہ وہ زیادہ وسیع ملکوں میں پھیل گئے جن کی آب وہوا اور ملک کی بناوٹ مختلف تھی تو اُس وقت ان کے دلوں کو نئے اور عجیب خیالات نے قریبًا ہر ایک بات کی نسبت گھیر لیا خصوصًا اس وجود کی ماہیت کی نسبت جس کی عظمت کے جلوے نیک یا بدخوف وہراس سے ان کو تسلیم کرنے پڑے۔

وہ لوگ اُن قدرتی ظہور کے طبعی اسباب سے جن کے دیکھنے سے ایک تربیت یافتہ آدمی کے دل میں بھی خوف وہراس پیدا ہوتا ہے جیسے کہ بھونچالوں کا آنا زمین کا دھنس جانا اور پھٹ جانا۔ دریاؤں کا جوش۔ سمندروں کا تلاطم۔ پہاڑوں کے عجائبات۔ درختوں کی کرامات۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ۔ بجلی کی کڑک اور چمک۔ اور اُس کے گرنے سے بربادی۔ اور خوفناک طوفانوں

کی تباہی کے اسباب سے محض ناواقف تھے۔ اس لئے اُنھوں نے ان سب کاموں کو کسی ایسے وجود کے کام تصوّر کیئے ہوں گے جس کو وہ اپنے آپ سے بدرجہا اعلیٰ اور زبردست اور بوجہ غیر ظاہر ہونے اُس وجود کے اور بھی زیادہ خوفناک تصوّر کرتے ہوں گے۔ یہی اسباب ہیں جن کے سبب ابتدا میں انسان کے دل میں عبادت کرنے اور قربانیاں چڑھانے اور پوجا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اُن دیوتاؤں کو ان تین طریقوں سے خوش کرنے یا اُن کا غصہ مٹانے میں بوجہ ملک کی خاصیت اور ملک کی آب وہوا کے اور اُس کے باشندوں کے عام مزاج اور چال چلن کے ہر ایک ملک کے باشندوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ہم کو اُمید ہے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا اُس سے اس کتاب کے پڑھنے والے سمجھ جائیں گے۔ کہ عرب میں عموماً مذہبوں کی ابتدا کس طرح پر شروع ہوئی۔

عرب میں جو قومیں قبل اسلام کے موجود تھیں۔ اُن کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں باعتبار مذہب کے چار مختلف فرقوں میں منقسم تھیں۔ بُت پرست۔ خدا پرست، لامذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔

بُت پرستی

انسان کی جبلّت میں جو ہر ایک چیز کے سمجھنے کی طاقت ہے اور جس کو ہم عقل یا سمجھ سے تعبیر کر سکتے ہیں اُس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اپنے وجود کی نہایت ابتدائی منزل میں اوّلاً بتوں کی پرستش کا اپنے ذہن میں خیال پیدا کرے۔ اسی سبب سے اوّلاً اُس کے ذہن میں بتوں کی پرستش کا خیال پیدا ہوا۔ اور پھر رفتہ رفتہ قائم و مستحکم ہوگیا۔

ایک مصنف کا قول ہے کہ " آدمی ازروے خلقت اور جبلّت کے مذہب کو ماننے والا پیدا ہوا ہے " اگر وہ معبود حقیقی سے ناواقف ہوگا تو مجازی معبود اپنے لئے بنائے گا۔ وہ خطروں اور مشکلوں سے گھراتا ہے وہ قدرت کی عظیم الشان طاقتوں کو ہر طرف اپنے اپنے کام میں مشغول دیکھتا ہے جن کے سبب سے اُس کو خوف و رجا پیدا ہوتی ہے اور باوصف اس کے ان کے کام اُس کے خیر اِدرک اور قبضۂ قدرت سے باہر ہیں۔ اس واسطے اُس کے دل میں اپنے سے کسی زیادہ طاقتور شے سے ایک تعلق پیدا کرنے کا جس پر وہ تکیہ اور بھروسہ کر سکے خیال پیدا ہوتا ہے۔ قدرت کے ان کاموں کو ذہن نشین کرنے اور اُن کے سمجھ میں آنے کے

لئے اب اُس کے واسطے صرف ایک طریقہ ہے۔ طبعی اسباب کا تصوّر تو بہت تھوڑے عرصہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابتدائی انسان صرف ایک قسم کی علّت کا گمان کر سکتا ہے۔ یعنی مثل اپنے ایک باارادہ طبیعت کا۔ اس لئے وہ تمام چیزوں کو جنھیں متحرک اور عمل کنندہ پاتا ہے۔ ذی رُوح اور ذی فہم وجود ٹھیرا لیتا ہے اور اُن کی طرف مثل انسانوں کے خیالات اور طبائع منسوب کرتا ہے اور اس سے زیادہ کیا قرینِ قیاس ہو سکتا ہے کہ بذریعہ نذروں اور التجاؤں کے اُن کے مہربان کرنے یا اُن کی بدمزاجی یا غصہ کے دُور کرنے کے واسطے کوشش کرے۔

جب کہ انسان ہنوز وحشیانہ حالت میں تھا اُس نے قدرت کی بڑی بڑی اشیاء کو اپنی فرحت یا مصیبت کے اسباب کی نظر سے دیکھا اور اسی واسطے اُن کو بہ نسبت اپنے زیادہ طاقت ور سمجھا۔ اور اس نیت سے کہ اپنی دعائیں اور التجائیں اُن سے ایک ظاہری شکل میں کرے اس کو اپنی خیالی چیزوں کے مجسم کرنے کے واسطے جواب اُس کے معبود ہو گئے نقاشی یا مصوری گو کیسی ہی ناقص ہو عمل میں لانی پڑی۔ بُت پرستی کی ایک اور بنا کسی قوم کے کسی شخص کی خدمات کی جو اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے مشہور و معروف ہوا۔ ممنونیت کی خواہش تھی یعنی ایسے کارہائے نمایاں جو شاعروں کے وحشیانہ گیتوں اور نظموں میں مشہور ہوئے اور مرنے کے بعد اُس شخص کو معبود ہونے کے رُتبہ کا صلہ دلایا۔ یہی امر عرب پر بھی صادق آتا ہے۔ آفتاب ماہتاب۔ سیارے اور بروج و ملائک اور ارواح جو بقول اُن کے انسانوں کی زندگانی کے واقعات پر حاوی اور قادر تھے۔ اُن سب کو رُتبۂ الوہیت دے رکھا تھا اور اُن کی پرستش کرتے تھے۔ اسی طرح اُن آدمیوں کی بھی پرستش کرتے تھے جنھوں نے اپنے شکر گذار ملک کی خدمتیں بجا لاکر نام حاصل کیا تھا۔

اس طریقۂ پرستش کے اختیار کرنے میں انسانوں کا منشا محض معلّل بہ دنیا تھا۔ اُن بتوں یا ان اشیاء اور اشخاص کی پرستش کا باعث جن کے وہ قائم مقام ہیں یہ اعتقاد تھا کہ اپنے پرستش کنندہ کو ہر قسم کی دنیوی خوشی اور آسائش عطا کرنا اور ان مصیبتوں اور خرابیوں کو جو اُس پر نازل ہونے والی ہوں رد کر دینا اُن کے اختیار میں ہے۔ اور اُن کی پرستش کو ترک کر دینے کی سزا اُن کے اعتقاد میں افلاس۔ بیماری۔ لاولدی اور عبرت انگیز موت ہوتی تھی۔

جب کہ زمانہ بڑھتا گیا جب کہ تہذیب اور شائستگی کو ترقی ہوتی گئی، جب کہ باہمی راہ و رسم کے ذریعے زیادہ شائع اور پُر امن ہوتے گئے جب کہ آدمیوں کو ایک دوسرے سے ملاقی ہونے

کا زیادہ اتفاق ہوتا گیا یہاں تک کہ اپنے خیالات اور اپنی رایوں اور اپنے عقائد کا تبادلہ کرنے کے قابل ہوئے اُن کے دماغ عالی ہوتے گئے اور اُن کی خوشیاں زیادہ شائستہ اور پاک ہوتی گئیں۔

یہی غیر محسوس خیالات کی ترقی عرب میں بھی واقع ہوئی۔ اور اُس ملک کے باشندوں نے اپنے معبودوں کو ہر جسمانی آسائش اور روحانی خوشی کے عطا کرنے کا اُس شخص کی نسبت جس سے وہ راضی ہوں، اختیار کلی دے دیا۔

قدیمی باشندگان عرب کی نسبت یعنی قوم عاد۔ ثمود۔ جدیس۔ جرہم الاولے اور عملیق وال وغیرہ کی اس قدر محقق ہے کہ یہ لوگ بُت پرست تھے۔ مگر ہمارے پاس کوئی ایسی مقامی روایت عرب کی نہیں ہے جو ہم کو ان کی پرستش اصنام کے طریقوں کی تعین اور جو قدرتیں کہ وہ اپنے معبودوں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اُن کی تصریح اور جن اغراض اور ارادوں سے کہ وہ مورتوں کو پوجتے تھے۔ ان کے بیان کرنے میں مطمئن کرے۔ قریب قریب تمام حال جو ہم کو عرب کے بتوں کی نسبت معلوم ہوتا ہے صرف یقطان اور اسمٰعیل کی اولاد کے بتوں کی نسبت معلوم ہے جو عرب العاربہ اور عرب المستعربہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کے بُت دو قسم کے تھے۔ ایک قسم تو وہ تھی جو ملائک اور ارواح اور غیر محسوس طاقتوں سے جن پر کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے اور جن کو مونث خیال کرتے تھے نسبت رکھتے تھے اور دوسری قسم کے وہ تھے جو نامی اشخاص کی طرف جنھوں نے اپنے عمدہ کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی تھی منسوب تھے۔

وہ قدرتی سادگی اور بے تکلفی جو ابتدائی درجہ تمدن میں آدمیوں کی نشانیاں ہیں اُن کی پرستش کے طریقوں میں قابل تمیز نہیں رہی تھیں۔ علاوہ اس کے اُنھوں نے بہت سے خیالات غیر ملکوں کے اور نیز اپنے ہی وطن اصلی کے الہامی مذہبوں سے اخذ کر لئے تھے اور ان سب کو اپنے توہمات سے خلط ملط کر کے اپنے معبودوں کو دنیا اور عقبےٰ دونوں کے اختیارات دیدیئے تھے لیکن اتنا فرق تھا کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیوی اختیارات بالکل اُن کے معبودوں کے ہاتھ میں ہیں اور عقبےٰ کے اختیارات کی نسبت اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ اُن کے بُت یعنی وہ جن کی پرستش کے لئے وہ بت بنائے گئے ہیں اُن کے گناہوں کی معافی کی خدا تعالیٰ سے شفاعت کریں گے اُن کی طرز معاشرت اور اُن کی خانگی سوشیل اور مذہبی اطوار اور رسوم نے بھی اسی طرح سے گردونواح کے ملکوں سے جن کے باشندے الہامی مذہب رکھتے تھے۔ اثر حاصل کیا تھا۔ غرضکہ

قبل ظہور اسلام کے ملک عرب میں بت پرستی کی یہ کیفیت تھی۔

لامذہبی

زمانۂ جاہلیت میں ملک عرب میں ایک فرقہ تھا جو کسی چیز کو نہیں مانتا تھا نہ تو بت پرستی کو اور نہ کسی الہامی مذہب کو۔ اُن کو خدا کے وجود سے انکار تھا اور حشر کے بھی منکر تھے اور جوکہ وہ گناہ کے وجود کے قائل نہ تھے۔ اسی لئے عقبیٰ میں بھی روح کی جزا یا سزا کے قائل نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو جملہ قیود قانونی خواہ رسمی سے مبرّا تصوّر کرتے تھے اور اپنی ہی آزاد مرضی کے موافق کاربند ہوتے تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کا وجود اس دُنیا میں ایک درخت یا جانور کی مانند ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے اور پختگی پر پہنچ کر تنزل پکڑتا ہے اور مرجاتا ہے جس طرح کہ کوئی ادنےٰ جانور مرجاتا ہے اور جانوروں ہی کی مانند بالکل نیست و نابود ہوجاتا ہے۔

خداپرستی

زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں بھی خداپرست عرب تھے اور وہ دو قسم کے تھے ایک تو ایک غیر معلوم اور پوشیدہ قدرت کو جس کو وہ اپنے وجود کا خالق قرار دیتے تھے مانتے تھے۔ لیکن باقی امور میں اُن کا عقیدہ لامذہبوں کے عقیدہ کی مانند تھا۔ دوسری قسم کے فرقہ کے لوگ خدا کو برحق مانتے تھے اور قیامت اور نجات اور حشر اور بقائے روح اور اُس کی جزا اور سزا کے جو حسب اعمال انسانوں کو ملے گی قائل تھے مگر انبیاء اور وحی پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔

اس اخیر فرقہ کا عقیدہ تھا کہ غیر فانی روح کی جزا اور سزا دوسرے جہان میں محض آدمیوں کے نیک اور بداعمال پر جو اس دنیا میں کئے ہوں منحصر ہے۔ اس لئے ضرور ہوا کہ وہ ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے اُن کو دائمی خوشی حاصل ہو اور اُن کو ابدی تکلیف اور خرابی سے محفوظ رکھے۔ لیکن خود ان کے پاس کوئی ایسا اصول جس پر وہ کاربند ہوں موجود نہ تھا، اس لئے انھوں نے ان قواعد کی طرف توجہ کی جن کو اُن کے گرد و نواح کی قومیں مانتی تھیں اور اپنی سمجھ کے موافق ہر قوم سے کچھ کچھ باتیں اخذ کر کے اختیار کیں۔ یہی اسباب تھے جن کے سبب سے عرب کے کچھ لوگ بُت پرست ہوگئے۔ اور بعض نے کسی مذہب معینہ کی پابندی نہیں کی بلکہ اپنی ہی عقل اور سمجھ کے بموجب کاربند ہوئے۔

الہامی مذہب

اسلام سے پہلے چار الہامی مذہب عرب میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے (۱) مذہب صابی۔ (۲) مذہب ابراہیمی اور دیگر انبیاء عرب کا (۳) مذہب یہود (۴) مذہب عیسوی۔

مذہب صابی

اس مذہب کو عرب میں قوم سامری نے رواج دیا تھا جو اپنے آپ کو قدیم مذہب کے پیرو سمجھتے تھے۔ وہ حضرت شیث اور حضرت اخنوخ یعنی ادریس کو اپنے نبی کہتے تھے اور اپنے مذہب کو اُن کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اُن کے ہاں ایک کتاب بھی تھی جس کو وہ صحیفۂ شیث کہتے تھے۔ ہماری رائے میں کوئی یہودی یا عیسائی یا مسلمان صابیوں کے اُس عقیدہ پر جو وہ حضرت ادریس کے ساتھ رکھتے تھے۔ کسی قسم کا اعتراض نہیں کرسکتا ہے۔ توریت میں حضرت ادریس کو ایک مقدس اور باخدا شخص لکھا ہے اور وہ آیت یہ ہے "واخنوخ باخدا سلوک نموده بعد ازاں ناپدید شد چہ خدا اورا گرفتہ بود" (کتاب پیدایش باب ۵ ورس ۲۴) وہ شخص جس کو مسلمان ادریس یا الیاس کہتے ہیں اور توریت کا اخنوخ ایک شخص ہیں۔ صابیوں کے ہاں سات وقت کی نمازیں تھیں اور وہ اُن کو اُسی طرح ادا کرتے تھے، جس طرح کہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ مردہ کی بھی وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک قمری مہینہ کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ مگر جو بُرائی کہ آہستہ آہستہ اُن کے مذہب میں پھیل گئی تھی وہ یہ تھی کہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے تھے۔ اُنھوں نے سات ہیاکل یعنی معبد سبع سیاروں کے لئے بنائے تھے اور جس ستارہ کا جو معبد تھا اُسی معبد میں اُس ستارہ کی پرستش کرتے تھے۔ حرّان کے معبد میں سب لوگ بہ نیت حج جمع ہوا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ کی بھی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ اُن کا سب سے بڑا مذہبی تیوہار اُس روز ہوا کرتا تھا۔ جب کہ آفتاب بُرج حمل میں جو موسم بہار کا اوّل بُرج ہے داخل ہوتا تھا اور چھوٹے چھوٹے تیوہار اُس وقت ہوتے تھے۔ جب کہ پانچ سیارے یعنی زحل۔ مشتری۔ مریخ۔ زہرہ، عطارد بعض برجوں میں یکے بعد دیگرے داخل ہوا کرتے تھے۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ ان سیاروں کا سعد اور نحس اثر انسان کی قسمتوں پر اور دنیا کے اور امور پر ہوتا ہے۔ وہ یقین کرتے تھے کہ بارش یا مینہ کی کشش انھیں ستاروں کی تاثیر

پر منحصر ہے۔ یہ خیال اور اسی قسم کے اور خیالات اور عقائد صابیوں کے سوا عرب کے اور لوگوں میں بھی رائج ہو گئے تھے۔ اُن میں اعتکاف کرنے کا بھی رواج تھا اور غاروں یا پہاڑوں میں چند روز مراقبہ اور سکوت میں بسر کرتے تھے۔

ابراہیمی یا دیگر انبیاء عرب کا مذہب

اسلام سے پہلے پانچ انبیاء عرب میں مبعوث ہوئے تھے (۱) ہود (۲) صالح (۳) ابراہیم (۴) اسمٰعیل (۵) شعیب۔ یہ سب نبی حضرت موسیٰ سے اور بنی اسرائیل کو احکام عشرہ کے عطا ہونے سے پیشتر گزرے ہیں۔

اصل اصول ان جمیع انبیاء کے مذاہب کا خدائے واحد کی عبادت تھا۔ اور دیگر احکام و مسائل جن کو انبیاء مذکور نے بتایا تھا باستثناء احکام و مسائل حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے سب فراموش ہو گئے تھے اور کوئی مقامی روایت ایسی موجود نہیں ہے جو ہم کو اس بات سے واقف کرے کہ وہ احکام کیا تھے اور کتنے تھے؟

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے مذہب کے احکام و مسائل کے لئے بھی اسی طرح کوئی ایسی کافی سند نہیں ہے جس سے کہ ہم اُن کو تفصیل وار بیان کر سکیں اور ایسے بہت کم مسائل ہیں جنھوں نے باستعانت روایت مذہبی اور روایت مقامی کے ایسا تاریخی رتبہ حاصل کیا ہو کہ ہم اُس کے حوالہ دینے کے لائق ہوں۔

حضرت ابراہیم کے تقوٰی اور پرہیز گاری کا سب سے پہلا کام بُت پرستی کا ترک کرنا اپنے باپ کے بتوں کا توڑنا اور خدائے برحق پر یقین کر کے صدق دل سے اُس کی پرستش کرنا تھا۔

ختنہ اور داڑھی کا رکھنا رسوم مذہبی ہیں جن کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ رسمیں حضرت ابراہیم نے مروّج اور معین کی تھیں۔ خدائے پاک کی پرستش کے واسطے قربان گاہوں کے بنانے کی رسم بھی حضرت ابراہیم نے جاری کی تھی اور منجملہ بے شمار قربان گاہوں کے جو حضرت ابراہیم نے بنائیں ایک قربان گاہ اُس مقام پر بھی بنائی تھی۔ جہاں کہ حجر اسود قبل اس کے کہ دیوار کعبہ میں اور پتھروں کے ساتھ نصب ہو کھڑا ہوا تھا۔

خداتعالیٰ کے نام پر قربانی کرنا بھی حضرت ابراہیم نے مقرر کیا تھا اور یہ رسم آج تک اُن کی

اولاد میں اور اُن کی اولاد کے پیروؤں میں بجنسہ مروّج ہے۔

خدائے تعالیٰ کی عبادت کے واسطے خانہ کعبہ کی تعمیر کی نسبت عرب کی تمام مقامی روایتیں اور تمام مؤرخ اس امر پر متفق ہیں کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے بنایا تھا۔

سینٹ پال حواری نے جو گلشیا والوں کے نام خط لکھا ہے، ہماری رائے میں اُس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کو جو "بیت المقدس کا ہم پایہ ہے" حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے بنایا تھا۔

خانہ کعبہ میں اول خدا کی عبادت اُس کے اندر اور باہر کیا کرتے تھے اور اُس کے بعد اُس کے گرد طواف کیا کرتے تھے اور طواف کے وقت ساری جماعت پکار پکار کر خدا کا نام لیتی تھی اور خانہ کعبہ کو بوسہ دیتی جاتی تھی۔

اس مقام پر خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا فرق ہے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے اور اُس کو اور حجر اسود کو بوسہ دینے اور قربان گاہوں کے بنانے اور اُن کی تعظیم کرنے اور حضرت یعقوب کے پتھر کھڑا کرنے اور اُس پر تیل ڈالنے اور نماز میں بیت المقدس یا کعبہ کی طرف سجدہ کرنے غرض کہ اشیائے مجسّم کی تعظیم اور حُرمت کرنے میں اور بُت پرستوں کی اُن رسوم میں جو کہ وہ اپنے بتوں کی نسبت عمل میں لاتے ہیں اور جس کی وجہ سے اُن کو ہر شخص حقارت اور غصہ کی نظر سے دیکھتا تھا اور اب بھی دیکھتا ہے۔

بلا شبہ اُن دونوں کاموں میں بڑا فرق ہے مگر جو امر کہ لوگوں کو ان دونوں کاموں میں صاف صاف تمیز کرنے سے روکتا ہے وہ لفظ "بُت پرستی" ہے جس سے یہ مراد سمجھی جاتی ہے کہ آدمی کسی مجسم اور مصنوعی شے کی تعظیم اور پرستش کرنے میں گنہگار ہوتے ہیں۔

مگر یہ غلطی ہے۔ بُت پرستوں کے مشرک اور گنہگار ہونے کی صرف یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ مجسّم اور مصنوعی اشیاء کی تعظیم اور پرستش کرتے ہیں بلکہ اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چند روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاء کو ان سب قدرتوں کا مالک سمجھتے ہیں جو درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے علاقہ رکھتے ہیں اور اُن اشیاء وغیرہ کی اس طرح بندگی بجا لاتے ہیں، جو صرف خدا تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔ اُن کے بُت اُن وجودوں کے جو غیر ظاہر ہیں قائم مقام اور یادگار ہوتے ہیں، نہ کہ خدا تعالیٰ کے۔ اس اعتقاد کی وجہ سے وہ مشرک اور گنہگار ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ اُن روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی

اشیاء کے ناموں پر کوئی مورت یا بت قائم کر کے پوجتے ہوں، خواہ صرف اپنے دل ہی میں یہ اعتقاد رکھ کر اُن کی پرستش کرتے ہوں۔ اور ظاہر میں اُن کا کوئی بت نہ بناتے ہوں۔ اُن کو بت پرست اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اکثر اُن روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاء کی جن کو وہ صفاتِ الٰہی کا مخزن اور معدن سمجھتے تھے اپنے خیال کے موافق بت اور مورتیں بنا کر اُن کے توسل سے اُن کو پوجتے تھے، اگر وہ ان ظاہری وسائل پرستش کو اختیار نہ کرتے، لیکن باطن میں یہی اعتقاد رکھتے تب بھی اُن کو بت پرست کہنا ناموزوں نہ ہوتا۔

حضرت ابراہیم کی بنائی ہوتی قربان گاہیں جن میں کہ حجر اسود بھی شامل ہے اور حضرت یعقوب کا کھڑا کیا ہوا پتھر اور خانہ کعبہ اور بیت المقدس یہ سب چیزیں کسی مشہور و معروف اشخاص کی یادگار کے طور پر نہیں بنائی گئی تھیں اور نہ وہ کسی فرشتہ یا عظیم الشان قدرتی شے کے نام پر قائم کی گئی تھیں۔ بلکہ بالتخصیص قادر مطلق کے نام پر جو تمام چیزوں کا خالق ہے اور اُسی کی پرستش کی غرض سے بنائی گئی تھیں، جملہ رسوم اور تکلفات جو ان مقاموں پر برتے جاتے صرف خدا تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے مختلف طریقے تھے اور خدا تعالیٰ کی بندگی کو کسی طور پر بجا لائی جائے، جس کو خدا تعالےٰ نے منظور اور مقبول کر لیا ہو۔ ہرگز گناہ یا شرک یا بت پرستی نہیں ہو سکتی۔

تمام آدمیوں کا میدان عرفات میں جمع ہونا جہاں کہ نہ حضرت ابراہیم کا حجر اسود ہے نہ حضرت یعقوب کا سنگ قربان گاہ اور نہ حضرت اسمٰعیل کا معبد بلکہ محض ایک وسیع میدان ہے۔ اُن لوگوں کا ایک ساتھ شامل ہو کر خدا کا نام لے کر پکارنا اور اپنے گناہوں کی معافی چاہنا خاص خدا کی عبادت ہے۔ جس کا نام مسلمانوں نے حج رکھا ہے اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اس طرح پر عبادت کرنے کے بانی ہوئے تھے۔ پس کون شبہ کر سکتا ہے کہ حج اُس واجب الوجود لاشریک لہٗ کی خاص الخاص عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ رفتہ رفتہ ملک عرب میں بت پرستی کا عام رواج ہو گیا تھا۔ مگر بایں ہمہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے اشخاص ایسے بھی تھے جو ان مذاہب الہامی میں سے کسی نہ کسی مذہب کے متبع تھے اور خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے۔ انھیں لوگوں میں سے متعدد نے مجدد مذہب ہونے کا دعوےٰ کیا اور اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی ہونے کا مجمع عام میں وعظ کہا اور لوگوں کو

بُت پرستی چھوڑنے پر ترغیب دی ۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی نسبت مجدد ہونے کی شہرت دی تھی اُن کے نام یہ ہیں۔ حنظلہ ابن صفوان ۔ خالد ابن سنان ۔ اسد ابوکرب۔ قیس ابن صیداہ وغیرہ اور بعضوں نے عبدالمطلب کو بھی ایک مجدد مذہب قرار دیا ہے ۔

لیکن یہ کیسا ہی حیرت انگیز امر کیوں نہ معلوم ہو کہ اُس شخص کی اولاد جس نے اپنے باپ کے بتوں کو توڑا اور اُن کی پرستش سے منہ موڑا اور خدائے برحق کی پرستش کے لئے متوجہ ہوا اور کہا " انی وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین " رفتہ رفتہ اُس بُت پرستی کی حالت میں ڈوب جائے ۔ مگر اس سے زیادہ تعجب انگیز اور حیرت آمیز یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اُسی کی اولاد میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا ۔ جس نے پھر اپنے مورثوں کے بتوں کو بلکہ تمام عرب کے بتوں کو غارت کر دیا اور جس نے خدائے اعظم اور علام الغیوب کی عبادت کو جو تمام چیزوں کا مبداء اور مرجع ہے ۔ رواج دیا اور اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچا دیا ۔ اور جس نے کہ جہالت اور کفر کی اُس گہری تاریکی کو جس میں کہ اُس کے ہم وطن مبتلا تھے دین حق کے پاک اور شفاف نور سے منور کر دیا ۔

یہودی مذہب

یہودی مذہب کو شام کے یہودیوں نے عرب کے ملک میں شائع کیا تھا جو اُس ملک میں جاکر آباد ہوتے تھے ۔ بعض مصنف ناواجب جرأت کر کے یہ رائے دیتے ہیں کہ ایک قوم بنی اسرائیل کی اپنے جتھے سے علیحدہ ہو کر ملک عرب میں جا بسی تھی ۔ اور وہاں اکثر قوموں کو اپنا مذہب تلقین کیا ۔ مگر یہ رائے صحت سے بالکل معرا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ یہودی مذہب عرب اُن یہودیوں کے ساتھ آیا تھا جو بتیسویں صدی دنیوی میں یا پانچویں صدی قبل حضرت مسیح کے بخت نصر کے ظلم سے جو ان کے ملک اور قوم کی تخریب کے درپے ہوا تھا ۔ بھاگ گئے تھے اور شمالی عرب میں بمقام خیبر آباد ہوئے تھے ۔ تھوڑے عرصہ بعد جب کہ اُن کی مضطرب حالت نے کسی قدر سکون اور قرار پکڑا ۔ اُنھوں نے اپنے مذہب کو پھیلانا شروع کیا اور قبیلہ کنانہ اور حارث ابن کعب اور کندہ کے بعض لوگوں کو اپنے مذہب میں لائے ۔ جب کہ ۳۲۵۰ء دنیوی میں ۷۵۰ء قبل مسیح کے یمن کے بادشاہ ذونواس حمیری نے مذہب یہود اختیار کیا ۔ تب اُس نے اور لوگوں کو بھی بالجبر اس مذہب میں داخل کر کے اس کو بہت ترقی دی

اُس زمانہ میں یہودیوں کو عرب میں بڑا اقتدار حاصل تھا اور اکثر شہر اور قلعے اُن کے قبضے میں تھے۔

اس بات کے یقین کرنے کا قوی قرینہ یہ ہے کہ یہودی بُت پرستی کو غصہ اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ مگر عرب کی کوئی مقامی روایت اس مضمون کی نہیں پائی جاتی کہ خانہ کعبہ کی نسبت اُن یہودیوں کی رائے عربوں کی رائے سے برخلاف تھی۔ مگر یہ امر تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک تصویر یا مُورت حضرت ابراہیم کی جن کے پاس ایک مینڈھا قربانی کے واسطے موجود کھڑا تھا۔ یہودیوں کے ذریعہ سے خانہ کعبہ میں اُس بیان کے مطابق جو توریت میں ہے کھینچی گئی ہوگی یا رکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ یہودی اس قسم کی تصویروں یا مورتوں کے بنانے اور رکھنے کو گناہ نہیں سمجھتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہودیوں کے ذریعہ سے ملک عرب میں خدا تعالیٰ کی معرفت کا علم جیسا کہ قبائل عرب میں بالعموم پیشتر تھا اُس سے بھی دوچند ہو گیا۔ وہ عرب جنھوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اور وہ لوگ بھی جو اُن سے راہ و رسم رکھتے تھے اُس سے فائدہ مند ہوئے تھے۔ کیونکہ یہودیوں کے پاس ایک عمدہ قانون، شریعت اور سوشیل اور پولٹیکل کا موجود تھا۔ اور اُس زمانہ کے عرب اس قسم کی چیز سے بالکل بے بہرہ تھے اس سے ایک معقول طور پر استنباط ہوتا ہے کہ بہت سے خانگی اور سوشیل آئین اور رسوم کو جو اس قانون میں مذکور ہیں عربوں نے اختیار کر لیا ہوگا۔ خصوصاً یمن کے رہنے والوں نے جہاں کہ اُن کے بادشاہ ذونواس نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اور اُس نے یہودی مذہب کی ترویج میں کوشش کی ہوگی۔

ہم کو اس مقام پر مذہب یہود کے مسائل اور عقائد اور اُن کی رسموں اور طریقوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ یہ سب باتیں توریت میں موجود ہیں اور ہر شخص اُن سے کسی نہ کسی قدر واقف ہے۔ اور وہ امور جن کا بیان کرنا ہم کو بالتخصیص مدنظر ہے اُس مقام پر بیان ہوں گے جہاں کہ ہم مذہب یہود اور اسلام کے تعلق باہمی پر بحث کریں گے۔

عیسوی مذہب

یہ بات محقق ہے کہ عیسوی مذہب نے تیسری صدی عیسوی میں ملک عرب میں دخل پایا تھا۔ جب کہ اُن خرابیوں اور بدعتوں کی وجہ سے جو آہستہ آہستہ مشرقی کلیسا میں شائع ہو گئی

تھیں قدیم عیسائیوں کی تباہی ہوئی تھی اور وہ لوگ ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے تاکہ اور کسی جگہ جا کر پناہ لیں۔ اکثر مشرقی اور نیز یورپین مورخ جنھوں نے اس مضمون کو مشرقی مصنفوں سے اخذ کیا ہے اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ وہ زمانہ ذونواس کی سلطنت کا زمانہ تھا۔ مگر ہم اس رائے سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے حساب کے موافق جس کا بیان ہم نے خطبہ اول میں کیا ہے ذونواس کا زمانہ قریباً چھ سو برس پیشتر اس واقعہ کے گذر چکا تھا اور اسی وجہ سے ہم اُن مصنفوں کی اس رائے کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ جن کا بیان ہے کہ ذونواس نے عیسائیوں کی تخریب کی تھی۔

اوّل مقام جہاں کہ یہ بھاگے ہوئے عیسائی آباد ہوئے تھے نجران تھا اور اُس سے پایا جاتا ہے کہ وہاں کے متعدد بہ لوگوں نے عیسوی مذہب قبول کر لیا تھا۔ یہ عیسائی فرقہ جیکو بائٹ یعنی یعقوبی فرقہ تھا۔ اور اس لقب سے مشرقی فرقہ "مانوفیزیٹیز" کا موسوم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ صحیح طور پر یہ لقب شام اور عراق اور بابل کے فرقہ "مانوفیزیٹیز" پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ جیکو ایٹ کا لقب شام کے ایک راہب کے سبب سے جس کا نام جیکوبس بیراڈیس تھا۔ اس فرقہ کا پڑ گیا تھا اور جس نے کہ یونان کے بادشاہ جسٹی نین کے عہد میں اپنے ملک سے نکلے ہوئے "مانوفیزیٹیز" کا ایک علیحدہ فرقہ قائم کر لیا تھا۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ صرف ایک صفت رکھتے ہیں یعنی ایک انسانی صفت نے اُن میں تقدیس کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

عیسائی مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ عیسوی مذہب نے اہل عرب میں بہت ترقی حاصل کی تھی۔ مگر ہم اس باب میں اُن سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باستثنائے صوبہ نجران کے جس کے اکثر باشندوں نے عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ قبائل حمیر۔ غسان۔ ربیعہ تغلب بحرد۔ تونخ سطے تودیہ اور حیرہ میں معدود اشخاص نے ان کی تقلید کی تھی اور کوئی جماعت کثیر یا قوم کی قوم عیسوی مذہب میں نہیں آئی تھی۔ جس طرح کہ یہودی مذہب میں آگئی تھی اغلب ہے کہ ان متفرق اعرب متنصرہ کی وساطت سے حضرت مریم کی تصویر خواہ مورت حضرت عیسیٰ کو گود میں لئے ہوئے خانہ کعبہ کی اندرونی دیواروں پر کھینچی گئی ہو یا اُس کے اندر رکھی گئی ہو۔

خانہ کعبہ میں متعدد قوموں کے معبودوں کی یا بزرگوں کی تصویریں یا مورتیں رکھی ہوئی تھیں اور جس فرقہ سے وہ تصویر یا مورت علاقہ رکھتی تھی وہی فرقہ اُس کی پرستش کرتا تھا۔ جب کہ عرب کے لوگوں نے یہودی اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ تو اُسی مذہب کے لوگوں

لئے حضرت ابراہیم اور حضرت مریم کی تصویر یا مورت خانہ کعبہ میں رکھی یا کھینچی ہوگی ۔کیونکہ جس طرح عرب کے اور فرقوں کو اپنے معبودوں یا بزرگوں کی مورتیں رکھنے یا کھینچنے کا کعبہ میں حق تھا اُسی طرح اُن عربوں کو بھی حق تھا جو یہودی یا عیسائی ہو گئے تھے۔ اور کسی کو اس کی ممانعت کا حق نہ تھا۔

اسلام سے پیشتر ملک عرب کی یہ مذہبی حالت تھی اور ایسے مختلف مذہب جو زمانہ واحد میں وہاں مروج ہو گئے تھے اُس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ ان مذہبوں کے احکام اور مسائل اور رسوم باہم خلط ملط اور اہل عرب میں بالعموم مروّج ہو گئے ہوں گے ۔کیونکہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اُن نیم وحشی اور جاہل لوگوں کو اس قدر شعور ہو کہ اتنے مذاہب مختلفہ کے باہمی تفرق کو جانچ سکتے ہوں اور ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر کے دقیق تفاوت کی تمیز کرتے ہوں۔

ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا اور اُس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اُس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعۃً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھرپور کر دیا۔ اس لئے اگر یہ کہنا جائز ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام عرب کے حق میں رحمت ایزدی سے کچھ زیادہ تھا۔ اسلام از روئے اصول کے بُت پرستی کے بالکل متناقض تھا ۔کیونکہ وہ حقائق قدرتی اور ابدی کی تعلیم و تلقین کر کے انسان کو اعلےٰ درجہ پر پہنچانا چاہتا تھا اور بُت پرستی' انسان کو جہالت کی حالت میں رکھ کر از روئے تمدن اور اخلاق کے دونوں طرح سے غلام بنانا چاہتی تھی ۔ اسلام لامذہبی سے بھی کچھ موافقت نہ رکھتا تھا کیونکہ اس کا ابتدائی اور خاص اُصول یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اُس کے وجود پر بے چون و چرا اعتقاد رکھنا چاہیے ۔ جس کے وجود سے لامذہبوں کا انکار تھا ۔ مذہب اسلام میں اور عرب کے خدا پرستوں کے مذہب کے دونوں فرقوں میں سے دوسرے فرقہ سے کوئی سخت مخالفت نہ تھی کیونکہ اگر اس فرقہ کے عقائد میں وحی کے عقیدہ کو اضافہ کیا جاوے تو مذہب اسلام کے اصلی اصول کے بہت قریب قریب ہو جاتا ہے مذہب صابی کے عقاید الہام سے اسلام بالکل مماثل تھا ۔لیکن اس مذہب میں اجرام فلکی کی پرستش کو رَد کرتا تھا اور سیاروں کے نام پر مورتیں بنانے اور معابد قائم کرنے کو بھی جو ایک قسم کی بُت پرستی ہے اور جس میں قوم صابی بوجہ امتداد زمانہ کے آہستہ آہستہ آپڑی تھی ناروا ٹھیراتا تھا۔

ابراہیمی مذہب اور عرب کے اور نبیوں کے مذہب اور یہودی مذہب کے اصول اور احکام اور عقائد اسلام کے اصول اور احکام اور عقائد کے کچھ بھی متناقض نہ تھے۔ بلکہ درحقیقت اسلام کے اصول اور احکام ابراہیمی مذہب اور دیگر انبیائے عرب کے مذہب اور یہود کے مذہب کے اصول اور احکام کو مکمل کرتے تھے۔ اسلام میں اور یہودی مذہب میں صرف یہ فرق تھا کہ اسلام حضرت یحییٰ کو تسلیم کرتا تھا۔ مگر یہودیوں اور عیسائیوں کی بعض غلط تفاسیر کو جو وہ توریت اور انجیل کی آیتوں کی کرتے تھے نہیں مانتا تھا۔ اصولِ اسلام اُن عمدہ اصول سے جن کی درحقیقت حضرت عیسےٰ نے تلقین کی تھی مطابقت تامہ رکھتا تھا۔ لیکن زمانۂ اسلام میں جو عیسائی تھے اُن کے اصول اور عقائد اور مسائل اور رسوم مذہبی اور اُن برتاؤ سے بالکل مخالف تھا اور بجز چند متفرق اور متعدد مسائل اخلاق کے کسی اور چیز میں ان دونوں مذہبوں میں مشابہت نہ تھی۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کیا ہے۔ ہم جواب دیتے ہیں کہ مذہب اسلام صابئی مذہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور ابراہیمی مذہب اور عرب کے دیگر الہامی مذہبوں کے اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور ترتیب اور یہودی مذہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی قرار واقعی تکمیل اور اللہ جل شانہ کی وحدانیت کی ایسے اعلےٰ درجہ پر توضیح جو کسی اور مذہب میں اس تکمیل سے نہیں تھی۔ اور جس کو ہم وحدت فی الذات اور وحدت فی الصفات اور وحدت فی العباد سے تعبیر کرتے ہیں اور اخلاق کے ان اصولوں کی جن کی حضرت عیسیٰ نے دراصل تلقین کی تھی تکمیل ہے۔ اور اُن تمام مذاہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور اجتماع کا نام اسلام ہے۔ ہم اپنے اس جواب کو بعض مثالوں کے حوالہ سے مشترح کرتے ہیں۔

مذہب اسلام میں دوسرے معبود کی پرستش کا امتناع اور بُت پرستی کا استیصال یہودیوں کے مذہب کے اصول کے بالکل مماثل ہے۔ توریت میں لکھا ہے کہ "درحضور من ترا خدایان غیر نہ باشند"۔ (سفر خروج باب ۲۰ ورس ۳) "بہرچہ شمارا مامور داشتم رعایت نماید واسم خدایان غیر را ذکر نہ نمودہ از دہانت شنیدہ نہ شود" (سفر خروج باب ۲۳ ورس ۱۳) "بجہت خود صورت تراشیدہ و ہیچ شکل از چیز ہائیکہ در آسمان است در بالا ویا در زمین است در پائین ویا در آب ہائے کہ در زیر زمین است مساز۔ آنہاں را سجدہ نہ نمودہ ایشان را عبادت منما زیرا کہ من خداوند

خدائے توام دسفر خروج باب۳۲ ورس ۴ و ۵)" بہ بتہا توجہ منما تید وخدایان ریختہ شدہ ازبرائے خود مسازید خداوند خدائے شما منم" دسفر لویان باب ۱۹ ورس ۴) "ازبرائے خودتاں بتان و اصنام تراشیدہ شدہ مسازید ونصب شدہا ازبرائے خودتاں برپائے منمائید ودر زمین خودتان تصویر ہائے سنگے جہت سجدہ نمودنش مگذارید۔ زیراکہ خداوند خدائے شما منم" دسفر لویان باب ۲۶ ورس۱) " خدایان ایشاں راسجدہ نہ نمودہ آنہا عبادت مکن وموافق اعمال ایشاں عمل منما بلکہ ایشاں را بالکل منہدم ساختہ وبت ہائے ایشاں بالتمام بشکن" دسفر خروج باب ۲۳ ورس ۲۴)

سب سے بہتر اور اعلیٰ احکام یہودی مذہب میں یہ ہیں جو ذیل میں لکھے جاتے ہیں اسلام میں یہی احکام بجنسہٖ موجود ہیں" پدر و مادر خودرا احترام نما۔ قتل مکن۔ زنا منما۔ دُزدی مکن۔ برہمسایہ ات شہادت دروغ مدہ۔ بخانہ ہمسایہ ات طمع مورز" دسفر خروج باب ۲۰ ورس ۱۲۔۱۷)

اوقات نماز جو اسلام میں مقرر ہیں اور جن کی تعداد[۱] سات یا پانچ یا تین ہیں مذہب صابی اور مذہب یہود کی اوقات نماز سے بہت مشابہ ہیں"

اسلام میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ صابی مذہب اور یہود کے مذہب کے طریقہ سے نہایت مماثل ہے۔ نماز دل کی صفائی کے لئے تھی اور یہی اصلی منشا رنماز کے مقرر کرنے کا تھا اور جسم اور پوشاک وغیرہ کی صفائی جس کے واسطے شرع اسلام میں حکم ہے صابئیوں اور یہودیوں کی اس قسم کی رسومات سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں۔ توریت میں خداتعالےٰ نے موسیٰ سے کہا کہ" نزد قوم روانہ شدہ ایشاں را امروز وفردا تقدیس نمائے تاکہ جامہ ہائے خودرا شست وشو نمایند"۔ دسفر خروج باب ۱۹ ورس ۱۰)" پس موسیٰ ہارون وپسرانش رانزدیک آوردہ ایشاں را بہ آب شست و شو داد" دسفر لویان باب ۸ ورس ۶)

مذہبی امور میں صرف ایک یہی بات اسلام میں نئی ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ یعنی نماز کے بُلانے کے لئے یہودیوں کی قرنائے بجانے اور عیسائیوں کے گھنٹے بجانے کے

---

[۱] یعنی فجر۔ ضحی۔ یعنی چاشت۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشا۔ تہجد۔ دوسری اور ساتویں نماز مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ اور باقی پانچ نمازیں فرض ہیں۔ دوسری اور تیسری کو اور چوتھی اور پانچویں کو ایک وقت میں پڑھ لینے کا اختیار ہے۔ اس صورت میں پانچ نمازیں اور تین وقت رہ گئے۔

بدلے اذان مقرر کی گئی ہے اس نرالے پن کی نسبت ایک عیسائی مصنف اس طرح پر لکھتا ہے کہ "مختلف اوقات نماز کی اطلاع مؤذن مسجدوں کی مناروں یا ماذنوں پر کھڑے ہو کر اذان دینے سے کرتے ہیں۔ اُن کا لحن جو ایک بہت سادہ مگر سنجیدہ لہجہ میں بلند ہوتا ہے۔ شہروں کی دوپہر کی دوند پکار میں مسجد کی بلندی سے دلچسپ اور خوش آواز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سنسان رات میں اُس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر فرنگیوں کی زبان سے بھی پیغمبر صاحب کی تعریف نکل گئی ہے کہ یہودیوں کے معبد کی قرنائے اور کلیسائے نصارٰی کے گھنٹوں کی آواز کے مقابلہ میں انسانی آواز کو پسند کیا"۔

تمام قربانیاں جو مذہب اسلام میں جائز ہیں، مذہب یہود کی قربانیوں کے مشابہ ہیں گویا یہ قربانیاں شارع اسلام نے مذہب یہود کی بے شمار قربانیوں سے منتخب کر لی ہیں اور جو تاکیدی حکم مذہب یہود میں ان قربانیوں کے کرنے کی نسبت تھا اس کو نہایت خفیف بلکہ اختیاری کر دیا ہے۔

مذہب اسلام میں جو روزے مقرر ہیں وہ بھی مذہب یہود اور مذہب صابئی کے روزوں سے مشابہ ہیں بلکہ صابئی مذہب کے روزوں سے بہ نسبت یہودی مذہب کے روزوں کے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔

ہفتہ کے ایک معینہ دن میں نماز اور دیگر رسوم مذہبی کے مقررہ وقت پر لوگوں کو کار ہائے دنیوی سے منع کرنا یہودیوں کی اسی قسم کی رسم سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم کے زمانہ سے اہل عرب جمعہ کو متبرک دن سمجھتے آتے ہیں۔

ختنہ بھی وہی ہے جس کا یہود اور پیروان حضرت ابراہیم کے ہاں دستور تھا۔ نکاح اور طلاق کا بھی قریب قریب ویسا ہی قاعدہ ہے جیسا کہ اور مذاہب الہامی میں تھا۔ توریت میں لکھا ہے کہ "اگر کسے زنے را گرفتہ بہ نکاح خود در آورد و واقع شود کہ بہ سبب چیزے کہ در یافت شدہ در نظرش التفات نیابد آنگاہ طلاق نامہ نوشتہ بدستش بارہد و او را از خانہ اش رخصت دہد" (سفر توریہ مثنیٰ باب ۲۴ درس ۱)۔

بعض عورتوں سے نکاح کرنے کے جواز یا عدم جواز میں جو احکام مذہب اسلام میں ہیں وہ اکثر باتوں میں یہودیوں کے مذہب کے احکام سے مشابہ ہیں۔

جنب مرد اور عورت کو مسجد میں جانے یا قرآن مجید کے چھونے کا امتناع انھیں دستوروں

ے مشابہت رکھتا ہے جو مذہب یہود میں جاری ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ مذہب اسلام میں بہ نسبت مذہب یہود کے یہ امتناع کم سختی سے ہے۔

سؤر کے گوشت کے کھانے کی ممانعت مذہب اسلام میں ویسی ہی ہے جیسی کہ بنی اسرائیل کے مذہب میں تھی۔ توریت میں لکھا ہے "وخوک باوجودیکہ ذی سم چاک وتمام شگاف است اما نوشخوارگی نمی کند آں برائے شما ناپاک است" (سفر لویان باب ۱۱ ورس ۷)

جانوروں کے حلال یا حرام ہونے اور مرے ہوئے جانور کا گوشت نہ کھانے کی نسبت جو احکام مذہب اسلام میں وہ موسوی شریعت کے نہایت ہی مشابہ ہیں، بلکہ علمائے اسلام نے وہ تمام مسائل موسوی شریعت سے مستنبط کئے ہیں۔

شراب خواری اور دیگر مسکرات کا امتناع بھی موسوی شریعت کے مشابہ ہے توریت میں ہے کہ "ہنگام درآمدن شما بہ خیمہ شراب ومسکرات رانخورید" (سفر لویان باب ۱۰ ورس ۹) مگر مذہب اسلام نے اس خرابی کی جو شراب سے ہوتی ہے پوری بندش کردی ہے یعنی شراب کو بالکل حرام کردیا ہے اور کسی وقت پینے کی اجازت نہیں ہے۔

مذہب اسلام میں مختلف جرائم اور تقصیرات کی نسبت جو سزائیں مقرر ہیں وہ بھی اُن سزاؤں سے جو موسوی شریعت میں ہیں نہایت درجہ مشابہت رکھتی ہیں۔ زنا کی سزا سَو کوڑے مارنا مذہب اسلام میں ہے۔ یہ سزا یہودیوں کے قانون سے مختلف ہے۔ لیکن جو علمائے اسلام یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں بھی زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے تو یہ سزا یہودیوں کے مذہب سے بالکل مماثلت رکھتی ہے۔

مسلمان فقہائے ارتداد کی سزا قتل قرار دی ہے۔ اگر درحقیقت مذہب اسلام میں ارتداد کی یہی سزا ہو تو وہ بھی موسوی شریعت سے بالکل مماثل ہے۔ توریت میں لکھا ہے۔ "وہر کسے کہ اسم خداوند را کفر بگوید البتہ باید کشتہ شود تمامی جماعت باید اورا بے تامل سنگسار نمایند خواہ غریب خواہ متوطن چونکہ اسم خداوند را کفر گفتہ است کشتہ شود" (سفر لویان باب ۲۴ ورس ۱۶)

بعض عیسائی مورخوں نے کہا ہے کہ اسلام میں ملائک کا تصور اور اعتقاد یہودیوں کی کتاب تالمد سے اور جنات اور شیاطین کا اعتقاد یہودیوں کی کتاب مدراش اور تالمد دونوں سے اور مرنے کے بعد جسم اور روح کی حالت کا بیان یہودیوں سے اور بہشت اور دوزخ کی

کیفیت یہودیوں اور عیسائیوں سے اور قیامت اور روز حشر کے حالات کا یہودیوں کی کتاب مدراش اور تالمد سے اخذ کیا ہے۔ مگر ہماری رائے یہ ہے کہ اول تو وہ حالات جس طرح پر کہ لوگ خیال کرتے ہیں اُس طرح پر مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ اُن امور میں سے جس قدر کہ مذہب اسلام سے علاقہ رکھتے ہیں وہ اُن ذریعوں سے اخذ نہیں کیے گئے کیونکہ بجز اتحاد نام کے اور جو کچھ کہ اسلام میں بیان کیا گیا ہے وہ کتب مذکورہ بالا کے بیان سے بالکل اختلاف رکھتا ہے۔

اس خطبہ میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ ہم اُن امور پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں اور اُن امور میں سے جو امور کہ متعلق اسلام ہیں اور جو امور کہ متعلق اسلام نہیں ہیں اُن میں تمیز کریں اور امور متعلقہ اسلام کی کامل تشریح کریں۔ اس لیے ہم اس مضمون کو یہ کہکر ختم کرتے ہیں کہ اگر بالفرض امور مذکورہ بالا مذہب اسلام سے علاقہ رکھتے ہیں جیسے کہ بالعموم مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر کا اعتقاد ہے تو وہ امور بھی مذہب اسلام میں اسی قسم کے تصور کیے جاویں گے جیسے کہ مذہب اسلام کے اور احکام یہودی مذہب سے مشابہ ہیں۔

اسلام نے عیسائی مذہب سے بجز مندرجہ ذیل دو عقیدوں کے اور کوئی عقیدہ اخذ نہیں کیا ہے۔ ایک یہ کہ "اللہ کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے پیار کر۔" (انجیل متی باب ۲۲ ورس ۳۷) دوسرا یہ کہ "اور جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے کریں تم بھی اُن سے ویسا ہی کرو۔"

(انجیل لوک باب ۶ ورس ۳۱)

اس مقام پر اگر کسی محقق اور صداقت کے متلاشی مزاج آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر یہی حال ہے تو اسلام اصول اور عقاید متفرقہ اور منتشرہ مذاہب سابق کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے جو ادھر اُدھر سے جمع کر لیے ہیں اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسلام کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہو۔ لیکن ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ مشابہت اور مماثلت اصول اور عقاید مذہب اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول وعقاید سے مذہب اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہے غیر منتہی اور کامل ذات ہو ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی۔ جس طرح کہ خدا تعالےٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ جس طرح کہ اُن کی ذات سے کسی

پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے اسی طرح سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول اور احکام اُس کی ذات سے صادر ہوں۔ مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہئے' جنھوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھیرایا۔ جنھوں نے دُنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے باایمان متبعین کے لئے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے۔

خطبہ چوتھا

اِنَّ الاِسلامَ رَحمَۃٌ لِلاِنسانِ وَحُبَّۃُ الاَدیانِ الاَنبیاءِ

بِاَوضَحِ البُرھانِ

اِسلام انسان کیلئے رحمت ہے اور تمام انبیاء کے مذاہب کی پُشت پناہ

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (القرآن)

مذہب اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور موسوی اور عیسوی مذہب کو اس سے نہایت فائدے پہنچے ہیں۔

یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے۔ کیونکہ طرف دار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا۔ اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانی مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اُس کو ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہوسکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرف دار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے، اور اسی لئے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے۔ ہمارا یہ مضمون چار حصوں پر منقسم ہے۔

پہلے حصہ میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو مذہب اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں۔

گو ہم کیسے ہی سچے دل اور نیک نیت سے ناطرف دارانہ اس مضمون کو لکھیں مگر ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جو بات مذہب اسلام کے متعلق ہوتی ہے اُس کو عیسائی مصنف ہمیشہ بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نیکی کو چھوڑ بدی پر حمل کرتے ہیں۔ اس لئے ہم کو توقع نہیں ہوتی کہ جو خاص ہماری رائے اس باب میں ہو وہ اُسی بدگمانی اور بدظنی کی نگاہ سے نہ دیکھی

جائے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر ہم اُنھیں رائوں کا بیان کریں جن کو خود بعض عیسائی مصنفوں نے انسان کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت لکھی ہیں۔

سر ولیم میور جو ایک نہایت دین دار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں جس کے لئے ہم مسلمانوں کو اُن کا شکر کرنا چاہئے ارقام فرماتے ہیں کہ "ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے (یعنی مذہب اسلام نے) ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے عرب کے ملک جزیرہ نما پر چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بُت پرستی موقوف ہوگئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ایک خاص اور ہر ایک جگہ احاطہ کی ہوئی قدرت کا مسئلہ حضرت محمدؐ کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہوگیا ہے جیسے کہ خاص محمدؐ کے دل میں تھا مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کے معنی ہیں' یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہیئے۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں' چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے۔ کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں۔ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیئے۔ غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت برتنی چاہیئے۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اُس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

سر ولیم کی اس تحریر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بُت پرستی کو معدوم نہیں کیا بلکہ اُس سچے مسئلہ وحدانیت کے وعظ نے بُت پرستی کو معدوم کیا ہے۔ جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پُر تاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا اور نہ صرف عرب سے بُت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اُس وقت دنیا میں رائج تھے اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی۔ اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بُت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔

برادرانہ دینی محبت کا برتاؤ آپس میں مسلمانوں کے ایک خدا کے ماننے والے ہونے کی وجہ سے بتایا جو ایک قدرتی رشتہ دینی بھائی ہونے کا ہے مگر انسانی محبت کا برتاؤ تمام انسانوں سے بلکہ ہر ایک سے جو جگر تر رکھتا ہو برتنے کو فرمایا۔

غلاموں کی نسبت اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو اسلام نے غلامی کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہے۔ اسیران جنگ کے سوا کوئی غلام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی زمانۂ جاہلیت کی رسم کے موافق مگر قرآن "امامنا بعد واما فداء" کہکر اس کو بھی نابود کر دیا۔ جو لوگ اسیران جنگ کو احساناً چھوڑ دیتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجہ پاتے ہیں۔ اور جو کچھ لے کر چھوڑتے ہیں وہ اُن سے کمتر گنے جاتے ہیں۔ اس حکم کے پہلے سے جو لوگ غلام رکھتے تھے اُن کی پرورش کا اسی طرح اُن کو حکم دیا جس طرح کہ وہ آپ اپنی جان کی پرورش کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کی نسبت سر ولیم میور نے مذکورہ بالا فقرہ میں اشارہ کیا ہے مگر اتنی بات اور زیادہ کرنی چاہیے تھی کہ مذہب اسلام نے قمار بازی کو منع کرنے اور ناشائستہ کلمات کے منہ سے نکالنے کی ممانعت سے والدین کے ساتھ محبت اور تعظیم سے پیش آنے کی تاکید سے ایک مناسب اندازہ سے خیرات دینے کی رغبت دلانے سے لوگوں کو اُن کی حاجت میں قرض حسنہ دینے سے وعدہ کی وفا کرنے کی تاکید سے جانوروں کے ساتھ رحم اور مہربانی برتنے کے حکم سے انسانوں کے اخلاق اور اُن کی حسنِ معاشرت میں بہت کچھ ترقی دی ہے۔

مشہور اور نہایت لائق اور قابل مؤرخ گبن اپنی کتاب میں جہاں یہ بحث کرتا ہے کہ حضرت محمدؐ اپنے ملک کی نسبت کیسے تھے اس طرح پر لکھتا ہے کہ "حضرت محمدؐ کی سیرت میں سب سے اخیر جو بات غور کرنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اُن کا عظیم و شان لوگوں کی بھلائی اور بہبودی کے حق میں مفید ہوا یا مضر۔ جو لوگ کہ آنحضرتؐ کے سخت دشمن ہیں وہ بھی اور نہایت متعصب عیسائی اور یہودی بھی باوجود پیغمبر برحق نہ ماننے کے اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرت نے دعویٰ رسالت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تلقین کے لئے اختیار کیا۔ گو وہ یہ کہیں کہ صرف ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اُس سے اچھا ہے (گو یا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذہبوں سے مذہب اسلام اچھا ہے) آنحضرتؐ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب سماویہ قدیمہ کی سچائی اور پاکیزگی اور اُن کے بانیوں یعنی اگلے پیغمبروں اور معجزوں اور ایمان داری کو مذہب اسلام کی بنیاد خیال کرتے تھے۔ عرب کے بُت خدا کے تخت کے روبرو توڑ دیئے گئے اور انسان کے خون کے کفارہ کو نماز روزہ خیرات سے بدل دیا جو ایک پسندیدہ اور سیدھے سادھے طریقہ کی عبادت ہے (یعنی جو انسان کی

قربانی بتوں پر ہوتی تھی اس کو معدوم کیا اور بعوض اُس کے نماز و روزہ و خیرات کو بطور کفارہ قرار دیا، اُن کے عقبےٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں۔ شاید وہ اپنے ملک کا اخلاقی اور ملکی اُنتظام درستی سے نہ کر سکتے ہوں مگر آنحضرت نے مسلمانوں میں نیکی اور محبت کی ایک روح ڈال دی آپس میں بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے احکام اور نصیحتوں سے انتقام کی خواہش اور بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم ہونے کو روک دیا۔ تو میں جو کہ مخالف تھیں اعتقاد میں فرماں برداری میں متفق ہو گئیں۔ خانگی جھگڑوں میں جو بہادری بیہودہ طور سے صرف ہوتی تھی نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے مقابلہ پر مائل ہو گئی۔

مسٹر گبن کی یہ رائے بھی کسی قدر حاشیہ لکھنے کے لائق ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسٹر گبن ایک نہایت غیر متعصب مؤرخ ہے اور مسلمانوں کی تاریخ بھی اُس نے نہایت سچائی اور دیانت داری سے لکھی ہے۔ مگر بعض مذہبی مسائل جو اس کو تحقیق نہیں ہوئے یا غلط طور سے اس تک پہنچے یا جہاں اصلی مسئلہ اور علما کی رائے اور اجتہاد میں اُس نے تمیز نہیں کی۔ اُن مقاموں میں اُس نے نسبت آنحضرت صلعم کے یا مذہب اسلام کے غلط رائے قائم کی ہے اور ہم کو اس نامی مؤرخ کے نہایت بے تعصب ہونے کی وجہ سے یقین ہے کہ اگر صحیح مسئلہ اُس تک پہنچتا تو کبھی وہ رائے قائم نہ کرتا جو اُس نے دی۔

اُنھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے اَن دیکھی اَن چھوئی اَن چکھی اَن سمجھی چیز کیونکر سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جس چیز کے لئے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہوں، وہ کیونکر بیان ہو سکتی ہے۔ کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جا سکتی ہے۔ یہ تمام امور محالات سے ہیں پس وحی یا الہام اُن کو کیوں کر بیان کر سکتا ہے۔ سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے کہ "لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے اور کچھ نہیں بتا سکتا۔ سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے، نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر۔ اس لئے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کو بیان کیا ہے۔ موسیٰ ہی فرمایا گئے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا غلہ

پیدا ہوگا وبا نہ ہوگی۔ گناہ کروگے تو قحط پڑے گا، وبا پھیلے گی۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی میں عقبیٰ کا نام ہی نہیں لیا کیونکہ اُس زمانہ کے لوگ بجز اُس کے اور کسی چیز پر سزا و جزا کا قیاس کر ہی نہیں سکتے تھے۔

آنحضرت صلعم نے سزا و جزا کا ان دنیاوی تمثیلوں میں بیان کیا جس پر اُس ملک کے لوگ سزا و جزا کے محبوب و موذی ہونے کا قیاس کر سکتے تھے نہ یہ کہ اُس سے وہی حقیقت مراد تھی جو اُن لفظوں کے لغوی معنی تھے۔ اگر آنحضرت صلعم یورپ کے کسی ٹھنڈے ملک میں پیدا ہوتے تو ضرور بجائے ٹھنڈی نہروں کے گرم پانی کی نہریں اور بجائے موتی کے محلوں کے آتش خانہ والے محل بیان فرماتے اور نہ اُس سے حقیقت مراد ہوتی، نہ اُس سے بلکہ صرف ایک تمثیل قیاس کرنے کو تھی وہ بھی صحیح قیاس کرنے کو نہیں بلکہ قیاس مع الفارق کرنے کو۔ جس قدر علمائے ربانی گذرے ہیں، وہ سب اسی بات کے قائل ہیں۔ قل آعوذیے ملانے بلکہ کٹ ملا ہمیشہ اُن کے برخلاف رہے مگر جو حقیقت ہے وہ کسی کے مخالف یا موافق ہونے سے تبدیل نہیں ہوتی۔

اخلاقی اور ملکی انتظام کی نسبت بھی جو کچھ مسٹر گبن صاحب نے لکھا حاشیہ چڑھانے کے قابل ہے۔ اخلاق کا لفظ جو انھوں نے استعمال کیا وہ اسپریچوئل اور سوشیل یعنی روحانی اور تمدنی دونوں برتاؤ کو شامل ہے۔ روحانی برتاؤ کی نیکی تمدنی برتاؤ کی خوبی کو لازم ہے۔ لاتمدنی برتاؤ کو روحانی نیکی یا بدی سے تعلق ہونا کچھ ضرور نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کا کام صرف اسپریچوئل ورچو یعنی روحانی نیکی کا بتانا تھا اور جہاں تک اس کو تمدن سے تعلق تھا بطور لزوم کے تھا نہ بطور مقصود بالذات کے۔ کیونکہ وہ از خود انسان کی حالت ترقی کے ساتھ ترقی پائی جاتی ہے۔ پس یہ بات آنحضرت صلعم نے روحانی اخلاق کو کافی ترقی دی خود مسٹر گبن نے تسلیم کیا ہے۔ باقی رہی تمدنی حالت۔ وہ اُن کے اصلی کام کی جس پر وہ کھڑے ہوئے جزو نہ تھی گو اُس میں بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔

ملکی انتظام محض ایک دنیاوی کام تھا جہاں تک جان و مال کے امن سے متعلق تھا وہ اُس زمانہ کی حالت کے مطابق ایک دنیاوی کام کے نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچا تھا اور آئندہ کے لئے وہ یہ انتظام فرما کر "انتم اعلم بامور دنیاکم" ان لوگوں کے ہاتھوں چھوڑا تھا جو آئندہ زمانہ میں ہوں یہ ایک نہایت غلطی ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی امور اور انتظام ملکی بھی ایک جزو پیغمبری کا تھا۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب مسمیٰ "اپالوجی فاروی محمد اینڈ قرآن" میں یہ رائے لکھی ہے کہ "اس بات کا خیال کرنا جیسا کہ بعضوں نے کیا ہے۔ بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں جس عقیدہ کی تلقین کی گئی ہے اُس کی اشاعت صرف بزور شمشیر ہوتی تھی۔ کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں وہ سب بلا تامل اس بات کو تسلیم کریں گے کہ حضرت محمد کا دین۔ جس کے ذریعہ سے انسانوں کے خون یعنی قربانی کے بدلے نماز اور خیرات جاری ہوتی اور جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ فیاضی اور حسنِ معاشرت کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی اور جس کا اسی وجہ سے، بہت بڑا اثر شائستگی پر ہوا ہوگا، مشرقی دنیا کے لئے ایک حقیقی برکت تھا اور اس وجہ سے خاص کر اُس کو اُن خوں ریز تدبیروں کی حاجت نہ پڑی ہوگی جن کا استعمال بلا استثنا اور بلا امتیاز کے حضرت موسیٰ نے بُت پرستی کے نیست و نابود کرنے کو کیا تھا۔ پس ایسے اعلےٰ وسیلہ کی نسبت جس کو قدرت نے بنی نوع انسان کے خیالات اور مسائل پر مدت دراز تک اثر ڈالنے کو پیدا کیا ہے۔ گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا کیسی لغو اور بیہودہ بات ہے۔ جب ان معاملات پر خواہ اُس مذہب کے بانی کے لحاظ سے خواہ اس مذہب کے عجیب و غریب عروج اور ترقی کے لحاظ سے نظر کی جائے تو بجز اس کے اور کچھ چارہ نہیں کہ اس پر نہایت سچے دل سے توجہ کی جائے اس امر میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جن لوگوں نے مذہب اسلام اور مذہب عیسائی کی خوبیوں کو بمقابلہ ایک دوسرے کے تحقیق کیا ہے اور اُن پر غور کی ہے۔ اُن میں سے بہت ہی کم ایسے ہیں جو اس تحقیقات میں اکثر اوقات تردد اور نہ صرف اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ مذہب اسلام کے احکام بہت ہی عمدہ اور مفید مقاصد ہیں۔ بلکہ اس بات کا اعتقاد کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں کہ آخر کار مذہب اسلام سے انسان کو فائدہ کثیر پیدا ہوگا"۔

جان ڈیون پورٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہر ایک طرح کی شہادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن شخصوں نے فلسفہ اور علوم و فنون کو سب سے پہلے زندہ کیا جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان میں بطور ایک سلسلہ کے بیان کئے گئے ہیں بلاشبہ وہ ایشیا کے مسلمان اور اندلس کے مور تھے جو خلفائے عباسیہ اور بنی امیہ کے عہد میں وہاں رہتے تھے علم جو ابتدا، ایشیا سے یورپ میں آیا تھا اُس کا وہاں دوبارہ رواج مذہب اسلام کی دانشمندی ہی سے ہوا۔ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ اہلِ عرب میں چھ سو برس کے قریب سے علوم و فنون جاری تھے اور یورپ میں، جہالت اور وحشیانہ پن پھیلا ہوا تھا اور علم ادب

قریباً نیست و نابود ہوگیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ تمام علوم طبیعیات ہیئت۔ فلسفہ۔ ریاضی۔ جو دوسری صدی میں یورپ میں جاری تھے۔ ابتدائے عرب کے علماء سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصاً اندلس کے مسلمان یورپ کے فلسفہ کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔"

جان ڈیون پورٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یورپ مذہب اسلام کا اور بھی زیادہ ممنون ہے۔ کیونکہ اگر ان جھگڑوں سے جو سلطان صلاح الدین کے وقت میں بیت المقدس کی لڑائیوں میں ہوئے۔ جن کو فریقین جہاد کہتے تھے قطع نظر کی جائے تو بالتخصیص مسلمانوں کے سبب سے فیوڈل انتظام کی سختیاں اور امیروں کی خودمختاری یورپ سے موقوف ہوگئی۔ جس کے باقی ماندہ اثروں پر ہمارے ملک یورپ کی آزادیوں کی نہایت بڑی عالی شان عمارت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اہل یورپ کو یہ بات بھی یاد دلانی چاہیے کہ وہ حضرت محمدؐ کے پیروؤں کے جو قدیمی اور زمانۂ حال کے علم ادب کے درمیان میں بطور سلسلہ کے ذریعہ ہیں، اس لحاظ سے بھی ممنون ہیں کہ مغربی تاریکی کی مدت دراز میں یونانی حکما کی بہت سی کتابیں اُن ہی کی کوششوں سے فنون اور علم ریاضی طب وغیرہ کے بعض نہایت بڑے بڑے شعبوں کی اشاعت ہوئیں۔

چیمبرز ان سیکلو پیڈیا میں ایک آرٹیکل لکھنے والے نے مذہب اسلام کی نسبت یہ رائے لکھی ہے کہ "مذہب اسلام کا وہ حصہ بھی جس میں بہت کم تغیر تبدل ہوا ہے اور جس سے اُس کے بانی کی طبیعت نہایت صاف صاف معلوم ہوتی ہے اُس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے۔ اس سے ہماری مراد قرآن کے علم اخلاق سے ہے۔ ناانصافی۔ کذب۔ غرور انتقام۔ غیبت۔ استہزا۔ طمع۔ اسراف۔ عیاشی۔ بے اعتباری۔ بدگمانی۔ نہایت قابل ملامت بیان کی گئی ہیں۔ نیک نیتی۔ فیاضی۔ حیا۔ تحمل۔ صبر۔ بُردباری۔ کفایت شعاری۔ سچائی۔ راست بازی۔ ادب۔ صُلح۔ سچی محبت۔ اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اُس کی مرضی پر توکل کرنا۔ سچی ایمان داری کا رکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے۔"

اس مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہم اس بات پر غور نہیں کر سکتے ہیں کہ اسلام نے تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے کیا کیا۔ لیکن اگر نہایت ٹھیک ٹھیک کیا جائے تو یورپ میں علوم و فنون کی ترقی میں اُسی کا حصہ تھا۔ مسلمان علی العموم نویں صدی سے تیرھویں صدی

تک وحشی یورپ کے لیے روشن ضمیر معلم کہے جا سکتے ہیں۔ خاندان عباسیہ کے خلفاء کے نہایت عمدہ زمانہ سے یونانی خیالات اور یونانی تہذیب کا از سرِنو سرسبز ہونا شمار کیا جا سکتا ہے۔ قدیم علم ادب ہمیشہ کے واسطے بغیر کسی علاج کے مفقود ہو جاتا اگر مسلمانوں کے مدرسوں میں اُس کو پناہ نہ ملتی۔ عربی فلسفہ قدرتی چیزوں کی تواریخ۔ جغرافیہ۔ علم تاریخ۔ صرف و نحو۔ علم کلام۔ اور فن شاعری کی (جس کی تعلیم پرانے اُستاد دیتے تھے) بہت سی کتابیں پیدا ہو گئیں۔ جن میں سے اکثر اُس وقت تک جاری رہیں گی۔ اور تعلیم بھی دی جائے گی۔ جب تک نسلیں تعلیم پانے کے واسطے پیدا ہوتی رہیں گی۔

ایک جواب مضمون لکھنے والے نے جس نے یہ مضمون اختیار کیا تھا کہ "اسلام ایک ملکی انتظام ہے جو مشرق و مغرب میں جاری ہے۔" اسلام کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "اسلام نے بچہ کشی کا انسداد کر دیا جو اس زمانہ میں قرب و جوار کے ملکوں میں جاری تھی۔ گو عیسائی مذہب نے بھی اُس کو روکا تھا مگر اسلام کے برابر اُس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اسلام نے غلامی کو موقوف کر دیا۔ جو اس ملک کی پرانی جاہلیت کی رسم تھی۔ اسلام نے ملکی حقوق کو برابر کر دیا اور صرف اُن ہی لوگوں کے حق میں انصاف نہیں کیا جو اس مذہب کے معتقد تھے۔ بلکہ اُن شخصوں کے ساتھ بھی برابر انصاف کیا۔ جن کو اُس کے ہتھیاروں نے فتح کیا تھا۔ اسلام نے اُس محصول کو جو سلطنت کو دیا جاتا تھا گھٹا کر صرف دسواں حصہ کر دیا۔ اسلام نے تجارت کو تمام محصولات اور مزاحمتوں سے آزاد کر دیا۔ اسلام نے مذہب کے معتقدوں کو اس بات سے کہ اپنے مذہبی سرگروہ کو مذہبی کام کو جبراً روپیہ دیں اور تمام لوگوں کو اس بات سے کہ غالب مذہب کو ہر ایک قسم کا مذہبی چندہ دیں بالکل بری کر دیا۔ اسلام نے فرقہ فتحمند کے تمام حقوق مفتوحہ لوگوں میں سے اُن شخصوں کو دیئے جو اُس مذہب کے پابند تھے۔ اُن کو ہر ایک قسم کی پناہ دی۔ اسلام نے مال کی حفاظت کی۔ سود لینے کو اور خون کا بدلہ بغیر حکم عدالت کے لینے کو موقوف کیا۔ صفائی اور پرہیزگاری کی حفاظت کی۔ اور ان باتوں کی صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اُن کو پیدا کیا اور قائم کر دیا۔ حرام کاری کو موقوف کر دیا۔ غریبوں کو خیرات دینے اور ہر ایک شخص کی تعظیم کرنے کی ہدایت کی۔

وہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ "جو نتیجے اسلام سے ہوئے وہ اس قدر وسیع اور دقیق اور مستحکم ہیں کہ ان کی تکمیل کر لینا تو درکنار ہم یقین نہیں کر سکتے کہ وہ انسان کے خیال میں

بھی آسکیں۔ اسی سبب سے بعوض اس کے کہ اس کی نسبت اس طرح پر دلیلیں کی جائیں جس طرح کہ سولن کے قنون یا نپولین کے فتوحات کے نتیجوں کے اندازہ کرنے میں کی جاتی ہیں۔ یا تو اُن کی نسبت یہ کہا جائے کہ اتفاقیہ ہو گئے ہیں یا بجبوری ربانی مرضی کی طرف منسوب کیا جائے۔ بااین ہمہ یہ نظم ایک شخص واحد نے کیا تھا۔ جس نے اپنے ملک کے تمام باشندوں میں اپنی روح پھونک دی اور تمام قوم کے دل پر نہایت تعظیم و تکریم کا خیال جو کسی انسان کے واسطے کبھی ظاہر نہیں کیا گیا نقش کر دیا۔ جو سلسلہ قوانین و اخلاق کا انھوں نے بنایا وہ اعلےٰ درجہ کی ترقی سے بھی اسی طرح موافق تھا، جیسا کہ ادنےٰ ترین لوگوں سے اور اُس سلسلہ نے ایک قوم سے دوسری قوم میں گذر کر ہر ایک قوم کو جس نے اُس کو قبول کیا۔ ان قوموں اور سلطنتوں سے فائق کر دیا جن سے اُن کا میل ہوا۔"

طامس کارلائل نے جو اس زمانہ کی دنیا میں نہایت نامور عالم ہیں اپنی کتاب میں جس کا نام "لیکچرز آن ہیروز" ہے اس مضمون کی نسبت جس پر ہم بحث کر رہے ہیں یہ رائے لکھی ہے کہ "اسلام کا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے ہی پہل اُس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی۔ عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو اُن کا کچھ خیال بھی نہ تھا۔ اُس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہو گئی اور چھوٹی چیز نہایت ہی بڑی چیز بن گئی۔ اس کے بعد ایک صدی کے اندر عرب کے ایک طرف غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہو گئی۔ عرب کی بہادری اور عظمت کی تجلی اور عقل کی روشنی زمانہائے دراز تک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چمکتی رہی۔ اعتقاد ایک بڑی چیز اور جان ڈالنے والا ہے جس وقت کوئی قوم کسی بات پر اعتقاد لاتی ہے تو اُس کے خیالات بارآور اور روح کو عظمت دینے والے اور رفیع الشان ہو جاتے ہیں۔ یہی عرب اور یہی حضرت محمدؐ اور یہی ایک صدی کا زمانہ گویا ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جو ظلمت میں کس مپرس ایک ریگستان تھا۔ مگر دیکھو کہ ریگستان کے زور شور سے اڑ جانے بارود نے نیلے آسمان تک اٹھتے ہوئے شعلوں سے دہلی سے غرناطہ تک روشن کر دیا" یہ رائیں ہیں عیسائی مصنفوں کی جو انھوں نے اسلام کی نسبت لکھی ہیں۔ اب ہم اپنے خطبہ کے اس حصہ کو اُن ہی رایوں پر ختم کرتے ہیں اور دوسرے حصہ پر

متوجہ ہوتے ہیں۔

دوسرے حصہ میں عیسائی مصنفوں کی اس رائے کی کہ اسلام انسان کی حالت معاشرت کے حق میں مضر ہوا ہے تردید کی جاتی ہے۔

آنریبل سرولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں فرماتے ہیں کہ "اگرچہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی مذہب اسلام سے تین بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ اُس میں ایک سے زیادہ جوروؤں کا ہونا اور طلاق دے دینا اور غلام بنا لینا مستحکم کیا گیا ہے اور رائج ہو رہا ہے اور یہ باتیں علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں۔ تمام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں اور حُسنِ معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دوم یہ کہ مذہبی آزادی یعنی یہ بات کہ لوگ جو نسا مذہب چاہیں اختیار کریں اور اُس کے لوازم مذہبی آزادی سے ادا کریں بالکل روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی گئی ہے۔ تحمل کا تو نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا۔ سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اُس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔" پس اب ہم اپنے اس خطبہ میں ان تینوں خرابیوں میں سے جن کا ذکر سرولیم نے کیا ہے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ غور کریں گے۔

اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ جوروان کرنی اسلام لانے والوں پر لازمی قرار دی گئی ہیں یا کچھ زیادہ ثواب کی بات ٹھیرائی ہے۔ بلکہ برخلاف اُس کے عموماً ایک سے زیادہ جوروان کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ صرف اُن لوگوں کو اجازت دی ہے جن کو وجوہات طبیعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو۔ لیکن اگر یہ عذر نہ ہو تو ایک سے زیادہ جوروئیں کرنی اُن نیکیوں اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے جن کی ہدایت اسلام نے فرمائی ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ جو مخالفت عیسائی مصنفوں اور مسلمانوں کے طور وطریق دستورات و خیالات میں ہے وہ اس امر کا مانع قوی ہے کہ اس معاملہ میں سنجیدگی اور نیک نیتی اور صفائی قلب سے غور کی جائے، مثلاً کثرت ازدواج کے لفظ سے بھی عیسائی مصنفوں کے دل میں ایسے مکروہ خیالات گذرتے ہیں کہ وہ اس امر میں ہر ایک بات کی نسبت پہلے ہی سے مصمم ارادہ کر لیتے ہیں کہ اس میں عیب نکالیں اور اس امر پر لحاظ نہیں کرتے کہ ملک کی آب وہوا اور مرد وعورت کی تعداد اور مختلف طبعی وجوہات اور معاشرت کے لحاظ سے وہ کس حالت میں اور کس حد تک

جائز ہو سکتی ہے۔

ہم اس معاملہ کی نسبت تین امر یعنی قانون قدرت اور باہمی معاشرت اور مذہب کے لحاظ سے بحث کریں گے۔ چنانچہ پہلے امر پر غور کرنے کے لئے ہم اس بات کا دریافت کرنا (بشرطیکہ ممکن ہو) ضروری سمجھتے ہیں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا۔ یعنی اُس نے انسان کثیر الازواج ذی روح بنایا ہے یا نہیں۔ خالق کائنات کا ارادہ جو کچھ کہ ہو صاف صاف بلا کسی حجت و تکرار کے قدرت کے تمام کاموں سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ امر صریح ناممکن ہے۔ اُس کی مرضی اُن چیزوں کے برخلاف ہو۔ جو اُس کی مرضی سے پیدا ہوئی ہیں۔

پس ہم قانون قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت اُن کے خالق کا یہ نشا تھا کہ اُن کے صرف ایک ہی مادہ ہو اُن کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک نر و ایک مادہ پیدا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مائیں ہونی مقصود ہیں۔ اُن کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادہ کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جان دار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں وہ اکثر بلکہ تقریباً کل کے اسی قسم کے ہیں۔ پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اُس بیش بہا و نادر و عجیب قوت کے جس کو عقل یا نطق بمعنی مدرک کلیات وجزئیات کہتے ہیں اور اُس کے خالق نے اس میں ودیعت کی ہے اور تمام مخلوقات سے اشرف ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے جو اُس کے گرد پیش رہتے ہیں قدرت نے اُس کو عطا کئے ہیں اُن کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ملک کی تاثیرات آب و ہوا کے کام میں لاوے ورنہ اُس میں اور دیگر حیوانات میں جو اُس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکری یا مُرغی سے زیادہ کچھ رُتبہ نہیں رکھتا ہے۔ پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی قطعی التزام ایک سے زیادہ نہ ہونے کا خلاف فطرت ہے۔

دوسرے امر کی نسبت یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ انسان اپنی سرشت سے مدنی الطبع

پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں یوں بیان کیا ہے کہ جب کہ خداتعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا انسان کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ تو اُس نے اُس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے تفکرات وترددات۔ لطف وفرحت۔ رنج وراحت میں شریک ہو۔ اپنی مجانست سے اُس کی خوشی کو بڑھا دے اور اپنی محبت اور اُلفت کی بھری ہوئی ہمدردی سے اُس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے یہ ہے کہ انسان کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے۔ مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرضوں کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالق زن ومرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی حد خاص تک ایک ہی وقت میں جورویں رکھنے کی اجازت ہو خواہ یہ ہو کہ پہلی زوجہ کے طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔ چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اُس کو حاصل ہے۔ سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے اس علاج کو کرسکتا ہے۔ لیکن عورت کو اول جج (یعنی قاضی) کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی جس کی ضرورت ہم نے صاف صاف لفظوں میں ثابت کی ہے۔ تو اُس کے سبب سے حسن معاشرت میں نہایت نقصان پہنچتا۔ کیونکہ ایسی سخت قطعی قید سے نہایت قبیح اور بدترین بُرائیوں اور گناہوں کی طرف انسان کو مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ اس نقصان کا تعلیم وتربیت کی ترقی سے کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں۔ جو حسنِ معاشرت کے لئے سم قاتل ہیں۔

مسٹر ہگنز صاحب نے جو اپنی رائے نسبت تعدد ازواج لکھی ہے اور جان ڈیون پورٹ نے جو مانٹگیو کی رائے اس باب میں نقل کی ہے افسوس کا اس مقام پر بیان کرنا بے موقع نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بات افسوس کی ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازدواج پر صرف ایک نظر سے نگاہ کی ہے یعنی امورات طبعی کے لحاظ سے مگر مذہب اسلام میں یہ خاص اجازت حالات خاص میں صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی ہے بلکہ جیسا ہم نے اوپر بیان کیا۔ اس غرض سے دی گئی ہے کہ تزویج کی تلخیوں کے واسطے اور مقاصد تزوج کے فوت ہوجانے کی حالت میں ایک

تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اُس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے مانٹسکیو کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "گرم ملک میں عورتیں آٹھ نو یا دس برس کی عمر میں نکاح کے لائق ہو جاتی ہیں۔ پس اُن لڑکوں میں بچپن اور نکاح کے لائق جوانی گویا ساتھ ہوتی ہے۔ بیس برس کی عمر میں وہ بڑھیا ہو جاتی ہیں۔ پس اس لئے یہ ایک قدرتی بات ہے۔ کہ اُن ملکوں میں جب کہ کوئی قانون مانع نہ ہو انسان جورو کو طلاق دے کر دوسری جورو کرے اور تعدد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جاوے۔

مسٹر گبز صاحب لکھتے ہیں کہ علم قوائے انسانی اور علم طبیعات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسے دریافت کئے ہیں جو کثرت ازدواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متصور ہو سکتے ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے بینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر بنی اسمٰعیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں متعلق ہو سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ بیان کرتے ہیں۔ سر ڈبلیو اوسلی صاحب کے مشرقی مجموعہ صفحہ ۱۰۸ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے۔ جہاں دونوں برابر برابر اور بتدریج عالم ضعیفی میں پہنچتے ہیں۔ مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانی مذہب اسلام کے لئے اس بات کی کہ انہوں نے متعدد جوروؤں کی اجازت دی ایک وجہ بڑی تھی اور یہ کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسٰے نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اُس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کی آئین پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی۔

اب ہم اس مقام پر اُن بدعادتوں اور خراب اخلاق کا جو آنحضرت صلعم سے پہلے ایام جاہلیت میں عموماً جاری تھے۔ اس ناظرف دارانہ بحث میں ذکر نہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ ملک ایران اپنے اخلاق کی خرابی میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہاں قوانین طلاق بالائے طاق رکھدیئے تھے اور رشتہ داری کا گو وہ کیسی ہی قریب ہو یا بعید مطلق پاس و لحاظ نہیں تھا۔ بیٹے کو اُس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اُس کی بیٹی اور بھائی کو اُس کی بہن۔ غرض کہ

اس معاملہ میں فی الواقع ایک جانور کے گلہ سے مشابہت رکھتے تھے جو کسی قسم کے قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ ایران کے گوشۂ شمال و مغرب میں یہودی بکثرت آباد تھے۔ اُن کے ہاں کثرت ازدواج کی رسم بلا قید اور حد کے بے روک ٹوک کے جاری تھی۔ اور زمانۂ ..... جاہلیت کے عرب کے حالات کو بہ نظر غور دیکھنے سے جہاں یہودیوں اور ایرانیوں کے دستورات خلط ملط ہو گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں یہ دونوں رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعدد ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی۔ لوگ جس عورت کو چاہتے تھے پسند کرتے تھے۔ اپنی پسند میں کسی قسم کے قانون کے پابند نہ تھے۔ تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز و رتبہ یا امر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عورتوں کی لنسبت بدنیتی کے وحشیانہ خیالات اور اُن کے ساتھ وحشیانہ حرکات کا تفاخر صرف بے عیب ہی نہیں گنا جاتا تھا، بلکہ شیخی اور عالی ہمتی اور بڑی بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے عیسائی مذہب پر اگر وہ مذہب عیسوی کہا جا سکے، جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اُس کے معتقدوں کو ایک ایسے طریقہ کا پیرو پاتے ہیں جو ادپر کے دستوروں کے بالکل برخلاف ہے۔ یعنی ایک بھی جورو کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی۔ بلکہ رہبانیت و تجرد محض کی عام ہدایت تھی اور مرد عورت دونوں کے لئے وہی نیکی گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جس میں عقل کی اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور رسم و رواج اور اخلاق اور طرز معاشرت اس درجہ خراب ہو گیا تھا۔ بانی اسلام نے نہایت خوبی اور دانشمندی سے ایک ایسا عمدہ قانون بنایا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسنِ معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لئے اُس کے تلخیوں کو دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔

تیسرے جب کہ ہم اس معاملہ پر بلحاظ مذہب کے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ دو اور الہامی مذہبوں نے یعنی یہودی مذہب نے اور خصوصاً عیسائی مذہب نے جس کے پیرو مذہب اسلام کے اس مسئلہ پر نہایت طعن کرتے ہیں۔ اس باب میں کیا کیا ہے اور اس کے بعد ہم دکھا دیں گے کہ مذہب اسلام نے یہ کیا اور پھر اہل انصاف سے پوچھیں گے کہ مذہب عیسوی نے تعدد ازداج کو رد کیا ہے یا مذہب اسلام نے۔

مذہب یہود تو ایک مخزن ہے جس میں بکثرت ازدواج اور بلا تعین حد موجود ہے عیسائی مذہب

نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی چنانچہ ہم اپنے اس قول کی تائید میں چند مشہور و معروف عیسائی عالموں کی رائیں نقل کرتے ہیں جن سے تعدد ازدواج کی تائید ہوتی ہے مسٹر گنز بیان کرتے ہیں کہ "حضرت محمد نے اس نہایت قدیم موسوی مذہب کے متقنن کی پیروی کرکے اپنی قوم کو جو اسمٰعیل کی اولاد ہے۔ (جو مسلمانوں کے باپ کا بیٹا تھا) متعدد بیویوں کی اجازت دی اس واسطے عیسائی ہمیشہ اس پر عیب لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے پیرودں کی کمینہ خواہش کو پورا کیا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان کی نظیر اور حضرت داؤد کی نظیر پر (جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لئے بنایا تھا) یہ امر چنداں اعتراض کے لائق نہیں ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ علیٰی مسیح نے بھی اُن بس انجیلوں میں سے جن کو اُن کے معتقدوں کے گروہ میں سے کسی نہ کسی نے اُن کے احکام کے قلم بند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا۔ کسی انجیل میں اُس کی ممانعت نہیں ہے۔

مسٹر ڈیون پورٹ اپنی کتاب بئیبل کی بہت سی آیتوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "اُن آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اُس میں برکت دی ہے" نہایت مشہور و معروف عالم جان لمٹن تعدد ازدواج کا ایک مشہور حامی ہے جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد یہ تحریر کیا ہے کہ "علاوہ اس کے خدا نے ایک تمثیلی صورت (حزقیل) میں مسانان اہولا و اہولیا سے اپنا نکاح کرنا ظاہر کیا ہے۔ اور یہ ایک ایسا بیان ہے کہ اس کو خداوند تعالےٰ بالتخصیص اس طوالت کے ساتھ ایک تمثیل میں بھی ہرگز نہ اختیار کرتا اور نہ درحقیقت ایسی بات کا مرتکب ہوتا اگر وہ رسم جس کی دلالت اُس سے ہوتی ہے فی نفسہ معصوب یا مذموم ہوتی۔ پس جس رسم کا امتناع انجیل میں کبھی کسی کو نہیں ہے وہ کیونکر معیوب یا مذموم خیال کی جاسکتی ہے کیونکہ انجیل میں اُن ملکی آئین میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں کیا گیا ہے جو انجیل سے پیشتر جاری تھے"۔

جان لمٹن یہ بھی کہتے ہیں کہ میں عبرانیوں کے خط کے باب ۱۲ اور ۱۳ سے اس طرز سے جواز تعدد ازدواج پر استدلال کرتا ہوں کہ تعدد ازدواج کی رسم یا تو نکاح جائز ہے یا مجور ہے یا زنا ہے پس اس مقدس رسول نے کوئی چوتھی صورت تسلیم نہیں کی ہے۔ پس میں یقین کرتا ہوں کہ ان بہت سے بزرگوں کی تعظیم و توقیر کے لحاظ سے جو کثیر الازواج تھے ہر ایک شخص اُس کو مجور یا زنا خیال

کرنے سے باز رہے گا۔ کیونکہ خدا حرام کاروں اور زانیوں کو سزا دے گا۔ حالانکہ اُن بزرگوں پر خدا کی خاص نظر تھی جیسا کہ خود اُس نے فرمایا ہے پس اگر متعدد نکاحوں کا کرنا ٹھیک ٹھیک نکاح ہو تو وہی جائز ہے اسی حواری کا قول ہے کہ "سب میں نکاح کرنا بھلا ہے اور بستر ناپاک نہیں۔

یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا۔ اب ہم کہتے ہیں کہ مذہب اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کو پسند کیا ہے۔ تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اُس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا۔ ضرور ایسا ہوگا جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور حسن معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرت ازواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو اور ٹھیٹ یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پُرپیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے کہ " فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ " یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے۔ اگر ان لفظوں پر کافی غور نہ کیا جائے اور صرف اوپری اوپری معنی لیے جائیں، جیسے کہ اکثر علماء اور فقہا نے لیے ہیں تو بھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو بے اعتدالی سے باز رکھنے کی غرض سے (جو ہمیشہ بدتر اور بعض دفعہ خطرناک ہوتی ہے) اور اس بات کا یقین ہونے کی نظر سے کہ جس شخص نے ایک سے زیادہ جورو کس وجہ ایک واقعی ضرورت کے سبب سے مجبور تھا، بہت سخت قیدیں اور شرطیں لگائی گئی ہیں مثلاً یہ کہ سب کو برابر حقوق دینے اور سب کے ساتھ برابر محبت رکھنی، تاکہ عدل کے معنی متحقق ہوں۔ پس جو لوگ سچے دین دار اور درحقیقت مذہب کے تابع ہیں وہ از خود بجز ضرورت مجوزہ کے ایک سے زیادہ جوروان کرنے سے باز رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ اس اجازت سے بغیر اُس کی شرائط کے پورا کیے جن کا پورا کرنا نہایت مشکل ہے فائدہ اٹھانا اپنے مذہبی فرائض کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا نہیں ہے۔

لیکن اگر ان مختصر لفظوں پر بتعمق نظر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شارع نے ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت کو نہایت محدود اور خاص حالت میں مخصوص کر دیا ہے، کیونکہ اُس نے فرمایا ہے کہ اگر تم کو خوف ہے کہ عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی ہونی چاہیے۔ لفظ خوف عدم ایک

ایسا لفظ ہے کہ جب تک محل عدل ساقط نہ ہو خوف عدم زائل نہیں ہو سکتا۔ گو اس وقت ہم کیسا ہی سچا ارادہ کریں کہ ہم دونوں بیویوں میں عدل کریں گے (جو درحقیقت بحالت قیام محل عدل ناممکن ہے) تب بھی خوف عدم عدل اگر محل عدل قائم ہے زائل نہیں ہوتا۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کی بخوبی تفصیل ہے جہاں خدا نے ان لوگوں کی نسبت جن کے پاس متعدد جورواں تھیں صاف صاف فرما دیا ہے کہ تم ہرگز متعدد جوروں میں عدل نہ کر سکو گے، گو تم عدل کرنے کی کتنی ہی حرص کرو، پس مت جھک پڑو اندھا دھندی سے جھک پڑنا تاکہ چھوڑ دو اُن کو ادھر میں لٹکتی ہوئی کہ نہ وہ بیوہ یا مطلقہ ہے کہ دوسرا شوہر کر سکے اور نہ سہاگن ہے کہ خصم کے ساتھ خوشی سے زندگی بسر کرے، پھر اگر تم صلح کر لو اور پرہیزگاری کرو تو بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے اور اگر تم دونوں جُدا ہو جاؤ تو اللہ تعالےٰ دونوں کو اپنی وسعت رزق سے بے پرواہ کرے گا۔ اور اللہ بڑی وسعت والا حکیم ہے۔

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفوراً رحیما وان یتفرقا یغن اللہ کلاً من سعتہ وکان اللہ واسعاً حکیما۔ سورۂ نساء

اس آیت سے صاف ثابت ہوگیا کہ عدل غیر ممکن ہے اور اس لئے خوف عدم عدل کبھی ساقط نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ محل عدل باقی ہے اور اس آیت میں طلاق کو مسقط محل عدل بتایا ہے۔ اگرچہ اور بھی چند امور مثلاً امراض یا نقصان خلقت مسقط محل عدل ہو سکتے ہیں۔ پس اجازت تعدد ازدواج کی عدم وجود محل عدل میں منحصر ہوگی اور عدم وجود محل عدل مستلزم عدم حسن معاشرت ہے، پس کس دانائی اور احتیاط اور خوبی اور بے انتہا عمدگی سے شارع نے قانون قدرت اور حسن معاشرت دونوں کو قائم رکھ کر اس باب میں حکم دیا ہے اور ہر غیر متعصب شخص کا دل قبول کرے گا کہ بے شک یہ حکم اُسی شخص کا ہے۔ جس نے مرد و زن کا جوڑا پیدا کیا ہے۔

ہاں بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا عین منشا ہٹی کی اوجھل میں شکار کھیلنا ہے، ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کے بے جا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اُس خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے، جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً اُن کو اُس قسم کی سزا دے گا جو اُن کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔

ان تمام باتوں کے سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ یہ

جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں زر او دولت ہوئی اور دو دو اور تین تین اور چار چار جوروان کرنے لگے اور ایک بازار کی عورت کو دانوں پر چڑھایا اور نکاح کر مارا۔ جہاں مقدس مولوی ہوئے اللہ میاں کے سانڈ بنے اس مریدنی کو بے ڈالا وہاں وعظ کہنے گئے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبۃ النکاح کا پڑھانے لگے۔ اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کرکے عورتوں کو کھنگالنا شروع کردیا۔ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدہوتا ہے پس ایسے شخصوں کے افعال پر اسلام کی خوبی وحقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے ملئے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔

اب طلاق کی نسبت ہم کو گفتگو کرنی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس طرح ہم نے تعدد ازواج کی نسبت تین طرح پر یعنی قانون قدرت۔ حسن معاشرت۔ اور مذہب کی رُو سے بحث کی ہے اس طرح پر بحث نہیں ہوسکتی اور اس لئے ہم اس مسئلہ پر صرف بلحاظ حسن معاشرت اور مذہب کے بحث کریں گے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ تمام قدیم وجدید قوموں ومذہبوں میں نکاح کا عام رواج ہے۔ اور وہ علی العموم انسان کی ذاتی وتمدنی بہبودی کی بنیاد ہے تو جو چیز اس کو معدوم کرنے والی ہے۔ یعنی طلاق وہ نہایت ہی بدچیز فوائد ذاتی وتمدنی کو برباد کرنے والی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ رومن کیتھولک چرچ نے بنظر اس کی حفاظت کے نکاح کو اپنے ساتھ پاک رسموں میں قرار دے کر اس کو متبرک ٹھیرایا ہے اور انگلستان کے پروٹسٹنٹوں نے طلاق کا حکم صرف ایک حالت میں جائز رکھا ہے۔ جب کہ ہوس آف لارڈز سے زر کثیر صرف کرنے کے بعد حاصل ہو۔ یہ انتظام ۱۸۵۶ء تک قائم تھا۔ یعنی اُس وقت تک جب کہ طلاق کے تمام مقدمات کے سننے اور جیوری کی رائے سے اُس کی نسبت تجویز ہونے کے لئے ایک نئی عدالت قائم کی گئی۔

عمومًا یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ سب سے بڑا دشمن! حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے اس کے سبب سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب وحالت سے ایسی خرابیاں مرد وعورت میں پیدا ہوجائیں جو کسی طرح

اصلاح کے قابل نہ ہوں تو اُن کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے۔ پس کچھ شک نہیں ہے کہ ایسی حالت میں طلاق سے فائدہ ہے اُس کے باعث سے مرد و عورت کو آزادی ہو جاتی ہے۔ جن کے مزاج کی مخالفت یا سختی یا بے استقلالی سے دونوں کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ بایں ہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو۔ لیکن بہ لحاظ ان بداخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اُس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے۔ تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جب کہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں۔ تو اُس کو بطور ایک علاج سمجھ کر اُسی حالت میں اُس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ جب کہ اُس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں اور ایسے تردداتِ اور تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والی اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والی اور باہمی حسن و معاشرت کے بدلے دن رات کے لعن وطعن جوتی پیزار رکھنے والی ہوں، دور ہو سکتی ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے (جیسے کہ اسلام نے صرف اسی حالت میں اُس کو بے گناہ ٹھیرایا ہے) تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اُس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔

جب کہ ہم بلحاظ مذہب کے طلاق کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے۔ جس نے طلاق کے مسئلہ میں سب سے زیادہ حسنِ معاشرت کی حفاظت اور اصلاح پر نظر رکھی ہے۔ یہودی مذہب میں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط و حالت کے مرد کے اختیار میں تھا کہ جب وہ چاہے طلاق نامہ لکھ کر جورو کے حوالہ کر دے اور ایسا کرنے سے کسی حالت میں وہ کسی گناہ کا گنہگار متصور نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ حال کے زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں (اگر وہ صحیح ہو) تو بجز ایک خاص وجہ کے اور کسی حالت میں طلاق کا دینا جائز نہیں رکھا اور فرمایا کہ "میں تمھیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے" اگر اس فقرہ سے عدم جواز طلاق سمجھا جائے جیسا کہ حال کے زمانہ کے عیسائی سمجھے ہیں (اور شاید وہ سمجھ صحیح نہیں ہے) تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسانوں سے قریب ناممکن کے تھی۔ چنانچہ حضرت مسیح کے

معتقدوں نے حضرت مسیح سے کہا کہ "اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں"
پس اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جس طرح کہ اس زمانہ کے عیسائی مانتے ہیں تو حسنِ معاشرت
کے لئے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام
حسن معاشرت اور اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اُس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد
دونوں کے لئے اور بہت سی خرابیاں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بایں ہمہ
بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ اس کے حکم سے عدم جواز طلاق نہیں پایا جاتا اور اس لئے
وہ عالم عیسائی مذہب کی رو سے بھی طلاق کا جائز ہونا سوائے زنا کے اور حالتوں میں بھی تسلیم
کرتے ہیں۔ چنانچہ جان ملٹن نے اپنی کتاب مسائل مذہب عیسوی میں یہ بحث لکھی ہے کہ
"نکاح کی جو تعریف کی گئی ہے اُس کی رُو سے نکاح نہایت مرتبہ کا ایک اتحاد ہے مگر ناقابل
انفکاک یا ناقابل تفریق نہیں ہے۔ بعض لوگ اُس کے ناقابل تفریق ہونے کی نسبت متی
کی انجیل باب ۱۹ ورس ۵ سے استدلال کرتے ہیں۔ جس میں لکھا ہے کہ "وہ دونوں ایک
تن ہو جائیں گے"۔ اگر ان الفاظ پر مناسب طور سے غور کیا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں
کہ نکاح قطعاً قابل تفریق نہیں بلکہ اُن سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خفیف خفیف باتوں
پر نکاح کو منقطع کرنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ جو کچھ نکاح کے ناقابل انفکاک ہونے کی نسبت کہا گیا ہے وہ خاص
مقصد نکاح اور اس کے تمام مقاصد و لوازمات کی پوری پوری تعمیل ہونے پر منحصر ہے خواہ وہ الفاظ بطور ایک حکم کے یا بطور
ایک قدرتی نتیجہ کے خیال کئے جائیں اور اسی وجہ سے متی کی انجیل میں ان لفظوں کے ساتھ یہ لفظ بیان کئے گئے ہیں کہ
"مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا۔ اور وہ دونوں ایک تن ہوں گے" یعنی بشرطیکہ
نکاح کی اصلی نوعیت کے مطابق (جن کا بیان کتاب پیدائش باب ۲ ورس ۱۸ لغایت ۲۰
میں ہے) عورت خاوند کے واسطے ایک مددگار ہو یا یہ کہ جانبین کے باہم خیر خواہی اور محبت
اور آرام دوفاداری میں کچھ فرق نہ آئے کیونکہ عرف عام کے بموجب یہی اصلی وضع نکاح کی ہے
لیکن اگر اصل منشاء نکاح کا منقطع ہو جائے تو اُس سے لازم آتا ہے کہ نکاح بھی دراصل
منقطع ہو گیا۔

دوسری آیت میں جو بیان ہوا ہے اور جس پر بڑا زور دیا گیا ہے یعنی "جو کچھ خدا نے
ملایا ہے اُسے آدمی جدا نہ کرے" لحاظ کے قابل ہے۔ مگر نکاح ہی کے عقد سے یہ بات ظاہر ہوتی
ہے کہ خدا نے کس چیز کو ملایا ہے؟ خدا نے صرف اُس چیز کو ملایا ہے جو ملاپ کے قابل ہے اور

جو مناسب سے بہتر ہے اور محترم ہے۔ اُس نے انسان کی قدرتی طبیعت کے خلاف اور نامناسب حالت کے ملاپ کا حکم نہیں دیا۔ جس میں صرف بے عزتی اور تکلیف اور عداوت و مصیبت بھری ہوئی ہو۔ خدا تعالیٰ کچھ اس قسم کے ملاپ نہیں کرتا ہے جو درحقیقت ملاپ نہ ہوں۔ بلکہ جبر یہ نا عاقبت اندیشی یا غلطی یا بدسلیقگی کے اثر سے ہوئے ہوں۔ پس ایسی ناگوار خانہ داری کی بُرائی سے اپنے تئیں نجات دینا کس وجہ سے ناجائز ہے۔ علاوہ اس کے ہمارا مسئلہ اُن شخصوں کو جدا نہیں کرتا، جن کو خدا تعالےٰ نے اپنے مقدس آئین کے بموجب ملایا ہے۔ بلکہ صرف اُن شخصوں کو علیحدہ کرتا ہے جن کو خود خدا نے اپنے ایسے ہی مقدس آئین کی رو سے جُدا کر دیا ہے۔ اور یہ ایک ایسا حکم ہے جس کا اثر ہم پر ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ سابق میں اس کی اُمت پر ہوتا تھا۔ مذہب عیسوی کے کمال کو جس کی ترقی بعض لوگ نکاح کے ناقابل انفکاک ہونے کی ایک دلیل بیان کرتے ہیں۔ اُس کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ اس ترقی کو جبر اور قوانین تعزیری کے ذریعہ سے ہم میں زبردستی اس کا رواج نہیں دینا چاہیے، بلکہ اگر ہو تو اُس کو ترغیب اور عیساقی پند ونصائح کے ذریعے سے جاری کرنا چاہیے۔ کسی شخص کی نسبت صرف اُس حالت میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے نکاح کو قطع کیا جو شرعاً منعقد ہوا تھا۔ جب کہ وہ احکام الہٰی میں اس بات کو زیادہ کر کے جو خاص اس حکم میں شامل نہ ہو مذہب کے حیلہ سے اُس شخص سے جدا ہو جائے جو اُس کی منشا کے موافق ہو کیونکہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے منصفانہ اور پاک اور مقدس قانون میں صرف مختلف وجہوں پر طلاق کی اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس کو جائز قرار دیا ہے اور بعض صورتوں میں اُس کی ہدایت کی ہے اور بحالت خلاف ورزی سخت سزائیں قرار دی ہیں دیکھو کتاب خروج باب ۲۱ درس ۱۰، ۱۱ اور کتاب استثنا باب ۲۱ ورس ۱۴ اور باب ۲۴ ورس ۱ و کتاب عزرا باب ۱۰ ورس ۳ نحمیا باب ۲۳ ورس ۷۔

توریت کتاب استثنا باب ۲۴ ورس ۱ میں لکھا ہے کہ جب کہ کوئی شخص ایک بیوی کرے اور اس سے نکاح ہو جائے اور ایسا اتفاق ہو کہ وہ اس کو پسند نہ ہو کیونکہ اُس میں کچھ ناپاکی ہے تو اس کو چاہیے کہ ایک طلاق نامہ لکھ کر اُس کے ہاتھ میں دیدے اور اُس کو اپنے گھر سے نکال دے۔" پس اگر فرض کیا جائے کہ جو سبب طلاق بتایا گیا ہے وہ سچا ہے اور مصنوعی نہیں تو اس مقام میں خداوند تعالیٰ نے ایک بیوی ابتدا ہی میں اس غرض سے دی کہ وہ اُس

کی مدد اور تسلی و خوشی کا باعث ہو جیسا کہ خود آئین نکاح سے ظاہر ہوتا ہے تو اگر بعد کو جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے وہ بیوی رنج و رسوائی اور تباہی اور اذیت اور مصیبت کی باعث ہو تو ہم کو کیونکر یہ خیال کرنا چاہئیے کہ خدا ہم سے ایسی عورت کے طلاق دینے سے ناخوش ہوگا۔ میں دل کی سختی کو اُس شخص سے منسوب کرتا ہوں جو اُس عورت کو اپنے پاس رہنے دے، نہ کہ اُس شخص سے جو اُس کو ایسی صورتوں میں گھر سے نکال دے اور صرف میں ہی نہیں بلکہ خود حضرت سلیمان یا شاید خود خدا کی روح نے حضرت سلیمان کے منہ سے یہی بات کہی ہے۔ چنانچہ توریت کتاب امثال سلیمان باب ۳۰ ورس ۲۱ و ۲۳ میں لکھا ہے کہ" تین چیزوں سے دنیا کو بے چینی حاصل ہوتی ہے بلکہ چار چیزیں ہیں جن کو وہ برداشت نہیں کرسکتی ہے × × × اور ایک مکروہ عورت سے جب کہ اُس کا نکاح ہو جائے" اس کے برخلاف کتاب واعظ باب ۹ ورس ۹ میں بیان ہوا ہے کہ" تو اُس عورت کے ساتھ ہنسی خوشی سے بسر کر جس کو اُس نے (خدا) نے تجھے دیا ہے اور جس کو تو اپنی فانی زندگی کے تمام زمانہ میں پیار کرتا ہے"۔ پس جو عورت اُس نے تجھ کو دی ہے وہ عورت ہے جس کو تو پیار کرتا ہے، نہ کہ وہ جس سے تو نفرت کرتا ہے اور کتاب ملاخی باب ۲ ورس ۱۶ میں بیان ہوا ہے کہ" جو شخص نفرت کرتا ہے (یا اُس وجہ سے کہ وہ نفرت کرتی ہے) اس کو چاہیئے کہ اُس کو چھوڑ دے"۔ چنانچہ یونیوس سے پہلے سب نے اس فقرہ کا ایسا ہی ترجمہ کیا ہے[۱] پس معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس حکم کو حضرت موسیٰ کی معرفت اس غرض سے صادر نہیں فرمایا۔ اور نہ اس نبی کی معرفت اُس برائی کو اس غرض سے دہرایا کہ شوہر کو اپنی سنگ دلی کے برتاؤ کا موقع ملے۔ بلکہ اس غرض سے صادر کیا ہے کہ جہاں کہیں ضرورت ہو اس بدنصیب عورت کو اس کے اثر سے بچائے۔ کیونکہ اس میں کوئی سنگ دلی نہیں ہے کہ اُس عورت کو عزت سے اور بلا تکلف رخصت کردے جس کا خود ہی یہ قصور ہے۔ کہ وہ محبوب نہیں ہوئی۔ ایسی عورت کو جو نہ صرف یہی ہے کہ محبوب نہیں ہوئی بلکہ وہ معلق چھوڑ دی گئی ہو اور اس سے نفرت اور عداوت کی جاتی ہو۔ غرض کہ جس عورت کا یہ حال

---

[۱] صحیفہ ملاخی باب ۲ کی آیتوں کے ترجمے اس طرح پر ہوئے ہیں۔

ترجمہ عربی سنہ ۱۸۱۱ء میں ہے" وامراۃ شبابک لا تترک لکن ان ابغضتہا سرحہا" اور ترجمہ عربی مطبوعہ سنہ ۱۸۷۱ء میں" وزوجۃ غلامتک لا تزدلہا اذا بغضت فاطلق"۔ اور ایسا ہی رومن کیتھولک بائبل میں ہے اور انگریزی ترجمہ پروٹسٹنٹ کے حاشیہ پر بھی یہی عبارت ہے جس سے ملٹن نے استدلال کیا ہے۔

ہو اُس کو ایک نہایت تکلیف وہ قانون کا اتباع کرکے اُس کے شوہر کے نہایت بھاری غلامی کے جوئے میں رکھنا (کیونکہ نکاح بے محبت ایسا ہی ہوتا ہے) جس کو نہ تو اُس کے ساتھ الفت ہو اور نہ دوستی ہو ایسی درحقیقت ایسی سختی ہے جس میں ہر ایک قسم کی طلاق سے زیادہ بے رحمی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے طلاق کی اجازت دیدی ہے جس کا اگر مناسب طور سے عمل درآمد کیا جائے تو وہ نہایت منصفانہ اور رحیمانہ ہے بلکہ اُس نے اُس کے فائدوں کو ان شخصوں تک بھی وسعت دی ہے جن کی نسبت وہ یہ جانتا ہے کہ یہ اپنی سنگ دلی کی وجہ سے اس کا بے جا عمل درآمد کریں گے اور اُسی نے بدکار آدمیوں کی سنگ دلی گوارا کرنا اس سے بہتر تصور فرمایا کہ نیک آدمیوں کی تکلیف رفع کرنے سے باز رہے۔ یا جس رسم کا ایک ربانی برکت سے ایک بدترین مصائب ہو جانے کا اندیشہ تھا خود اسی کو درہم برہم کردے۔

خود حضرت عیسیٰ نے نویں آیت میں زنا کی وجہ سے طلاق کی اجازت دی ہے اور یہ بات نہ ہوتی اگر خدا تعالیٰ کو یہ بات منظور ہوتی کہ جن شخصوں کو خدا نے ایک مرتبہ عقدِ نکاح میں باندھ دیا ہے وہ ہرگز آئندہ جدا نہ ہوں۔ مگر مشرقی زبانوں کے محاورہ کے بموجب اُس لفظ سے جس کا ترجمہ زنا کیا گیا ہے۔ صرف زنا ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے یا تو وہ چیز مراد ہے جس کو "ناپاک چیز" کہا گیا ہے۔ یا کسی ایسے امر کا نقصان مراد ہے۔ جو جس امر کا ایک بیوی کی ذات میں ہونا واجباً ضروری ہے۔ جو کتاب استثنا کے ۲۴ باب کی پہلی آیت میں مذکور ہے۔ جیسا کہ سیلڈن نے سب سے پہلے اپنی کتاب اکزور ہبریا میں ایسے محاورہ کو۔ بہت سی ربانیین یہود کی شہادت سے ثابت کیا ہے۔ اور یا اس سے وہ شے مراد ہے جو محبت۔ وفاداری۔ باہمی امانت یا معاشرت یعنی اصلی آئین نکاح کے مقصد کے خلاف ہو کہ ہرگز اس سے موافقت نہ ہو سکے جیسا کہ سیلڈن نے ثابت کیا ہے کیونکہ جس وقت فریسیوں نے یہ سوال کیا تھا کہ ایک بیوی کو ہر ایک وجہ سے طلاق دینا جائز ہے یا نہیں، تو یہ جواب دینا لغو ہوتا کہ سوائے زنا کے اور کسی حالت میں جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بات تو بخوبی مشہور و معروف تھی کہ زنا کی حالت میں وہ جائز ہی نہیں تھی، بلکہ ایک زانیہ کو نکال دینا ضروری تھا۔ اور وہ بھی طلاق کے ذریعہ سے نہیں بلکہ قتل کردینے سے۔ پس اس مقام پر اُس لفظ سے بہ نسبت محض زنا کے زیادہ تر وسیع معنی سمجھنے چاہئیں جیسا کہ کتاب اقدس کے اکثر مقامات سے خصوصاً قاضیوں کی کتاب باب ۱۹ آیت ۲ سے ظاہر ہے جہاں لکھا ہے کہ "اُس کی بیوی زنا کرکے چلی گئی" یہاں زنا کے عرفی معنی

نہیں ہو سکتے کیونکہ ایسی حالت میں اُس کو جرأت نہ ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی جائے بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے متمردانہ (نشوز) برتاؤ کر کے چلی گئی اور نہ ایسی صورت میں (یعنی جب کہ بجز زنا کے طلاق جائز نہ تھی) پولوس مقدس کسی کافر مرد یا عورت کے جدا ہو جانے کے سبب سے طلاق کی اجازت دیتے[1] اگر یہ بھی ایک قسم کا زنا نہ ہوتا۔ اس بحث سے یہ امر کچھ متعلق نہیں ہے کہ یہ مسئلہ کافر مرد یا عورت کے متعلق ہے۔ کیونکہ جو شخص خاندان کو ترک کر دے وہ کافر سے بدتر ہے (پولوس کا پہلا خط تموتی کے نام باب ۵ آیت ۸) اور نہ نکاح کے اصلی منشا کے حق میں کوئی بات اس سے زیادہ تر ضروری اور پسندیدہ ہو سکتی ہے کہ جو عقد محبت اور تمام عمر کی باہمی اعانت کی توقع اور نیک ارادوں سے کیا گیا ہو وہ کینہ اور سنگین عداوت اور طرفین کی جانب ناپسندیدہ برتاؤ کے سبب سے قطع کر دیا جائے۔ پس خدا تعالےٰ نے انسان کے لئے جب کہ وہ بہشت میں معصومیت کی حالت میں تھا۔ دُنیا میں گناہ کے آنے سے پہلے یہ حکم دیا۔ کہ نکاح ناقابل انفکاک ہونا چاہیئے۔ گناہ کے بعد حالات کے تغیر کے موافق اور نیز اس نظرے کہ معصوم آدمی بدکار آدمیوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے ضرر سے محفوظ رہے۔ اُس نے نکاح کے انفکاک کی اجازت دی اور یہ اجازت قانون قدرت اور موسوی شریعت کا ایک جزو ہے۔ اور حضرت مسیح نے بھی اُس کی ممانعت نہیں کی پس ہر ایک معاہدہ سے جب کہ ابتدائً عمل میں آتے اس کا دوامی اور ناقابل انفکاک ہونا مقصود ہوتا ہے۔ گو وہ کسی فریق کی بدعہدی کے سبب سے کیسی ہی جلد کیوں نہ ٹوٹ جائے اور نہ اب تک کوئی معقول وجہ اس بات کی بیان کی گئی ہے کہ نکاح کی نوعیت اس باب میں اور تمام معاہدوں سے مختلف ہونی چاہیئے۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ پولوس مقدس نے یہ بات بیان کی ہے کہ کوئی بھائی یا بہن ایسی باتوں میں مقید نہیں ہے۔ یہ نہ صرف چھوڑ دینے کی نسبت بلکہ ایسی تمام صورتوں میں جو ایک نالائق قید پیدا کرنے میں ہوتی ہے جیسا کہ قرنتیوں نے پہلے خط میں لکھا ہے (باب ۷، آیت ۱۵) کہ "کوئی بھائی یا بہن ایسی باتوں میں مقید نہیں کہ خدا نے ملاپ کے لئے بلایا ہے" پس خدا تعالیٰ نے ہم کو اس غرض سے نہیں بلایا کہ ہم دائمی نزاع اور ترددات کے باعث سے پریشان خاطر رہیں۔ کیونکہ ہمارے بلانے کا مقصد

---

[1] اس مقام پر پولوس کے خط موسومہ قرنتیان کے ساتویں باب کی ۱۵ آیت پر اشارہ ہے۔

امن اور آزادی ہے نہ کہ نکاح چہ جائیکہ دائمی نزاع اور ایک ناخوش ازدواج کی غلامانہ قید جس کو رسول نے تمام چیزوں سے زیادہ ایک آزاد آدمی اور عیسائی کے ناقابل بتلایا ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ حضرت مسیح نے موسوی شریعت سے کوئی ایسا حکم خارج کر دیا جس سے مظلوم اور مصیبت زدہ شخصوں پر رحم کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اور نہ اس موقع پر حضرت مسیح کو یہ منظور تھا کہ ان کا یہ قول حکم عدالت سمجھا جائے یا اس معاملہ کی نسبت کوئی نیا اور سخت حکم دیا جائے بلکہ قانون کے بے جا عمل درآمدوں کے بیان کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنے حسب معمول ایک زیادہ تر کامل دستور معاشرت کا بتلایا اور اس موقع پر مثل اور تمام موقعوں کے منصب قضا کا دعوٰے نہیں کیا اور امر حق کو محض نصیحت کے طور پر بیان فرمایا نہ کہ جبریہ احکام سے۔ پس انجیل کی آیتیں قرار دینا اور احکام تعزیری کے ذریعہ سے اُس کو نافذ کرنا ایک سخت غلطی ہے"

یہ تمام تقریر جان ملٹن کی تھی جو انھوں نے ایک محققانہ اور عالمانہ طور پر بائبل کے احکام سے استنباط کی ہے۔ ہماری رائے میں یہ مطلب نہایت مختصر تقریر سے ختم ہوتا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسٰی سے پوچھا کہ بیوی کو ہر ایک طرح پر طلاق دینی درست ہے یا نہیں اُن کا جواب یہ ہے کہ بجز افعال ذمیمہ کے اور کسی صورت میں جائز نہیں۔ جس لفظ کا ترجمہ حرام کاری یا زنا کیا گیا ہے وہ عام لفظ ہے اور سب قسم کی بُرائیاں اُس میں داخل ہیں اور اُس کا ٹھیک ترجمہ افعال ذمیمہ ہو سکتا ہے۔ پس جو کچھ کہ حضرت عیسٰی نے فرمایا اُس سے امتناع طلاق نہیں نکلتا۔ بلکہ بلا قصور صرف اپنی نفسانی بدخواہشوں کے لئے طلاق دینا ناجائز بتایا گیا ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ مذہب اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اس کو بطور علاج ایک مرض لاعلاج کے جائز اور مباح بتلایا۔ مگر زن و شوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور ایک عجیب قسم کے ارتباط و اختلاط کا معاملہ ہے۔ کہ اُس میں جو بیماری پیدا ہو سوائے اُن ہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں۔ اس لئے بانیٔ اسلام نے اُس کی تشخیص نہ کسی (جج) کی یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوٰی پر بلکہ صرف اس کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لئے ابتدا میں عورت بطور انیس دل نواز اور مونس غمگسار کے پیدا ہوئی تھی۔

اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف

مرد کے حسن اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی۔ جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔

ما خلق اللہ شیئاً علی رجہ الارض البغض الیہ من الطلاق۔ (رواہ ابوداؤد)

بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا "بجز طلاق کے اور کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب ہو"۔

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق (رواہ ابوداؤد)

پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ "مباح چیزوں میں سب سے زیادہ خدا کو غضب میں لانے والی چیز طلاق ہے"۔

یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا ہے

ایما امراۃ سالت زوجھا طلاقا فی غیر ما باس فحرام علیھا رائحۃ الجنۃ (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد وابن ماجہ والدارمی)۔

کہ "جو عورت اپنے خاوند سے بغیر ضرورت شدید اور بغیر حالت سختی کے طلاق چاہے اس پر خوشبو جنت کی حرام ہے یعنی جنت میں نہ جائے گی۔

ہمارے پیغمبر خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا۔ کہ جو شخص اپنی بیوی کو دفعۃً طلاق دیدے وہ قتل ہونے کے لایق ہے چنانچہ

اخبر رسول اللہ صلعم عن رجل طلق امرۃ ثلث تطلیقات جمیعا فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ عز وجل وانا بین اظھرکم حتی قام رجل فقال یا رسول اللہ الا اقتلہ (رواہ النسائی)

ایک دفعہ رسول خدا صلعم کو اطلاع ہوئی۔ کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو دفعۃً تین طلاقیں دیدی ہیں یہ سن کر آنحضرت صلعم غصہ کے مارے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا خدائے بزرگ کے حکم کو کھیل بنایا ہے ایسی حالت میں بھی کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا۔ اور عرض کیا کہ اے رسول خدا کے کیا میں اس کو قتل کر ڈالوں یعنی وہ شخص آنحضرت کے غصہ ہونے سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کئے جانے کے لائق کام کیا ہے۔

بانی اسلام نے انہی ہدایتوں اور تہدیدوں ہی پر طلاق کے روکنے میں بس نہیں کیا بلکہ نکاح اور ملاپ کے قائم رکھنے کی اور بھی نہایت عمدہ تدبیر رکھی ہے یعنی پوری تفریق واقع ہونے

کو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہے اور پھر اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ دفعتہً تین طلاقیں نہ دی جائیں بلکہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے کہ ہر ایک میں قریباً پچیس روز کا فاصلہ ہو جاتا ہے اور پھر بھی اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے اور رنجش مٹ جائے اور دونوں کی محبت تازہ ہو جائے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں۔ دوسری طلاق کے بعد بھی اسی طرح وہ پھر آپس میں مل سکتے ہیں اور بدستور جورو خصم رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر پھر تیسری دفعہ طلاق دی جائے۔ تو ثابت ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں پھر بہتر ہے کہ پوری تفریق ہو جائے۔

ان ہدایتوں کے سوا ایک اور نہایت عمدہ ہدایت یہ فرمائی ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ عورت کو مرد سے کنارہ کش رہنا پڑتا ہے طلاق نہ دی جائے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ شاید زمانہ مقاربت میں محبت و اُلفت کی ایسی تحریک ہو کہ خیال طلاق کا ان دونوں کے دل سے جاتا رہے۔

علاوہ ان ہدایتوں کے ہمیشہ عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور اُن کے ساتھ مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے اور اُن کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید سے ہدایت فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اُسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔

ان سب احکام سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بانیٔ اسلام نے صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دی ہے جب کہ وہ ایک نہایت بیش بہا نعمت ثابت ہونے میں ذرا خطا نہ کرے اور جب کہ اُس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کے تردداًت اور تکلیفیں اور تلخیاں یا تو بالکل رفع ہو جائیں یا بہر کیف کچھ کم ہو جائیں۔ اور اگر طلاق کو کام میں نہ لایا جائے تو حالت معاشرت روز بروز زیادہ تکلیف دہ ہوتی جائے۔ ایسی صورت میں طلاق حسن معاشرت کے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتی بلکہ برخلاف اُس کے وہ دونوں کے حق میں ایک برکت اور حالت معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوتی ہے۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس اُن کے افعال کی نفرین انھیں پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر۔ ہم کو اُمید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب کہ تھیٹ اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل، انصاف، معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا

اور صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اُمی اُستاد کا بتایا ہوا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کر کے اُس کے لیے اُس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اُس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔ اور غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے ورقوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتادیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لاعلاج کا علاج ہے۔

اب ہم غلامی کے الزام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ایک سب سے بڑا الزام اُس کے جائز رکھنے کا مذہب اسلام کی نسبت لگایا گیا ہے اور بیان ہوا ہے کہ قوانین حسن معاشرت اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے۔ قوانین حسن معاشرت کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اُس کی نسبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جن میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اُس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ کا اُس زمانہ کے رسم و رواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اُس بے رحم دستور کی ممانعت ہو۔ قبل اس کے کہ ہم اس معاملہ میں اپنی رائے بر بناء مذہب اسلام ظاہر کریں۔ گاڈفری ہگنز صاحب نے جو کچھ اُس کی نسبت لکھا ہے اُس کو بیان کرتے ہیں۔

گاڈفری ہگنز صاحب لکھتے ہیں کہ "انسان کے حق میں یہ ایک بدقسمتی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ نہ تو حضرت عیسیٰؑ نے اور نہ حضرت محمدؐ نے غلامی کا موقوف کرنا مناسب خیال کیا۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ دونوں نے اپنے معتقدوں کو یہ ہدایت کی کہ اُن کو اوروں کے ساتھ وہ کرنا چاہیے جیسا کہ اوروں سے اپنے ساتھ کرنا چاہتے ہیں تو اُنھوں نے درحقیقت غلامی موقوف کردی۔ یہ بات ظاہر میں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ عمل میں ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی خانگی غلامی بلاشبہ ناقابل حمایت ہے لیکن افریقہ کی بردہ فروشی اور ویسٹ انڈیز کے کارخانہ باغات میں غلاموں پر کی سختیوں اور بے رحمیوں کے مقابلہ میں (جو عیسائی ملکوں میں مروج تھیں) کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتیں۔ ہم نہایت اعتقاد سے روم کے پوپ اور کنٹربری کے آرچ بشپ اور کونسلوں اور مجلسوں اور پوپ کے احکام اور

عقاید اور مذہبی قوانین اور معاہدوں کا ذکر سنتے ہیں ۔ مگر ہم نے کب یہ بات سنی ہے کہ اُن لوگوں نے کوئی عام تدبیر اس خوفناک تجارت کے انسداد کے لیے کی ہو واضح ہو کہ اُس زمانہ میں تمام فرنگستان میں غلامی کی تجارت رائج تھی، ورنہ اُس کی نسبت ہم کو پوپ کا کوئی حکم دکھا دیا کسی مجلس کا کوئی قانون بتاؤ ۔ روم اور کنٹر بری کے بشپ خود اس خطاب کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے معتقدوں کی خواہشوں کے پورا کرنے کے کام دیتے تھے جو خطاب کہ انھوں نے حضرت محمدؐ کو اس وجہ سے دیا ہے ۔ جب کہ رُوم کے پوپوں کو اس تجارت کا فساد عظیم صاف صاف ثابت ہو گیا تھا ۔ تو انھوں نے اُن شخصوں کو قوم سے خارج نہیں کیا جو اُس تجارت میں مصروف تھے جیسا کہ کیوکارس یعنی پیروان جارج فاکس نے کیا تھا ۔

میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہ یہ ظاہری عذر کریں گے کہ وہ کسی شخص کو اس وجہ سے کہ غلاموں کا مالک ہے قوم سے خارج نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے ۔ مثلاً جہاں کہیں لفظ "سروس" یا "وولوس" پایا جاتا ہے ۔ اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے ۔ وہاں اُس کا ترجمہ غلام ہونا چاہیئے ۔ لفظ "سروس" کے لغوی معنی اُس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو اور "فریدمین" ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے ہم معنی ہیں ۔ لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جائے تو اس سے کسی طرح پر یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے ۔ جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں کبھی نہ تھا اور جو ہر طرح پر اُن کی خانگی غلامی سے مختلف ہے ۔

اگرچہ پیغمبر صاحب نے اس مکروہ دستور کو موقوف نہیں کیا جیسا کہ ان کو کرنا چاہیئے تھا تاہم اُنھوں نے بالکل بغیر ذکر کیے ہوتے نہیں چھوڑا ۔ بلکہ اس بات کے فرمانے سے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور کسی شخص کو اپنے بھائی کو غلامی میں رکھنا نہیں چاہیے ۔ اُنھوں نے انسانوں کے ایک گروہ کثیر کو آزاد کر دیا ۔ جس وقت کوئی یہ کہدے کہ میں ایمان لے آیا تو وہ فوراً آزاد ہے ۔ اگر حضرت محمدؐ نے اس باب میں جیسا کہ چاہیے تھا ویسا نہیں کیا ۔ تو اُنھوں نے کچھ تو کیا جو بالکل نہ ہونے سے (جیسے کہ انجیل میں کچھ نہیں ہے) بہتر ہے اور اس سبب سے غالباً کچھ لوگ بلا تصدیق قلبی بھی مسلمان ہو گئے ہوں گے گو کہ اس امر کو کوئی پکا دین دار عیسائی جس کا گرم ایمان مذبح کے دہکتے ہوئے انگارے سے زیادہ تر گرما گرم ہے عیب لگا دے اور اُس کو بدنیتی پر حمل کرے ۔ لیکن تاہم

اس تدبیر نے لاکھوں آدمیوں کو مصیبت سے بچایا ہے۔ ایک اور تدبیر غلامی کی ترمیم یا اس کی قباحتوں کی تخفیف کرنے کی پیغمبر صاحب کے اس حکم سے ملتی ہے۔ جہاں یہ فرمایا ہے کہ غلاموں کو فروخت کرنے میں ماں سے بچے جدا نہ کئے جائیں۔ ہمارے ویسٹ انڈیز والے ہر روز یہی جرم کرتے ہیں۔ مجھ کو کوئی ایسا حکم انجیل میں نہیں ملا اس لئے حضرت محمدؐ نے اس کو انجیل میں سے نہیں لیا ہے۔

گاڈفری ہگنز صاحب لکھتے ہیں کہ "ہم عیسائی اکثر اوقات بیچارے حبشیوں کو عیسائی بنانے کی خواہش کرتے ہیں مگر میں انہی مشنری سوسٹیوں کو یہ صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنی دولت کثیر کو اس باب میں صرف کریں۔ کہ جس وقت حبشیوں کا مذہب تبدیل ہوجائے تو اُن کو فوراً آزاد کردیں' اور ان کو اپنا بھائی قرار دیں جیسا کہ مسلمان کیا کرتے ہیں۔ اور میں اُن کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے تمام وعظوں سے اس قدر لوگ ان کے معتقد نہ ہوں گے جیسے کہ اس بات سے ہوں گے۔"

گاڈفری ہگنز صاحب نے ولیٹ منسٹر ریویو کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ اُن کا مسئلہ قانون غلامی کے باب میں یہ ہے کہ "اگر غلام تمھارے پاس آئیں تو تم اُن کو قید اور اُس کے بعد اُن کو سربازار مت فروخت کرو گو کوئی دعوے دار اُن کا موجود نہ ہو (جیسا کہ اٹھارہویں صدی میں عیسائی انگلستان کا قانون اُس کے صوبوں میں جاری ہے) بلکہ اُن کو آزاد کردو اور تم کو مناسب نہیں کہ اُن کو نکال دو۔ مگر حضرت محمدؐ (جنھوں نے غلامی کے مٹانے کی نسبت نہایت عمدہ تدبیریں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے۔

حضرت محمدؐ تو فرماتے ہیں کہ "ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کردیں۔ تو وہ اپنے تئیں آزاد کرلیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھدو۔ اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے اُن کو دو۔" گاڈفری ہگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا گاڈفری ہگنز کا استدلال تھا مگر یہ استدلال کسی قدر حاشیہ لکھنے کا محتاج ہے۔ ان کا یہ بیان ہے کہ "حضرت محمدؐ نے غلامی کو موقوف کرنا مناسب خیال نہ کیا" صحیح نہیں ہے جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے ہورہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے۔ اور جو لوگ خاص آنحضرت صلعم کو اپنا ہادی اور پیشوا جانتے ہیں۔ اور زید اور عمرو کی

رائے اور اجتہاد کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تو وہ صاف صاف قرآن مجید میں پاتے ہیں کہ بانی اسلام نے آئندہ کی غلامی کو بالکل قطعاً موقوف کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ پس یہ فخر صرف مذہب اسلام ہی کو ہے کہ اُس نے غلامی کو معدوم کیا ہے اور ہر انسان کو آزاد قرار دیا ہے۔

اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈفری ہگنز نے کیا ہے ہم کو دل سے اُس پر اتفاق ہے۔ خدا تعالےٰ نے سورہ حجرات میں صاف فرمایا ہے کہ "انما المومنون اخوۃ" یعنی سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں اور سورہ آل عمران میں فرمایا ہے کہ "سب لوگ اکھٹے ہو کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑو اور جدا جدا راہوں میں مت بھٹکو اور تم کو جو نعمتِ خداوندی ہے (یعنی اسلام) اس کا شکر کرو۔ ایک وقت تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر تمھارے دلوں میں خدا نے محبت ڈال دی پھر تم ہو گئے اللہ کی نعمت (یعنی اسلام) کے سبب آپس میں بھائی"

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا (سورہ آل عمران)

پس کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور اس لئے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ یہی "اخوت" اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مرجاتا ہے تو اُس کا مال بیت المال میں اُس کے سب مسلمان بھائیوں کے لئے چلا جاتا ہے مگر جب ہمارے پیغمبر نے علانیہ صاف صاف لفظوں میں آئندہ کی غلامی کو عام طور پر معدوم کر دیا ہے تو ہم کو اس قسم کی خاص خاص باتوں پر استدلال کی حاجت نہیں ہے۔

کتابت کا جو ذکر گاڈفری ہگنز صاحب نے کیا ہے وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو بلکہ اُس کا کرنا واجب تھا اور انکار کرنا قابل سزا کے تھا۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے (اگر وہ صحیح ہو) معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انس سے کتابت کی درخواست کی تو اُنھوں نے انکار کیا۔ ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا اور حضرت عمر نے حضرت انس کو اس انکار کرنے پر دُرّوں سے پٹوا دیا اور کتابت یعنی خط آزادی و معاوضہ روپیہ کے جبر حضرت انس سے لکھوا دیا۔ گو یہ حدیث قابل شبہ ہو مگر خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کہ کتابت کی درخواست کرنے پر خط آزادی بمعاوضہ روپیہ کے لکھ دینا لازم ہے۔

بہرحال جو حمایت اس عالم اور فاضل مصنف نے نہایت قابلیت اور بڑی سرگرمی سے مذہب اسلام کی کی ہے اُس کا واجب شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مصنف نے غلامی کی ترمیم یا اس کی خرابیوں کی تخفیف میں جو بچوں کو ماں سے جدا نہ کرنے کا ذکر کیا ہے اُس کے ساتھ چند

اور اسی قسم کے احکام زیادہ کرنے چاہئیں جو غلامی کی ترمیم اور اُس کی خرابیوں کی تخفیف کے حق میں ویسی ہی مفید ہیں چنانچہ آنحضرت صلعم نے غلاموںؑ کے حق میں فرمایا ہے کہ "وہ تمھارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے)، جو تمھاری خدمت کرتے ہیں تمھارے کاموں کو سنوارتے ہیں اللہ نے ان کو تمھارے تابع کر دیا ہے پس جو شخص کہ اُس کا بھائی اُس کے تابع ہو تو اُس کو چاہئے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اُس کو کھلائے اور جو آپ پہنتا ہے اُس میں سے اُس کو پہنائے اور اُن سے ایسی تکلیف کے کام جو اُن کو تھکا دیں نہ لے اور اگر ایسی تکلیف کا کام اُن کو دیا جائے جو اُن کو تھکا دے گا تو خود ان کی مدد کرے"

قال (ای النبی صلعم فی حق العبید) ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل و یلبسہ مما یلبس و لا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فاعینوھم (بخاری باب قول النبی صلعم العبید اخوانکم صفحہ ۳۴۶)

اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اُس زمانہ میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا اُن کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے اور باری باری سے نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے۔

خلیفہ عمرؓ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں (خواہ اُن کے عالی مرتبہ کو پیغمبر کا جانشین ہونے کی وجہ سے خیال کرو خواہ ایک ایسی سلطنت کا بادشاہ تصور کرنے سے جو دنیا میں سب سے زیادہ وسیع اور با عظمت تھی)، اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر اُن کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے۔ فاطمہؓ پیغمبر کی بیٹی اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں کبھی اُن کا دست مبارک ہتے کو نیچے سے تھامتا تھا۔ اور کبھی لونڈی کا تاکہ دونوں کو برابر محنت پڑے۔ پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حُسنِ معاشرت کو ابتر کرنے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے

ؑ اس حدیث میں بوجہ اسلام کے بھائی ہونے کا ذکر نہیں ہے اور آیت قرآن مجید میں جو اوپر مذکور ہوئی بوجہ اسلام بھائی ہونے کا ذکر ہے۔ اس لئے اسلام سے غلامی کے ساقط ہونے پر گاڈفری ہگنز صاحب نے استدلال کیا ہے۔

ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسنِ معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زاید از حد ترقی متصوّر ہے۔ پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی۔ قیاس کرنا محض غلطی ہے۔ آنحضرت صلعم نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا بلکہ اُن کی نسبت لونڈی و غلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے اُن کی رقیت اور حقارت نکلتی تھی منع فرمایا اور نہایت شائستہ و مہذب و شفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یعنی یہ فرمایا کہ "اُن کو لڑکا" اور "لڑکی" کہکر پکارا کرو (جس کو بگاڑ کر ہندوستان کے ناخدا ترسوں نے "چھوکرا" اور "چھوکری" بمعنی لونڈی و غلام کہنا شروع کیا ہے۔ مسلم کی اس حدیث کے لفظوں کو دیکھو اور سمجھو کہ تمھارے پیشوا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا ہے کہ اس فرمانے کے بعد ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ پیارے پیغمبر رحمۃ للعالمین نے فرمایا کہ "کوئی تم میں سے میرا غلام اور میری لونڈی ہرگز نہ کہے تم سب خدا کے غلام ہو اور سب تمھاری عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں مگر یوں کہو کہ میرا بچہ اور میری بچی اور میرا لڑکا اور میری لڑکی" علاوہ اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔

(۱) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی وامتی کلکم عبید اللہ وکل نساءکم اماء اللہ ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتائی وفتاتی (مسلم کتاب الالفاظ من الادب)

اب ہم ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے غلامی کی نسبت کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام نے آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ بموجب قدیم رسم جاہلیت کے غلام ہو چکے تھے اُن کی آزادی کا احسانًا بلا لینے زر معاوضہ کے حکم نہیں دیا وہ بدستور اُن لوگوں کے ملک رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے۔ اگر کوئی ناسمجھ بدنام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعۃً کیوں نہ آزاد کر دیا تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج نہیں ہے۔ مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں اس قدر تو ضرور تسلی ہوگی کہ اُن بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے۔ اور ایسا رحم و شفقت جو اسلام نے اُن کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں اُن کی آزادی کی نسبت کیں اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں، ہاں بلاشبہ جو

سمجھدار اور دانشور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے اُن کی آزادی کا دفعتہً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کردیا جائے اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے۔ پس یہی کام اسلام نے کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے۔ بلکہ اُسی کا ہے جس نے انسان میں حسنِ معاشرت کو پیدا کیا ہے۔

بقول مسٹر گبنز کے گو حضرت مسیح نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمۃ للعالمین نے غلامی کو بالکل موقوف کردیا۔ تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا اور جو قدیم زمانہ کے بُت پرستوں اور اُس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی۔ اور جن رسموں کو اُس بڑے مقدس مقنن موسیٰ نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا۔ اور جن کو حضرت مسیح نے بھی نہیں توڑا تھا اور جن کو حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا دفعتہً منسوخ کردیا اور تمام پُرانی رسموں اور مطوّل قانونوں کو ایک دو لفظ کے فرمانے سے کہ "اِمّامنا بعد واما فداء" مٹا دیا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست ۔۔۔ کتب خانۂ چند ملت بشست

صلی اللہ علیہ وسلم۔ بابی انت وامی یارسول اللہ۔

اُس رسول مقبول ہادم الوثنیۃ ناصر الانسان رحمۃ للعالمین نے اپنے مبارک ہونٹوں سے فرمایا کہ خدا تعالےٰ یہ حکم دیتا ہے کہ جب تم مقابل ہو کافروں کے تو گردنیں کاٹو جب کہ تم اُس پر گھمسان کر چکو تو اُن کو قید کرلو۔ پھر قید کرنے کے بعد یا تو اُن پر احسان رکھ کر یا اُن سے فدیہ چھڑائی لے کر چھوڑ دو۔

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فامنا بعد واما فداءً (سورہ محمد آیت ۴)۔

اس آیت سے پایا جاتا ہے کہ کافروں کے مغلوب ہو جانے پر جو اُن کے قید کرنے کا حکم ہے اُس سے مقصد اُن کی جان بچانا ہے اور قید کرنے کے بعد جو حکم اُن کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے اُن سے چھڑائی لے کر چھوڑنے میں جب دو حکم دیئے جاتے ہیں۔ تو اُن لوگوں کو جن کی نسبت وہ حکم ہیں اس قدر تو ضرور اختیار رہتا

ہے کہ اُن دونوں میں سے جونسے حکم کی چاہیں تعمیل کریں ۔ مگر دونوں میں سے ایک کا بجالانا واجب ہوتا ہے ۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں ۔ بلکہ کوئی اور امر اختیار کریں پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل درآمد کرنا واجب ہے ۔ ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیئے رقیت یعنی قیدیوں کا لونڈی اور غلام بنانا بالکل نیست ونابود ہوگیا ہے ۔ ہاں یہ بات ہوسکتی ہے ۔ کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو اُس وقت تک اُس کو قید رکھے ۔ مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہوگا اور رقیت ومملوکیت کسی حالت میں اُس پر طاری نہ ہوگی ۔ اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا ۔ تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی اور اسی لئے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی ۔

ہمارے ہاں کے عالموں کی رائے میں اس امر کی نسبت اختلاف ہے کہ کن صورتوں میں قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑنا چاہیئے ۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ اُن کو صرف اُس حالت میں چھوڑنا چاہیئے ۔ جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہوکر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں اور بعضوں کی یہ رائے ہے ۔ جو بظاہر معقول بھی معلوم ہوتی ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیئے اور کوئی شرط اُن پر نہ لگائی جائے اور چھوٹ جانے کے بعد اُن کو اختیار ہے کہ چاہیں مسلمانوں کے ملک میں رعیت ہوکر رہیں اور چاہیں اپنے خاص ملک کو چلے جائیں ۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں احسان رکھ کر چھوڑ دینے کی حالت میں کوئی قید و شرط نہیں لگائی ہے اور اسی لئے ہمارے نزدیک پچھلی رائے اُن عالموں کی پہلی رائے سے زیادہ مستند ومعتبر وصحیح ہے ۔

دیکھو کتابت یعنی بمعاوضہ روپیہ کے خط آزادی لکھ دینے اور فدیہ لے کر چھوڑنے میں چنداں فرق نہیں ہے اگلے غلاموں کی نسبت جو کتابت کا حکم ہے وہ اگلے غلاموں کی آزادی کی نہایت معتبر دستاویز ہے ۔

جس نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے ۔ اس کو دیکھ کر ہم کو کچھ کم رنج نہیں ہوتا ۔ مگر ہم اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے ۔ وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اُس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے ۔ اور وہ ضرور ایک دن اُس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا ۔ خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینہ میں ۔

سر ولیم میور اسلام میں ایک یہ نقص تبلاتے ہیں۔ کہ اسلام میں مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی ہے۔"

مگر سر ولیم میور کی اُس رائے کا جس سے وہ مذہب اسلام میں مذہبی رائے کی آزادی نہ ہونے کا نقص نکالتے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے اور اور مذہبوں میں ایسی کونسی بات ہے جو اُس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی جن کی کتب مقدسہ گویا مذہب اسلام ... اور مذہب عیسائی دونوں کی بنیاد ہیں یہ پکا عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ مع اُس کے تاریخی مضمون کے باوجودیکہ اُن کے مصنف بھی معلوم نہیں ہیں وحی آسمانی ہیں اور اس لئے سہو و خطا و غلطی سے بالکل مبرا ہیں اور ہر ایک انسان کو بغیر ذرا سے بھی تامل کے اور بغیر کسی حجت کے اور بغیر استعمال کرنے اپنے قوائے عقلیہ کے اُن کے حق ہونے کا اعتقاد کرنا چاہیئے۔

عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ بلحاظ اعتقاد لنسبت کتب مقدسہ کے وہ دو فرقے ہو گئے ہیں۔ ایک وہ جو یقین کرتے ہیں کہ کتاب مقدس تمام و کمال وحی من السماء ہے۔ دوسرا وہ جو صرف اُس کے ایک حصہ کو وحی سمجھتا ہے جو مسائل و احکام سے متعلق ہے اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا۔

مگر قطع نظر اُس اختلاف سے جو عیسائیوں کو کتب مقدسہ کے اعتقاد اور اُن کے وحی ہونے کی لنسبت ہے۔ ان کو دو بڑے بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے جن کے سبب سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور سے بالکلیہ نیست و نابود ہو جاتی ہے اور اس لئے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں اور وہ دو مسئلے یہ ہیں۔

ایک مسئلہ "توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید" کا ہے۔ یہ ایک نہایت عجیب طور کا مسئلہ ہے جس کی لنسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے۔ لفظ تثلیث کا خدا کے تین مقدس جسموں کے ظاہر کرنے کو حضرت عیسٰے کی دوسری صدی تک یعنی اُس وقت تک جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اُس کو ایجاد کیا جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل یا ناسیا میں بھی جو ۳۲۵ برس بعد حضرت عیسٰے کے ہوئی تھی۔ اور جس میں ایریس کے

مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا طے نہیں ہوا تھا اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ پارسن اور اور مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس پر خاص اس مسئلہ کا استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے۔ پس اگر اعتقاد کی خوبی نہایت عجیب و مشکل و خلاف عقل مسائل پر اعتقاد لانے میں ہو تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص عیسائی کہلائے اور اُس کو عیسائیوں کے حقوق خدا کی بارگاہ میں حاصل ہوں اُس کو اس مسئلہ عجیب و غریب پر پکا اعتقاد لانا چاہئیے تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانونِ قدرت اور آئین عقل کے برخلاف ہے تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار و معطل چھوڑ کر نہایت اصرار و تعصب سے اُس پر اعتقاد کرنا چاہئیے۔ دلیل و عقل کو اُس میں دخل دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ فدیہ کا یعنی حضرت عیسٰی کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آیندہ کے گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے۔ اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے اور یہ مسئلہ بھی ایسا مسئلہ ہے جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ فدیہ کا ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کے سبب سے انسان اپنے اعمال کا جوابدہ نہیں رہتا اور بدی اور بداخلاقی کے دروازہ کو کھول دیتا ہے کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا بقول شخصے ؎

"گناہ من از نامدے در شمار ترا نام کے بودے آمرزگار"

پس جو کوئی زیادہ گناہ کرے گا وہی شخص زیادہ رحمت کا مستحق ہوگا جو حق ایک بڑے ولی کو ہونا چاہئیے۔ اس لئے سب سے بڑا گنہگار سب سے بڑا ولی ہوگا۔ مگر ہم ایسی رائے کو پسند نہیں کرتے اور سچے ایمان داروں کو جو وہ کسی معبود حق یا باطل پر یقین رکھتے ہوں۔ ان کا نیکوکار ہونا لازم سمجھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ فدیہ کے بعد بھی دوزخ بالکل خالی نہ ہوگی کیونکہ عیسائی مذہب کے موافق بھی تمام کافر جو بے شمار گروہ ہیں اور جن کے بے شمار نام ہیں سب دوزخ میں جائیں گے اور اُس کے تنگ و تاریک مکانوں میں قید رہیں گے۔

ایک مسئلہ مذہب عیسوی کا جو سرنوشت کے نام سے مشہور ہے حسن معاشرت کے حق میں ویسا ہی مضرت بخش ہے اگر اس مسئلہ کا معتقد نیک طبیعت اور صاف دل ہو تو بآسانی اُس کو یقین

ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ازل سے اُس کا نام کتاب حیات میں لکھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ خیال کرتا ہے کہ اگر اُس کی بُرائیاں اور اُس کے گناہ سمندر کے کناروں کے ریت کے برابر بھی ہو جائیں تب بھی اُس کا نام صفحہ کتاب حیات سے نہ مٹا سکیں گے اور اگر وہ کمبخت بےنصیب پرپیچ دار اور بدخصلت خشک طبیعت عبوس صورت ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا نام صفحہ کتاب حیات میں مندرج نہیں ہے اور اس لئے وہ اپنے قدرتی مزاج کے خراب میلان کو روکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور نیکی کی طرف رجوع کرنے کو اُسے کوئی ترغیب نہیں رہتی۔

مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسہ سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اُس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بےنظیر ہے اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اُس سے فائق نہیں ہے۔

ہم اس مقام پر ایک مشہور و معروف فرانسیسی عالم یعنی ایم ڈی سینٹ ہلیر کی رائے نقل کرتے ہیں جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب اور خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانشمند بےتعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ "اسلام میں کوئی بات شتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے۔ مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے۔ اور اگر اب تک اُس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے"۔

اب مذہب اسلام کی آزادی رائے کا حال مذہبی معاملات کی نسبت غور کرو۔ دین محمدی صلعم کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت ہر ایک شخص آزادانہ رائے دے سکتا ہے۔ راویوں کی نسبت، روایت کے مضمون کی نسبت۔ نہایت آزادانہ تحقیقات و تفتیش کرنے کا اور اُن تمام روایتوں اور حدیثوں کو جو اُسکی آزادانہ تحقیقات اور بےتعصب رائے میں تحقیق کے بعد نامعتبر ٹھیریں نامقبول کرنے کا ہر ایک شخص کو کلیۃً اختیار حاصل ہے۔ جو روایتیں اور حدیثیں کہ غور و فکر اور تحمل سے تحقیقات کرنے کے بعد عقل اور قدرت کے برخلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں، یا جو روایتیں اور حدیثیں بےسند ہوں اُن سب کو رد کر دینے کا کلیۃً مجاز ہے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ "حدیث بےسند گوز شتر است"۔

یہ قول ایک ایسے بڑے شخص کا ہے۔ جس کو لوگوں نے نبی سے کچھ ہی کم مان رکھا ہے۔

قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ ہم نے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اُس کے سچ ہونے سے مانا ہے۔ ٹھیٹ مذہب اسلام کی روسے ہر ایک شخص کو آزادی ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اُس میں پائے اس پر عمل کرے کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور سمجھ کا پابند نہیں ہے۔ مذہب اسلام میں ایسی قوت کسی کو نہیں ہے کہ دوسرے کو خواہ نخواہ برخلاف اُس کی سمجھ کے اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے۔ ہر شخص آپ اپنے لئے مجتہد ہے۔ صحابہ جن کو ہم بعد پیغمبر کے بزرگ سمجھتے ہیں اُن کی نسبت بھی اکابر مذہب اسلام کا قول ہے کہ "نحن رجال وھم رجال" پس اس سے زیادہ اور کیا مذہبی معاملات میں آزادیِ رائے ہو سکتی ہے۔

مگر ہم یہودی اور عیسائی مذہب میں اس قسم کی آزادی رائے معاملات مذہبی میں نہیں دیکھتے مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ اُس کا جو سب سے بڑا اصول ہے یعنی خدا کے وجود اور اُس کی وحدانیت کا ماننا وہ بھی اندھا دھندی کے اعتقاد اور بے مداخلت عقل اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ خود قرآن مجید اس بڑے مسئلہ کو جبر و سختی و نا سمجھی سے تسلیم کرنے کو نہیں کہتا بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اُس کو سکھاتا ہے۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے خدا تعالےٰ کے وجود اور اُس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اُس کے بعد اُس لازوال ہستی اور ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ اُس پاک کتاب میں لکھا ہے کہ "خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تم چلتے پھرتے آدمی ہوئے۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم کو پیدا کیا اور تم ہی میں سے تمھارے لئے جوڑا بنایا کہ اُس سے تم کو چین ہو اور آپس میں تمھاری محبت و شفقت پیدا کی اسی میں اُن لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ خدا کے ہونے پر بہت سی نشانیاں ہیں خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے تمھارا رات میں اور دن میں سو رہنا اور اُس کی مہربانی سے رزق کا

ومن آیاتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون۔ ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لآیات للعلمین۔ ومن آیاتہ منامکم باللیل والنھار وابتغاؤکم من فضلہ ان فی ذلک

لآیات لقوم یسمعون۔
ومن آیاتہ یریکم البرق خوفاً و
طمعاً وینزل من السماء فاحیا بہ
الارض بعد موتها ان فی ذالک
لآیات لقوم یعقلون۔
ومن آیاتہ ان تقوم السماء
والارض بامرہ۔
ومن آیاتہ ان یرسل الریاح
مبشرات ولیذیقکم من رحمۃ
ولتجری الفلک بامرہ۔
اللہ الذی یرسل الریاح فتثیر
سحابا فیبسطہ فی السماء کیف
یشاء ویجعلہ کسفا فتری الودق
یخرج من خلالہ۔
اللہ الذی خلقکم من ضعف
ثم جعل من بعد ضعف قوۃ ثم
جعل من بعد قوۃ ضعفا وشیبۃ
(سورہ روم)
الم تر ان اللہ انزل من السماء
ماء فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا
الوانها ومن الجبال جدد بیض
وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود
ومن الناس والدواب والانعام
مختلف الوانہ کذلک (سورہ فاطر)
ان فی السموات والارض لآیات

تلاش کرنا اسی میں اُن لوگوں کے لیے جو بات کو سنتے یعنی سمجھتے ہیں خدا کے ہونے پر بہت سی نشانیاں ہیں۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے بجلی کی چمک اور کڑک کا تم کو دکھلانا جس سے تم ڈر جاتے ہو اور مینہ برسنے کے لالچ کرتے ہو اور برساتا ہے آسمان سے مینہ پھر مری ہوئی یعنی خشک زمین کو زندہ یعنی ہرا کر دیتا ہے اسی میں ان لوگوں کے لیے جو سمجھدار ہیں خدا کے ہونے پر بہت سی نشانیاں ہیں" خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے۔ کہ اسی کے حکم سے آسمان و زمین کھڑے ہیں۔ خدا کے ہونے نشانیوں میں سے ہے کہ مینہ کی خوش خبری لانے والی ہوا کو چلاتا ہے تاکہ اُس کی رحمت کا تم مزہ چکھو۔ اور اُس کے حکم سے پانی سے کشتیاں چلیں۔ خدا وہ ہے کہ ہوا چلاتا ہے پھر وہ بادلوں کو ہانک لاتی ہے۔ پھر جس طرح چاہتا ہے۔ ان میں پھیلا دیتا ہے۔ اور پھر بادلوں کا دل کر دیتا ہے پھر اُن میں سے بوندیں ٹپکاتا ہے۔ خدا وہ ہے جس نے تم کو پہلے نہایت ہیچ ناتواں پیدا کیا پھر تم کو ناتوانی سے قوی کیا پھر قوی سے ضعیف کر دیا۔ اور بڑھاپے سے تمھارے بال بھی سفید کر دیئے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اُس سے رنگ برنگ کے پھل پیدا کیئے اور پہاڑوں میں سفید و سرخ اور سیاہ بھجنگ تہیں نکالیں اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں طرح بطرح کے رنگ بنائے۔ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے ہونے پر یقین والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور تمھارے پیدا کرنے میں اور جانوروں کو بہتات سے پھیلانے میں یقین والوں کے

للمؤمنين وفى خلقكم وما يبث من
دابة آيات لقوم يوقنون ○
واختلاف الليل والنهار وما
انزل الله من السماء من رزق فاحيا
به الارض بعد موتها وتصريف
الرياح آيات لقوم يعقلون. تلك
آيات الله نتلوها عليك بالحق
فبای حديث بعد الله وآياته
يؤمنون (سورۂ جاثیہ)

هو الذي انزل من السماء ماء
فاخرجنا به نبات كل شئ فاخرجنا
منه خضرا نخرج منه حبا متراكبا
ومن النخل من طلعها قنوان دانية
وجنات من اعناب والزيتون
والرمان مشتبها وغير متشابه
انظروا الى ثمره اذا اثمر وينعه
ان فى ذلكم لآيات لقوم يؤمنون
(سورۂ انعام)

هو الذي مد الارض وجعل فيها
رواسي وانهارا ومن كل الثمرات فيها
جعل زوجين اثنين يغشى الليل
النهار ان فى ذلك لآيات لقوم
يتفكرون (سورۂ رعد)

وفى الارض قطع متجاورات و
جنات من اعناب وزرع ونخيل

لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور رات کے جانے اور دن کے آنے اور اُن کے بڑا ہونے اور چھوٹا ہونے اور آسمان سے مینہ کے برسنے پھر مردہ زمین کے زندہ کرنے اور ہوا کے ادل بدل کرنے میں سمجھ دار لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ٹھیک تجھ کو بتلاتی ہیں۔ پھر کونسی بات ہے جس پر اللہ کی اور اُس کی نشانیوں کے بعد ایمان لائیں گے۔ خدا وہ ہے جو برساتا ہے آسمان سے پانی پھر پانی کے سبب ہم نے تمام اُگنے والی چیزیں پائیں۔ پھر ہم نے اُس سے سبز پودے نکالے جن میں سے دانوں کے گچھے نکلتے ہیں اور کھجور کے درختوں میں اُن کی پھننگ میں سے پھل کے بوجھ سے زمین کو جھکے ہوئے گابھے نکلتے اور انگور اور زیتونوں اور انار کے باغ ایک سے اور الگ طرح کے اُگتے ہیں۔ دیکھو اس کے پھل کو جب کہ وہ پھلے اور پکے اُس میں بھی بلاشبہ اُن لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں خدا کے ہونے کی نشانیاں ہیں۔ اللہ وہ ہے جس نے زمین کو ایسا بڑا بنایا اور اُس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور اُس میں تمام پھلوں کو دو دو بنایا۔ رات سے دن کو چھپا دیتا ہے۔ اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں اور زمین کے مختلف ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ ہیں کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں۔ کسی کی بہت گھنی شاخیں ہیں اور کسی کی چھدری جو ایک سے پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور کھانے میں ایک دوسرے سے مزے دار ہیں اس میں بھی بے شک اُن لوگوں کے لئے

صنوان و غیر صنوان یسقی بماءٍ واحد ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون (سورۃ رعد)

الذی جعل لکم الارض مهدا و سلک لکم فیها سبلا وانزل من السماء ماء فاخرجنا به ازواجا من نبات شتی کلوا وارعوا انعامکم ان فی ذلک لآیات لاولی النهی (سورۃ طٰہٰ)

والانعام خلقها لکم فیها دفءٌ ومنافع ومنها تاکلون ولکم فیها جمال حین تریحون وحین تسرحون وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیه الا بشق الانفس - (سورۃ نحل)

وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونها من بین فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشاربین (سورۃ نحل)

ومن آیته الجوار فی البحر کالاعلام ان یشاء یسکن الریح فیظللن رواکد علی ظهره ان فی ذلک لآیات لکل صبار شکور (سورۃ شوریٰ)

واللہ اخرجکم من بطون امهاتکم

جو سمجھتے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں وہ خدا ہے جس نے تمھارے لئے زمین کو پنگوڑھا بنایا اور تمھارے لئے اُس میں رستے جاری کئے اور آسمان سے مینہ برسایا پھر ہم نے پانی کے سبب مختلف اُگنے والی چیزوں کے جوڑے نکالے کھاؤ اور اپنے جانوروں کو چراؤ اس میں بھی عقل والوں کے لئے خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں اور تمھارے لئے مویشی کو پیدا کیا ان میں گرم ہونے کا سامان اور بہت سے منافع ہیں اور اُن ہی میں سے تم کھاتے ہو اور تم کو ان سے زیبائش ہے جب کہ شام کو چرا کر لاتے ہو اور چرانے کو لے جاتے ہو اور تمھارا بوجھ کسی شہر کو اٹھا لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر ادھ موئے ہوئے نہ پہنچ سکتے تھے۔ اور تمھارے لئے مویشی میں ایک بڑی نصیحت ہے ہم تم کو وہ چیز پلاتے ہیں۔ جو اُن کے پیٹ میں گوبر و لہو کے سبب بنتی ہے۔ یعنی اچھا خاصا دودھ جو پینے والوں کے حلق میں آسانی سے اُتر جاتا ہے اور خدا کے ہونے کی نشانیوں میں ہیں۔ پہاڑوں کی مانند جہاز سمندر میں چلنے والے اگر خدا چاہے ہوا بند کردے وہ سمندر کی پیٹھ پر ٹھہر جائیں اس میں بھی بے شک اُن لوگوں کے لئے جو صابر و شاکر ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں۔ اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا تم کچھ نہیں جانتے تھے بنایا تمھارے لئے سننا تاکہ تم شکر کرو کیا تم پرندوں کو نہیں دیکھتے۔ جو اوپر آسمان کی وسعت میں ہیں کون اُن کو تھامے ہوئے ہے بجز خدا کے اس میں بھی بے شک اُن لوگوں کو جو ایمان والے ہیں۔ خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں ۔

لا تعلمون شيئاً وجعل لكم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکھن الا اللہ ان فی ذلک لآیات لقوم یومنون (سورہ نحل)

اگرچند آیتوں کے مضامین کو مختصراً ایک جگہ جمع کردیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس خوبی اور فصاحت وبلاغت سے خدا کے ہونے پر قدرتی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ دنیا کو دیکھو کہ وہ کیسی عجیب چیز ہے۔ تاروں بھرا آسمان۔ اندھیرے کو اُجالا کرنے والا سورج۔ گھٹنے بڑھنے والا اندھیری رات میں چاندی کے سے پترے بچھا دینے والا چاند، دریا کی موجوں اور بے نشان رستوں میں رستہ بتانے والے ستارے خدا کی طرح بہ طرح کی صنعتیں کھلی ہوئی آنکھوں والوں کے لئے خدا کے ہونے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ زمین خدا نے تمھارے لئے بنائی، اُس میں ہر طرف کو جانے آنے کے رستے رکھے تم اُس پر رہتے ہو اور ادھر اُدھر پھرتے ہو۔ بادلوں کے بے انتہا دل اس نیلے گھیرے کے سینہ میں پیدا ہوتے ہیں کھڑے رہتے ہیں، ڈولتے پھرتے ہیں، پھر غائب ہوجاتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کی صورت کے جگر بادل روئی کے پھوئے کی طرح ہوا کے جھونکے سے اُڑتے پھرنے والے دل کے دل موسلا دھار مینہ برساتے ہیں۔ پژمردہ زمین کو سرسبز کرتے ہیں۔ گھاس اُگتی ہے اونچے اونچے کھجور کے درخت پتوں کی خوش نما چھتریوں سمیت اُگتے ہیں جن کے گرد کھجوروں کے گچھے لٹکتے ہیں۔ کیا یہ اُس کے پیدا کرنے والے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں۔ تمھارے مویشی بھی کیا عجیب نہیں ہے۔ تمھارے لئے گھاس کو دودھ بنا دیا جاتا ہے۔ اُس کے اون سے تم اپنی پوشاکیں بناتے ہو۔ دن بھر جنگل میں چرتی ہیں شام کو صف باندھ کر تمھارے گھر آتی ہیں۔ پھر اُن بڑے بڑے پہاڑوں یعنی جہازوں کو دیکھو جو اپنے کپڑے کے پر پھیلائے سمندر کی لہروں پر دوڑتے اڑتے پڑے پھرتے ہیں۔ پر پھیلاتے ہی جست کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ ہوا ان کو لئے پھرتی ہے۔ مگر جب خدا نے ہوا بند کرلی تو وہ مردہ کی طرح پڑے ہیں۔ پھر ہل تک نہیں سکتے۔ کیا یہ ایک کرشمہ نہیں ہے۔ تم کیا کرشمہ چاہتے ہو تم خود کیا کچھ کرشمہ نہیں ہو۔ چند برس پہلے تمھارا وجود نہ تھا۔ تم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ چھوٹے سے بڑا کیا۔ خوبصورت بنایا۔ طاقت تم کو دی۔ خیالات کی قوت تم میں رکھی۔ تم کو ایک دوسرے پر رحم آتا ہے۔ اگر تم کو ایسا نہ بناتا تو تمھارا کیا حال ہوتا۔ پھر تمھارے بال سفید ہوتے ہیں۔ تمھاری طاقت گھٹ جاتی ہے۔ ناتوان ہوجاتے ہو۔ پھر تمھارا وجود نہیں رہتا یہ سب چیزیں اُس کے بنانے والے

ہونے کی نشانیاں ہیں ؎

برگ درختاں سبز درنظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

تمام قرآن اسی قسم کے قدرتی مضامین سے بھرا ہوا ہے جن سے اُس علۃ العلل یعنی خدا کے ہونے پر استدلال کیا ہے۔ پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقہ پر بیان کی ہیں۔ اور

امن خلق السموات والارض و انزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بہجۃ ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا ءالہ مع اللہ بل ھم قوم یعدلون۔ امن جعل الارض قرارا وجعل خلالھا انھارا وجعل لھا رواسی وجعل بین البحرین حاجزا ءالہ مع اللہ بل اکثرھم لایعلمون (سورہ نمل)

یوں فرمایا ہے کہ "کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے تمہارے لئے آسمان پر سے مینہ برسایا۔ پھر ہم نے اُس سے فرحت بخش باغ اگائے تم اُن کے درخت نہیں اُگا سکتے تھے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے مگر کافر وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ سے پھر جاتے ہیں۔ کس نے زمین کو ٹھیرنے کی جگہ بنایا اور کس نے اُس میں دریا بنائے اور کس نے زمین کے پہاڑ بنائے اور کس نے دو سمندروں میں جزیرہ بنایا۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ مگر بہت کافروں میں سے نہیں جانتے۔ اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہو گی۔

یہ کہنا کہ اسلام کے نہ قبول کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے: مذہب اسلام پر منجملہ اُن سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اُس پر کئے ہیں یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کی نظر سے باندھے ہیں۔ اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ پس کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس چیز سے وہ بات پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جس کی ضرورت اسلام کے لئے ہے اُس کے کرنے کو خود اسلام ہی ہدایت کرے۔ جو لوگ مذہب اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں اور خدا کے کلام کو ایک ادنیٰ توجہ سے ہی دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خیال کہ اسلام زبردستی و تلوار کے

زور سے قبلوا لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے جہاں خدا نے

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا واللہ سمیع علیم (سورہ بقر آیت ۲۵۷)

فرمایا ہے کہ "دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیونکہ سیدھی راہ یعنی اسلام گمراہی یعنی کفر سے علانیہ کھل گئی ہے پھر جو کوئی بتوں کا منکر ہو اور اللہ پر ایمان لائے تو بے شک اس نے نہایت مضبوط کنگورہ پکڑ لیا ہے جو ٹوٹنے کے قابل نہیں ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" ایک اور جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ "اگر چاہتا اللہ تیرا پروردگار تو سب جو زمین میں ہیں اکھٹے ایمان لے آتے، پھر کیا تو دباؤ ڈال سکتا ہے لوگوں پر تاکہ مسلمان ہو جائیں (یعنی دباؤ سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا)، کسی شخص کو یہ بات ممکن نہیں ہے کہ بغیر حکم خدا کے ایمان لائے اور اللہ ان لوگوں پر ناپاکی ڈالتا ہے جو نہیں سمجھتے۔"

ولو شاء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین و ماکان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون (سورہ یونس آیت ۹۹ و ۱۰۰)

جس اصول پر کہ حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثنار کے قتل و غارت و نیست و نابود کر دیں۔ اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔ اُس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اسلام نے کبھی تلوار کو نکالا مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کے امن اور اُن کی جان و مال کی حفاظت اور اُن کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو اور یہ ایک ایسا منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص کسی قسم کا الزام نہیں لگا سکتا۔

اسلام میں سب سے بڑا مقصد جیسا اُس لازوال ہستی پر خود یقین لانا ہے ویسا ہی اُس کے وجود اور اُس کی وحدانیت کا علی العموم مشتہر کرنا ہے شروع اسلام کے زمانہ کے مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا۔ اور حال کے زمانہ کے مسلمانوں پر بھی بقدر اُس حاجت اور ضرورت کے جواب باقی ہے فرض ہے کہ کافروں میں اور کافروں کے ملک میں جائیں اور ایسے خدائے واحد کے وجود کا یقین جو دکھائی نہیں دیتا، اپنے وعظ و نصیحت سے لوگوں کے دلوں میں بٹھلا دیں۔ جن

ملکوں میں اس مقصد کے ادا کرنے میں کوئی مانع و مزاحم نہیں ہے۔ اس ملک پر اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت نہیں دی، مگر جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں، جیسے کہ مکّہ کے کافروں نے کیا اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے اُس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے مگر اُسی وقت تک جہاں تک کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے تاکہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ و تلقین و پند و نصائح کے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھلا دیں تاکہ اُسی واحد حقیقی کی پرستش دنیا میں جاری ہو۔ مسلمان کافروں میں بہ امن و امان رہیں اور اپنے چال چلن اور عادت و عبادت اور اخلاق محمّدی سے خود اپنے تئیں مجسم اسلام بنائیں، تاکہ کافر لوز اسلام کو اُس مجسم اسلام میں دیکھیں اور اسلام پر دل سے یقین لائیں۔

ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ بمجرد حاصل ہونے اس مقصد کے تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے گو کہ ایک بھی کافر مسلمان نہ ہوا ہو۔

یہ مقصد یعنی یہ کہ مسلمان امن سے رہیں اور خدائے واحد کی پرستش کیا کریں اور خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں اور اپنے چال چلن اور عادت و عبادت و اخلاق و محبت و ہمدردی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلائیں، تین طرح سے حاصل ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ایک مذہب ہو جائے اور وہاں کے لوگ مسلمان ہو جائیں جیسا کہ مدینہ میں ہوا۔

یا یہ کہ صلح رہے یعنی یہ کہ کفار ادائے فرائض مذہبی سے معترض نہ ہوں جیسے کہ ابتداءً مکّہ میں تھا یا جن مسلمانوں نے حبشہ میں ہجرت کی تھی اُن کا حال تھا یا کافر لڑائی کی حالت میں مسلمانوں کو ملک میں رہنے اور آمد و رفت کرنے اور اُن کی جان و مال کی حفاظت اور ادائے فرائض مذہبی سے معترض نہ ہونے پر صلح کر لیں۔

یا یہ کہ ملک فتح اور کفار مغلوب ہو جائیں تاکہ اُن کو طاقت تعرض کی مسلمانوں سے ادائے فرائض مذہبی اور اعلائے کلمۃ اللہ کی نہ رہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے۔ گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے

کسی ایک طریقہ میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو آزادی رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچائے اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کر دے۔

اس بیان سے اُن مصنفوں کی بھی سخت غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جنھوں نے لکھا ہے کہ "اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے"۔ ہاں ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا۔ مگر مذہب اسلام کا اندازہ اُن کے افعال سے نہ کرنا چاہیئے بلکہ ہم کو یہ بات تحقیق کرنی چاہیئے کہ آیا انھوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں اور اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان فتحمند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے۔ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلحاظ قوم مذہب کے ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے۔ تواریخ سے ہم کو بے شمار مثالیں مسلمان فتحمندوں کی دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنے کی ملتی ہیں اور ہم اس مقام پر چند رایوں کو نقل کرتے ہیں جو اس باب میں عیسائی مصنفوں نے لکھی ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنا اسلام کی خاصیت میں سے ہے۔

چیمبرز سائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرف دار ہو اسپین کے علم تواریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے اور اُس نے اُس معاملہ میں یہ لکھا ہے کہ "اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابل بیان کے ہے۔ کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانہ تک اُن کے بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے یعنی اُن کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا"۔

گاڈفری ہگنز صاحب نے اس معاملہ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے۔ جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب زیادہ ہے اور اس میں دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے۔ یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے۔ وہ کون تھا۔ (عیسائی) جس نے مُور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے

باین وجہ جلاوطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے اور وہ کون تھا۔ عیسائی، جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور اُن سب کو بطور غلام کے دیدیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے۔ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا۔ کئی صدیوں سے عیسائی امن امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور اُن کے مذہب۔ اُن کے پادریوں، اُن کے بشپ۔ اُن کے بزرگوں۔ اُن کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جو لڑائی بالفعل (یعنی بزمانہ تحریر کتاب) یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے۔ وہ بہ نسبت اُس لڑائی کے جو حال میں دیبرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے۔ یونانی اور حبشی اپنے فتح مندوں کی اطاعت سے آزاد ہوا چاہتے ہیں اور اُن کا ایسا کرنا واجب ہے۔ جب کبھی خلیفہ فتحیاب ہوتے تھے اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے۔ تو فوراً اُن کا رُتبہ بالکل فتحمندوں کے برابر ہو جاتا تھا۔ ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے سراسین یعنی مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ " وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب اُن میں خوش وخرّم تھے۔

" لیکن اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلاوطن کئے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے۔ مگر مجھ کو گمان ہے کہ اُس کا سبب اور ہی تھا۔ یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی مانگ یعنی دین دار سمجھتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے۔ اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک اُن کا یہ خیال صحیح تھا۔ جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی۔ ایرانی۔ اسپین خواہ ہندو قتل نہیں کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے۔ بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن وامان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیتے جاتے تھے۔ اور اس پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے ہیں جو اس قدر خفیف ہوتا

لہ مسٹر گبز نے یہاں غلطی کی ہے۔ کافروں سے جو مفتوح ہو جاتے ہیں۔ اس معاوضہ میں کہ ان کو اُن کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے جزیہ نہیں لیا جاتا بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بلامزد یا قلیل مزد پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کئے جاتے اور گورنمنٹ کی بغرض قائم رکھنے حکومت اسلامی اور بحال رہنے امن وامان کے کوئی خدمت بجا نہیں لاتے بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ وامن کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے معاوضہ میں اُن سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے بلکہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا۔ خلفا کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی سوائی کا باعث ہو۔ جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ ایک مثال بھی اس بات کی پائی جاتی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب چلا گیا ہو۔ نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اُس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ پچھلے مسلمان فتحمندوں نے اپنی فتوحات میں بڑی بڑی بے رحمیاں کی ہیں جن کا الزام عیسائی مصنفوں نے بھی جدوجہد سے مذہب اسلام پر لگایا ہے مگر یہ واجب نہیں ہے۔ درحقیقت مذہبی تعصب کے باعث لڑائی کی خرابیاں زیادہ ہوگئیں۔ مگر اس باب میں مسلمان فتح مند کچھ عیسائیوں سے زیادہ بدتر نہ تھے۔

اس کے بعد مسٹر گاڈفری ہگنز صاحب نہایت شائستہ ملکوں میں بھی دوسرے مذہب کی آزادی کے باب میں شبہ کرتے ہیں اور ایک دلچسپ تقریر لکھتے ہیں کہ "عیسائی پادریوں کی کوشش کو اگرچہ بہ حسب ظاہر بہت بڑی وسعت دی گئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی" وہ لکھتے ہیں کہ "مجھ کو اس امر کی نسبت کسی قدر شبہ ہے کہ اس شائستہ زمانہ میں بھی جیسا کہ وہ مشہور ہے اُس وقت کیا ہو۔ اگر سلطان روم (جس طرح کہ ہمارے پادریوں نے مسٹر ووریمنڈ نامی کو اپنے خاص مذہب کی تلقین کے لئے جنیوا میں بھیجا تھا) اپنے ایک نہایت عالم مفتی کو لندن میں ایک مسجد بنانے اور قرآن کا وعظ کرنے کو بھیجے۔ مجھ کو اندیشہ ہے اور میرا یہ اندیشہ معقول وجہ پر مبنی ہے کہ اس کے سبب سے جو آگ ۱۸۔۔ء میں یا حال میں بمقام برمنگھم مشتعل ہوئی تھی وہ پھر پادریوں کی بدولت بھڑک اُٹھے اور ہمارے وزیر اُس کا جواب ایک ایڈمرل یعنی امیرالبحر کے منہ سے دیں جس کی یہ رائے ہوگی کہ قسطنطنیہ پر گولہ اندازی کرنا ممکن ہوگا"۔

مگر مجھ کو مسٹر ہگنز کی رائے کے ساتھ ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لندن کی شائستگی مسٹر ہگنز کے زمانہ سے اب ترقی پر ہے۔ جب میں لندن میں تھا تو ایک شخص مسمی ڈاکٹر پرفکٹ نے عین لندن میں ایک مکان لیا تھا اور ہر اتوار کو اس مکان میں برخلاف مذہب عیسائی کے لکچر دیا کرتا تھا۔ اور جو لوگ چاہتے تھے وہاں جا کر اس کا لکچر سنتے تھے۔ میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: خلیفہ کو بہ نظر مصلحت ملکی بالکل اختیار ہے۔ چاہے لے چاہے نہ لے۔ پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے نہ مذہب سے۔ مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے۔ یعنی چہال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔

بھی کئی دفعہ اس کا لکچر سننے گیا تھا اور ایک دفعہ اس نے قرآن اور اسلام پر بھی لکچر دیا تھا۔ اچھا لکچر تھا مگر جو عام غلطیاں قرآن اور اسلام کی نسبت انگریزوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اُس کے لکچر میں تھیں۔ میں نے سنا کہ پادریوں نے اُس کا لکچر بند کرنے میں بڑی کوشش کی، مگر پارلیمنٹ سے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب مسمٰی اپالوجی میں لکھا ہے کہ "نائیسا کی کونسل میں یہ امر واقع ہوا تھا کہ کانسٹنٹائین نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس نے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے جن کا خلاصہ ان چند سطروں میں موجود ہے خوں ریزی اور بربادی ان احمقانہ لڑائیوں کی جو عیسائیوں نے قریب دوسوبرس کے عرصہ تک ترکوں پر کئے تھے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ قتل کرنا اُن شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے۔ کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیئے۔ لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا۔ وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اُس کی بیٹی میری نے دیا۔ فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا۔ چالیس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا۔ فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک۔ عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا جو اب تک قابل نفرین ہے۔ کیونکہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا۔ علاوہ اس کے اور بے انتہا بدعتوں کا اور اس بیں برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے۔ زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا اور تیرہ چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعویٰ، جو ہر قسم کے گناہ اور عیب اور بدکاری میں جو ایک نیرو یا ایک گیلیگیولا سے نہایت فوق لے گئے تھے۔ آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لئے ایک کروڑ بیں لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لئے قتل ہونا۔ یقیناً یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ ایک ایسا مکروہ اور قریباً ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ سوبرس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا۔ اور جن قوموں کی نسبت بُت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنا پر نہیں بہایا"۔

مشہور و معروف مؤرخ مسٹر گبن جو زمانہ حال کے مؤرخوں میں سب سے بڑا مورخ ہے اور جس کی سند نہایت معتبر گنی جاتی ہے اس امر کی نسبت اپنی کتاب میں یہ لکھتا ہے کہ "مسلمانوں

کی لڑائیوں کو اُن کے پیغمبر نے مقدس قرار دیا تھا مگر آنحضرت نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں اُن سے خلیفاؤں نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی جس سے اسلام کے غیر معتقدوں کی مخالفت رفع ہو جائے۔ ملک عرب حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، مگر وہ دنیا کی قوموں کو محبت سے اور بہت کم رشک سے دیکھتا تھا۔ بہت سے دیوتاؤں کو ماننے والے اور بُت پرست جو اُن کو نہ مانتے تھے۔ شرعًا نیست و نابود کئے جا سکتے تھے۔ مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان فتحمندوں نے بعض کام دوسرے مذہب کی آزادی کے برخلاف کرنے کے بعد اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی کے معتقدوں سے بہ متانت یہ استدعا کی گئی ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کے الہام کو جو زیادہ تر کامل ہے قبول کریں، لیکن اگر انھوں نے نہ مانا اور ایک معتدل خراج یعنی جزیہ دینا قبول کر لیا وہ اپنے عقیدہ میں اور مذہبی پرستش میں آزادی کے مستحق تھے۔

ایک مصنف نے اپنے ایک آرٹیکل میں جو ایسٹ اور ویسٹ اخبار میں چھپا تھا اور جس کا عنوان یہ تھا کہ "اسلام بطور ایک ملکی نظام کے ہے" اسلام میں آزادی مذہب کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "صرف حضرت محمدؐ ہی ایسے بانی مذہب کے تھے۔ جو ایک دنیوی بادشاہ بھی تھے اور سپاہی بھی تھے' اور یہ دونوں قوتیں خاص کر اس لئے تھیں کہ تشدد اور اولوالعزمی کی جانب وہ مائل تھے اور تلوار اُن کے اختیار میں تھی اس لئے خیال ہوتا ہے کہ جب کہ انھوں نے مذہب کو دنیوی حکومت کا وسیلہ قرار دیا اور اپنے معتقدوں کی طبیعتوں پر وہ غلبہ حاصل کیا۔ جس کے سبب سے وہ لوگ شرع اور حق اُسی بات کو سمجھتے تھے جو آپ جاری کرنا چاہتے تھے۔ تو چاہیئے کہ اُن کا مجموعہ احکام شرعی اور تمام مجموعوں سے مختلف ہو، بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ان احکام انصاف سے بھی مختلف ہو جو ہر ایک انسان کی طبیعت میں پڑے ہوتے ہیں۔ اب اگر ہم یہ بات دیکھیں کہ آنحضرت کے احکام کا مجموعہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اُس کے برخلاف یہ دیکھیں کہ حضرت محمدؐ نے قومی معاملات میں حق رسائی اور فتح کرنے میں رحم اور حکمرانی کرنے میں اعتدال اور سب سے مقدم دوسرے مذہب کی عدم مزاحمت کے احکام قرار دیئے ہیں تو ہم کو یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ آنحضرت اپنے ہم جنسوں میں ایسی ہی تعظیم کا استحقاق

رکھتے تھے"۔

پھر اُسی مصنف نے اُسی آرٹیکل میں دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ "اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لئے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اُس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتحمندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے اور مفتوحہ سلطنتیں اُن شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جو ہر ایک فتحمند نے ابتدائے دنیا سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ قرار دی تھیں"۔

اُسی مصنف نے لکھا ہے کہ "اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے۔ جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے"۔ اسلام کی تاریخ کے ہر ایک صفحہ میں اور ہر ایک ملک میں جہاں اس کو وسعت ہوئی دوسرے مذہب سے مزاحمت نہ کرنا پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے اُن واقعات کا جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ بارہ سو برس بعد علانیہ یہ کہا تھا کہ "صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں"۔ اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعنہ کیا ہے کہ "وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں" اب دیکھو کہ یہ رائیں بہت سی بے طرف دار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے کیسی برخلاف ہیں۔

تیسرے حصہ میں ہم اُن فائدوں کا بیان کرتے ہیں جو یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔

مذہب یہود اور عیسائی مذہب کے شامل بیان کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ حضرت عیسےٰ نے شریعت موسوی کے کسی حکم یا مسئلہ کو تغیر و تبدل نہیں کیا، بلکہ حضرت موسیٰ کی شریعت کو بدستور جاری رکھا۔ خود حضرت عیسیٰ کے اس قول سے جو متی کی انجیل باب ۵ ورس ۱۷ میں مندرج ہے کہ "یہ مت خیال کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا۔ میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں" ہمارے قول کی تصدیق ہوتی

ہے۔ پس اس وجہ سے ضرور بالضرورہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو فائدے یہودی مذہب نے مذہب اسلام سے اٹھائے ہیں۔ مذہب عیسوی نے بھی لزوماً وہ فائدے حاصل کئے ہیں، مذہب یہود بلا شبہ ربانی مخرج سے پیدا ہوا تھا اس لئے اُس لازوال مسئلہ یعنی وحدانیت خدا کی تلقین اُس حد تک کی جس قدر کہ نجات ابدی کے حاصل کرنے کو ضروری اور اُس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ کے لائق تھی۔ مگر اُس وحدانیت کو کاملیت سے اسلام نے شائع کیا جس سے مذہب یہود کا مسئلہ بھی کامل ہو گیا۔

تین چیزوں میں وحدت کے یقین کرنے سے خدا کی وحدانیت پر کامل طور سے یقین ہو سکتا ہے۔ وحدت فی الذات۔ وحدت فی الصفات۔ وحدت فی العبادت۔ وحدت فی الذات کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے ساتھ کوئی دوسرا شخص یا کوئی شے شریک نہیں ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور نہ کوئی شے اُس کے مشابہ ہے نہ آگ نہ پانی نہ ہوا۔ وحدت فی الصفات کے یہ معنی ہیں کہ جو صفتیں خدا کی ہیں وہ دوسرے میں نہیں اور نہ دوسرے میں ہو سکتی ہیں۔ اور نہ دوسرے سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ وحدت فی العبادت کے یہ معنی ہیں کہ نہ کسی دوسرے کی عبادت کرنا، نہ کسی دوسرے کو عبادت کے لائق سمجھنا اور نہ وہ افعال جو خاص خدا کی عبادت کے لئے مخصوص ہوں کسی دوسرے کے لئے بجا لانا جیسے سجدہ کرنا روزہ رکھنا نماز پڑھنا وغیرہ۔ ان تینوں وحدتوں میں سے پہلی دو وحدتوں کو اور تیسری وحدت کے پہلے حصہ کو اوسط طور پر جو نہ ناقص تھا کیونکہ نجات کے لئے کافی تھا اور نہ کامل طور پر تھا، کیونکہ وحدت کا پورا کمال اُس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ کے لائق نہ تھا) یہودی مذہب نے بیان کیا اور تیسری وحدت کے اخیر حصوں کو جن سے درحقیقت اس وحدت کا کمال ہے مطلق ذکر نہیں کیا۔ اسلام نے پہلی دو وحدتوں کو بھی "لیس کمثلہ شیئ" فرما کر کامل کیا۔ پس نہ آگ جو موسٰی نے دیکھی خدا تھا اور نہ وہ آواز "انی انا اللہ" کی جو موسٰی نے سنی خدا تھا اور نہ وہ نیک اور برگزیدہ شخص جس کو یہودیوں نے صلیب پر چڑھایا خدا ہو سکتا تھا۔ اسلام نے تیسری وحدت کو ایسے کمال پر پہنچایا جس کے سبب ایمان والوں کے دلوں میں بجز خدا کے اور کچھ نہیں رہا، جس کی تصدیق "ایاک نعبد وایاک نستعین" سے ہوتی ہے۔ اسلام میں یہی کمال ہے اور اسی کمالیت کی وجہ سے خدا نے فرمایا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"۔

موسیٰ کی پانچوں کتابوں میں نہ قیامت کا ذکر ہے نہ مرنے کے بعد روح کی حالت کا کچھ بیان ہے۔ نیکی کی جزا۔ دشمن پر فتح پانا۔ عمر کا بڑا ہونا۔ مفلسی سے نجات پانا۔ بیان ہوا ہے اور گناہ کی سزا۔ مرنا۔ قحط پڑنا۔ وبا کا ہونا۔ مفلسی کا ہونا۔ اور اسی قسم کی اور مصیبتوں کا آنا۔ موسیٰ کے بعد اور پیغمبروں اور نبیوں نے اُن کا کچھ کچھ ذکر کیا مگر جس تفصیل اور کاملیت سے اسلام نے اس کو بتایا جس کے لیئے خدا نے گویا عمداً یہ کام رکھ چھوڑا تھا کسی نے نہیں کیا تھا۔ مگر چونکہ روحانی حالتوں کو یعنی گنہگاروں کی ارواحوں کی تکلیفوں کا اور نیک آدمیوں کی ارواحوں کی راحت اور خوشی کا بیان کرنا اور تصویر کھینچ دینا بجز اس کے اور کسی طرح ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کو ایسی چیزوں اور حالتوں کے پیرایہ میں تشبیہاً بیان کیا جائے۔ جن کو انسان اپنی اُس زندگی میں اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کا حال بہشت و دوزخ کے نام سے اور خوشی و ایذا و تکلیف اٹھانے کے مختلف طریقوں اور سامانوں سے بیان کیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ سے منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہماری دانست میں اُن تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تحریروں کو الہام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کو ان افعال قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے ہیں۔

اسلام نے اُن معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو اُن تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے ان پر لگائے تھے اُن کو فتحمندی سے دفع کیا اور تمام پیغمبروں اور نبیوں اور بہت سے مقدس بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیاء و پیغمبر سب پاک معصوم ہیں۔ توریت کو بڑی غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور اُنھوں نے دریافت کیا کہ یہ غلطیاں کچھ تو اس سبب سے پڑی ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت کی عبارت اور الفاظ کی غلط طور پر تعبیر کی اور کچھ اس سبب سے وہ غلطیاں ہوئیں کہ خود توریت کے قدیمی نسخوں میں جو کوڈیکس کہلاتے تھے اور قلمی تھے متعدد وجوہ سے غلطیاں تھیں اور پھر جن لوگوں نے مقابلہ کر کے ان کو صحیح کیا اُن کی تصحیح بھی غلطیوں سے خالی نہ تھی اور سب سے بڑا سبب اُن غلطیوں کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو انسانوں نے بغرض تسلسل مطلب حضرت موسیٰ کے کلام کے ساتھ ملا کر لکھے تھے اور جن میں بلاشک بہت

سی غلطیاں ہیں اُن کو بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے مقدس تحریر سمجھا تھا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت لوط اور اُن کی بیٹیوں اور حضرت اسحٰق اور حضرت یہودا اور حضرت یعقوب کی بیویوں اور بیٹوں اور ہارون اور داؤد وسلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے تمام دنیا کی نظروں میں ویسے ہی حقیر ہوتے ... جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کرکے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُن کے گناہوں کی سزا کے لئے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے اُن تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اُس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے۔

چوتھے حصہ میں ہم ان فائدوں کو بیان کرتے ہیں جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں۔

دُنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں۔ مذہب عیسائی کی بنیاد اُس نیک اور حلیم شخص سے ہے (یعنی حضرت یحییٰ پیغمبر سے) جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دار و مدار اُس عجیب شخص پر ہے جس کو انھوں نے اتنا بزرگ و مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسٰی پر)، مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادے اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرف دار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ۔ جان دی باپٹسٹ، یعنی حضرت یحییٰ بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسٰی بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ و روح اللہ تھے پس کونسا مذہب اس بات کا دعوٰی کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کے حق میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اُس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی۔ وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو اس کے لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور اُن خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسٰیؑ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال نعمت کا باعث ہے کہ اُسی نے خدائے واحد ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اس خالص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت عیسٰیؑ نے کی تھی اسلام

ہمیشہ اس زمانہ کے عیسائیوں کو اُن کی غلطی سے تنبہ کرتا رہا اور اب بھی کرتا رہتا ہے۔ اسلام نے عیسائیوں سے اسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ "قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً" بہت سے عیسائیوں کی اسلام کی روشنی سے آنکھیں کھل گئیں اور اُس ذلیل حالت سے خبردار ہوتے جس میں وہ مبتلا تھے اور انھوں نے پھر اُسی رُتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے اُن کو حاصل تھا یعنی اُنھوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدہ کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہ لاشریک لہ اور عیسیٰ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب "یونیٹیرین" یعنی موحدین عیسائی سے معزز ہے۔

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا میں سے اٹھا لیا جاوے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ "اگر سینٹ پٹیر یا سینٹ پال ویٹیکن یعنی پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسی پُراسرار رسومات کے ساتھ اس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ اکسفورڈ یا جنیوا میں جا کر اُن کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جا کر سوال وجواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول مفسروں نے ان کی تحریرات اور ان کے مالک کے کلمات کی تفسیر کی ہے۔ اس میں غور کرنا پڑے گا۔

جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اُس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا بااختیار نائب سمجھتے تھے اور اُس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ اُن کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے پوپ کو اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ درحقیقت پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اس کو حاصل تھے اور جن اختیاروں کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو برائیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں اُن کو بتلایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور ان کو سمجھایا

کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لئے سچ کی جستجو کریں۔ چنانچہ خدا نے قرآن مجید میں فرمایا۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (ال عمران آیت ۵۷)

"اے کتاب والوں یعنی عیسائیوں آؤ ایک بات پر کہ ہم میں اور تم میں یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں اور نہ ہم کسی چیز کو اُس کے ساتھ شریک کریں نہ بنادیں ہم ایک دوسرے کو (یعنی پوپوں اور بڑے بڑے پادریوں کو) پروردگار خدا کے سوا"

اور پھر دوسری جگہ فرمایا کہ "عیسائیوں نے اپنے پادریوں اور درویشوں کو پروردگار بنا لیا خدا کے سوا اور مسیح ابن مریم کو بھی اور اُن کو سوائے اس کے اور کچھ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کی عبادت کریں کہ صرف وہی خدا ہے اور نہ اور کوئی۔ خدا پاک ہے اُس چیز سے کہ[۱] شریک کرتے ہیں"۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا لا الٰہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون۔ (سورۃ توبہ آیت ۳۱)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم اُس وقت عیسائی تھے آنحضرت صلعم کے پاس آئے اور ان کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی آنحضرت نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک چنانچہ انھوں نے نکال ڈالی جب وہ پاس آئے تو حضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں اور درویشوں کو پروردگار بنالیا خدا کے سوا جب آنحضرت پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ہم تو ان کی پرستش نہیں کرتے آپ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کردیتے ہیں اُس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر اس کو حرام سمجھتے ہو عدی نے

روی عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قال اتیت رسول اللہ صلعم وفی عنقی صلیب من ذھب فقال لی یا عدی اطرح ھذا الوثن من عنقک فطرحتہ فلما انتھیت الیہ وھو یقرأ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ حتی فرغ منھا

---

[۱] جارج سیل نے قرآن کے ترجمہ جلد اصفحہ ۲۲ میں لکھا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں پر بت پرستی اور دیگر الزاموں کے سوا حضرت محمدؐ نے یہ الزام لگا ہے کہ وہ اپنے قسیسوں اور رہبانوں کی حد سے زیادہ اطاعت کرتے ہیں جنھوں نے اس بات کا قرار دینا کہ کونسی چیز حلال ہے اور کونسی حرام اور خدا کے احکام کی تعمیل کو ملتوی کردینا اپنے اختیار میں لیا ہے۔

قال فقلت له انا لسنا نعبد ھم
قال الیس یحرمون ما احل اللّٰہ
فتحرمونه ویحلون ما حرم اللّٰہ
فتستحلونه قال فقلت. بلی فتلك
عبادتھم

(معالم التنزیل)

کہا ہاں یہ تو ہے آنحضرت نے فرمایا کہ بس یہی اُن کا پوجنا ہے۔ ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کئے اور اُس کے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ ان دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جس میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرا خدا یا جھوٹا خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اُس سچے مسئلہ نے اُن کے دل پر اثر کیا اور جیسے کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور اپنا پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پا لیا پا لیا اور اُسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور ان کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے۔ نکل آئے اور صاف صاف اُس کے برخلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے۔

جس کی بدولت ہم لاکھوں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام مذہب عیسائی کو یہ نعمت نہ بخشتا۔ تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بُت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھلک فرقہ کے لوگ بُت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم صورت لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

جو کہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لئے اس کے مخالف علانیہ اُس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان[1] تھا تاہم اُس نے اپنی کوششوں کو

---

[1] جینی بوارڈ نے یورپ کی طرف سے جرمنی کے رفارمروں کے اور خصوصًا لوتھر مقدس کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اُس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ مذہب اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا جو میل بت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔ یارتینس الفانسس اور والڈس کہتا کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھ کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ حضرت محمد نے بھی اُنہی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔ انھوں نے (یعنی حضرت محمد نے) روزوں کا وقت تبدیل کر دیا (باقی اگلے صفحہ پر)

نہیں چھوڑا اور آخرکار اُس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا - جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا فارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے (جو ایک مرشدانہ غلامی تھی) آزاد کردیا - ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اس نبی آخرالزمان پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے -

---

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- اور یہ لوگ (یعنی پیروان لوتھر) تمام روزوں سے نفرت کرتے ہیں (ایک شخص نے اس کی تائید میں یہ کہا تھا کہ قرآن میں بھی روزوں کی چنداں تاکید نہیں ہے بلکہ بعوض روزہ کے غریبوں کو کھانا کھلا دینا لکھا ہے - اسی کی پیروی سے لوتھر نے روزوں سے نفرت کی تھی) پس لوتھر کا مذہب اور اسلام کا مسئلہ درحقیقت ایک ہی تھا ، انھوں نے اتوار کی جگہ جمعہ کو سبت قرار دیا اور یہ کسی تہوار کو نہیں مانتے (اسی شخص نے اس کی تائید میں کہا کہ اسلام نے بھی درحقیقت سبت کا کوئی دن نہیں ٹھیرایا ، وہ جمعہ کو بھی سب کام کرتے ہیں پس اسی کی پیروی لوتھر نے کی تھی) اُنھوں نے ولیوں کی پرستش کو رد کیا - اور لوتھر کے فرقہ کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں (حضرت محمد صلعم کسی کو اصطباغ نہیں دیتے تھے اور کالون بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتا) ان دونوں نے طلاق کو جائز رکھا ہے وعلیٰ ہذا القیاس (انتخاب از کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۷۵)

خطبہ پانچواں

حالاتِ کتبُ المسلمین

حسبنا کتاب اللہ

جس زمانہ سے کہ خدائے مجید کی توحید کے سب سے بڑے مجدد نے لا الٰہ الا اللہ کا وعظ فرمایا اُس زمانہ سے تمام مسلمان خدائے پاک بے چون و بے نمون پر دلی مضبوطی اور غیر متزلزل اعتقاد اور ایمان رکھنے میں ہمیشہ اور ہر جگہ ممتاز اور سرفراز رہے ہیں اور دینی علوم کی طرف بھی بہت بڑی توجہ کی ہے مگر جب تک کہ خلفائے بنی عباس کی خلافت کو جو بنی امیہ کے بعد ہوئی تھی پوری مضبوطی نہ ہولی مسلمانوں میں دنیاوی علوم وفنون کا رواج جیسا کہ چاہیے ویسا نہ ہوا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان میں خلفائے عباسیہ کی سرپرستی سے مسلمانوں میں ہر ایک قسم کے علوم فنون کا چرچا ہوا۔ اُن کے سینہ میں علم کی محبت بھی قرآن مجید کی ترویج کے شوق کی ہم سری کرنے لگی عرب کے لوگوں کے چال چلن میں بلاشبہ یہ ایک عجیب و غریب وصف ہے کہ جب اسمٰعیل کی اولاد کو مناسب تحریک ہوئی تو انھوں نے ہر قسم کے علم کی دولت کو بھی اُسی آسانی سے لُوٹ لیا جس طرح کہ انھوں نے مشرق میں بے مثل فتوحات حاصل کی تھیں۔ اُن کے قلم کی فتوحات بھی اُن کی تلوار کی فتوحات کی مانند معروف و مشہور، لیکن اُن سے زیادہ دیرپا ہوئیں پُرانی دنیا کا ایک بہت بڑا حصّہ اپنی موجودہ شائستگی اور روشن دماغی میں مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ یورپ کی مغربی حدود کے مرکز سے علم کی وہ شعاعیں نمودار ہوئیں جنھوں نے خدا تعالےٰ کی کروڑوں مخلوق کے دلوں کو منور کردیا۔

ایک غیر متعصب عیسائی مصنف کا قول ہے کہ "اگر زیادہ تصریح سے بیان نہ کیا جائے تو بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان نویں صدی سے تیرھویں صدی تک جاہل یورپ کے روشن دماغ معلم

بنے ہیں۔ عربی علم حکمت۔ علم طب۔ تاریخ طبعی۔ جغرافیہ۔ تواریخ عام۔ صرف نحو۔ بلاغت اور دل آویز فن شاعری میں بکثرت تصنیفیں عمل میں آئی ہیں اور اکثر اُن میں سے تا قیام سلسلہ بنی آدم جاری رہیں گی اور اپنے مفید مطالب سے اُن کو فیض بخشیں گی"۔

مگر حال کے زمانہ کے نکتہ چینوں کو اگلے زمانہ کے علمائے دین کی تصانیف کے عیب و ہنر جانچنے کے وقت اُن تصانیف کے اصلی حالات پر خیال نہیں رہتا۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان مصنفوں نے وہ تصنیفیں اُس زمانہ میں کی تھیں جب کہ "علم تحقیق" کے مسلّم قواعد کا عرب میں وجود بھی نہ تھا۔ اسی وجہ سے جس طرح کہ اُن مصنفوں کے خیالات کی بلند پروازی اور اُن کے استعارات کی وسعت کی کچھ روک ٹوک نہ تھی اسی طرح قواعد ترتیب اور خوش اسلوبی سے اتفاقیہ انحراف کی بھی کوئی چیز اُن کی مانع اور مزاحم نہ تھی۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی مصنف کے عیب و ہنر کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی اور نہ کسی شخص کو اُس کے منشار کا ٹھیک علم ہو سکتا ہے بجز اُن کے جن کو مصنف کے زمانہ کے قواعد انشا پردازی اور خیالات کے ڈھنگ سے یا اُن امور سے جو کسی نہ کسی طرح پر اس مضمون سے جس میں وہ کتاب تصنیف ہوئی ہے علاقہ رکھتے ہیں پوری واقفیت اور کامل مہارت حاصل ہو۔ اسی عدم مہارت اور عدم واقفیت کا سبب ہے کہ غیر ملک کے محققین نے جب ہمارے مذہب کی خوبیوں پر کوئی رائے قائم کرنے کا صلہ کیا ہے تو اس میں فاش فاش غلطیاں کی ہیں۔

اس کے سوا اور امور بھی ایسے ہیں جو کسی مصنف کی لیاقت کا صحیح صحیح اندازہ کرتے وقت دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی مصنف کی دو تصنیفوں میں سے ایک تو بڑا اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اور دوسری محض بے حقیقت ہوتی ہے اور اس کا سبب دونوں تصنیفوں کے موضوع کا مختلف ہونا ہوتا ہے۔ محمد اسمٰعیل بخاری مسلمانوں میں بہت بڑا عالم اور متقدس مصنف ہے۔ ایک کتاب اس کی صحیح بخاری ہے جو بلحاظ اُس حیثیت کے جس حیثیت سے کہ وہ تصنیف ہوئی ہے نہایت معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے گو کہ دوسری حیثیت سے وہ ویسی نہ ہو۔ دوسری کتاب اس کی تاریخ بخاری ہے۔ جو کچھ بھی قدر کے لائق نہیں ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اُن دونوں کتابوں کی تصنیف کا موضوع مختلف ہے۔ اسی طرح نام کی مشابہت بھی دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ کتاب اُسی شخص کی ہے جو ایک مشہور مصنف ہے حالانکہ وہ اُس کی تصنیف نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم نام دوسرے شخص کی تصنیف ہوتی ہے۔ کبھی اس طرح پر دھوکا پڑ جاتا

ہے . کہ ایک کتاب میں اُس کے مصنف نے کسی مشہور شخص کی روایتیں کثرت سے نقل کیں لوگوں نے سمجھا کہ وہی مشہور شخص اُس کا مصنف ہے اور اس خیال سے اُس کتاب کو اُس مشہور شخص کی طرف منسوب کیا اور مستند قرار دیا ۔ رفتہ رفتہ اس کی ایسی قدر ہو گئی جس کی وہ ہرگز مستحق نہ تھی جیسے کہ تفسیر ابن عباس کا حال ہے ۔

یہ باتیں تو صرف تمہید کی تھیں جن کو ہم لکھ چکے اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ کتب مذہبی کی تصنیف کے فن کا نرالا ڈھنگ جو مسلمانوں نے اختیار کیا تھا سب لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے اور اس مقصد کے لئے مصنفین نے جو مختلف طریقے دینیات کے متعدد شعبوں مثل حدیث ۔ سیر تفسیر فقہ کی کتابوں کی تصنیف میں اختیار کئے ہیں اُن کو بیان کریں ۔ اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ ہمارے مذہب کے آئندہ نکتہ چینوں کی ہدایت کے لئے ایک سید ھا رستہ بن جائے ۔ کیونکہ اکثر لوگوں نے جو ہماری دینیات کی کتابوں کے حالات سے ناواقف تھے ہماری کتب دینیات کو دیکھ کر نہایت ناسزا اور درشت کلمات کہے ہیں اور ان کے بعد جو لوگ گذرے ہیں انھوں نے بھی بارہا اندھوں کی طرح ان کی تقلید کی ہے ۔

اوّل کتب حدیث

جناب پیغمبر خدا اور صحابہ کرام اور نیز تابعین کے زمانہ میں حدیثوں کے قلم بند نہ ہونے کی دو وجہیں تھیں ۔ ایک یہ کہ اُس زمانہ میں لوگوں کو اُس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر ٹھیک اور اصلی وجہ بیان کی جائے تو یہ تھی کہ حدیثوں کے لکھنے اور جمع کرنے کے اکثر صحابہ کرام شدید مخالف تھے اور ہمارے نزدیک انھیں صحابہ کرام کی رائے نہایت صحیح اور بہت درست تھی ۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانہ میں فن تصنیف عرب میں محض ایک ابتدائی حالت میں تھا اُس وقت میں ایسی باتوں کے لئے حافظہ بہترین مخزن خیال کیا جاتا تھا ۔ ان اسباب سے نبوت سے دو سو برس تک اور ہجرت سے دو سو برس قریب تک حدیثوں کا قلم بند ہونا عمل میں نہیں آیا تھا ۔ جب حدیثوں کا لکھنا شروع ہوا تو اُس وقت یہ مشکل پیش آئی کہ مختلف سببوں سے احادیث موضوعہ جو صحیح حدیثوں میں مخلوط ہو گئی تھیں ۔ اس قدر زمانہ کے بعد صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے تمیز کرنا ایک امر اہم معلوم ہوا ۔ مگر بااینہمہ بہت سے شخصوں نے جن کی استعداد اور علم کے اعلیٰ درجہ میں کسی کو کلام نہ تھا صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے علیحدہ کرنے کا بوجھ اپنے سر پر اٹھایا اور اپنے کام میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی ۔

ان علماء نے جو محدثین کہلاتے ہیں حدیثوں کے اعتبار کا اندازہ کرنے کو چند قواعد قرار دیئے جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اول:۔ حدیث کے ہر ایک راوی کو جملہ راویوں کے نام جن کے ذریعہ سے اُس کو حدیث پہنچی ہو سلسلہ وار پیغمبر خدا تک یا جہاں تک وہ جانتا ہو بتلا دینا لازمی قرار دیا۔

دوم:۔ یہ امر ضروری قرار دیا کہ خود راوی اور نیز وہ سب لوگ جن کے ذریعہ سے سلسلہ وار وہ حدیث اُس تک پہنچی ہو، راست گو اور معتبر ہوں۔ اگر اس سلسلہ راویوں میں سے ایک راوی بھی ایسا نہ خیال کیا جاتا تو وہ حدیث معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ سلسلہ حدیث سے خارج کر دی جاتی تھی۔

سوم:۔ حدیثوں کے لکھنے کے وقت اس بات کو لازمی کیا تھا کہ جملہ راویوں کے نام جن تک اُس حدیث کا سلسلہ پہنچتا ہے حدیث کے ساتھ لکھ دیئے جائیں۔ تاکہ اگر ان راویوں کے عام چال چلن کی بابت اور لوگوں کو کسی قسم کی آگاہی ہو تو اس سے مطلع کر دیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ راوی کس درجہ تک اعتبار کے لائق ہے۔

چہارم:۔ مذکورہ بالا قواعد کے سوا بعض محدثین نے اپنی تصنیفات میں حدیثوں کے درجہ اعتبار کے قلم بند کرنے کی رسم اختیار کی تھی۔

جملہ حدیثیں مختلف اوقات میں ان اصولوں پر لکھی گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ کتب حدیث کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ اگر سب کی سب ایک جگہ جمع کی جائیں تو ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے کو اونٹوں کی ضرورت ہو۔ ان بے شمار کتب احادیث میں سے کتب مندرجہ ذیل بمقابلہ اوروں کے زیادہ مستند ہیں۔

(۱) صحیح[1] بخاری (۲) صحیح مسلم[2] (۳) ترمذی[3] (۴) ابو داؤد[4] (۵) نسائی[5] (۶) ابن ماجہ[6] (۷) موطا[7] امام مالک۔

---

[1] محمد اسمٰعیل بخاری ۱۹۴ھ ہجری مطابق ۸۱۰ء عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ ہجری مطابق ۸۷۰ء عیسوی میں انتقال فرمایا۔

[2] مسلم ۲۰۴ھ مطابق ۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ مطابق ۸۷۵ء میں انتقال فرمایا۔

[3] ابو عیسیٰ محمد ترمذی ۲۰۹ھ مطابق ۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ مطابق ۸۹۲ء میں انتقال فرمایا۔

[4] ابو داؤد ۲۰۲ھ مطابق ۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ مطابق ۸۸۸ء میں انتقال فرمایا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ابو عبدالرحمن نے احمد نسائی سے پوچھا کہ تیری کتاب کی سب حدیثیں صحیح ہیں۔ تو اس نے انکار کیا۔ صراط المستقیم میں لکھا ہے کہ "ازوے پرسیدند کہ کتاب سنن تو ہمہ صحیح ماست گفت لا۔"

ان کتب احادیث کی اور کتابوں پر ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں وہی حدیثیں منقول ہیں۔ جو حتی الامکان صرف معتبر اشخاص سے مروی ہوئی ہیں اور اور کتب احادیث میں یہ قید نہیں ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح کتب مذکورہ بالا میں بعض مشتبہ یا موضوع حدیثوں کے ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے اسی طرح اور کتب حدیث میں بعض احادیث صحیح کا ہونا بھی ممکن ہے۔

مگر پہلی قسم کی کتابوں کے استثناء کی نسبت یہ درجہ اشتباہ کا ایسا ضعیف ہے کہ علماء کو اُن پر اعتقاد کامل رکھنے سے (بشرطیکہ وہ اعتقاد صرف مذہبی بنا پر نہ ہو) تا وقتیکہ اُن کی تکذیب میں کوئی صریح دلیل نہ پیش ہو باز نہیں رکھتا۔ مگر دوسری قسم کی کتابوں کی نسبت یہ اعتقاد نہیں ہے۔ جو حدیثیں کہ اُن میں منقول ہیں وہ جبھی قابل اعتبار خیال کی جاتی ہیں کہ اُن کی صحت کے لئے کوئی شہادت موجود ہو یا اُن کے نامعتبر ہونے کے لئے کوئی دلیل نہ ہو۔

جس زمانہ میں یہ کتب حدیث زبانی روایتوں سے لکھی گئی تھیں راویوں نے اس بات کا التزام نہیں کیا (اور یقیناً ایسا کرنا بھی ناممکن تھا) کہ وہ ہی الفاظ بجنسہٖ جو پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلے تھے بیان کریں بلکہ اپنے الفاظ میں پیغمبر خدا کا مدعا ادا کرتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کوشش کسی حدیث کے مخصوص الفاظ کے معنی معین کرنے سے بعض احکام یا واقعات کے قائم کرنے میں کی جائے اس میں بڑی احتیاط چاہیے کیونکہ ہم کو اطمینان کامل نہیں ہے کہ درحقیقت جناب پیغمبر خدا نے انھیں الفاظ کو استعمال کیا تھا۔

بہت سی حدیثیں ایک ہی باب میں ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ پس اُن میں سے ایک کو صحیح مان لینا اور باقیوں کو غلط بہت مشکل کام ہے۔ اس مشکل کے حل کرنے کو عالموں نے چند قواعد وضع کئے ہیں اور ان کا نام اصول علم حدیث رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اُن میں سے کسی خاص حالت میں اُس مدعا کے انجام دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں قاصر ہوں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:

۵۵ ابوعبدالرحمن احمد نسائی نے ۳۰۳ھ مطابق ۹۱۵ء میں انتقال فرمایا۔

۵۶ ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ نے ۲۹۳ھ مطابق ۵۰۶ء میں انتقال فرمایا۔

۵۷ امام مالک ۹۵ھ مطابق ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ مطابق ۷۹۵ء میں انتقال فرمایا۔

تمام بیہودہ قسم کی حدیثیں مشتبہ خیال کی گئی ہیں اور ایسی حدیثیں جو مطالب قرآن مجید سے متناقض ہیں غلط قرار دینے کے لائق ہیں۔ جس طرح کہ حضرت عایشہ نے حدیث "سماع موتے" کی نسبت کیا تھا۔ کیونکہ وہ حدیث قرآن مجید کے اس بیان سے بالکل مخالف تھی "وما انت بمسمع من فی القبور"۔ حضرت عائشہ کے اس قول سے ہر ایک مسلمان واقف ہے۔

ایسے لوگ جو بہ کثرت حدیثیں بیان کرتے تھے صرف ان کے کثیر الروایت ہونے کی وجہ سے ان کی روایتوں کی صحت میں کلام ہوتا تھا۔ اور کسی شخص کی روایت کی ہوئی کوئی حدیث غلط ثابت ہو جاتی تھی تو اُس کی اور تمام روایتوں کے مشتبہ ہونے کے لئے کافی ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے راویوں کے باب میں، بہت سی کتابیں اسمار الرجال کی مرتب ہوئیں تاکہ معتبر اور غیر معتبر راویوں کا حال معلوم ہو جائے۔ مجدالدین فیروز آبادی نے جو ایک مشہور محدث اور بہت بڑا عالم ہے اپنی کتاب مسمی بہ سفر السعادت میں ترانوے مضمون شمار کئے ہیں اور بیان کیا ہے کہ تمام حدیثیں جو ان مضمونوں میں سے کسی مضمون کے باب میں ہوں، سب غیر معتبر ہیں۔ علاوہ اس کے اور بہت سے ذی لیاقت محدثین نے احادیث موضوعہ پر بحث کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔

پس اُن لوگوں کو جو ہمارے دین کے اصول پر رائے دینا یا ہمارے علمار نے جو واقعات سیر اُن کتابوں میں لکھے ہیں اُن پر یا ہمارے دین کے مختلف مسائل پر بحث کرنا چاہیں تو ان کو اپنی رائے اور خیال کی تائید میں صرف اُن حدیثوں کے حوالہ دینے پر اکتفا کرنا نہیں چاہیئے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ بلکہ مثل ایک محقق کے سب سے پہلے اُس ذریعہ کے صدق وصحت کی تحقیق کرنی چاہیئے جہاں سے وہ حدیثیں پہنچی ہوں۔

ان ضروری اصولوں کی فراموشی یا ناواقفیت کی وجہ سے غیر ملک کے بعضے مصنفوں سے (شاید نادانستہ) جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری یا تاریخ لکھتے وقت بڑی ناانصافی کا جرم سرزد ہوا ہے۔ علی الخصوص اُس وقت جب کہ باقاعدہ اور غیر متعصبانہ تحقیق کی جائز دلیلوں کے عوض انھوں نے اپنی نالائقی سے ٹھیک تضحیک اور ہجو اختیار کی ہے۔

دوم کتب سیر

مصنفین کتب احادیث نے تو یہ خیال کیا تھا کہ جس مضمون پر وہ کتابیں لکھتے ہیں اور حدیثیں جمع کرتے ہیں اُن کو مذہب سے تعلق ہے اور وہ مذہبی مسائل کی بنا قرار پائیں گی اور اُن کی بنیاد پر

بے انتہا مسائل اور جدید عقاید اور مناظرات مذہبی پیدا ہوں گے۔ اگر ان میں احتیاط نہ کی جائے تو مذہب اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ اسی خیال سے اُنھوں نے راویوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر نہایت کوشش کی اور جس کو معتبر سمجھا اس کی روایت لکھی مگر اہل سیر نے سیر کی کتابیں تصنیف کرتے وقت اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ کیونکہ اُن کو اس قسم کا مطلق اندیشہ نہ تھا۔ اور کبھی اُن کو یہ خیال نہیں تھا کہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں کسی عقیدہ یا مذہبی مسئلہ کی بنیاد قرار پائیں گی اور مذہبی اختلافات اور بدعات کا مادہ ہوں گی۔ اس لئے اُنھوں نے مثل اہل حدیث کے ان مضامین کی صحت پر جو اُنھوں نے اس میں لکھے اور ان راویوں کے اعتبار پر جن سے وہ حالات اُن کو پہنچے۔ بہت ہی کم التفات کیا۔ اُن کی تحریرات کا سب سے بڑا خزانہ زبانی روایتیں تھیں۔ جس کسی نے جو قصہ اُن سے بیان کیا اُنھوں نے نہایت اشتیاق سے اُس کو سُنا اور اس قصہ کی اصلیت اور راوی کے چال چلن کی نسبت ذرا بھی تفتیش نہیں کی اور اُس کو اپنی کتاب میں لکھ لیا۔

ان مصنفوں کی غرض نہ تو کسی قصہ کی تصدیق تھی اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقع کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے اُس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں اور اُن قصوں کی صحت یا لغویت کی چھان بین پڑھنے والے کی جاں فشاں تحقیق اور رائے پر چھوڑ دیں۔ یہ رسم بہت جلد عام ہو گئی۔ اول اول تو راویوں کے نام بھی لکھے گئے اور پھر رفتہ رفتہ راویوں کے نام لکھنے کو بھی متروک کر دیا۔ ان کتابوں میں اکثر ایسی روایتیں بھی مندرج ہیں۔ جن کے راوی مصنف کے زمانہ سے بہت پہلے گذر چکے تھے اور کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف نے کس طرح پر اُس روایت کو اپنی کتاب میں لکھ دیا۔ ان کتابوں میں اکثر انبیائے سابقین کے قصے بھی مندرج ہیں اور وہ وہی قصے ہیں جو ایک زمانہ میں یہودیوں میں مشہور اور زباں زد تھے اور جن کی اصلیت بالکل محض تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اُن کا رُتبہ دیوپری کے قصوں سے کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے مسلمانوں کے جملہ علوم میں سے وہ علم جو سب سے زیادہ غور اور تحقیق کا محتاج ہے وہ علم سیر ہے اور جس پر تمام علما کو نہایت عمیق توجہ کرنی لازم ہے۔

پس اُن کتابوں کو صرف یہ امر کہ وہ مشہور اور معروف علمائے سابقین کی تصنیفات سے ہیں اعتبار کا مستحق نہیں کرتا ہے۔ مذہب اسلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کو اُن کے اعتبار کو بلحاظ اس اصول کے جس پر خود اُن کے مصنفوں نے اُن کو تصنیف کیا ہے۔ ساقط سمجھنا چاہیے اور جب تک کہ اُن کتابوں کی مندرجہ روایات کی صحت فی نفسہ نہ ثابت ہوئے اور اصولِ تحقیقات سے اُن پر طمانیت نہ ہوئے

اُن روایتوں کا ان کتابوں میں مندرج ہونا اعتبار کے لئے کافی نہیں ہے۔

ان وجوہ سے تاریخ محمد اسمٰعیل بخاری۔ تاریخ محمد جریر طبری۔ سیرت ابن سعد کاتب الواقدی۔ اور دیگر علمائے متبحر کی مشہور و معروف تصنیفیں جیسے مدارج النبوت قصص الانبیاء۔ معراج نامہ۔ شہادت نامہ۔ مولد نامہ وغیرہ اور اور اسی قسم کی کتابیں سب کی سب یکساں حالت میں ہیں۔

ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے اُن حالات کو منتخب کرنے میں یورپین مصنفوں نے اس قدر متحملانہ تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے جو اس مضمون کی عظمت کے شایاں ہے بلکہ برخلاف اس کے ازراہ تعصب اور بغض کے انھوں نے دیدہ و دانستہ اُس روشنی سے آنکھ چرائی ہے جس کی شعاعیں اُن کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں اور اس طرح پر انھوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ "کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ جو اراداتاً نہیں دیکھتے"۔

سوم کتب تفسیر

اکثر لئیق شخصوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔ بعض نے اُس کی بلاغت اور فصاحت آمیز کلام اور خوبصورت اور بے نظیر طرز بیان کی تفسیر کی ہے۔ بعض نے اُس کے پڑھنے کا خاص طریقہ مع قرأت اور لہجہ کے بتلایا ہے۔ بعضوں نے صرف آیاتِ احکام کی، جو قرآن مجید میں ہیں تفسیر کی ہے۔ بعض نے اپنا وقت اور اپنی محنت آیات کے شان نزول دریافت کرنے میں صرف کی ہے۔ بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لئے دلچسپ اور عجیب و غریب اور حمقا کے خوش کرنے کے لئے دور از عقل و قیاس مضامین جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے جمع کر دیئے ہیں۔ بعضوں نے ایسی تفسیریں لکھی جو ان تمام مضامین پر حاوی ہیں۔

ان مفسرین نے اپنی تفسیریں لکھنے میں کتب سیر اور احادیث کی طرف رجوع کیا تھا جن کا بیان ہم ابھی کر چکے ہیں۔ یہ بات نہایت افسوس کے قابل ہے کہ یہ مفسرین ان بے شمار جھوٹی روایتوں اور مصنوعی قصوں ہی کو جن کا موجود ہونا اُن کتابوں میں ابھی بیان ہو چکا ہے کام میں لائے۔ بلکہ ایسی روایتیں اور حدیثیں بھی انھوں نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیں جو صرف انھیں تفسیروں میں پائی جاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں بھی جو بعض حیثیات سے درجہ اعتبار کا رکھتی ہیں اور جو صحاح ستہ یا صحاح سبعہ کے نام سے مشہور رہیں اور جن کے نام ہم اوپر لکھ آئے ہیں قرآن مجید کی تفسیر کے لئے خاص ابواب مخصوص ہیں جو کتاب التفسیر کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ اگر اُن کل کتابوں کے مضامین کو جو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہیں ایک جگہ جمع کیا جاوے تو معدودے چند صفحوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ مگر مفسرین نے نہایت موٹی موٹی جلدیں ایسی بیہودہ اور نامعتبر روایتوں سے بھرلی ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ غرضیکہ ایسی تفسیریں اور علی الخصوص وہ جو واعظین کے فائدے کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن میں خیالی اور بیہودہ قصے انبیاء علیہم السلام کے بھرے ہوئے ہیں اور ملائک اور بہشت اور دوزخ اور ان کے اوصاف و خواص کے بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کتب سیر سے خلاف قیاس بیانات کو پیش کرتے ہیں۔ سراسر غیر معتبر روایات سے مملو ہیں اور وہ روایتیں صرف یہودیوں کے ہاں جاری تھیں۔ مگر خود مذہب یہود میں اُن کے معتبر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان تفسیروں میں اکثر ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جو علمائے دین کی طرف منسوب کی گئی ہیں مگر اس امر کا تحقیق کرنا کہ وہ روایتیں درحقیقت اُنھیں عالموں کی روایتیں ہیں ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ اس بات کا دریافت کرنا کہ وہ روایتیں ان مفسرین تک کیونکر پہنچیں۔

ان تفسیروں کے وہ حصے جن میں قرآن شریف کی بلاغت اور فصاحت اور اُس کے طرز بیان کی خوبصورتی اور اُن کی قرأت کے خاص لہجوں کا بیان ہے بلاشبہ نہایت عمدہ اور قابل قدر کے ہیں مگر ان حصوں کے سوا تمام روایتیں اور قصے جو ان تفسیروں میں شامل ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کیونکہ وہ مثل سچے اور جھوٹے موتیوں کے باہم مخلوط ہیں اور یہ کام خریدار کا ہے کہ اُن میں سے سچے موتیوں کو منتخب کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص بدون مناسب چھان بین اور کافی تحقیقات کے کسی ایسی تفسیر کے قصوں کا حوالہ دے کر ہمارے پاک مذہب پر خوردہ گیری اور عیب چینی کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ جیسے کہ اکثر یورپ کے مصنفین نے کیا ہے وہ نہایت غلطی اور دھوکے میں پڑتا ہے۔

غرض کہ یہ تینوں قسم کی کتابیں جن کا اوپر ذکر ہوا مذہبی امور پر لکھنے والے اور بحث کرنے والے کے لئے نہایت بیش بہا اور نہایت بے قدر مادہ کو آن واحد میں جمع کرتے ہیں علمائے محققین اسلام نے بہت سے طریقے اختیار کئے ہیں جن کے وسیلے سے وہ اس مخلوط مادّہ سے معتد بہ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یورپ کے مصنفین اس سے محروم ہیں۔

اکثر عالم ایسے گذرے ہیں جو خدا تعالےٰ کی قدرت کاملہ میں اپنی نیک دلی سے نہایت سچا اور

مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو اپنی قدرت کاملہ سے ہر ایک امر کرنے کا پورا اختیار ہے گو وہ کام عقل اور قوانین فطرت کی رُو سے کیسے ہی متناقض کیوں نہ ہوں۔ اس مسئلہ کا اُن کو ایسا دلی اعتقاد ہے کہ جو کوشش اُن کے اس اعتقاد کے سُست اور متزلزل کرنے میں کی جائے، یقیناً ناکام ہوگی۔ وہ ہر حجت اور دلیل کے سننے سے یا اُس پر ذرا سی بھی غور کرنے سے جو اُن کے دل نشین عقیدہ کے مخالف ہو ضد سے انکار کیے جائیں گے۔ ایسے سادہ مزاج اور صاف باطن آدمیوں کو بہشتی آدمیوں کا لقب دیا گیا ہے۔ کما قیل اهل الجنة بلہ"۔

اُن مقدس اور بزرگوار لوگوں نے اپنی تصنیفات میں یہ طریقہ رکھا ہے کہ بلا کسی تمیز کے جملہ روایتوں کو معتبر خیال کرتے ہیں اور ہر واقعہ کو جو اس میں مندرج ہے صحیح سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی روایت مختلف صورتوں میں ان کے پاس پہنچے یا ایک ہی واقعہ کی نسبت متعدد روایتیں جو آپس میں متناقض ہوں اُن تک پہنچیں تو وہ ان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ واقعہ متعدد دفعہ اور متعدد صورتوں میں واقع ہوا ہوگا جن کا الگ الگ بیان ہر ایک روایت میں ہے۔

پس ایسے لوگوں کی تصنیفات جنھوں نے صحیح اور کامل غور و فکر کے ساتھ اس مضمون کو نہیں لکھا ہے بلکہ اندھادھندی سے مذہبی جوش و حرارت کی بنا پر لکھ ڈالا ہے۔ غیر ملک کے اُن علماء کی نکتہ چینی کے قابل نہیں ہے جو اپنے دلائل کو اُن کتابوں کی روایات مندرجہ پر مبنی کر کے اُن سے ایسے نتائج مستنبط کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مذہب اسلام کے حق میں مضر ہوں۔

اقسام مذکورہ بالا کے سوا ایک اور قسم کی کتابیں بھی ہیں جو محض اُن لوگوں کے لئے لکھی گئی تھیں جو مذہب اسلام پر بغیر کسی وسوسہ کے قوی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں اس غرض سے لکھی گئی تھیں کہ اُن لوگوں کا مذہبی اعتقاد زیادہ ہو اور اُن کی حرارت مذہبی زیادہ مشتعل ہو جائے جیسی کتاب شفا قاضی عیاض ہے جس کی سند پر ہم اُسی کتاب سے عبارت پیش کرتے ہیں۔

قال القاضی ابو الفضل حسب المتامل ان یحقق ان کتابنا ھذا لم نجمعہ لمنکر نبوۃ نبینا ولا لطاعن فی معجزاتہ فنحتاج الی نصب البراھین علیھا وتحصین حوزتھا حتی لا توصل المطاعن الیھا و نذکر شروط المعجزۃ والتحدی وحدہ وفساد قول من ابطل نسخ الشرائع ورد بل الفناہ لاھل ملۃ الملبین لدعوتہ والمصدقین لنبوتہ یکون تاکیداً فی محبتھم ومنماۃ لاعمالھم ولیزدادوا ایماناً مع ایمانھم"۔

ان مصنفین نے اپنی تصنیفات میں واقعات کا ذکر بلا تمیز اُن کی صحت اور عدم صحت کے

اور بدون کوشش اُن واقعات کے اصلی معنی دریافت کرنے کے کیا ہے۔ پس اگر کوئی محقق نکتہ چین اپنی دلیل کو کسی جھوٹی روایت پر جو ایسی کتاب میں منقول ہو مبنی کرتا ہے تو وہ ایمان داری اور راست بازی سے ہمارے مذہب کی تحقیق اور تدقیق نہیں کرتا۔

اسی قسم کے بعض بزرگوار ذی علم لوگوں نے جو اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں اپنی تصنیف کے دائرہ کو بھی وسیع کر دیا ہے۔ وہ ہر چیز کے امکان کو خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف منسوب کر کے اس بنار پر ہر ایک واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں اور اُس کے وقوع کے امکان کو منطقی دلیلوں سے تائید کر کے اپنے مذہب کے مخالف عیب چینوں کو جواب باصواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کتابیں درحقیقت ایسی مصرح اور مدلل لکھی گئی ہیں کہ کوئی شخص جو کسی مذہب کو مانتا ہو اور مذہبی معجزات کا قائل ہو کسی عقیدہ مندرجہ کتب مذکور پر بدون اس کے کہ اپنے مذہب کو بھی ویسے ہی الزامات اور اعتراضات کا مورد بنادے حرف گیری نہیں کر سکتا۔

لیکن اُس شخص کے نزدیک جو قوانین قدرت کے برخلاف کسی امر کے ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتا اور وحی اور الہام کو بھی نہیں مانتا ان کتابوں کی دلیلیں جن کی نصف کی بنار مذہب کے اوپر ہے اُس آدمی کی مانند ہیں جس کی صرف ایک ٹانگ ہو اور چلنے پھرنے سے عاری ہو۔

اُن علمار نے جو اوروں کی نسبت زیادہ ذی علم تھے اپنی تصانیف میں ایک فلسفیانہ قاعدہ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے اختیار کیا ہے کہ مذہب علم سے مطابقت رکھتا ہے انھوں نے ہر روایت کی صحت کی تحقیق کی ہے اور ہر ایک لفظ کے معنوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان علمائے فلسفی میں سب سے پچھلے خیال کئے جاتے ہیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ایسی تصنیفات جیسی کہ اُن کی ہیں کچھ زیادہ مطبوع اور مروج نہ ہوئیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن کے مضامین عام لوگوں کے احاطۂ فہم و ادراک سے باہر ہیں اور کچھ اس سبب سے کہ وہ اُن بزرگوار مصنفوں کے مطبوع خاطر نہیں جو عقاید مذہبی پر فلسفی دلیلیں لانے پر اعتراض کرتے ہیں اور اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ مذہب کے ثبوت پر حکمت سے استمداد کی جائے۔

پہلی قسم کے علمار کو جنھوں نے اپنے مذہب کے واسطے فلسفی دلائل پیش کرنے میں جانفشانی کی ہے۔ دوسری قسم کے علما۔ اُن کو دین حق کا دشمن قرار دیتے ہیں اور ان کو گمراہ کہتے ہیں جس

اتہام سے خود شاہ ولی اللہ صاحب بھی نہیں بچے۔

لیکن ان کتابوں میں ایک اور نقص بھی پایا جاتا ہے یعنی وہ دلیلیں جو اُن میں مستعمل ہوئی ہیں۔ فلسفہ قدیم کے اصول پر مبنی ہیں جن میں سے اکثر تو رواج سے ساقط یا غلط ثابت ہو گئی ہیں یا علوم جدیدہ میں مختلف طور پر بیان ہوئی ہیں۔ مگر یہ نقص صرف علمائے دین اسلام پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ اور مذہبوں کے عالموں میں بھی جو دین کی بحث اصول فلسفہ پر کرتے ہیں موجود ہے۔ اس لئے ہر مذہب وملت کے عالموں کا جو اُس کو پاک اور بے لوث رکھنا چاہتے ہیں یہ فرض ہے کہ اُن کتابوں کی جو فلسفہ قدیم کے اصول پر لکھی گئی ہیں نظرثانی کریں اور فلسفہ جدیدہ کے اصول پر نئی کتابیں لکھیں اور اپنے مذہب کے اصول کو اصول قانون قدرت کے مطابق بحث کرنے کے قابل کریں۔

چہارم کتب فقہ

جب کہ حدیثوں کا یہ حال تھا جو ہم نے اوپر بیان کیا تو اُن لوگوں کا کام جنھوں نے احکام شرعی کو مستنبط کرنا چاہا نہایت ہی مشکل تھا اور جب کہ کتب حدیث لکھی جا چکیں اُس وقت یہ کام اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ جو عالم کہ سب سے زیادہ لائق تھا اُس نے صرف[1] قرآن مجید کو اپنا رہنما سمجھا جس کی صحت وصداقت علی العموم مسلّم تھی اور بڑے بڑے عالموں نے جو مجتہد کہلاتے ہیں قرآن اور احادیث کو جو دستیاب ہوتیں (اور کچھ شک نہیں جو افادہ ظن سے زیادہ اور کوئی بات اُن سے حاصل نہیں ہوتی تھی) احکام شرع کے لئے ماخذ قرار دیا۔ اول قرآن مجید کو اور بعد اُس کے اُن حدیثوں کو جن کی صحت پر اُن لوگوں کو یقین تھا جنھوں نے اُن کو جمع کیا تھا، درجہ دیا جاتا تھا اُس کے بعد صحابہ کے اقوال اور کاموں کو اور بعض عالم تابعین کے اقوال اور کاموں کو بھی اس کام کے لئے فائدہ مند خیال کرتے تھے۔

---

[1] جناب پیغمبر خدا کے زمانہ میں قرآن مجید جیسا کہ بالفعل موجود ہے تمام وکمال یک جا لکھا ہوا نہ تھا بلکہ وہ علیحدہ علیحدہ حصوں میں لکھا ہوا تھا اور کچھ آیتیں ایسی تھیں جو صرف لوگوں کو یاد تھیں اور بعض آدمی ایسے بھی تھے جن کو تمام وکمال حفظ تھا۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں اُن لوگوں نے اُن تمام متفرق حصوں کو ایک جگہ جمع کیا جس طرح کہ اب موجودہ حالت قرآن مجید کی ہے اور اُن تمام لوگوں نے جنھوں نے اُس کو خود پیغمبر خدا کی زبانی سنا تھا اُس مجموع کی صحت اور درستی کو تسلیم کیا۔

جو لوگ کہ اس کام پر متوجہ ہوئے مجتہد اور فقیہ اُن کا لقب تھا۔ اکثر ایسی صورتیں بھی فقہائے اسلام کے سامنے پیش کی گئیں یا درحقیقت واقع ہوئیں جو قرآن مجید یا احادیث میں نہیں پائی گئیں اور اسی وجہ سے بادی النظر میں کوئی قطعی فیصلہ ان صورتوں کا قرآن مجید یا کتب حدیث میں نہیں پایا گیا۔ اس مجبوری کی حالت میں فقہائے اسلام نے قرآن مجید اور احادیث میں ایسے اصول کی تلاش کی جو اُن صورتوں پر حاوی ہوں اور خوش قسمتی سے وہ اس میں کامیاب ہوئے اور الفاظ کے استعمال اور طرز بیان سے اور ایک حکم کے جو کسی واقعہ میں ہوا تھا اُس کے مشابہ ایک دوسرے واقعہ پر قیاس کرنے سے اس مطلب کو حاصل کیا۔

ان علماء نے بعض اوقات قرآن مجید کے ایسے حکم کو جو کسی صورت خاص سے متعلق تھا عام ٹھہرایا اور کبھی قرآن مجید کے ایسے حکم میں جو ظاہر میں عام ہوتا تھا مستثنیات قائم کئے۔ انھیں علماء نے بعض ایسے اصول و قواعد منضبط کئے جن پر عمل کرنے سے عجیب و غریب مقدمات میں بھی قرآن مجید اور حدیث سے احکام مستخرج ہو سکیں اور یہ ایک نئی شاخ علم دین کی علوم دینیہ میں قائم ہو گئی جو بنام اصول فقہ موسوم ہے۔ اسی بنیاد پر انسان کے تمام افعال کی نسبت احکام استخراج کئے گئے اور اس میں کتابیں لکھی گئیں جو کتب فقہ کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں میں سب سے پچھلی کتاب جو فرقہ حنفیہ کے اصول پر لکھی گئی وہ فتاویٰ عالمگیری ہے جو شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے مرتب ہوئی تھی۔ فقہ کی تمام کتابوں کے مصنفین کا نہایت شکر گزار رہنا چاہیے کہ انھوں نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے اُن کو لکھا ہے اور جس قدر تعظیم و اکرام ان مصنفین کو شایان ہے اتنی ہی قدر و منزلت اُن کتابوں کی سزاوار ہے لیکن باستثنائے اُن احکامات کے جو خاص قرآن مجید سے جن میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا اخذ کئے گئے ہیں اور اُن احکامات کے جو اُن احادیث سے لئے گئے ہیں جن میں روایتاً اور درایتاً دونوں طرح پر صحیح و معتبر ہونے کا ظن غالب ہے باقی احکامات کو گو کہ فقہائے قرآن مجید اور احادیث ہی سے مستنبط کیا ہو، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مثل نصوص صحیح کے مذہبی احکام ہیں۔ غیر ملک کے مصنفین اور نکتہ چین محققین نے ایسے مستخرجہ احکام کو اصلی ارکان دین اسلام سمجھنے میں اکثر مغالطہ کھایا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ وہ ذی لیاقت علماء جنھوں نے اُن احکامات کو اسلام کے اصول اصلی سے متخرج کیا ہے بہ نسبت ہمارے بہت بڑے عالم تھے۔ مگر اس اصول پر کہ —— "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن میں کچھ خطا نہیں ہے، اور

وہ سب احکاماتِ مستخرجہ خطاء وغلطی سے بالکل متبرا ہیں۔ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری کتب فقہ دو قسم کے اصول واحکامات سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک ان احکامات اصلی سے جو بغیر کسی شبہ کے منصوص ہیں دوسرے وہ جن کو علمائے مجتہدین نے مستنبط اور مستخرج کیا ہے اور جو اسی وجہ سے ممکن الخطار خیال کئے جا سکتے ہیں پس اُن لوگوں کا جو ہمارے احکام شرعی کی تحقیق وتدقیق کرنا چاہیں فرض ہے کہ اول قسم کے احکام کو دوسری قسم کے احکام سے تمیز کریں کیونکہ اگر دوسری قسم کے احکام میں کوئی نقص پایا جائے تو اس کو مذہب اسلام پر عاید کرنا نہیں چاہیئے بلکہ اس کا الزام اُس عالم کے سر پر ہے جس نے اُن احکامات کو استخراج کیا ہے اور جو مذہب اسلام کے ایک فقیہ ہونے سے کچھ زیادہ رتبہ کا متحق نہیں ہے۔ مذہب اسلام میں جو چار بڑے بڑے فقیہ اور مجتہد گذرے ہیں جن کی تمام مسلمان پیروی کرتے ہیں اُن کی بھی یہی رائے ہے[۱]۔"

قال الشیخ عبد الوھاب الشعرانی فی الیواقیت کان ابو حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ اذا افتی یقول ھذا رای النعمان ابن ثابت یعنی فی نفسہ وھو احسن ما قدرنا علیہ فمن جاء باحسن منہ فھو اولیٰ بالصواب۔

وقال کان الامام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ یقول ما من احد الا ھو ماخوذ من کلامۃ ومردود علیہ الا الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

ثم قال وکان الامام احمد رحمۃ اللہ علیہ یقول لیس لاحد مع اللہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم کلام وقال ایضاً للرجل لا تقلدنی ولا تقلدن مالکا ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرھم وخذ والاحکام من حیث اخذوا من الکتاب والسنۃ۔ وروی الحاکم والبیھقی من الشافعی رحمۃ اللہ انہ قال یوماً للمزنی یا ابراھیم لا تقلدنی فی کل ما اقول وانظر فی ذلک بنفسک فانہ دین وکان وحمد اللہ یقول لا حجۃ فی قول احد دون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[۱] امام ابو حنیفہ ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء میں وفات پائی۔

امام مالک ۹۵ھ مطابق ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ مطابق ۷۹۵ء میں وفات پائی۔

امام احمد حنبل ۱۶۴ھ مطابق ۷۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ مطابق ۸۵۵ء میں وفات پائی۔

امام شافعی ۱۵۰ھ ہجری مطابق ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ ہجری مطابق ۸۱۹ء میں وفات پائی۔

چھٹا خطبہ

الروایات المرویات فی الاسلام

یاایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (القرآن)

مذہبِ اسلام کی روایتوں کی اصلیت اور اُن کے رواج کی ابتدا

تاریخ اسلام کے ابتداء زمانہ سے آج تک قرآن مجید شرع محمدی کا لازوال منبع رہا ہے۔ اور ہمیشہ تک رہے گا۔ ہر مسلمان کا یہ اعتقاد ہے کہ خود جناب پیغمبر خدا ہمیشہ قرآن مجید کے موافق کاربند ہوتے ہیں۔ یعنی جو احکام قرآن مجید میں بہ نص صریح مندرج ہیں۔ خواہ استدلالاً اُس سے نکلتے ہیں۔ انھیں کے مطابق عمل فرمایا ہے۔ یہ اصول ہر قرن میں لمحوظ رہا اور کوئی قول برخلاف قرآن مجید کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی اصول ہم کو حضرت عائشہ نے سکھایا ہے۔ جب کہ انھوں نے سماع موتیٰ کی حدیث کو قرآن مجید کے برخلاف ہونے کی وجہ سے رد کردیا۔ پس جو حدیث کہ قرآن مجید کے منشاء کے متناقض ہو اُس کو یک لخت غیر معتبر اور موضوع خیال کرنا چاہیئے۔

لیکن جب کہ ہم وحی "غیر متلو" میں بھی یعنی ایسی وحی میں جس کا مطلب آنحضرت پر القا ہوا ہو اور اس مطلب کو آنحضرت نے اپنے لفظوں میں بیان فرمایا ہو جس پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے۔ اعتقاد رکھتے ہیں تو بلاشک ہم پر واجب ہے کہ احادیث نبوی کو جمع کرکے جہاں تک ممکن ہو

اُن کی تحقیق اور تدقیق کریں۔ مگر جب کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث قرآن مجید کے منشاء کے خلاف نہیں ہو سکتی تو ہم کو اس تحقیقات میں معلوم ہوگا کہ صحیح حدیثیں صرف تین قسم کی ہو سکتی ہیں۔ اول وہ جو قرآن مجید کے مطابق ہوں اور اس کی تائید کرتی ہوں۔ دوسری وہ جن سے قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر ہوتی ہو۔ اور تیسری وہ جو ایسے امور سے متعلق ہوں جن کا قرآن مجید میں کچھ ذکر نہیں ہے۔

لیکن خود جناب پیغمبر خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ سوائے قرآن مجید کے ان کا تمام کلام وحی نہیں ہے بلکہ وحی وہی ہے جو تبلیغِ رسالت سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کی نسبت خود جناب پیغمبر خدا نے ان کا وحی سے ہونا بیان فرما دیا ہے یا اُن میں ایسے امور بیان ہیں جو عقاید مذہبی اخلاق۔ عالم عقبیٰ اور روح کے حالات سے علاقہ رکھتے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ بغیر وحی کے معلوم نہیں ہو سکتے۔ مذکورہ بالا اقسام کے سوا باقی کلام آنحضرت کا وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ اور جس کی نسبت خود آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک انسان ہوں، جب میں تم کو تمھارے دین کی کسی چیز میں حکم کروں تو اُس کو پکڑ لو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کسی چیز میں حکم کروں تو میں بھی انسان ہوں۔

انما انا بشر اذا امرتکم بشئی من امر دینکم فخذوہ واذا امرتکم بشئی من رائی فانما انا بشر۔

اور حدیث تابیر النخل میں فرمایا ہے کہ "میں نے ایک طرح کا گمان کیا تھا اور گمان کرنے میں تم مجھ سے کچھ جھگڑا مت کرو لیکن جب میں تم کو خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اُس کو پکڑ لو۔ کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں کہتا۔

فانی انما ظننت ظنا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوبہ انی لم اکذب علی اللہ۔

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت نے جو بیماریوں کا علاج بتایا یا کسی رنگ کے گھوڑے کو پسند یا ناپسند کیا یا کوئی کام آنحضرتؐ نے بطریق عادت کیا نہ بطور عبادت کے یا اتفاقیہ کوئی کام بغیر قصد کے ہو گیا یا آنحضرت کی ایسی باتیں جیسی کہ لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور نیز ایسے کام جو سردار کو لشکروں کے معین کرنے اور اُن کے لئے نشانیوں کے قرار دینے اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے کے ہیں یہ سب اُسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔ زید ابن ثابت نے کہا کہ میں آنحضرت کے ہمسایہ میں رہتا تھا پھر جب وحی آتی تھی تو مجھ کو یاد فرماتے تھے اور میں اُس کو لکھ دیتا تھا۔ پھر جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آنحضرت بھی ہمارے ساتھ اُسی کا ذکر

کرنے لگتے تھے۔ اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو ہمارے ساتھ اُسی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو کھانے کا ذکر فرماتے تھے۔ پس سوائے ذکر آخرت کے باقی تمام باتیں تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔ بااین ہمہ، ہم آنحضرت کے تمام افعال واقوال کا نہایت ادب کرتے ہیں اور اُن کو مقدس اور نہایت نیک خصال اور پاک اقوال اور افعال سمجھتے ہیں مگر رسالت سے اُن کو کچھ تعلق ہیں۔

غرضکہ چار قسم کے اقوال آنحضرتؐ کے ایسے ہیں۔ جن پر ہم کو غور کرنی لازمی ہے (۱) وہ جو ہمارے دین سے علاقہ رکھتے (۲) جو جناب پیغمبر خدا کے مخصوص حالات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ (۳) ایسے اقوال جو تمام لوگوں کے حالات پر مؤثر ہیں (۴)، وہ احکام جو سیاست ملکی اور انتظام مدنی سے متعلق ہیں۔

ان میں سے پہلی قسم تو کچھ غور طلب نہیں ہے مگر صرف پچھلی تین قسمیں اس قابل ہیں کہ اُن کی نسبت اس قسم کی تحقیق و تدقیق کی جائے کہ کون سے اُن میں کے از روے وحی کے ہیں اور کون سے ان میں کے از روئے وحی کے نہیں ہیں اور ہم کو لازم ہے کہ صرف انھیں احادیث کو وحی سمجھیں جن کی نسبت ہم کو ایسا سمجھنے کے لئے کافی دلیل اور ثبوت ہو۔

اگرچہ جناب پیغمبر خدا نے ہم کو بتصریح اُن کے قدم بقدم چلنے بلکہ صحابہ اور تابعین کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے مگر یہ حکم محض متعلق بہ معاملات دین سمجھا گیا ہے۔ ہم مسلمانوں کو بھی حتی الامکان مذکورہ بالا امور میں اُن کی پیروی کی کوشش کرنی ہے۔ مگر اخیر کے تین امروں کی پیروی کرنے میں اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں یعنی اگر اُن کا وحی سے ہونا ثابت ہو تو اُس کی اطاعت اور پیروی ہم پر فرض ہے اور دوسری صورت میں ہم اپنی خوشی سے عالم عقبیٰ میں ثواب حاصل کرنے اور اپنے پیغمبر کی محبت اور اُن کی تعظیم اور عقیدت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں یا حالات زمانہ اُس کے ترک پر ہم کو مجبور کریں تو بغیر اس کے کہ مذہب میں کچھ نقصان عاید ہو یا کسی گناہ کے مرتکب ہوں اس کو ترک کرسکتے ہیں۔

اسی قسم کے خیالات نے ہم کو جناب پیغمبر خدا کی جملہ احادیث کے جمع کرنے اور ان کی تحقیق کرنے پر مجبور کیا۔ جناب پیغمبر خدا کی حیات ہی میں اسلام کی سلطنت جزیرہ عرب میں وسیع ہوگئی تھی اور بے شمار لوگوں نے دین اسلام قبول کرلیا تھا۔ ہر مسلمان کی جناب پیغمبر خدا تک رسائی محال تھی اس لئے جناب پیغمبر خدا کے اقوال اور افعال اور عادات کا علم اُن مسلمانوں تک پہنچانا جو اقطاع

دور دور دراز میں رہتے تھے۔ لازم ہوا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا نے اس بات کو پسند کیا جیسا کہ حدیث ذیل میں مذکور ہے۔ پس اُسی زمانہ سے روایتوں کے بیان کرنے کا رواج ہوا۔

ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو سیراب کرے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی اور اُس کو اسی طرح دوسروں کو پہنچایا جیسے کہ مجھ سے سنا تھا سو اکثر پہنچائی گئی سننے والے سے زیادہ اُس کو یاد رکھنے والے ہیں۔

عن ابن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول نضر اللہ امرأ سمع منا شیا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی لہ من سامع (رواہ الترمذی وابن ماجہ رواہ الدارمی عن ابی الدرداء)

اگرچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کی حیات ہی میں چند اشخاص بعض متفرق احادیث کو بھی قلمبند کر لیا کرتے تھے اور آنحضرت کی وفات کے بعد سے اس رواج کو زیادہ ترقی ہوتی گئی مگر ان دونوں زمانوں میں یہ رسم اس قدر محدود تھی کہ کسی خاص غور اور توجہ کے لائق نہیں ہے۔ اُس زمانہ میں بہت سے لوگ زندہ موجود تھے جنھوں نے خود جناب پیغمبر خدا کا کلام سنا تھا۔ اور جو ایسے نہ تھے اُن کو جناب پیغمبر خدا کے اقوال اور افعال اور عادات کی نہایت آسانی سے واقفیت ہو سکتی تھی۔ اور اس لئے احادیث کے جمع کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مگر رفتہ رفتہ جب کہ وہ سن رسیدہ آدمی جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کا زمانہ دیکھا تھا یکے بعد دیگرے انتقال کرتے گئے اُس وقت لوگوں کو احادیث کے جمع کرنے کی اشد ضرورت معلوم ہوئی یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں چند دین دار اور پرہیزگار آدمیوں نے جنھوں نے اس دنیائے دون پر لات ماری تھی اور اپنی جان کو محض راہ خدا میں وقف کر دیا تھا۔ احادیث کے جمع کرنے کا بوجھا اپنے سر پر اٹھا لیا۔ کتابیں لکھنی شروع کیں۔ اور رفتہ رفتہ صحیح اور غیر صحیح کتابوں کا ایک انبار ہو گیا۔

اس سزا کا بیان جس کا مستحق جھوٹ حدیث بیان کرنیوالے کو جناب پیغمبر خدا نے قرار دیا ہے

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کی حیات ہی میں اور آنحضرت کے ارشاد کے مطابق حدیثوں کے اور لوگوں تک پہنچانے کی رسم شروع ہو گئی تھی مگر اس بات کا بھی بیان کرنا ضروری ہے

کہ ایک شخص کے دوسرے شخص تک حدیث پہنچانے میں کس قدر احتیاط کرنے کا منشاء آنحضرت کا تھا اور اُس منشار کے ظاہر کرنے کو ترمذی اور مسلم کی حدیثوں کو اس مقام پر ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ ابن عباس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلعم اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار (رواہ الترمذی)

نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث روایت کرنے میں پرہیز کرو مگر اس قدر جتنا کہ تم جانتے ہو۔ سو جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ کہے گا اس کو اپنا ٹھکانا آگ میں بنانا چاہیئے (ترمذی)

عن سمرۃ بن جندب والمغیرۃ بن شعبۃ قال قال رسول اللہ صلعم من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین (رواہ مسلم)

مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو شخص مجھ سے کسی حدیث کو یہ جان کر روایت کرے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ خود جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے (مسلم)

مگر باوجود اس احتیاط کے ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں جھوٹی اور بے بنیاد روایتیں بعینہٖ اسی طرح پھیل گیئں جس طرح کی جھوٹی روایتیں اور موضوع کتابیں یہودیوں اور عیسائیوں میں مروج ہوگئی تھیں۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے مذہب کے عقاید میں قرار نہیں دیا، بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے اور اس لئے اُنھوں نے ایسی جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو گو کیسے ہی پاک اور نیک ارادہ سے انھوں نے ایسا کیا ہو جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی اور اُن کو اُس آگ سے بچانے میں کبھی کوشش نہیں کی۔ مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے باطنی عقاید کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا، بلکہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔

سر ولیم میور صاحب اپنی اُردو تاریخ دین مسیحی میں بیان کرتے ہیں کہ "دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بُت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے تو انھیں کی بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں۔ آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے بموجب طریقۂ مذکور تسلیم ہوا۔ اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی۔ لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا۔ پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جاننے

ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو کہ اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں اس طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقہ کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اُس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلہ سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اُس کی باتیں زیادہ مانیں گے۔ اگرچہ اُس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں سو اسی طرح مسیحی جو فیلسوفوں کی طرح بحث کرتے تھے کتاب لکھ کے کسی حواری یا خادم حواری یا معروف اُسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں شروع میں ہوا۔ اور کئی سو برس تک رومی کلیسیا میں جاری رہا۔ یہ بات بہت ہی اس کے حق اور قابل الزام شدید کے تھی" (میور صاحب کی تاریخ دین مسیحی حصہ دوم باب ۳)

موشیم نے اپنی کتاب تاریخ مذہبی میں اس طرح پر لکھا ہے کہ" افلاطونی اور فیثاغورثی حکمأ نے صدق اور پاکبازی کی حمایت میں فریب دینے اور جھوٹ بولنے کو جائز ہی قرار نہیں دیا ہے بلکہ مستحسن ٹھیرایا ہے۔ یہودیانِ ساکن مصر نے اس عقیدہ کو قبل سنہ مسیحی کے اُن سے سیکھا اس میں اُس شخص کو کچھ کلام نہ ہوگا جس کو کہ کتابوں کو مشہور آدمیوں کی طرف منسوب کرنے کی بے شمار جعل سازیاں نظمی پیشین گوئیاں اور اسی قسم کی واہیات چیزیں جن کی ایک بڑی مقدار اس صدی اور آئندہ صدیوں میں ظاہر ہوئی تھی یاد ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا۔ برخلاف اس کے اغلب یہ ہے کہ ان کے ایک جزو اعظم کے موجد فرقجات نسطیق بانی ہوتے تھے۔ مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس قصور سے محض مبرا نہ تھے صریح انکار نہیں ہو سکتا (ایکلیزیاسٹکل ہسٹری باب ۳ صفحہ ۷، مطبوعہ ۱۸۶۰ء)

ایک اور مقام پر موشیم نے اُسی مضمون کو اس طرح پر لکھا ہے" لیکن اس کا اس قدر جلد عمل میں آنا مختلف اسباب پر موقوف تھا بالخصوص یہ امر کہ حضرت مسیح کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے شاید بُرے نہ تھے بلکہ وہ وہمی سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات بنام نہاد حواریان مقدس سارے جہان میں مشہور کی گئیں" (ایکلیزیاسٹکل ہسٹری (سیبرت) حصہ دوم باب ۲ صفحہ ۳۶)

اُس طرزِ تحریر کے بیان میں جو روایات کے لکھنے میں مستعمل کیا گیا تھا

اس بات کے ظاہر کرنے کو کہ حدیث ایک شخص سے دوسرے تک کس طرح پہنچی محدثین نے چند کلمات بطور اصطلاح کے مقرر کئے تھے اور اسی لئے حدیث کے ہر ایک راوی پر واجب تھا کہ انھیں کلمات مخصوص سے جو اُس حدیث کے واسطے موزوں ہوں حدیث کو شروع کرے اور یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ہر حدیث پر بلحاظ بیان کے اسی قدر اعتبار کیا جائے جس درجہ اعتبار کے وہ سزاوار ہو۔

کلمات مذکورہ یہ ہیں (۱) "حدثنا" یعنی اُس نے مجھ سے کہا (۲) "سمعتہ یقول" یعنی میں نے اس کو کہتے سنا (۳) "قال لنا" یعنی اُس نے مجھ سے کہا (۴) "ذکرنا" یعنی اُس نے مجھ سے ذکر کیا (۵) "اخبرنا" یعنی اُس نے مجھ کو خبر دی (۶) "انبانا" یعنی اُس نے مجھ کو آگاہ کیا (۷) "عن فلان" یعنی اُس سے۔

اول کے چار کلمے صرف اُس صورت میں استعمال کئے جاتے تھے جب کہ کوئی راوی کسی دوسرے شخص سے حدیث کے الفاظ بجنسہ بیان کر دیتا تھا۔ پانچواں اور چھٹا کلمہ اس مقام پر استعمال کیا جاتا تھا جب کہ کوئی راوی اپنے سے اوپر کے راوی سے کسی امر یا واقعہ کی صحت یا عدم صحت کی نسبت دریافت کرتا تھا۔ اخیر کلمہ ایک مبہم کلمہ ہے اور اسی وجہ سے یہ امر منقح نہیں ہو سکتا کہ اخیر راوی نے جو دوسرے راوی کا نام لیا ہے وہ حدیث درحقیقت اُس راوی نے بیان کی ہے یا اُس کے اور اخیر راوی کے درمیان اور لوگ روایت کرنے والے بھی چھوٹ گئے ہیں۔ اس اشتباہ کے رفع کرنے کو خارجی امور کی تحقیقات ضرور ہوتی ہے۔ مگر اُن کی نسبت علمار کی مختلف رائیں ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ اگر یہ محقق ہو جائے کہ وہ راوی سلسلہ روایت میں اور راویوں کے نام بغرض فریب چھوڑ دینے میں متہم نہیں ہے اور وہ ایسے زمانہ میں اور ایسے مقام پر رہتا تھا کہ ان کا ایک دوسرے سے ملاقی ہونا ممکن تھا۔ گو کہ اُس ملاقات کا ثبوت نہ ہو تو بھی یہ فرض کر لیا جا سکتا ہے کہ اُن دونوں کے درمیان کوئی اور راوی نہیں چھوٹا ہے۔

دوسری رائے جو بعض علمائے مستند کی رائے ہے یہ ہے کہ اس امر کا ثابت ہونا بھی ضرور ہے کہ وہ دونوں اپنی تمام عمر میں ایک مرتبہ بھی ملاقی ہوئے ہوں۔

تیسری رائے جو بعض علمار کا قول ہے یہ ہے کہ اس امر کا ثبوت بھی ضرور ہے کہ وہ اتنے عرصہ تک یک جا رہے ہوں جو اُن کے ایک دوسرے سے حدیث سیکھنے کے واسطے کافی ہو۔

چوتھی رائے بعض عالموں کی یہ ہے کہ اس امر کا ثبوت بھی ضرور ہے کہ ایک نے دوسرے سے درحقیقت حدیث سیکھی بھی تھی۔

درجات احادیث کے بیان میں ایک راوی کے دوسرے تک پہنچنے کے لحاظ سے

جب کبھی کوئی حدیث بیان ہوتی ہے اُس کا رُتبہ سلسلہ روایت سے جانچا جاتا ہے اور اُس شناخت کے لئے الفاظ مصطلح مقرر کئے گئے ہیں۔

اول:۔ "مسند یا مرفوع" یہ لقب اُس حدیث کو دیا جاتا ہے جب کہ راوی صاف صاف بیان کرتا ہے کہ فلاں بات خود پیغمبر خدا نے بیان فرمائی تھی یا خود کی تھی یا اوروں نے اُن کے روبرو کی تھی اور آپ نے منع نہیں فرمایا تھا۔

دوم:۔ "مرفوع متصل" اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا تک لگاتار یعنی بلا فصل پہنچتا ہو تو اُس کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

سوم:۔ "مرفوع منقطع" اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ بلا فصل پیغمبر خدا تک نہ پہنچے تو اُس حدیث کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

چہارم:۔ "مرسل یا موقوف" یعنی وہ حدیث جس کو پیغمبر خدا کے اصحاب نے بیان کیا ہو۔ مگر پیغمبر خدا سے منسوب نہ کیا ہو۔

پنجم:۔ "مرسل یا موقوف متصل" اگر راویوں کا سلسلہ اُس صحابی تک جس نے اُس کو بیان کیا ہے بلا فصل چلا گیا ہو تو اُس حدیث کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

ششم:۔ "مرسل یا موقوف منقطع" لیکن اگر راویوں کا سلسلہ اُس صحابی تک مسلسل نہ ہو تو اُس حدیث کا یہ لقب ہوتا ہے۔

اس بات میں کہ آیا حدیث "مرسل یا موقوف متصل" کو معتبر اور قابل استدلال خیال کرنا چاہیے یا نہیں۔ علماء میں اختلاف رائے ہے۔ لیکن صحابہ کی ایسی حدیث جس میں ایک ایسے واقعہ یا مقام کا مذکور ہو، جہاں وہ خود موجود نہیں تھے تو اُس حدیث کو کسی طرح بغیر اور کسی سند کے حدیث نبوی کے ہم پایہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اُن علماء کی رائے نہایت صحیح اور قرین انصاف ہے جو دربارہ نزول وحی کے حضرت عائشہ کی روایات کو قابل سند نہیں خیال کرتے کیونکہ وہ اُس زمانہ میں موجود نہ تھیں۔

ہفتم:۔ "مقطوع" یعنی وہ حدیثیں جو تابعین نے بیان کی ہیں اور اپنے سے اوپر کے صحابہ کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔

ہشتم:۔ "مقطوع متصل" اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ اُس تابعی تک برابر چلا جائے تو اُس حدیث کا یہ نام ہے۔

نہم:۔ "مقطوع منقطع" اگر اُس کا سلسلہ اُس تابعی تک نہ پہنچے تو اس حدیث کو اس نام سے پکارتے ہیں۔

دہم:۔ "روایت" یہ اقسام مندرجہ بالا سے بالکل علیحدہ ہے۔ یہ نام اُن حدیثوں کا ہے۔ جو اس طرح پر شروع ہوتی ہیں۔ "یہ بیان کیا گیا ہے" یا "فلاں شخص نے یوں روایت کی ہے" اس قسم کی روایتیں بازاری گپ سے کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ایسی ہی روایتوں سے ہمارے مفسرین و مورخین نے اپنی تصنیفات کا حجم بڑھا لیا ہے اور ایسی ہی واہیات اور بیہودہ باتوں سے ہشامی طبقات کبیر۔ کاتب الواقدی وغیرہ کتابیں سیرو تواریخ کی پایہ اعتبار سے ساقط گنی جاتی ہیں اور جو مایہ افتخار و ناز اُن عیسائی مصنفوں کا ہے جو مذہب اسلام کے برخلاف کتابیں لکھتے ہیں۔

درجات احادیث کے بیان میں بلحاظ راویوں کے چال و چلن یعنی اُنکے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے

جب کبھی حدیث کے درجہ صحت کا امتحان راویوں کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے تو اُس کا درجہ بترتیب ذیل قرار پاتا ہے۔

اول:۔ "صحیح"۔ اس نام سے وہ حدیث موسوم ہوتی ہے جس کے تمام راوی اول سے آخر تک پکے دین دار اور متقی اشخاص ہوں اور کبھی کسی قسم کی بُرائی کے ساتھ متہم نہ ہوئے ہوں بلکہ تدین اور صدق مقال کے واسطے مشہور اور سب لوگوں کے نزدیک مسلّم ہوں۔ ایسی حدیثوں کا درجہ اعتبار اس سبب سے اور بھی بڑھ جاتا ہے جب کہ اس قسم کے راویوں نے علیحدہ علیحدہ بلا کسی اختلاف کے اُسی حدیث کو بیان کیا ہو مگر ایسی حدیثیں نہایت ہی قلیل ہیں۔

دوم:۔ "حسن"۔ اس لقب سے وہ حدیثیں ملقب ہوتی ہیں جن کے تمام راوی اور اوصاف حمیدہ میں اول قسم کی حدیث کے راویوں کی کوئی ہمسری نہ کر سکتے ہوں مگر با ایں ہمہ پرہیزگاری اور عام ثقاہت کے ساتھ متصف ہوں اور اس حدیث کی اصلیت بھی غیر مشتبہ ہو۔ اس قسم کی بے شمار حدیثیں ہیں جن سے معتبر کتب احادیث مملو ہیں۔

سوم:۔ "ضعیف"۔ یہ نام ان حدیثوں کو دیا جاتا ہے جن کے تمام راویوں میں سے ایک شخص بھی اول یا دوم قسم کے راویوں کی مانند نہ ہو۔ ان احادیث کے ضعف کا درجہ دیگر اسباب سے بھی زیادہ یا کم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی کتب احادیث جو دوسرے درجہ کی کہلاتی ہیں اسی قسم کی احادیث سے بھری پڑی ہیں۔

چہارم:۔ "غریب"۔ یہ لقب اُن حدیثوں کا ہے جن کے راویوں میں سے کسی نے بجز ایک آدھ حدیث کے اور کوئی حدیث نقل نہ کی ہو جس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ فن حدیث میں کچھ اعتبار نہیں رکھتا۔

راویوں کے درجہ اعتبار کے بیان میں اُن کے تفقہ فی الدین کے لحاظ سے

تمام صحابہ کبار اور تابعین اور تبع تابعین جب کوئی حدیث آنحضرتؐ کی بیان کرتے تھے تو ان کے الفاظ بعینہٖ وہی نہیں ہوتے تھے جو آنحضرتؐ نے فرمائے ہوں اور ایسا کرنا امکان سے بھی خارج تھا معہذا خیال کیا گیا ہے کہ بعض دعائیں ایسی ہیں جن کے الفاظ بجنسہٖ محفوظ ہیں۔ غرضکہ تمام حدیث کے راویوں میں حدیث کو بالمعنی روایت کرنے کا رواج تھا۔ پس یہ بات قرین قیاس ہے کہ جو لوگ زیادہ

علم رکھتے تھے اور تفقہ فی الدین کا اُن کو زیادہ ملکہ تھا وہ آنحضرت کے کلام کا بہ نسبت اوروں کے اچھی طرح پر مطلب سمجھتے ہوں گے اور اوروں کو بھی ٹھیک طور پر بخوبی سمجھا سکتے ہوں گے اس واسطے راویوں کے باعتبار اُن کے علم کے سات درجے کئے گئے ہیں۔

اول:۔ وہ جو علم اور تفقہ میں زیادہ تر ممتاز تھے۔ اور حافظہ بھی قوی رکھتے تھے۔ ایسے اشخاص ائمہ حدیث کہلاتے ہیں۔

دوم:۔ وہ جو پہلوں سے کم درجہ رکھتے تھے۔ اور جن سے شاذو نادر ہی کسی غلطی کے سرزد ہونے کا احتمال تھا۔

سوم:۔ وہ جنھوں نے مسائل مذہبی میں اختلاف کیا تھا مگر اس کو اس قدر تعصب نہیں ہو گیا تھا۔ کہ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہوں اور نیز اُن کے تدین اور صدق کلام میں کسی طرح کا شک دشبہ نہیں تھا۔

چہارم:۔ وہ جن کے حالات کی نسبت کچھ اچھی طرح آگاہی نہیں ہے۔

پنجم:۔ وہ جنھوں نے مسائل مذہبی میں اختلاف کیا تھا مگر اُن کا تعصب حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔

ششم:۔ وہ جن کی طبیعت میں شک اور وہم بڑھا ہوا تھا اور ان کا حافظہ بھی قابل اعتبار کے نہ تھا۔

ہفتم:۔ وہ جھوٹی حدیثیں بنانے میں مشہور اور بدنام تھے۔

علمائے دین کی یہ رائے ہے کہ اول تین درجے کے لوگوں کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو باعتبار اُن کے مراتب کے صحیح خیال کرنا چاہیے اور اخیر کے تین درجے کے لوگوں کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو بلا تامل رد کر دینا چاہیے۔ باقی رہ گئے چوتھے درجہ کے لوگ اُن کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو جب تک کہ اُن کے راویوں حال معلوم نہ ہو قابل اعتبار سمجھنا نہ چاہیے۔

جو روایتیں کہ یہودیوں کے ہاں مذکور تھیں اُن کے بیان کرنے سے مسلمانوں کو ممانعت نہ تھی

آنحضرت نے فرمایا تھا کہ یہودیوں کے جو روایتیں ہیں اُن کے بیان کرنے میں کچھ ہرج نہیں

ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق اُس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری میں مذکور ہے اور اسی وجہ سے مسلمان۔ یہودیوں کی روایتوں کے بیان کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے اور وہ حدیث یہ ہے۔

عن عبد الله ابن عمر قال قال رسول الله صلعم بلغوا عني ولو آية وحدثوا عن بني اسرائيل ولا حرج ومن كذب علي متعمداً فليتبوء مقعده من النار (رواه البخاري)

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہنچاؤ مجھ سے اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ اور حدیث بیان کرو بنی اسرائیل سے اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ بولے گا۔ تو اُس کو اپنا ٹھکانا آگ میں بنانا چاہیئے۔ (بخاری)

روایات میں اختلاف ہونے کے اسباب

جب کبھی ہم راویوں کی روایتوں میں اختلاف دیکھیں تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا نہیں چاہیئے۔ کہ یہ روایتیں راویوں کی بناوٹ ہے جیسا کہ عیسائی مؤرخ عموماً خیال کرتے ہیں۔ اس لئے احادیث موضوعہ کے سوا اور بھی قدرتی اسباب ایسے موجود ہیں جن کی وجہ سے روایات میں اختلاف پڑنا ممکن الوقوع ہے۔ چنانچہ ہم اُن قدرتی اسباب کو بیان کرتے ہیں جن کے سبب دو روایتوں میں اختلاف پڑتا ہے۔

اول:۔ حدیث کے مطلب کی غلط فہمی۔

دوم:۔ حدیث کے معنی سمجھنے میں دو راویوں کے باہم اختلاف۔ یعنی ایک ہی حدیث کے ایک نے کچھ معنی سمجھے اور ایک نے کچھ۔

سوم:۔ حدیث کا مطلب لوگوں سے صاف صاف بیان کرنے کی عدم قابلیت۔

چہارم:۔ راوی کے حافظ کا قصور کہ یا تو اُس نے کسی حدیث کا کوئی جزو چھوڑ دیا۔ یا دو مختلف حدیثوں کو باہم خلط ملط کر دیا۔

پنجم:۔ راوی کا کسی جزو حدیث کی تفصیل کا بیان کرنا اس غرض سے کہ سننے والا بآسانی اُس کو سمجھ جاتے لیکن سننے والے نے ازراہ غلطی اُس تفصیل کو بھی حدیث کا جزو سمجھا۔

ششم:۔ راوی نے اپنی گفتگو میں جناب پیغمبر خدا کے چند کلمات بیان کئے اور سننے والوں نے اُس کے تمام کلام کو حدیث سمجھ لیا۔

ہفتم:۔ کسی راوی نے یہودیوں کی روایتیں بیان کیں اور سننے والے نے ان کو غلطی سے حدیث سمجھ لیا اور اسی ذریعہ سے یہودیوں کی روایتوں کا اختلاف مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو آیا۔ اگلے نبیوں اور بزرگوں کے قصے جن سے ہمارے ہاں کی تاریخیں اور تفسیریں سیاہ ہیں سب انھیں ذریعوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

ہشتم:۔ وہ اختلافات جو زبانی روایات کے سلسلہ سے خود بخود عارض ہوتا ہے اور اسی ذریعہ سے معمولی باتیں معجزات اور کرامات کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔

نہم:۔ مختلف حالات جن میں کہ راوی نے آنحضرت کو دیکھا تھا یا کچھ فرماتے سُنا تھا، یا کرتے دیکھا تھا۔

یہ تمام اسباب ایسے ہیں جن کے سبب سے بغیر ارادہ تصنع کے قدرتی طور پر روایتوں میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ منجملہ اُن کے نویں قسم ایسی ہے کہ باوجود اختلاف کے کل روایتوں کا سچا ہونا ممکن ہے۔

موضوع حدیثوں کا بیان

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ بہت سی حدیثیں جناب پیغمبر خدا کے نام سے جھوٹی اور موضوع بنائی گئیں اور جو لوگ کہ ایسی شرمناک جعل سازی کے مرتکب ہوئے تھے وہ مختلف قسم کے لوگ تھے۔

اول:۔ وہ لوگ تھے جو عوام الناس میں کسی نیک رسم یا کسی ثواب کے کام کی ترویج کے خواہاں تھے اور اپنے کامیاب ہونے کی غرض سے اُنھوں نے کوئی حدیث بنالی۔ اس قسم کی جعلسازی زیادہ تر اُن حدیثوں سے متعلق ہے۔ جن میں چھوٹے چھوٹے نیک کاموں کے کرنے میں بڑے بڑے ثواب بیان کئے ہیں اور نوافل کے پڑھنے میں گناہوں کے بخشے جانے اور قیامت میں اعلے درجے ملنے کے وعدے کیے گئے ہیں۔ قرآن کی سورتوں کے پڑھنے کی عجیب عجیب خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ بیماریوں سے شفا پانے اور رزق میں فراخی ہونے کی خاصیتیں یا بعض قرآن کی سورتوں کا قیامت میں گناہ بخشوانے کے لئے شفیع ہونا بیان ہوا ہے۔ ان موضوع حدیثوں کے بنانے والوں کا منشاء یہ تھا کہ لوگ نیک کاموں میں اور قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل کے ادا کرنے پر زیادہ متوجہ ہوں۔ لیکن مذہب اسلام

اس قسم کے فریبوں اور جھوٹوں کو پناہ نہیں دیتا بلکہ اُن کو جہنم کی آگ میں ڈالتا ہے۔

دوم:۔ واعظین نے اس غرض سے کہ اُن کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو جائیں اور سننے والے عجیب و غریب باتوں کے سننے سے خوش ہوں اور نیز اس غرض سے کہ سننے والوں کے دل میں نرمی اور رحم اور خداترسی اور رقت قلب اور نیک کاموں کی رغبت پیدا ہو اور بُرے کاموں کی دہشت اُن کے دل میں پیدا ہو اور خدا کا خوف اور نجات کی امید میں اُن کے دل میں بھڑک اٹھیں۔ بہت سی حدیثیں موضوع کرلیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کو یہ خیال نہیں کہ اُن کے ان افعال سے مذہب اسلام بالکل نفرت کرتا ہے۔ یہ حدیثیں زیادہ تر دوزخ اور بہشت اور ملائک کے حالات وغیرہ سے علاقہ رکھتی ہیں۔

سوم:۔ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مذہب کے مسائل میں اختلاف کئے اور اُس تعصب میں جادۂ اعتدال سے بڑھ گئے اور اپنی دلیلوں میں غلبہ حاصل کرنے کی غرض سے اس قسم کی حدیثیں وضع کرلیں جو اُن کے مفید مطلب ہوں۔

چہارم:۔ مخالفین مذہب اسلام نے جو اُس زمانہ میں زیادہ تر یہودی اور مشرکین تھے۔ بہت سی باتیں سچ اور جھوٹ آنحضرت کی نسبت مشہور کی تھیں اور وہ عرب میں پھیل گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ بطور روایت کے بیان ہونے لگیں اور لوگوں نے غلطی سے اُن کو حدیثوں میں شمار کیا۔

ہمارے علمار نے احادیث موضوع اور غلط روایات مروجہ کے دریافت کرنے میں از حد کوشش کی ہے اور اس باب میں اکثر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اور صحیح اور باطل روایتوں کی تحقیق اور تمیز کرنے کے لئے قواعد اور اصول منضبط کئے ہیں۔

مقدم اصول جو اس امر کی تحقیق کے لئے علمار نے قرار دیئے ہیں وہ یہ ہیں کہ احادیث کے الفاظ اور طرز عبارت کا امتحان کیا جائے۔ ہر حدیث کے مضمون کو قرآن مجید کے احکام اور عقائد و رسائل مذہبی مستخرجہ قرآن اور احادیث متسند سے مقابلہ ہو۔ احادیث کے منشار اور بیان کی تحقیق اور تدقیق کی جائے کہ اُس میں کوئی ایسا تاریخی واقعہ تو نہیں ہے جو از روئے تاریخ کے غلط ہو یا اُس میں ایسے عجائبات تو نہیں بیان ہوئے جن کو عقل تسلیم نہ کرتی ہو۔ جن حدیثوں میں اس قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں وہ موضوع خیال کی جاتی ہیں۔

مختصر طور پر اس کتاب کے پڑھنے والے جان لیں گے کہ جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں اُن میں کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا لحاظ ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یعنی راوی نے

صاف اور مصرح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی۔ سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا تک غیر منقطع ہو۔ پیغمبر خدا سے لے کر اخیر راوی تک جملہ راوی تقویٰ اور تدین اور نیک اعمال کے لئے مشہور ہوں۔ ہر راوی کو اپنے ما سبق راوی سے ایک سے زیادہ حدیثیں پہنچی ہوں۔ ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو تاکہ یہ امر تلقین ہو جائے کہ اُس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا اور راوروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا۔ حدیث کا منشا احکام مندرجہ قرآن مجید یا عقائد مذہبی مستخرجہ قرآن یا حدیث مستند سے تناقض نہ ہو۔ اُس میں عجائبات و غرائبات دور از عقل بیان نہ ہوں بلکہ منشا حدیث کا اس قسم کا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو۔

کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدۂ مذہبی کی بناء ہو سکتی ہے۔ مگر باایں ہمہ اُس میں ایک اور شبہ کا عارض ہونا باقی رہ جاتا ہے یعنی وہ حدیث اس لیے کہ صرف ایک ہی شخص کی روایت ہے مفید یقین نہیں ہو سکتی بلکہ افادۂ ظن کرتی ہے۔

اس شبہ کے سبب سے احادیث مستندہ کے بھی تین درجے قائم کئے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) متواتر، (۲) مشہور (۳) خبر آحاد۔

متواتر۔ وہ حدیثیں کہلاتی ہیں جن کو جناب پیغمبر خدا کے زمانہ سے لے کر جملہ صحابہؓ کبار اور علمائے دین نے ہر ایک زمانہ میں پے در پے بالاتفاق صحیح اور مستند تسلیم کر لیا ہو اور اُن میں کسی نے کبھی کوئی جرح و قدح نہ کی ہو۔ ہر زمانہ کے علماء کا قول ہے کہ صرف قرآن مجید ہی حد تواتر کو پہنچا ہے مگر بعض حدیثوں کو بھی متواتر بتاتے ہیں اور اُن کی تعداد پانچ سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ایسی احادیث پر بلا تکلف اعتبار کرنا اور اُن پر معتقدانہ عمل کرنا واجب ہے۔

مشہور۔ اُن حدیثوں کو کہتے ہیں جو تواتر کے درجہ تک نہ پہنچی ہوں مگر زمانہ کے عالموں نے اُن کو صحیح تسلیم کیا ہو۔ یہ وہ حدیثیں ہیں جو ہماری کتب حدیث میں جو معتبر گنی جاتی ہیں منقول ہیں اور اس باعث سے اُن کی صحت بالعموم مسلّم ہے اور ہمارے بعض عقائد مذہبی بھی اُن پر مبنی ہیں گو کہ وہ درایۃً تنقیح اور تنقید کے امتحان سے بری نہیں۔

خبر آحاد۔ ان حدیثوں کا نام ہے جو مذکورہ بالا حدیثوں کے اوصاف تک نہیں پہنچیں اور اسی قسم کی حدیثیں بہت کثرت سے حدیث کی کتابوں میں ہیں۔ علمائے اسلام اس باب میں کہ اس پچھلی قسم کی حدیثوں پر کوئی عقیدہ مذہبی مبنی ہو سکتا ہے یا نہیں مختلف الرائے ہیں۔

جن لوگوں نے کہ احادیث کے جمع کرنے کا بوجھ اٹھایا تھا ان میں سے جو سب سے اعلیٰ اور افضل اور ائمہ حدیث کہلاتے تھے اُنھوں نے اپنی ہمت صرف اس بات پر مصروف کی تھی کہ راویوں کے اعتبار کی لحاظ، تحقیق کرنے کے بعد حدیثوں کو لکھیں اور انھیں لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں صحاح میں داخل ہیں۔ اور بعضوں نے اس بات پر ہمت معروف کی تھی کہ جس قدر حدیثیں ان کو ملیں وہ جمع کر لیں اُنھیں کی لکھی ہوئی کتابیں دوسرے درجہ کی گنی جاتی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جامعین حدیث نے ایسی کسی حدیث کو نہ اختیار کیا ہوگا جو علانیہ بادی النظر میں غلط ہو مگر جس قدر کہ حدیثیں اُنھوں نے منتخب کر کے جمع کر لیں۔ اُس پر اُن کو از روئے درایت کے تحقیق اور تدقیق کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اُنھوں نے یہ کام اپنے سے بعد کے لوگوں پر چھوڑا تھا۔ افسوس ہے کہ اُن کے بعد اُن کی حدیثوں کی ایسی وقعت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی کہ اُن بجز خاص علمائے محققین کے درایۃً اُن حدیثوں کی تنقیح اور تنقید کی جرأت نہیں ہوئی۔ مگر از روئے مذہب اسلام کے ہر ایک مسلمان کا حق ہے کہ اُن کی حدیثوں کی درایۃً تنقیح اور تنقید کرے۔ ہمارے مورخین نے اور مفسرین نے جو کام اختیار کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام ولدر اور ناقص اور ضعیف حدیثوں کو اپنی تصنیفات میں جگہ دیتے ہیں۔

عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجہ صحت اور تحقیق کے اُن قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کئے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں اور درایت کے تو نام سے بھی واقف نہیں ہیں جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز ضعیف احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گئے اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور جب کہ اُن کی یہ مایہ افتخار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گذرتی ہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مصنفین کی بے علمی اور تعصب پر جو اُن کی تصنیفات سے مترشح ہوتی ہے ہنستے ہیں اور اُن کی بے فائدہ صرف اوقات پر افسوس کرتے ہیں۔

سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنّفوں کے شبہات کی تردید

اگرچہ ہم نے مسلمانوں کی روایتوں کا پورا پورا اور بہ تفصیل بیان کیا ہے تاہم بر نظر مزید

تحقیق اُس آگاہی کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہم کو اپنے نبی کی سوانح عمری لکھنے والے دو لیق عیسائی مصنفوں سے حاصل ہوئی ہے۔ یعنی اے اسپرنگر ایم ڈی اور سر ولیم میور ایل ایل ڈی ہیں۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے اور اُس تھوڑے ہی بیان سے اُن کے اس مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ اُن کی مثال ٹھیک ٹھیک اُس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی میں پڑا ہوا اور لوز کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر گیا ہو اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو۔ مگر اُن کا ایک بیان قابلِ غور ہے وہ کہتے ہیں کہ کتب دینیات اہل سنت وجماعت کے ہاں چھ کتابیں سب سے معتبر ہیں یعنی صحیح بخاری۔ مسلم۔ سنن ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں جو اکثر کتب سابق پر مبنی ہیں جن کی سنیوں کے ہاں بہت قدر ہے۔ مثلاً (واضح ہو کہ بعض ناموں کی صحت جو انگریزی میں لکھے ہوئے تھے نہیں ہو سکی) دارمی۔ دار قطنی۔ ابن عینیہ۔ اصمعی برقانی احمد سنی۔ بیہقی۔ حمیدی۔ خطابی۔ بغوی۔ رزین۔ جوزی ابن الاثیر مبارک ابن جوزی۔ لوذی۔

اب اوّل تو یہ اخیر کی چودہ کتابیں اُن میں سے جس قدر سے کہ ہم واقف ہیں پہلی چھ کتابوں پر مبنی نہیں ہیں سوائے مشکوٰۃ کے جو بغوی کی ہے اور اکثر ان میں کی غیر معتبر اور غیر مستند ہیں اور اُن میں جو حدیثیں مذکور ہیں وہ ان چھ کتابوں میں نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی حدیث ہو خواہ وہ پہلی قسم کی کتابوں میں نہ کسی مذہبی عقیدہ کی بنا قرار پاتی ہے۔ نہ صحیح اور مستند تسلیم ہوتی ہے۔ جب تک کہ وہ اُن قواعد سے جو اوپر مذکور ہوئے صحیح نہ ثابت ہوئی ہو۔

سر ولیم میور نے کسی قدر طوالت کے ساتھ اسلام کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بحث کی ہے مگر ہم بافسوس بیان کرتے ہیں کہ اُن کی طرز تحریر سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ ایک غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحقیق اور جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ متخرج کریں۔ اُن کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ یہ سب روایتیں جھوٹی اور لوگوں کی محض بناوٹیں اور ایجادیں ہیں اور اول ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے گو وہ امر حق کچھ ہی کیوں نہ ہو جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشاء ہوتا ہے یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیئے۔ اُن کے طرز استدلال ہی سے اُن کی غرض ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ اس فقرہ سے مطلب کو آغاز کر کے کہ

" اگلے مسلمانوں کی عادتیں روایت کے رواج کی موید ہیں" فرماتے ہیں کہ " اپنے نبی کے کاموں اور باتوں سے زیادہ اور کس مضمون پر مسلمانان سابق سرگرمی سے بحث کرتے" اس کے بعد صاحب موصوف یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ " ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد (صلعم) کو عجیب وغریب اوصاف سے متصف کردیا۔ اُن کے پیرووں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ محمد (صلعم) کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں ..... اسی مادہ سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں آئیں۔ جب کبھی اُن بیانات کے امتحان کے لئے واقعات کا کوئی اندازہ سردست موجود نہ ہوتا تو حافظے کو قوت واہمہ کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی" "صحابہ کبار کی روایتوں کی تعظیم اور حرمت جو زمانہ مابعد میں لوگوں کو تھی" وہ بقول صاحب موصوف "امتداد ایام کا اثر تھا جو لوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوا ہوگا"

اب کہ سر ولیم میور اس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نیک اور پرہیزگار شخص کا کیا حال ہوگا اگر اس کی ہر بات اور حرکت کو دغا بازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں اور جس قدر خراب معنی ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کرسکے اُن کے اوپر عائد کریں۔

کیا حضرت موسٰی کے تمام معجزات " اُن کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہوجانا" " اُن کا ید بیضا" "دریا کا خون کی مانند ہوجانا" "مینڈکوں کی وبا" اور اور معجزات جو ان سے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے "بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لئے رستہ کا کھل جانا" "من وسلوے کا آسمان سے نازل ہونا" "پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدا تعالٰی نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا۔ خدا تعالٰی کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا اور ان کو "میری منتخب قوم" کے خطابات سے سرفراز کرنا اور اس قدر برکتیں اُن کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو "میرا پہلوٹھا" بیٹا کہکر ممتاز کرنا کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے اختیار کیا ہے۔ نہیں کہہ سکتے۔ جن کو اُس نبی کے سرگرم پیرووں یعنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو۔ جنھوں نے "بہ سبب" تشکیانہ تعظیم" اور "شائقانہ تکریم" کے امتداد زمانہ میں اپنے نبی کو "عجیب وغریب اوصاف سے" متصف کردیا۔ کیا یہ بات کبھی حضرت موسٰی پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی ہے کہ " اُن کی وضع کی شان کو دھیان اور مراقبہ سے عروج حاصل ہوا اور جس قدر دور زمانہ اُن کے پیرووں سے اُن کو کرتا گیا۔ اُس عجیب وغریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے

فرشتوں (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام وسلام رکھتا تھا۔ زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا۔ دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ اُن کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل اور ایسے سامانوں سے جو انسان کے امکان سے باہر ہیں گھرے ہوئے ہیں ؎۔

حضرت عیسیٰ اور اُن کے با اعتقاد اور سرگرم متبعین کا اُس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص اُن روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا جن میں حضرت عیسیٰ کی کراماتی پیدایش اور حضرت عیسیٰ کا ازسرنو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور اُن کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا یعنی حسب قانون وحدت فی التثلیث کے اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔

لیکن عقل وفہم کی تعظیم ہم کو اُن لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور اُن کی بدترین تاویل کرنے سے مانع آتی ہے۔ جنھوں نے تقوی اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو۔ اور اس امر سے بھی البتہ انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر مصنف کو لازم ہے کہ جب اوروں کی تحریرات اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کرے۔

محمد رسول اللہ کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف مصروف کردیا تھا وہ امر حق کو مانتے تھے اور اس جہان فانی کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ وہ ایمان دار صادق القول اور نیک طینت تھے اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے بدیں غرض کہ احادیث نبوی کا ایک مجموعہ ہو جائے۔ دور دراز کے سفر اختیار کئے تھے۔ انھوں نے حکام وقت کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ اُن کو بے شمار دقتیں پیش آئیں اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں، جو بمشکل خیال میں آسکتی ہیں۔ بایں ہمہ انھوں نے کبھی اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی اور اُن کو انجام تک پہنچایا۔ جس سے صریح ثابت ہے۔ کہ اُن کو دینی اور نیک نیت وجہوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی۔ اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہوسکتے کہ اُن کے افعال کو ریاکاری اور فریب کی طرف منسوب کریں اور اُن کی تصنیفات کی اس بے بنیاد بیان پر کہ محض بناوٹی ایجادیں ہیں بے جا تحقیر کریں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ "ترقی پذیر سلطنت کی احتیاجیں قرآن کے مجموعہ سیاست کی افزائش کی خواہاں ہوئیں۔ جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادہ وضع اور محدود نظام مدنی کے واسطے بخوبی

کفایت کرتی تھی اُن کی اولاد کی روزافزوں احتیاجوں کے واسطے غیر مکتفی ہوگئی" وہ کہتے ہیں کہ۔
"یہ اور اسی قسم کے اسباب قرآن کے معدود اور معرا مسائل کی توسیع اور اُس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے"

اس بیان میں سر ولیم میور نے دو طرح پر غلطیاں کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت اور مجموعہ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے۔ انھوں نے احادیث نبوی کو محض باغراض دینی جمع کیا تھا۔ اُن کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے یعنی اُن کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ مسلمانوں نے امور متعلق سیاست کو الہامی سمجھا ہو۔ خود جناب پیغمبر خدا اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہ سے صلاح لیتے تھے اور اس صلاح کے مطابق کاربند ہوتے تھے۔ اُس زمانہ کے بعد بھی اُن روایتوں کو جو سیاست سے متعلق تھیں کسی نے الہامی نہیں سمجھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ قرآن مجید اور نیز جناب پیغمبر خدا نے ہر چیز متعلق سیاست اور انتظام مدن کو باستثنائے چند اصول عام کے بالکل فرماں رواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے کام کریں، جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں۔ پس مسلمانوں کو اور اُن کی اولاد کو اپنی روزافزوں احتیاجوں کے واسطے قرآن مجید کی تکمیل کے لیے حدیثوں کی تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہاں بلاشبہ مسلمانوں میں یہ خواہش تھی۔ کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے اسی طرح پر کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی اور یہ اس محبت و عشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبر کے ساتھ رکھتے ہیں اور اسی لئے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے۔ پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی۔ مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین تاویل میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد سر ولیم میور صاحب یہ فقرہ لکھ کر کہ "قرآن ہی چال وچلن کا نافذ قانون تھا" یہ بیان کرتے ہیں کہ "پھر وہ اپنی غرض اصلی کے واسطے مکتفی نہ ہوا اور اس نقص کی تلافی سنت یعنی پیغمبر صاحب کے احکام اور افعال سے کی گئی" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اُنھوں نے (یعنی پیغمبر خدا نے) کبھی اپنے آپ کو خطا سے مبرا نہیں قرار دیا۔ بجز اُس صورت کے جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوتا تھا۔ مگر اس نئے عقیدہ نے یہ بات تراش لی کہ پیغمبر صاحب کے ہر قول و

فعل میں ایک الہٰی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔

ہم مسلمانوں کا معاملات دینی و دنیوی میں اپنے پیغمبر کی تقلید میں کوشش کرنا خواہ وہ امور دین سے علاقہ رکھتے ہوں خواہ امور دنیا سے خواہ امور سیاست مدن سے اور خواہ امور متعلق عادت اور عبادت سے دوسری چیز ہے اور اس بات کا اعتقاد کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کون سا قول اور فعل از روے وحی کے غیر قابل خطا کے تھا اور کون سے افعال صحابہ کے مشورہ سے کیے گئے تھے جن کو وحی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ دوسری چیز ہے۔ سر ولیم میور نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے خواہ خود غلطی میں پڑ کر ہماری نسبت ناانصافی سے یہ اعتقاد منسوب کیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کے ہر قول و فعل میں ایک الہٰی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم مسلمان تمام قول و فعل اپنے پیغمبر کو اُسی ادب اور عظمت سے دیکھتے ہیں جیسے کہ ایک نبی اولوالعزم کے اقوال و افعال ادب اور عظمت کے مستحق ہیں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ روایتوں کی بناوٹ اور اشاعت کا "کام عوام الناس کے فائدوں اور سلطنت کے ملکی حالات پر اس قدر موثر تھا کہ بطور خود لوگوں کی سرگرمی پر بالکل چھوڑ دینے کے قابل نہ تھا" اور اپنے بیان کی تائید میں ڈاکٹر اسپرنگر کے مندرجہ ذیل فقرہ کو نقل کرتے ہیں، جو قسطلانی شرح بخاری سے ان کو ہاتھ لگا تھا اور وہ فقرہ یہ ہے:۔ "چونکہ پیغمبر صاحب کے ہر معتبر اور صحیح بیان کی جو دستیاب ہوسکے قلم بند کرنے کی ضرورت اشد تھی اس لئے خلیفہ عمر نے ایک گشتی حکم اس باب میں جاری کیا اور بالتخصیص ابوبکر بن محمد کو روایات کے جمع کرنے پر مامور کیا"

اگر قسطلانی نے یہ مضمون لکھا ہے تو محض غلط ہے۔ حضرت عمر حدیثوں کے جمع کرنے کے خود مخالف تھے جس کو سر ولیم میور نے بھی قبول کیا ہے۔ اور عنقریب معلوم ہوگا۔ کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے اُن لوگوں کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کا یہ بیان ہے کہ "خلیفہ عمر نے تمام احادیث موجودہ کے باقاعدہ جمع کرنے کا گشتی حکم جاری کیا تھا" ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نشان دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو۔ برخلاف اس کے ہم اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثنا ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفا کے دربار میں جانے سے بھی ازحد پرہیز کرتے تھے۔ اُس زمانہ کے خلفا جناب پیغمبر خدا کے خلیفہ نہ تھے، بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے، کیونکہ سلسلہ خلافت کا جناب رسالت مآب کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہو گیا تھا۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے

نقل کرتے ہیں۔ اُن روایتوں میں اخیر روایت یہ ہے کہ خلیفہ عمر جانشین ابوبکر نے سنت کے قلمبند کرنے کا ارادہ کیا اور ایک مہینہ تک اس باب میں اللہ جل شانہ سے دعا کی۔ لیکن آخر کار جب اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہوتے تب یہ فرما کر باز رہے کہ "مجھ کو ایک قوم کا ذکر یاد ہے جنھوں نے اسی قسم کی تحریرات قلم بند کی تھیں اور کتاب ربانی کو چھوڑ کر ان پر عمل کیا تھا۔"

یہ روایت جس طرز بیان میں واقدی نے نقل کی ہے وہ ایسی ہے جیسی کہ اس قسم کی روایتوں میں ایک افواہی باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ دراصل صرف اتنی بات ہے کہ حضرت عمر احادیث کے جمع کرنے کے برخلاف تھے اور اُن کو یقین تھا کہ حدیثوں کا ٹھیک ٹھیک طور پر جمع ہونا نہایت مشکل ہے۔ اور اُن کے جمع ہونے سے بلاشبہ ایسی ہی خرابی پیدا ہوگی۔ جیسی کہ یہود کے ہاں پیدا ہوگئی۔

اختلاف روایات کے اسباب یعنی انسان کے حافظہ کا عالم ضعف۔ غلطیاں، مبالغے، تعصب حمایت اور نیز وہ تفرقہ اور فساد جو بعد شہادت حضرت عثمانؓ کے اسلام میں پھیل گیا تھا۔ سرولیم میور نے بیان فرمایا ہے۔ کہ اُس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اسی صدی میں روایات نے جڑ پکڑی اور مستقل شکل حاصل کی۔ اختتام صدی پر روایات موجودہ کی باقاعدہ تلاش شروع ہوئی اور باضابطہ لکھی گئیں۔ وہ نمونہ جو اُس وقت ڈھالا گیا تھا کم سے کم اپنی مخصوص ہیئت پر برابر چلا آیا۔"

ہم کو اس مقام پر اختلاف روایات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم اُس کو اوپر بیان کر چکے ہیں۔ لیکن ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب آتا ہے کہ اگرچہ سرولیم کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں۔ بایں ہمہ انھوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے۔ جس میں ضعیف ترین روایات منقول ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے اور نیز مطابق اپنے عقیدہ کے اُن کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور بانی اسلام کی نسبت معترض ہوتے۔ تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں جنھوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اسی امر ضروری کی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوش گواری سے ہضم کر جاتے ہیں اور دوسروں کی نسبت عجیب و غریب پیرایہ میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔

اگر سرولیم میور کی محض یہ غرض ہے کہ روایات اسلام کا لغو اور غیر معتبر اور موضوع ہونا لوگوں کو

معلوم ہو جائے تب بھی مذہب کی کچھ بے حرمتی اور ذلت نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس امر کو کچھ چھپایا نہیں رکھا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر کتابیں حدیث صحیحہ اور غیر صحیحہ میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور ان کی صحت اور درجہ اعتبار کے جانچنے کے لئے اصول و قواعد اور سخت امتحانات قرار دیئے گئے ہیں۔ جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گنہگار ٹھیرائے گئے ہیں اور اسی قسم کی اور باتیں اسی غرض سے کام میں لائی گئی ہیں۔ ہم اس بات کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اس باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے۔ مذہب عیسوی میں موضوعہ کتابوں اور بے شمار رسالوں کی وجہ سے کتب دینی جو روزانہ ہر کلیسا میں مستعمل ہوتی تھیں بہت بڑھ گئی تھیں اور دین دار لوگوں کے باہم بے انتہا مناقشوں اور قضیتوں کی باعث ہو گئی تھیں جب کہ قسطنطین اعظم نے دین عیسوی قبول کیا تو منجملہ اور اغراض کے جن کے واسطے اُس نے مجلس نیس (نسیا) کو ۳۲۰ء میں جمع کیا تھا۔ ایک یہ بھی غرض تھی کہ صحیح اور موضوع اناجیل میں تمیز کی جائے۔

والٹیر لکھتا ہے کہ" عیسائیان سابق اس بات سے مورد نفرین تھے کہ انھوں نے عیسیٰ کے نام پر صنعت ترشیح میں چند اشعار لکھ کر ایک پُرانی کاہنہ کی طرف منسوب کئے تھے اور حضرت عیسیٰ کی طرف سے بادشاہ اڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جس زمانہ میں کہ کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا حضرت مریم کے خطوط۔ سنیفا کی جانب سے پلوس کے نام کے خطوط۔ پلاط کے خطوط اور افعال مصنوعی اناجیل۔ جھوٹے معجزات۔ اور اور ہزاروں جعل سازیاں اور فریبوں کے الزامات بھی لگائے تھے یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔

وہ اہم مسئلہ درباره الوہیت مسیح جس نے کہ کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی مجلس نیس میں۔ جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی طے ہوا۔ اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے مسیح کی الوہیت سے انکار کیا۔ اور اس پر حجت کی لیکن سب سے سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیح خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ خدائے پدر سے پیدا ہوتے ہیں (نعوذ باللہ منہا) ایرس جو منجملہ اٹھارہ بشپہائے معترضین کے تھا فرقہ یونیٹیرین (موحدین) کا سرغنا ہوا۔ یعنی اُن لوگوں کا جو حضرت مسیح کی الوہیت کے منکر تھے۔ اور اسی بنا پر بالزام بے دینی جلاوطن کیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس کو قسطنطنیہ میں پھر بلا لیا اور اپنے عقائد کو فوقیت بخشنے میں کامیاب ہوا۔ حتیٰ کہ تمام صوبجات روم میں اُنھوں نے رواج پایا۔ باوجود اس کے کہ اس کے سخت مخالف آثاناسیوس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا از حد کوشش کی۔ اسی مجلس میں

کی کارروائی کے تتمہ میں مرقوم ہے کہ آبائے کلیسا نے اس امر کی تحقیق میں نہایت حیران اور ششدر ہو کر کہ توریت اور انجیل میں کونسے صحیفے صحیح اور کونسے غیر صحیح ہیں اُن سب کو بلا تمیز و لحاظ ایک قربان گاہ پر رکھ دیا سُنا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی جن میں اُن امور کی جو روح القدس کے بارہ میں مجلس نیس نے غیر منفصل چھوڑ دیئے تھے تشریح کی گئی تھی اور اس موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس بلاشک وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اُس نے احترام حاصل کیا ہے ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بمقام افیس مجتمع ہوئی تھی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریم بلاشک اُم اللہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ حضرت عیسٰی میں دو صفتیں تھیں اور ایک وجود۔ نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ اختلاف و تفرقہ عظیم واقع ہوا، جس کے بعد شہر روم میں تخمیناً انتیس خوں ریز مشاجرات کرسی پوپ کے حصول کے واسطے واقع ہوئے۔"

سر ولیم میور اُن مضرت آمیز اسباب کا ذکر کر کے جو خلیفہ مامون الرشید کی متعصبانہ عمل داری میں اپنی کارروائی کر رہے تھے اور یہ بیان کر کے کہ "روایتوں کا عام طور سے جمع ہونا ایسے ہی اسباب کی وجہ سے عمل میں آیا" یہ فرماتے ہیں کہ "خراب اور بے اصل مادہ کی کثرت خود مسلمانوں ہی کی چھان بین کے اندازہ سے قیاس کی جا سکتی ہے اُن کا قول ہے کہ اس باب میں ڈاکٹر ویل کی رائے قابل اعتماد اور تعریف ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ ایسے وقت میں روایات زبانی پر اعتماد کرنے نے جب کہ وہ حافظہ سے منتقل ہوتی آئی تھیں اور ہر روز نئے نئے اختلافات اسلام میں پیدا کرتی تھیں اختراع اور بناوٹ کے لئے ایک وسیع رستہ کھول دیا جب کہ کسی دینی یا دنیوی معاملہ کی حمایت کی ضرورت ہوتی تو اس سے سہل کوئی بات نہ تھی کہ پیغمبر صاحب کی کسی زبانی روایت کا حوالہ دیتے۔ اس قسم کی روایات کی اصلیت اور جس طور سے کہ محمد (صلعم) کے نام کو تمام دروغ اور بیہودہ ممکنات کی تائید میں بدنام کرتے تھے اس امر سے صاف صاف ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ بخاری نے جو علما سے روایات حاصل کرنے کے واسطے ملکوں ملکوں پھرا تھا بہت سے برسوں کی چھان بین کے بعد اس بات پر قرار پکڑا کہ منجملہ چھ لاکھ روایات کے جن کا اُس زمانہ میں مروج ہونا تحقیق ہوا تھا صرف چار ہزار معتبر اور مستند تھیں اور منتخب تعداد میں سے یورپین محقق کم سے کم نصف کے خارج کرنے پر بلا دسواس مجبور ہوتا ہے۔ اُس زمانہ کے بالیاقت جامعین کے تجربہ سے بھی یہی منکشف ہوتا ہے۔ اسی طرح ابوداؤد کی نسبت بھی سُنا گیا ہے۔ کہ پانچ لاکھ روایتوں میں سے جو اُس نے

جمع کی تھیں...... چھیانوے ہزار کو صرف مستند قرار دیا۔"

اس جگہ ہم اس بات پر کہ تعداد روایات خارج شدہ کی کیا اصلیت ہے اور کس اصول پر خارج شدہ روایتیں خارج کی گئی تھیں اور آیا اس سے اُن کل روایتوں خارج شدہ کا موضوع ہونا لازم آتا ہے یا نہیں، بحث کرنی نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم ڈاکٹر ویل اور سرولیم میور دونوں کی رائے سے متفق ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم اس بات کا بھی افسوس کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ویل کے اس بیان کے بموجب کاربند ہونے کے بجائے کہ" چار ہزار روایات منتخبہ بخاری میں سے یورپین محقق کم سے کم نصف کے خارج کرنے پر بلا وسواس مجبور ہوتا ہے" یورپین محققوں نے جن میں سرولیم میور سب سے نمبر اول ہیں۔ بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کرکے اپنی تصنیفات کو واقدی شامی مولود نامہ۔ معراج نامہ اور کتابوں پر جن میں بجز بیہودہ باتوں کے اور کچھ نہیں ہے اور جن کو خود مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے مبنی کرنے کی جانب مائل ہوتے ہیں۔

سرولیم میور بیان کرتے ہیں کہ" جامعین نے گو کہ وہ غیر معتبر روایات کے خراج میں بے دھڑک تھے روایات معتبر کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کا برتاؤ نہیں کیا"۔ اس کی تشریح وہ اگلے جملہ میں اس طرح پر کرتے ہیں کہ" مضمون روایت سے کچھ بحث نہ تھی بلکہ محض نام ہی جن کی طرف وہ روایت منسوب ہوتی تھی، مسئلہ اعتبار کو حل کر دیتے تھے۔ اگر یہ نام الزام سے مبرّا ہوتے تو روایت مستند قرار پاتی۔ کوئی بیہودگی کیسی ہی صریح کیوں نہ ہو کسی روایت کو جو اس امتحان میں پوری ہوتی روایات مستندہ کے رتبہ سے خارج نہیں کر سکتی تھی۔

سرولیم میور کا یہ بیان ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے مگر انھوں نے اُس موضوع سے جس پر جامعین حدیث نے حدیثوں کو جمع کیا غور نہیں کی۔ جس وقت کہ حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اور اول اول ان کے جمع ہونے کا کام شروع ہوا تو پہلا کام جامعین حدیث کا یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو صرف اُن کے راویوں کی معتبری تحقیق کر کے اُن حدیثوں کو قلم بند کر لیں بشرطیکہ بادی النظر میں کوئی ایسا امر جو اس حدیث کی صحت میں مخل ہو موجود نہ ہو۔ دوسرا کام اُن حدیثوں کی معتبری اور نامعتبری کا بلحاظ اُن کے مضامین کے تھا اس کا وقت اُن جامعین کو نہیں ملا تھا کیونکہ پہلا ہی کام جو انھوں نے کیا وہی نہایت سخت اور مشکل تھا۔ اگرچہ پچھلے لوگوں کے دلوں میں اُن بزرگوں کی جنھوں نے حدیثوں کو باعتبار راویوں کے جمع کیا تھا۔ ایسا ادب اور ایسی عظمت جم گئی تھی کہ اکثروں نے اُس دوسرے کام کی نسبت جو باقی رہا تھا توجہ نہ کی۔ لیکن بہت سے علمار محققین ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس

دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے اور اُس کے لئے قواعد بھی منضبط کئے ہیں اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں اور بلحاظ مصنف حدیث کی معتبری اور نامعتبری قرار دینے کو فن درایت سے موسوم کیا ہے۔ قطع نظر اس کے اس وقت ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ بلحاظ اُصول درایت کے جس کتاب کی حدیث پر چاہے اُس پر معتبر اور نامعتبر ہونے کی بحث کرے اور جس کو نامعتبر سمجھے اُس کو نہ مانے۔

سر ولیم میور اپنے بیان کے ضمن میں راویوں کے ایمان دار ہونے کو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اُس کے یہ بھی کہتے ہیں کہ موضوع روایتیں معتبر روایتوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں اور بغرض تمیز مابین صحیح اور موضوع روایتوں کے اس طرح پر لکھتے ہیں کہ "امور جن پر کسی روایت کے اعتبار کا غلبہ بالخصوص منحصر ہونا چاہیے۔ یہ معلوم ہوتے ہیں کہ آیا مسلمانوں میں بالعموم مضمون مروی کی جانب رعایت اور طرف داری پائی جاتی تھی یا نہیں۔ دوم یہ کہ آیا راویوں میں کسی خاص غرض یعنی تعصب یا کسی عام غرض کے آثار پائے جاتے ہیں یا نہیں اور سوم یہ کہ آیا راوی کو واقعات کے علم کا بذاتِ خود موقع ملا تھا یا نہیں"۔

ان تین قواعد معینہ سر ولیم میور میں اخیر کے دو قواعد کے تسلیم کرنے میں ہم کو کچھ کلام نہیں ہے کیونکہ یہ دو بھی منجملہ انھیں قواعد کے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ قاعدہ اول کی نسبت ہم حیران ہیں کہ بغیر زیادہ کسی تفصیل کے ہم اس کو اس بات کے لئے کہ آیا فلاں حدیث صحیح ہے یا غلط اور کس قدر صدق یا کذب اُس میں موجود ہے کس طرح پر قاعدہ قرار دیں۔

اس حیرانی کے رفع کرنے کو ہم نے اُس تفصیل کی طرف رجوع کی جو اُس کی نسبت سر ولیم میور نے تحریر فرمائی ہے۔ وہ مذکورہ بالا امر پر دو طرح سے نظر ڈالتے ہیں یعنی زمانہ کے لحاظ سے اور مضمون کے لحاظ سے۔ زمانہ کو وہ چند حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا حصہ اُس وقت تک شمار کرتے ہیں "جب تک کہ محمد (صلعم) کی شہرت شروع نہیں ہوئی تھی" وہ بیان کرتے ہیں کہ "پیغمبر صاحب کے اُس زمانہ کے حالات کے شاہد یا تو عمر میں اُن سے چھوٹے یا اُن کی برابر ہیں اس واسطے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات یا اُن کی طفولیت کے حالات کے باب میں اُن کی شہادت معتبر نہیں ہے۔ اور اُن کی نوجوانی کے سوانح بھی اُن میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہد کئے ہوں گے"۔

بظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے اول یہ فرض کر لیا ہے جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "روایت کی سب سے پہلی ترویج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا" مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں اور

ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی۔ دوم یہ کہ صاحب موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کرلیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کی حیات میں وفات پائی تھی یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا اُن کے ہم عمر تھے یہ امر تاریخی واقعہ کے برخلاف ہے اور صحابہ بھی بلحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور نیز اُن کے بچپن اور جوانی کے حالات کو بچشم خود مشاہدہ کیا اور نیز اُن کو صحیح صحیح یاد رکھ کر اوروں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں۔

علاوہ اس کے کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہانِ معاینہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کرلیا ہے۔ سراسر انحراف کرنا ہے۔ گواہانِ معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا عمل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے۔ اور کسی واقعہ کے صدق یا کذب کو ضرور قائم کر دیتے ہیں۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کی نسبت کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق کرے فی الفور تسلیم کرلیا جاتا ہے اور صورت ثانی میں تواتر اور کثرت راویوں کی اُس کی صحت کو بتلاتے ہیں۔ پس جناب پیغمبر خدا کے کسی زمانہ کے واقعات کی تصدیق میں ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتے کہ اُن مسلمہ قوانین کی شہادت کے بموجب جو انسان کے قوائے عقلی نے بدون لحاظ کسی مذہب کے مرتب کئے ہیں گواہ کے بیان صدق کا امتحان کریں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ "اگر کسی واقعہ کی جانب توجہ بالتخصیص مائل نہ ہو تو اُس کی نسبت کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی اور بہت سے برسوں کے گذرنے کے بعد ایسے گواہ سے زیادہ سے زیادہ یہ توقع ہوسکتی ہے کہ واقعات قابل الذکر کا عام طور پر بیان کردے"۔ اس اصول کو صاحبِ موصوف جناب پیغمبر کی سوانح عمری کے اُس زمانہ تک جب کہ بقول اُن کے جناب پیغمبر خدا ایک فریق کے سرگروہ ہوگئے۔ نہایت شدومد سے مستعمل کرتے ہیں اور اُس کو اُس زمانہ کے پیشتر تک وسعت دیتے ہیں جب کہ بقول اُن کے "آنحضرت نے علانیہ دعوئے نبوت کیا تھا اور شرک سے ممانعت کی تھی اور اہالیانِ مکہ سے کھلم کھلا لڑائی اختیار کی تھی"۔ اور اس بیان سے یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ کہ جناب پیغمبر خدا کے اُن حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب تک کہ اُنھوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے۔

سر ولیم میور کے اس فرضی اصول کو جو اُنھوں نے اپنی ذہانت سے اختراع کیا ہے ہم بلا مواس

مان لیتے اگر ہم اس تردد میں نہ ہوتے کہ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی کی اس سوانح عمری کی نسبت جو اُن کی شہرت حاصل کرنے سے پیشتر وقوع میں آئی تھی کیا کیا جائے گا۔ کیا "ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی" اور کیا اُن حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا۔

ہم کو جناب پیغمبر خدا کے اُس زمانہ کی سوانح عمری کی بہ نسبت حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی کے حالات قبل از پیدائش اور وقت پیدائش اور اُن کے ایام طفولیت اور ایام جوانی کی سوانح عمری سے زیادہ غرض ہے۔ کیونکہ ہم جناب پیغمبر خدا کے کسی واقعہ ماقبل ولادت اور اُن کی کسی سوانح عمری ایام طفولیت کو ایسا نہیں پاتے جس کی صحت پر آنحضرت کی نبوت کی صحت کا مدار ہو۔ ہم کو آنحضرتؐ کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرت کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو۔ مگر حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی کے باب میں ایسا نہیں ہے ان دونوں انبیاء علیہم السلام کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت اُن کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے۔ ہم کو کس طرح اس امر کا یقین ہو سکتا ہے کہ وہ لامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا جس کو کہ تمام دنیا حضرت موسٰی کہتی ہے۔ اور ہم کو کس طرح اس بات کا یقین کلی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ بچہ جس کو ہم "کلمۃ اللہ اور "روح اللہ" اور عیسائی ابن اللہ کے خطابوں سے مخاطب کرتے ہیں اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ کے پیدا ہوا تھا داؤد کی نسل میں سے تھا اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسٰی مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں۔ ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور ایسا غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی چیز محال اور غیر ممکن کا ثابت کرنا ہے۔ اگر ہم سر ولیم میور صاحب کے اصول مندرجہ بالا کو صحیح تسلیم کرلیں تو ہم کو اندیشہ ہے کہ مبادا ہمارے مذہب کے حق میں مضر ہو کیونکہ ہم بھی حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی پر اعتقاد کامل رکھتے ہیں۔ چونکہ اس خیال سے ہمارا دل تھرّاتا ہے اس لئے ہم سے یہ امید ہرگز رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم ایسے ضرر رساں اصول کو منظور کریں۔

ہم کو صرف اس زبانی بیان سے کہ سر ولیم میور کا اصول صحیح ہے تسکین نہیں ہوتی بلکہ ہم زیادہ بحث کرکے اُس سقم کو دریافت کریں گے جس سے محمد رسول اللہ اور حضرت عیسٰی اور حضرت موسٰی کی زندگی کے غیر مشہور زمانہ کے حالات کو صحیح ماننے میں حیرانی ہوتی ہے"۔

یہ سقم جس کو ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں سر ولیم میور کے الفاظ "بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد" کے غیر مصرح ہونے سے واقع ہوا ہے اور ایسا کلام شہادت کے مسلمہ قوانین کے برخلاف ہے۔ اُن کو بجائے اُن الفاظ کے اس طرح کہنا چاہیے تھا کہ "ایسے زمانہ کے انقضا کے بعد جو ایک جائز تحقیق اور نتیجہ کی صحت کے احتمال کو غیر ممکن کر دے"۔ لیکن جناب پیغمبر خدا کے غیر مشہور زمانہ حیات کو اس قدر عرصہ نہیں گزرا تھا زمانہ رواج رؤایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کی پیدائش اُن کا بچپن اُن کا لڑکپن اور اُن کی نوجوانی دیکھی اور گو بقول سر ولیم میور کے "اُن کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات کو بالتخصیص ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا" تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دیدہ باتوں کو بھول گئے ہوں۔

برخلاف اس کے جب کہ "ایک بیکس یتیم بچہ۔ ایک محض بے اثر باشندہ" ایک ایسا شخص "جس کی نسبت تمام سکنائے مکہ میں سب سے کم یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اُن کے پڑوسیوں کی آنکھیں اُس کی طرف متوجہ ہوں" اور جب کہ ایسا غیر مشہور شخص ایسا عام چال چلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو اور جو اُس کے خاندان اُس کے ہمسایوں اور اُس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس اُس کا مقتضی ہے کہ ہر شخص جو اُس سے قربت رکھتا ہوگا اُس کی زندگی کے غیر مشہور زمانہ کے حالات اور خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا اور اُس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے اُن واقعات سے مقابلہ کرے گا" جو اُن سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ کے گواہ ہوں۔

سر ولیم میور آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ "ضرور یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جملہ صورتوں میں جن پر کوئی قاعدہ منجملہ قواعد متذکرہ صدر کے مؤثر ہوتا ہو صراحت ایک بڑی علامت بناوٹ کی ہوگی اور عیسائیوں کے لیے فن تحقیق اور تدقیق کے اسی قسم کے قانون کا اختیار کرنا بہتر ہوگا کہ ہر روایت جس کی ابتدا واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان کے بیہودہ ہے۔ اس سے ہمارا (یعنی عیسائیوں کا) بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے پیچھا چھوٹ جائے گا جن میں گٹھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی جزوی علامات نقلی کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہیں"۔

جب کہ ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سر ولیم میور کے مذکورہ بالا قواعد شہادت کے اصول مسلّمہ کی رو سے سراسر غلط ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جو نتیجہ اُن قواعد سے مستنبط کیا ہے کہ "صراحت ایک بڑی علامت بناوٹ کی ہوگی"۔ وہ بھی غلط ہے اور جناب پیغمبر خدا کی زندگی کے زمانہ غیر مشہور پر ٹھیک

ٹھیک صادق نہیں آتا ہے۔ اُن کا یہ بیان کہ" ہر روایت جس کی ابتدا، واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان کے بیہودہ ہے" قانون شہادت کے خلاف ہے۔ اگر وہ اس طرح پر کہتے کہ " وہ روایت جس کا راوی ۔ نہ یہ کہ جس کی ابتدا سے روایت۔ واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان بیہودہ ہے"۔ تو گنجائش تھی۔

وہ نتیجہ جو سر ولیم میور نے عیسائیوں کے فن تحقیق و تدقیق کے قانون کو روایات اسلام پر مستعمل کرنے سے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ" بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور الجھے ہوئے کلام کی علامتیں نقلی کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہیں"۔ لیکن ہم کو اس بات کے کہنے سے نہایت افسوس ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے اس استنباط میں بھی غلطی کی ہے کیونکہ یہ استنباط بھی شہادت کے مسلمہ قوانین کے سراسر خلاف ہے جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے۔ جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور جو امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن معلوم ہوتی ہیں تو اس بنا پر جو شبہ پیدا ہوتا ہے راوی کی نسبت ہوتا ہے کہ اُس کو کیونکر یہ تفصیل یاد رہی نہ مضمون روایت کی نسبت کیونکہ اس کا صحیح ہونا حیزِ امکان سے خارج نہیں ہے۔ اور اس لئے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جامعین روایات کو قواعد منضبطہ کے بموجب راوی کا چال چلن ہر طرح بے لوث ثابت ہو جائے اور اس کے حافظہ پر اعتماد ہو اور اُن واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کو بھی صحیح تسلیم کرنے میں کچھ شک و شبہ نہیں رہتا۔

اس کے بعد سر ولیم میور دوسرے زمانہ کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی ۔ وہ جداگانہ حصہ زمانہ کا جو محمد (صلعم) کے مشہور حصہ عمر اور فتح مکہ کے مابین حائل ہوتا ہے"۔ اُن کے کل بیان کا لب لباب یہ ہے کہ ہم اُن روایات کو معتبر تسلیم نہیں کر سکتے جن میں " بناوٹ کے افعال"۔ بے بنیاد اتہامات" اور مبالغہ آمیز الزامات جو محمد (صلعم) کے مخالفوں کی طرف عائد ہوتے ہیں منقول ہیں کیونکہ تمام کفار نے جو مکہ کے رہنے والے خواہ مدینہ کے رہنے والے تھے۔ سب نے اسلام قبول کر لیا تھا اور تمام یہودی عیسائی اور مشرکین نکال دیئے گئے تھے اور اب کوئی ایسا شخص وہاں نہ رہا تھا۔ جو ایک طرفہ بیان کی تردید کرتا اور چونکہ خود محمد (صلعم) کفار پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو اُن کی حمایت کی جرأت ہوتی اور اسی وجہ سے " اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے" اور مؤرخین ہمیشہ " اُس شہادت کی طرز پر جو اُن کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے

رہتے تھے۔

بغیر اس کے کہ ہم اس مقام پر بیان کو طول دیں یا یہ کہیں کہ صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء علیہم السلام اور اُن کے تبعین پر بھی صادق آتا ہے۔ خصوصاً اُس زمانہ پر جب کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی، ایمان داری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانونِ قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں، لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یک لخت محو ہو گئے ہوں اور وہ سب یک دل یک زبان ہو کر بد ترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو۔ یہی امر یعنی اُن واقعات کے گواہانِ معاینہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا اُن واقعات کے غلط بیانی کی عدم امکان پر دلالت کرتا ہے۔

ذاتی میلان پر غور کرنے کے وقت سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ "راوی کی اس ہوس نے کہ محمد صاحب کی صحبت میں بار پائے" کیونکہ اُن کے نام کے ساتھ "شرافت و حرمت مربوط تھی اور اُن کی دوستی حصول مدارج اور عزت کی باعث تھی" اور اس ہوس نے کہ محمد صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے علاقہ قریبہ حاصل کرے "کس واسطے کہ" وحی میں مذکور ہونا سب سے بڑی ممکن الحصول عزت شمار کی جاتی تھی خلاف فطرت واقعات کے اختراع یا مبالغہ پر "جرأت بڑھائی اور" روایات کے مبالغہ غلط بیانی اور نیز ایجاد کی باعث ہوئی۔"

جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرف دار بن جائے۔ تو اس میں کچھ چارہ نہیں۔ یہ کس طرح پر خیال میں آسکتا ہے کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر خدا کی سنت کا اتباع ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ رستہ ہے اور اُن کے احکام سے سرتابی کرنا ضلالت ابدی کا موجب ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبیؐ کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی، اور ریاکاری میں یک لخت مبتلا ہو گئے

ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہرطرح کی بداعمالیاں اور گناہ اُن سے سرزد ہوتے ہوں۔ بطور مثال کے کسی مذہب کو لو۔ ہندو مذہب کو۔ بدھ مذہب کو۔ دیگر مشرکین کے مذہب کو۔ یہودی مذہب کو۔ عیسوی مذہب کو مع اُس کے بہت سے فرقوں کیتھلک۔ پروٹسٹنٹ۔ یونی ٹیرین۔ ٹرینیٹیرین۔ ویزڈ لنز۔ بیپٹسٹ۔ جمپرز۔ مورمنز۔ وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی۔ صداقت۔ ایمان داری۔ راست بازی۔ سرگرمی۔ راسخ الاعتقادی۔ اور جان نثاری کی بُو پاؤ گے اور اپنے نبی کے احکامات اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے اُن کو خائف اور ہراساں پاؤ گے۔ ہم کو اپنے بیان کی تائید اور تصدیق کے لئے منجملہ ہزاروں مثالوں کے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کہ زید ابن ثابت سے حضرت ابوبکر نے قرآن کے اجزائے منتشرہ کو ایک جگہ جمع کرنے کا ارشاد کیا تو کچھ عرصہ تک زید ابن ثابت خوف کے مارے عالم سکوت میں رہے اور پھر جب ہوش و حواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکر سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے ملے ہوئے جوش سے استفسار کیا کہ ایسے کام کرنے کی جو خود پیغمبر خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا آپ کیوں کر جسارت کرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ذہن میں آسکتا ہے کہ اُن لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے اس قدر خوف اور اُن کی اس قدر تعظیم کرتے تھے اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے فی الفور ایسی برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل اور خوار کر دیا ہو اور ایسے گناہ عظیمہ اُن سے سرزد ہوئے ہوں۔

اسی طرح کی متعصبانہ طبیعت سے سر ولیم میور آگے چل کر یہ بیان کرتے ہیں کہ "ہم اس باب میں غیر مشتبہ شہادت رکھتے ہیں کہ رعایت اور جانب داری نے روایت پر ایک گہرا اور مستقل نقش کر دیا" اس کے بعد صاحب موصوف روایات موضوعہ کے رواج کے بہت سے اسباب کے ضمن میں یہ کہتے ہیں۔ کہ "قومی میلان عموماً تمام اسلام میں پھیلا ہوا ہے۔ اس وجہ سے زیادہ مضر ہے" اسی طرح "محمد صاحب کی توقیر اور اُن کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کرنے کی خواہش" سر ولیم میور کے نزدیک تمام قصوں کی ابتدا آنحضرت سے ہوئی تھی۔ کیونکہ سر ولیم میور بموجب اپنے اعتقاد کے ذرا بھی شک نہیں رکھتے کہ "اصلی واقعات ایک وہم ناک خیال کی رنگ آمیزی سے اس طرح آراستہ یا مبدل ہوگئے ہیں" اس کے بعد سر ولیم کہتے ہیں کہ "محمد صاحب کی توقیر کی اسی عام خواہش کی طرف اُن مسلّم معجزات کو بھی منسوب کرنا چاہئے۔ جن سے کہ اُن کی سب سے ابتدائی تاریخیں بھی مملو ہیں"۔ اس کے بعد سر ولیم میور نے اپنی بے انتہا خفگی اُن یہودی اور عیسائی عالموں پر ظاہر کی ہے جنھوں

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بشارات کا ذکر کیا ہے۔ سرولیم میور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کو بھی موضوع اور بے اصل اس وجہ سے بتلاتے ہیں کہ "پیغمبر صاحب اسلام کو حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں خیال کرنے کی خواہش اور شاید ثابت کرنے کی کوشش اُن کی حیات ہی میں شروع ہوئی تھی" بعد اس کے وہ کہتے ہیں کہ دلیل خلف سے بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے، یعنی وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں۔ اس لئے کہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہوگئیں کیونکہ اُن سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی۔" پھر وہ کہتے ہیں کہ "اس معاملہ میں حالت کی وجہ سے اس مقام کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گذشتہ کو ثابت کیا گیا۔ غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اب ہم کو اُن روایتوں کا جو اوائل میں ترک کردی گئی تھیں۔ کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا۔"

یہ خلاصہ ہے سرولیم کے ایک طول طویل بیان کا جس سے صریح ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے۔ جو اپنے بیانات اور اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے۔ اور جو اپنے مذاہب کے سوا اور مذاہب کی باتوں پر اور بالخصوص اُس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی نہ کسی طرح پر مضرت پہنچی ہو نہایت حقارت اور بے اصل شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے۔ تو ہم اُن سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دیں جو یہودی حضرت عیسٰی علیہ السلام اور اُن کے مذاہب کے بارہ میں استعمال کیا کرتے تھے۔

سرولیم میور فرماتے ہیں کہ "روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی تھیں کیونکہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں، عموماً بے اعتبار یا کل خارج ہوگئیں کیونکہ اُن سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی۔"

مگر یہ کیسا غلط بیان ہے اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ نہایت صاف اور بے لاگ زبان میں بیان کرتے ہیں گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلّم تاریخی واقعہ ہے اور شک و شبہ کی گنجائش نہیں رکھتا ہے اُس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ ہم نہایت دلچسپی سے اس معاملہ کو محض یہ کہکر دفعتہً طے کرتے ہیں کہ "اس معاملہ کی حالت کی وجہ سے اس مقام کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا... غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اب ہم کو اُن روایتوں کا جو اوائل میں ترک کردی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا۔" کیا اس طرح بے دلیل لانا ایک تعصب کا اثر نہیں ہے؟ معہذا

سرولیم میور کا یہ بیان بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوتے ہیں اور کوئی بات نہ خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں مگر ہم اُن کے اس تہتک آمیز اسباب کی طرف منسوب ہونے سے جو سرولیم میور صاحب نے بیان کئے ہیں اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ اختلافات محض اُن وجہوں سے عارض ہوئے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

ہم کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ عیسائی مصنفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف غلط اور بے جا اتہامات ہی نہیں لگائے ہیں، بلکہ بدوں کسی وجہ کے اپنے دل میں یہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر کے نام پاک پر اُنھوں نے دھبہ ثابت کیا ہے۔ کچھ بھی تعجب اور ملال نہیں ہوا ہے کیونکہ بے اصل بات کچھ بھی تعجب اور ملال کے لائق نہیں ہوتی۔ مگر ان بے اصل خیالات کی بنا اے اسپرنگر ایم ڈی سے معلوم ہوتی ہے جنھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ایک جرنل یعنی ایک رسالہ میں اور بعد ازاں اپنی کتاب بائی اوگرفی آف محمد[1] میں اس مضمون پر بحث کی تھی۔ سرولیم میور کی عمدہ خصلت اور لیاقتوں کی قدر سے جو ہمارے دل میں تھی اور اُن کی بہت بڑی مہارت مشرقی علم ادب کی وجہ سے ہم کو قوی اُمید ہوتی تھی وہ ڈاکٹر اسپرنگر کے یک طرفہ بیانات اور الزامات کی کماحقہ موشگافی کریں گے۔ اور ایک سنجیدہ تحقیقات اور منصفانہ رائے سے رسول عرب کی معصومیت کی حمایت کریں گے مگر افسوس کہ وہ امید کیسی بے اثر نکلی۔

ڈاکٹر اسپرنگر سورہ "والنجم" کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی اور اُن کو تسلیم کر لیا۔ اور جب کہ وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا۔ اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ کے حوالہ پر مبنی کرتے ہیں۔

سرولیم میور اس مضمون پر یوں بحث کرتے ہیں کہ "بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے جس سے محمد صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے وہ اپنے بیان کو واقدی اور طبری کے بیان پر مبنی کرتے ہیں اور خاص کر ایک دلچسپ عبارت جو اس قصہ کی اسناد کی تشریح میں مصنف مواہب لدنیہ نے لکھی ہے" جو اعتراضات و شکوک کو اسلام کی ضرر اور فساد عقیدہ کے خوف کی طرف منسوب کرتا ہے۔

---

[1] سوانح عمری محمد (مخدومی)

مصنف مواہب لدنیہ نے اپنی کتاب میں اس مضمون پر تمام مختلف روایتوں اور علماء کی رایوں کو لکھ دیا ہے اور اس لئے ہم اس مقام پر اُس کتاب کا بجنسہٖ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ اس کی کامل تشریح بھی کریں گے اور اس غرض سے کہ مطلب سمجھنے میں آسانی ہو مواہب لدنیہ کی عبارت کو جداگانہ دفعات میں منقسم کرتے ہیں۔

وقدم نفر من مهاجرة الحبشة حين قرأ عليه السلام والنجم اذا هوى حتى بلغ افرأيتم اللات والعزى ومناة الثالثة الاخرى القى الشيطان فى امنيته اى فى تلاوته تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى فلما ختم السورة سجد صلى الله عليه وسلم وسجد معه المشركون لتوهمهم انه ذكر الهتهم بخير وفشى ذلك بالناس واظهره الشيطان حتى بلغ ارض الحبشة ومن بها من المسلمين عثمان ابن مظعون واصحابه وتحدثوا ان اهل مكة قد اسلموا كلهم وصلوا معه صلى الله عليه وسلم وقد امن المسلمين بمكة فاقبلوا سراعا من الحبشة۔

اول :- چند لوگ حبش کے ہجرت کرنے والوں میں سے آئے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی " والنجم اذا ھوی " (قسم ہے ستارہ کی جب نیچے آتا ہے) یہاں تک کہ جب آنحضرت اس آیت پر پہنچے " افرئیتم اللات والعزیٰ ومنات الثالثۃ الاخریٰ " (کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ کو اور پھر منات کو جو تیسرا ہے) تو شیطان نے اُن کی تلاوت میں یہ الفاظ ڈال دیئے " تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ " (یہ بڑے بُت ہیں اور ان کی شفاعت کی اُمید ہے) پس جب آنحضرت نے سورہ ختم کی تو سجدہ کیا۔ مشرکوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا کیونکہ اُن کو یہ گمان ہوا تھا کہ رسول اللہؐ نے اُن کے خداؤں کو بھی بھلائی سے یاد کیا۔ اور یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور شیطان نے اُس کو مشہور کیا۔ یہاں تک کہ ملکِ حبش میں اور اُن مسلمانوں میں جو وہاں تھے یعنی عثمان بن مظعون اور اُن کے ساتھیوں میں یہ خبر عام ہوئی۔ اُن لوگوں نے آپس میں گفتگو کی کہ مکہ کے سب لوگ اسلام لائے اور آنحضرتؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور مسلمانوں کو مکہ میں امن ہو گیا۔ وہ لوگ بڑی تیزی سے حبش سے روانہ ہوئے۔

ولما تبين المشركين عدم ذلك رجعوا الى اشد ما كانوا عليه۔

دوم :- اور جب مشرکین کو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے تو پہلے سے زیادہ سختی پر مائل ہوئے۔

سوم :- قاضی عیاض نے "شفاء" میں اس قصہ پر اور اُس کی اصل کے سُست ہونے پر کافی و شافی گفتگو کی ہے۔ لیکن اُس کے بعض حصوں پر گرفت کی گئی ہے۔ جیسا کہ آتا ہے۔

وقد تکلم قاضی عیاض رضہ فی الشفاء علی ھذہ القصة وتوھین اصلھا بما یشفی ویکفی لکن تعقب فی بعضہ کما سیاتی۔

چہارم :- امام فخرالدین رازی نے کہا ہے۔ جیسا کہ مَیں نے ان کی تفسیر کا ملخص سمجھا ہے۔ کہ یہ قصہ جھوٹ ہے اور گڑھا ہوا ہے۔ اُس کا بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ "آنحضرتؐ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں بولتے۔ وہ نہیں ہے مگر وحی جو کہ بھیجی گئی" اور خدا نے کہا۔ "ہم تم کو پڑھا دیں گے سو تم نہ بھولو گے"۔

وقال الامام فخرالدین الرازی ما لخصتہ من تفسیرہ ھذہ القصة باطلة وموضوعة لا یجوز القول بھا قال اللہ تعالیٰ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی وقال اللہ تعالیٰ سنقرئک فلا تنسیٰ۔

پنجم :- بیہقی نے کہا یہ ثابت نہیں ہے روایت کی رو سے۔ پھر بیہقی نے اس بات پر گفتگو کی ہے کہ اس قصہ کے راوی مطعون ہیں۔

وقال البیھقی ھذہ غیر ثابتة من جھة النقل ثم اخذ یتکلم فی ان رواة ھذہ القصة مطعونون۔

ششم :- نیز بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ نجم پڑھی اور اُن کے ساتھ مسلمانوں اور مشرکوں اور آدمی اور جن نے سجدہ کیا۔ اس روایت میں غرانیق کی حدیث نہیں ہے۔ بلکہ یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مروی ہے مگر کسی میں غرانیق کی حدیث مذکور نہیں ہے۔

وایضاً فقد روی البخاری فی صحیحہ انہ علیہ السلام قرأ سورة النجم وسجد معہ المسلمون والمشرکون والانس والجن ولیس فیہ حدیث الغرانیق بل روی ھذا الحدیث من طرق کثیرة ولیس فیھا البتة حدیث الغرانیق۔

ہفتم :- اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو شخص اس بات کو جائز رکھے کہ رسول اللہ نے بتوں

ولا شك ان من جوز على الرسول تعظيم الاوثان فقد كفر لان من المعلوم بالضرورة ان اعظم سعيه كان فى نفى الاوثان ولو جوزنا ذلك ارتفع الامان عن شرعه وجوزنا فى كل واحد من الاحكام والشرائع ان يكون كذلك ويبطل قوله تعالى يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته فانه لا فرق فى العقل النقصان فى الوحى والزيادة فيه فبهذه الوجوه عرفنا على سبيل الاجمال ان هذه القصة من وضع الزنادقة لا اصل لها انتهى۔

کی تعظیم کی تو وہ کافر ہے۔ کیونکہ یہ تو بداہۃً معلوم ہے۔ کہ آنحضرت کی بڑی کوشش بتوں کا مٹانا تھا۔ اور اگر ہم اس بات کو جائز رکھیں تو شریعت پر کچھ اعتبار نہ رہے گا۔ اور ہم کو کل احکام و شریعتوں میں ایسا ہی جائز خیال کرنا لازم آئے گا۔ اور خدا کا یہ قول باطل ہو جائے گا کہ "اے رسول خدا کی طرف سے جو تجھ پر اُتارا گیا ہے اُس کو لوگوں کو پہنچا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے اپنی رسالت کو نہیں پہنچایا"۔ کیونکہ کام کے اعتبار سے وحی کے گھٹانے میں اور زیادہ کر دینے میں کچھ فرق نہیں ہے۔ پس ان دلیلوں سے ہم نے مجملاً جان لیا کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ قصہ زندیقوں کے موضوعات سے ہے جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

ہشتم:- اور ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی ایک اصل ہے۔ کیونکہ اُس کو روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم وطبری و ابن المنذر نے متعدد طریقوں سے شعبہ سے اُنھوں نے ابو بشر سے، اُنھوں نے سعید ابن جبیر سے اور اسی طرح ابن مردویہ اور بزاز اور ابن اسحٰق نے سیرت میں اور موسٰی ابن عقبہ نے مغازی میں اور ابو معشر نے سیرت میں جیسا کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

وليس كذلك بل لها اصل فقد اخرجها ابن ابى حاتم والطبرى وابن المنذر من طرق عن شعبة عن ابى بشر عن سعيد بن جبير وكذا ابن مردويه والبزار وابن اسحاق فى السيرة وموسى ابن عقبة فى المغازى وابو معشر فى السيرة كما نبه عليه الحافظ عماد الدين ابن كثير وغيره۔

نہم:- لیکن کہا ہے کہ اُس کے سب طریقے مرسل ہیں اور یہ کہ وہ صحیح طور سے مستند نہیں کی گئی ہے۔ اور اس پر اعتراض کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔

لكن قال ان طرقها كلها مرسلة وانه لم يرها مسندة من وجه صحيح

وھذا متعقب بما سیاتی۔

دہم :۔ اور اسی طرح اُس کے اصل کے ثابت ہونے پر شیخ الاسلام اور حافظ ابوالفضل عسقلانی

کذ انبه علی ثبوت اصلها شیخ الاسلام والحافظ ابوالفضل العسقلانی فقال اخرج ابن ابی حاتم والطبری وابن المنذر من طرق عن شعبة عن ابی بشر عن سعید ابن جبیر قال قرأ رسول الله صلی الله علیه وسلم بمکة والنجم فلما بلغ افرئیتم اللات والعزی ومنات الثالثة الاخری القی الشیطان علی لسانه تلك الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی فقال المشرکین ما ذکر الهتنا بخیر قبل الیوم فسجد وسجد فنزلت هذه الآیه وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیة الآیه۔

نے تنبیہ کی ہے سو کہا کہ روایت کیا ہے ابن ابی حاتم اور طبری اور ابن المنذر نے متعدد طریقوں سے شعبہ سے انھوں نے ابو بشر سے اُنھوں نے سعید بن جبیر سے کہا اُنھوں نے پڑھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں "والنجم" کو پس جب پہنچے آیت پر "افرئیتم اللات والعزی ومنات الثالثة الاخریٰ" شیطان نے آنحضرتؐ کی زبان پر یہ الفاظ ڈال دیئے "تلك الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجیٰ" پس کہا مشرکوں نے آج سے پہلے کبھی محمدؐ نے ہمارے خداؤں کو بھلائی سے یاد نہیں کیا تھا۔ پھر آنحضرت نے سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔ پس یہ آیت اُتری وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیة۔ اخیر آیت تک۔

یازدہم :۔ اور روایت کیا ہے اس کو بزار نے اور ابن مرویہ نے امیہ بن خالد کی روایت

واخرجه البزار وابن مردویه من طریق امیه بن خالد عن شعبة فقال فی اسناده من سعید ابن جبیر عن ابن عباس فیما احسب ثم ساق الحدیث وقال البزار لا یروی متصلا الا بهذا الاسناد تفرد بوصله امیه بن خالد وهو ثقة مشهور۔

سے امیہ نے شعبہ سے۔ پس کہا "اس کی اسناد جہاں تک میں جانتا ہوں سعید ابن جبیر کی روایت ابن عباس سے ہے۔" پھر حدیث بیان کرنے لگے اور بزار نے کہا۔ یہ حدیث اتصال کے ساتھ صرف اسی اسناد سے مروی ہے اس کے وصل کرنے میں امیہ بن خالد متفرد ہے اور وہ مشہور ثقہ ہے۔

دوازدہم :۔ اور کہا کہ یہ روایت کی گئی ہے کلبی کے طریقہ سے اُس نے ابوصالح سے

وقال انما یروی هذا من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس انتهى والکلبی متروک لا یعتمد علیه۔

اُس نے ابن عباس سے انتہیٰ۔ اور کلبی چھوڑ دیا گیا ہے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

سیزدہم :۔ اور اسی طرح اُس کو نحاس نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے۔

وکذا اخرجه النحاس بسند آخر فیه الواقدی وذکرها ابن اسحاق فی السیرة مطولا واسند عن محمد ابن کعب وکذلک ابن عقبة فی المغازی عن ابن شهاب عن الزهری وکذا ابی معشر فی سیرته له عن محمد ابن کعب القرظی ومحمد ابن قیس اورده من طریقه الطبری واورده ابن ابی حاتم من طریق اسباط عن السدی ورواه ابن مردویه من طریق عباد ابن صهیب عن یحیی ابن کثیر عن الکلبی عن ابی صالح وعن ابی بکر الهذلی وایوب عن عکرمة وسلیمان التیمی عن من حدثه ثلاثتهم عن ابن عباس واورده الطبری من طریق العوفی عن ابن عباس ومعناهم کلهم فی ذلک واحد وکلها سوی طریق سعید ابن جبیر اما ضعیف واما منقطع لکن کثرة الطرق تدل علی ان للقصة اصلا۔

جس میں واقدی ہے اور اُس کو ابن اسحاق نے کتاب سیرت میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اور اُس کو محمد بن کعب سے اسناد کیا ہے اور اسی طرح ابن عقبہ نے مغازی میں ابن شہاب سے اُس نے زہری سے اور اسی طرح ابومعشر نے سیرت میں محمد بن کعب قرظی کے طریقہ سے و محمد بن قیس کے طریقہ سے اور طبری اُسی کے طریقہ سے لایا ہے۔ اور ابن ابی حاتم لایا ہے اسباط کے طریقہ سے وہ سدی سے۔ اور ابن مردویہ نے اُس کو روایت کیا ہے طریقہ عباد بن صہیب سے وہ یحییٰ بن کثیر سے وہ کلبی سے وہ ابوصالح سے اور ابوبکر ہذلی سے اور ایوب سے وہ عکرمہ سے اور سلیمان تیمی نے اُن تین شخصوں سے جنھوں نے ابن عباس سے روایت کیا۔ اور طبری اُس کو عوفی کے طریق سے لایا ہے اور وہ ابن عباس سے۔ اور سب کا مطلب ایک ہی ہے اور وہ سب طریقے سوائے سعید ابن جبیر کے طریقہ کے یا ضعیف ہیں یا منقطع ہیں۔ لیکن بہت سے طریقوں کا ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قصہ کی کچھ اصل ہے۔

چہار :۔ باوجود اس کے کہ اُس کے دو طریقے ہیں جو مرسل ہیں۔ اور ان کے راوی

مع ان لها طریقین اخریین مرسلین رجالهما علی شرط الصحیح احدهما ما

صحیح کی شرط کے موافق ہیں۔ ایک تو وہ جس کو طبری نے روایت کیا ہے۔ یونس بن یزید کے طریقہ سے یونس

اخرجه الطبری من طریق یونس ابن یزید عن ابن شهاب حدثنی ابو بکر ابن عبد الرحمن بن الحرث عن ابن هشام فذکر نحوه والثانی ما اخرجه ایضاً من طریق المعتمر ابن سلیمان وحماد ابن سلمة کلاهما عن داؤد ابن ابی هند عن العالیه۔

ابن شہاب سے کہ حدیث بیان کی مجھ سے ابو بکر بن عبد الرحمن بن الحرث نے بن ہشام سے پس اُسی طرح ذکر کیا اور دوسرے وہ جس کو طبری نے روایت کیا معتمر بن سلیمان کے طریقہ سے اور حماد بن سلمہ کے طریقہ سے دونوں نے داؤد بن ابی داؤد بن ابی ہند سے داؤد نے عالیہ سے۔

پانزدہم:- کہا حافظ ابن حجر نے جرأت کی ابن العربی نے اپنی عادت کے موافق پس کہا

قال الحافظ ابن حجر وقد تجرأ ابن العربی کعادته فقال ذکر الطبری فی ذلک روایات کثیرة لا اصل لها وهو اطلاق مردود علیه وکذا قول القاضی عیاض هذا الحدیث لم یخرجه اهل الصحة ولا رواه ثقة بسند سلیم متصل مع ضعف نقله واضطراب روایاته وانقطاع اسانیده وکذا قوله ومن حکیت عنه هذه القصة من التابعین والمفسرین لم یسندها احد منهم ولا رفعها الی صاحبه واکثر الطرق عنهم فی ذلک ضعیفة واهیة۔

کہ "ذکر کیا طبری نے اس باب میں بہت سی روایتوں کو جن کی کچھ اصل نہیں ہے۔" اور یہ مطلقاً حکم لگانا رد کیا گیا ہے اور اسی طرح قاضی عیاض قول کہ "اس حدیث کو صحت والوں نے نہیں روایت کیا۔ اس کے ساتھ اُس کی نقل کرنے والے ضعیف ہیں اور اُس کی روایتوں میں اضطراب ہے۔ اور اُس کی سندیں منقطع ہیں" اور اسی طرح قاضی عیاض کا یہ قول کہ تابعین و مفسرین میں سے جن سے اس قصہ کی حکایت کی گئی ہے کسی نے اُس کو سند کے ساتھ نہیں بیان کیا اور نہ کسی نے اُس کو کسی صاحب کی طرف مرفوع کیا اور اکثر طریقے جو اُن سے مروی ہیں ضعیف اور واہی ہیں۔

شانزدہم:- کہا کہ بزار نے بتادیا کہ یہ حدیث کسی ایسے طریقہ سے مروی نہیں ہے۔

قال وقد تبین البزار انه لا یعرف من طریق یجوز ذکره الا طریق ابی بشر عن سعید ابن جبیر مع الشک الذی

جس کا ذکر کرنا جائز ہو بجز اس طریقہ کے جو ابو بشر نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ لیکن باایں ہمہ اُس کے وصل میں شک واقع ہوا ہے۔ لیکن کلبی تو اُس سے روایت

وقع فی وصله واما الکلبی فلا یجوز الروایة عنه لقوة ضعفه ثم ردہ من طریق النظر بان ذلک لو وقع لارتد کثیر ممن اسلم قال و لم ینقل ذلک انتهی۔

کرنی جائز نہیں ہے بوجہ اُس کے ضعف کے۔ پھر اس حدیث کو عقلاً رد کیا ہے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے۔ حالانکہ یہ کہیں منقول نہیں۔ انتہیٰ۔

ہفت و ہم :- اور یہ سب باتیں قواعد حدیث کے مطابق نہیں چل سکتیں کیونکہ جب حدیث

وجمیع ذلک لا یتمشی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت مخارجها دل ذلک علی ان لها اصلا وقد ذکرنا ان ثلاثة اسانید منها علی شرط الصحیح وهی مراسیل یحتج بمثلها من یحتج بالمرسل وکذا من لا یحتج به لاعتضاد بعضها ببعض
(مواهب)

کے بہت سے طریقے ہوں اور اُن کے مخرج جداگانہ ہوں۔ تو اس بات کی دلیل ہوگی کہ اُس کی کچھ اصل ضرور ہے۔ اور ہم نے بیان کیا کہ تین سندیں اُن میں سے صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور وہ مرسل ہیں اُن مثل سے دلیل لاتے ہیں۔ وہ لوگ جو مرسل سے دلیل لاتے ہیں اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو مرسل سے نہیں دلیل لاتے۔ کیونکہ بعض طریقہ کو بعض سے تقویت ہوتی ہے۔

اس قصہ کی نسبت مصنف مواہب لدنیہ نے جو طول طویل بیان کیا ہے وہ اس مقام پر ختم ہوتا ہے۔ مگر مصنف مواہب لدنیہ نے اخیر کو جو یہ بات بیان کی ہے کہ "روایت کے متعدد مخرج ہونے سے اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ اُن کی کچھ اصلیت ہے اور تین سندیں جن کا سلسلہ آنحضرتؐ تک نہیں پہنچا۔ صحیح تصور کرنے کے لائق ہیں اور جو لوگ کہ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرتؐ تک نہ پہنچا ہو صحیح تصور نہیں کرتے وہ بھی اُس کے متعدد ہونے کے سبب اُس کو تسلیم کریں گے" یہ بیان اُس کا محض غلط ہے۔ جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں اور جو خود اُس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں اور روایات مختلفہ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعدد مخارج ہیں اور روایات مرسل یعنی جس کا سلسلہ آنحضرتؐ تک نہ پہنچا ہو گو اُس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو قابل سند نہیں ہے۔ جب تک کہ اُس کی تائید کے لئے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو اور نیز وہ روایت قرآن مجید کے مخالف نہ ہو۔ لیکن جب کوئی روایت مثل روایت مذکورہ بالا کے قرآن مجید کے احکام کے برخلاف ہو۔ اور جب کہ وہ جناب پیغمبر خدا کے اُن تمام حالات کے

برخلاف ہو جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصول سے اتفاق نہ رکھتی ہو اور معہذا ایسی مختلف اور مشتبہ ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے اور کہنے والا بھی محقق نہ ہوا ہو تو ایسی روایت ازروئے عقل اور انصاف کے کس طرح اُن قواعد میں داخل ہو سکتی ہے۔ جن میں اُس روایت کے داخل کرنے کو مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے۔

وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اُس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے۔ اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ سر ولیم میور اس قدر اعتماد کے ساتھ کس بنا پر یہ بیان فرماتے ہیں کہ "بظاہر ایک خوب مستند قصہ موجود ہے۔ جس سے محمد صاحب کا مشرکین مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کر لینا ثابت ہوتا ہے۔

اس روایت کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا اس کتاب کے پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔ خود مصنف مواہب لدنیہ نے جو روایتیں اس کی نسبت لکھی ہیں اُنھیں سے اُس کی صحت اور عدم صحت کا سراغ لگاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فقرہ "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی" ہرگز جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔ کیونکہ مصنف مواہب لدنیہ نے لکھا ہے جیسا کہ فقرہ دوم میں ہم نے نقل کیا ہے کہ "جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو اُنھوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی"۔

جناب پیغمبرؐ خدا کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گذرا ہے۔ یعنی جب آنجناب مکہ میں تشریف رکھتے تھے کہ کفار مکہ آنحضرتؐ کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور ہر طرح پر جو اُن کا وحشیانہ بغض ایجاد کر سکتا تھا۔ آنحضرتؐ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے۔ کفار مکہ جناب پیغمبرؐ خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ آنحضرتؐ کو نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے تھے اور جب کہ آنحضرتؐ خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان فرماتے تھے مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرتؐ سورہ نجم نماز میں پڑھ رہے تھے۔ کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی۔

یعنی جب کہ جناب پیغمبر خدا سورہ نجم پڑھ رہے تھے اور اس آیت پر پہنچے۔ افرئیتم اللات

والعزی ومنات الثالثۃ الاخری" تو مشرکین میں سے کسی نے اپنے بتوں کی تعریف کی غرض سے یہ جملہ کہا "تلك الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی" اور جب کہ جناب پیغمبر خدا نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی براہ برابری اپنے بتوں کو سجدہ کیا۔ مشرکین میں اس بات کا اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا۔ کچھ عجب نہیں کہ مشرکین سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا۔ مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا اور اس لئے آنحضرتؐ سے زیادہ دشمنی پر مستعد ہو گئے۔ اُس وقت کے مسلمان ہرگز یقین نہیں کر سکتے تھے۔ کہ آنحضرتؐ نے وہ جملہ فرمایا ہو۔ اور کہنے والا بھی متحقق نہیں ہوا۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ شیطان نے کہا تھا بعد اُس کے جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت پہنچی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا۔ جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا دے سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو۔ اُنھوں نے کہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے۔ کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیئے تھے۔ مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر صاحب نے وہ لفظ کہے تھے۔ بایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جناب رسولؐ خدا کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی نہج پر پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا۔ کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ اُن صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو۔ بلکہ نہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اُس کو بیان کیا ہے۔ یہی بے سر و پا روایتیں ہیں۔ جن کا ذکر طبری اور واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ وہ جملہ مشرکین میں سے کسی نے کہا تھا اُس کی تشریح خود مواہب لدنیہ کی ایک روایت میں مندرج ہے۔ جس کو ہم بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

اُس روایت کا ترجمہ یہ ہے "اور کہا گیا ہے کہ رسول اللہ جب اس آیت پر پہنچے: "

وقیل انه لما وصل الی قوله ومناة الثالثة الاخری خشی المشرکون ان یاتی بعدھا بشئی یذم الھتھم به فبادروا الی ذلك الکلام فخلطوه فی تلاوة النبی صلعم علی عادتھم	مناۃ الثالثۃ الاخری" تو مشرکوں کو ڈر ہوا کہ اس کے بعد کچھ ایسی چیز نہ پڑھیں جن میں اُن کے خداؤں کی مذمت بیان کریں۔ پس وہ لوگ فوراً یہ کلام کرنے لگے۔ اور رسول اللہ کی تلاوت میں ملا دیا۔ اپنی اس عادت کے موافق جیسا کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس قرآن کو سُومت

فی قولھم لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ ونسب ذلک الی الشیطان لکون الحامل لھم علی ذلک او المراد بالشیطان شیطان الانس

اور اس میں گڑبڑ کر دو۔ اور یہ بات منسوب ہو گئی شیطان کی طرف۔ کیونکہ اُس نے اُن لوگوں کو اس پر آمادہ کیا تھا یا شیطان سے مراد آدمیوں کے شیطان ہیں۔ (یعنی شریر آدمی)

(مواھب)

روایات کے معتبر قرار دینے کے لئے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "جب کسی روایت میں محمد صاحب کی تحقیر کے کلمات ہوں مثلاً بعد ہجرت کے اگر اُن کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا اُن کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو یا کارِ خیر میں ناکام ہونا یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشاءِ اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے۔ تو اُس کے تسلیم کرنے کو قوی دلیلیں ہیں۔ کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں اختراع کر لی جائیں یا مخترع ہو کر محمد صاحب کے متبعین میں رواج پا سکیں۔

درحقیقت کسی روایت کی صحت کے اثبات کا یہ ایک عجیب طرز ہے! کیا ہم کو اُن تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیئے۔ جن کو مخالفین اسلام نے موضوع اور مخترع کیا تھا۔ اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اس غرض سے نقل کیا ہے کہ اُن کی تردید کریں اور اُن کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں یا وہ کسی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں اور جن کی نسبت علمائے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں۔ دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بیہودہ روایتیں اور قصے آنحضرتؐ کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ نئے مذہب اور اُس کے بانی پر عیب لگائیں اختراع کر لئے تھے۔ پس اُن مذکورہ بالا وجوہات سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا کوئی دلیل اُن کی صحت کی نہیں ہو سکتی۔

تعجب ہے کہ سر ولیم میور اُن روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ "قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات اختراع کر لی جائیں یا مخترع ہو کر متبعین محمد صاحب میں رواج پا سکیں۔" یہی اُن کی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مخترع ہیں۔

سر ولیم میور ایک اور نیا قاعدہ ایجاد کرتے ہیں اور اس کا نام "تلوّن آمیز اختراع" قرار

دیتے ہیں اور اُس کی مثالیں اس طرح پر بیان کرتے ہیں کہ "مثلاً بعض گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب خضاب کیا کرتے تھے اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتلاتے ہیں۔ بعض صرف اسی قدر دعوئے نہیں کرتے کہ ہم نے بچشم خود اس امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی میں مشاہدہ کیا تھا۔ بلکہ اُن کی وفات کے بعد آپ کا بال جس پر کہ رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلا دیا تھا۔ اور بعض گواہ جن کو ایسے ہی عمدہ ذریعے واقفیت کے حاصل تھے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب نے کبھی خضاب نہیں کیا اور اُن کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اُن کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے سفید بال نہایت کم تھے کہ گنتی میں آسکتے تھے۔ اور آنحضرتؐ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں کیا۔ جو لوگ کہ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے اور اُن کا یہی بیان ہے کہ جو کہ سفید بال ہونے سے پہلے اکثر بال بھورے ہوجاتے ہیں۔ تو جن لوگوں نے اُن بھورے بالوں کو دیکھا خیال کیا کہ خضاب کئے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے آنحضرتؐ کا خضاب کرنا بیان کیا۔ اور اُسی بھورے بال کو دکھا کر استدلال کیا۔ خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے۔ بلکہ حدیث میں اُس شے کا ذکر ہے جس کو پیغمبر خدا بروقت غسل کے اپنے سر پر ملتے تھے پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اُن روایات کا اختلاف حالات مذکورہ بالا کے سبب قدرتی اسباب سے وقوع میں آسکتا ہے اُن کو دیدہ و دانستہ عیارانہ بناوٹ نہیں کہہ سکتے اور نہ اُن روایتوں کو اور نہ اُسی قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے۔ متناقض روایتیں کہہ سکتے ہیں۔

بعد اُس کے سر ولیم میور اس قسم کی ایک اور مثال پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "خاتم نبوی کے باب میں جس میں کوئی جانب داری مطالب خاندانی یا عقیدہ کے مضر نہ تھی نہایت متناقض روایتیں ہیں۔ ایک فریق کا قول ہے کہ اپنے مراسلات پر مہر لگانے کی ضرورت سے پیغمبر صاحب نے خالص چاندی کی ایک انگشتری بنوائی تھی۔ دوسرے فریق کا بیان ہے کہ خالد ابن سعید نے اپنے واسطے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی تھی اور محمد صاحب نے اُس انگوٹھی کو پسند کرکے اپنے پاس رہنے دیا۔ ایک تیسری روایت ہے کہ اُس انگشتری کو عمرو ابن سعد حبش سے لائے تھے۔ اور چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ ابن جبل نے اُس مہر کو اپنے لئے یمن میں کھدوایا تھا۔ بعض روایتوں میں منقول ہے کہ محمد صاحب اس انگشتری

کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے اور بعض میں لکھا ہے کہ اُلٹے ہاتھ میں۔ بعض روایات میں مندرج ہے کہ مہر کا رُخ اندر کی طرف رکھا کرتے تھے۔ اور بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف کو۔ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس مہر پر جملہ "صدق اللہ" منقّش تھا اور بعض سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ "محمد رسول اللہ" تھا۔ اب یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمد صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابوبکر اور عمر اور عثمان نے زیب انگشت کیا تھا اور عثمان کے ہاتھ سے چاہ غریس میں گر پڑی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نہ تو پیغمبر صاحب نے اور نہ کبھی ان کے خلفائے راشدین نے کوئی انگشتری پہنی تھی"۔

جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے بلاشبہ نہایت افسوس کے قابل ہے اور سر ولیم میور کی طبیعت سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان سر ولیم میور کا کہ "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں" محض غلط ہے اور جو دلیل اُس کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کی ہو؟ یا چاندی کی انگوٹھی علیٰحدہ اور خول والی انگوٹھی علیحدہ ہو۔ کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ ابن جبل والی پر جملہ "صدق اللہ" اور جناب پیغمبر خدا کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر جملہ "محمد رسول اللہ" کندہ ہو۔ کبھی آنحضرتؐ نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو اور کبھی اُلٹے ہاتھ میں۔ اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رُخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف۔ اُس انگوٹھی کو آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے۔ جس شخص نے اُن کو ایسی حالت میں دیکھا اُس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی۔ جو کہ سر ولیم میور نے غلطی سے یا دانستہ اُن سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری سے متعلق کیا ہے اس لئے اپنی دلیل میں بلا تفصیل بیان کرتے ہیں کہ وہی انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی۔ حالانکہ وہ صرف وہ انگشتری تھی جس پر جملہ "محمد رسول اللہ" کندہ تھا۔ پس اُن روایتوں میں سے کوئی روایت بھی متناقض نہیں ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی اور دل نشین نقوش و خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ اُن کو حجت و بُرہان کی صراطِ مستقیم سے منحرف کر دیا ہے اور ہر شے متعلق باسلام کو گو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو۔ شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل کیا ہے اور اس کو جعلسازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ ناموں سے بدنام

کرتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تجربہ کاری سے بحیثیت ایک اعلےٰ درجہ کے عالم ہونے کے یقینی اُمید تھی کہ اُن کو اس بات سے مطلع کروے گی کہ محض بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل و ثبوت نہ ہو۔ ہمیشہ اُسی مقصد کی خرابی کے باعث ہوتے ہیں جس کی حمایت کی اُن سے توقع کی گئی ہو۔

ہر صحیح دماغ اور ذی ہوش شخص کو اس بات کے معلوم ہونے سے ملال ہوگا کہ سر ولیم میور نے قواعد فن تصنیف سے اس قدر انحراف اختیار کیا ہے کہ دین اسلام پر الفاظ ذیل میں ایک بے جا اتہام عاید کرتے ہیں یعنی وہ فرماتے ہیں کہ "مقدس جھوٹ کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے۔ مروجہ دینیات اسلام کی رو سے فریب بعض حالتوں میں روا ہے۔ خود پیغمبر صاحب نے اپنے احکام و نظیر سے اس عقیدہ کی ترغیب دی ہے کہ بعض مواقع پہ جھوٹ بولنا جائز ہے"۔ اس عبارت کے حاشیہ میں وہ بیان کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے اس عام اعتقاد یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اول کسی شخص کی جان بچانے کے واسطے۔ دوم صلح اور اتفاق کرانے کے واسطے۔ سوم۔ عورت کی ترغیب دینے کے واسطے۔ چہارم۔ سفر یا مہم کے وقت میں"۔

اُن کی مثالیں بھی صاحب موصوف لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ" اول کی نسبت تو پیغمبر صاحب کی صریح منظوری موجود ہے۔ عمار ابن یاسر کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہنچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر اُنھوں نے رہائی پائی۔ پیغمبر صاحب نے اس فعل کو پسند کیا اور فرمایا کہ" اگر وہ پھر ایسا کریں۔ تو پھر اسی طرح انکار کر دینا" (کاتب الواقدی صفحہ ۲۲۷ء) ایک اور روایت خاندان یاسر میں چلی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا اور جب تک کہ اُن سے محمدؐ صاحب کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی اُن کو نہ چھوڑا۔ اور جب وہ پیغمبر صاحب کے پاس آئے اور اُنھوں نے حال پوچھا تو کہا کہ یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی۔ جب تک کہ میں نے آپ کی مذمت اور اُن کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا۔ پیغمبر صاحب نے پوچھا کہ تو اپنے دل کا کیا حال پاتا ہے۔ تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے۔ اُس وقت محمدؐ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں۔ تو پھر یہی کہہ دینا۔ محمدؐ صاحب نے یہی فرمایا کہ عمار کا جھوٹ ابوجہل کے سچ سے بہتر ہے۔

سر ولیم میور کی نکتہ چینی ہر ایک شخص کو تعجب میں ڈالتی ہوگی۔ شکسپیر کا قول ہے" دیکھو کس طرح ایک سادہ قصہ تم کو دھوکا دے گا"۔ اول تو ان روایتوں کی جس کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے۔ معتبر سند درکار ہے دوسرے جن الفاظ میں صاحب موصوف نے ان مضمونوں کو بیان کیا ہے وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں یعنی زیادہ تر عام اور غیر معین ہیں۔ سر ولیم میور اول موقع جھوٹ

بولنے کے جواز کا "کسی کی جان بچانا" بیان کرتے ہیں۔ اول تو یہی غلط ہے کیونکہ بموجب اُن روایتوں کے جو اُنھوں نے بیان کی ہیں اُن کو لازم تھا "اپنی جان بچانا" لکھتے اور اس بے دھڑک اور پُر جرأت بیان کے بجائے سر ولیم میور کو لازم تھا کہ جملہ شرائط اور قیود اور مواقع کی جو صدق سے اس طرح انحراف کرنے کو جائز ٹھیراتے ہیں تصریح کر دیتے۔ جس فریبندہ اور معیوب پوشاک میں سر ولیم میور نے اس مضمون کو ملبوس کیا ہے۔ اگر وہ اتار لی جائے تو وہ اصلی نتائج جو بذریعہ جائز اور منصفانہ دلیل اور صحیح مقدمات سے مستنبط ہوں گے۔ یہ ہوں گے کہ "اگر کفار یا کوئی بے رحم وجفا کار اشخاص جبر اور اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی ایسے آدمی سے اُس شے کا انکار کرالیں، جس کو کہ وہ اپنے دل سے اور ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس کے اوپر وہ ایسی مصیبت میں بھی دلی اعتقاد رکھتا ہو تو ایسے حال میں اگر وہ اس سے انکار کرے تو سزائے ارتداد کا ہرگز مستوجب نہیں ہے"۔

جبریہ مواعید سے انحراف کے جواز کی تصدیق فرانسس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ہوتی ہے یعنی اس بادشاہ کو چارلس خامس نے چنگ پا دیا (۱۵۲۵ء) میں مقید کر کے ماڈرڈ کے پُر ذلت صلح نامہ کا بالجبر اقبال کرا کے دستخط کرائے تھے۔ بادشاہ فرانسس نے مخلصی پاتے ہی اپنے قول و قرار پر قائم رہنے سے بعذر اجبار انکار کیا اور پوپ کلیمنٹ سابع نے درحقیقت اُس کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔

آدمی کے افعال کے جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے اور اسی بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں۔ کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے بہ سبب اذیت اور قتل کی دھمکیوں کے لکھوا اور کرائے گئے ہوں، اسی درجہ اور ویسی سزا کے مستوجب ہیں جیسے کہ اُس شخص کے کلمات اور حرکات جو بلا اجبار و اکراہ اُس سے سرزد ہوئے ہوں۔

یہ اصول جس سے کہ اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے اور جو محض ایک بے خطا اور قدرتی فطرت کا بے کم و کاست سچا نمونہ ہے اور جس کو سر ولیم میور نے البتہ اس قابل الاعتراض اور خراب صورت میں بیان کیا ہے۔ قرآن مجید میں نہایت سادہ اور صریح طور پر بالفاظ ذیل بیان کیا گیا ہے کہ "جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا۔ بعد ایمان لانے کے۔ مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اُس

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم (سورۃ النحل آیت ۱۰۸)۔

کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ لیکن جس نے کفر کے ساتھ سینہ کھولا پس اُس پر خدا کا غصہ ہے اور اُن پر بڑا عذاب ہے۔

اس آیت پر فقہا نے غور کی ہے اور اُس کے حکم کا مقصد دو طرح پر قرار دیا۔ اول عزیمت یعنی باوصف اذیتوں اور تکلیفوں اور قتل کے خوف کے جو کفار اُس پر روا رکھیں۔ وہ ظاہر ایس بھی اُسی سچ پر قائم رہے جس پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ دوم رخصت یعنی ایسی حالت میں اُس کو اپنے بچانے کے لیئے اجازت ہے کہ ظاہر میں اُس ایمان کا جس کی تصدیق اُس کے دل میں ہے بطور تقیہ کے انکار کرے اور دشمنوں کی ایذا سے نجات پاتے۔ البتہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ سر ولیم میور نے اس حقیقت کو اُس مقدس جھوٹ پر محمول کیا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا اور اس پر بھی ہم کو نہایت تعجب آتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے مدعا کو عجیب اختصار اور اقتصار کے ساتھ ادا کیا ہے یعنی ان چند لفظوں میں کہ "کسی کی جان بچانے کے واسطے" جس کے بیان کے لئے قرآن مجید میں بھی باوجود اُس کی مشہور و معروف مختصر البیانی کے ایک پوری آیت درکار ہوئی ہے۔

دوسرا موقع جواز کذب کا بقول سر ولیم میور کے وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ امر روایت ذیل سے بخوبی ثابت ہے۔ اس روایت کا ترجمہ انگریزی زبان میں جو اُنھوں نے فرمایا ہے وہ حسب مندرجہ ذیل ہے۔

"وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کراتے اور اُن کے رفع نزاع کے واسطے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے گو وہ کلمات دروغ ہوں۔"

مگر یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے۔ اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اور جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے ہم بجنسہٖ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ" ام کلثوم نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

عن ام کلثوم قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فیقول خیرا و یمنی خیرا (متفق علیہ مشکوٰۃ)	نہیں ہے جھوٹا وہ شخص جو صلح کرادے درمیان آدمیوں کے پس کہے بھلائی اور پہنچائے بھلائی۔

قاضی بیضاوی نے اس کی شرح اس طرح پر کی ہے کہ "پہنچائے وہ باتیں جو مواد میں اُس

قال القاضی البیضاوی ای یبلغ   کو اور چھوڑ دے شر کی باتوں کو۔"
ما یسمعه ویل ۹ ش ۷ (کرمانی)

سر ولیم میور کی عربی علمیت کو خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اصل حدیث پر غور کرتے اور خود اس کا صحیح ترجمہ لکھتے انھوں نے کپتان ای این میتھو کے غلط ترجمہ مشکوٰۃ کو اختیار کیا اور کپتان میتھو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ " گو وہ کلمات دروغ ہوں " اپنے ترجمہ میں بڑھا دیتے ہیں اور وہ الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔

ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے۔ اور قصداً کسی بدنیتی سے اُس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے جناب پیغمبر خدا نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے۔ تو وہ کذابوں میں داخل نہیں ہے۔ یعنی جو سزا کہ ایسے شخص کے لئے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے اس سزا کا مستحق نہیں ہے۔

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے " کسی عورت کو ترغیب دینے میں " اور " سفر یا مہم میں " سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ " بلحاظ تیسرے موقع کے ہمارے پاس ایک افسوس آمیز نظیر موجود ہے کہ محمد صاحب نے ماریہ قبطیہ کے معاملہ میں اپنی ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے معیوب نہ سمجھے اور بلحاظ چوتھے موقع کے ان کا معمول تھا کہ بوقت ترتیب مہمات (باستثنائے مہم تبوک) اپنے مدعائے اصلی کو پوشیدہ رکھتے تھے اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے۔"

سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے۔ کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں ہے اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اُس کی بابت ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور چونکہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے۔ پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔ جب کہ اُس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو مشتہر کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں۔ جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے عزم جنگ مشتہر نہیں کیا گیا ہے اُس وقت

تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکا ہو بلا شبہ خلاف اخلاق اور صداقت کے ہے۔ لیکن جب جنگ کا اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو صداقت کے خلاف نہیں ہے۔

تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اُس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے مسلمانی مذہب پر عاید کرنا چاہتے ہیں۔ مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا۔ کیونکہ اس کا تصور اُس صدق حقیقی کی نقیض ہے جو قرآن مجید کا لب لباب اور جوہر ہے اور اس کی ہر سطر میں جلوہ نما ہے۔ برخلاف اس کے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں جیسا کہ تاریخ سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے منجملہ ارکان مذہبی کے مقدس جھوٹ بھی ایک رُکن تھا اور ہم کو اس بات کے سننے سے تعجب آتا ہے کہ مقدس پال حواری اُس کو بُرا بھی نہ سمجھا تھا گناہ سمجھنا تو درکنار جیسے کہ خود عیسائی عالم اس امر کو مقدس پال کے اس کلام سے ثابت کرتے ہیں جہاں اُنھوں نے فرمایا ہے کہ " اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اُس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لئے میں گنہگار گنا جاتا ہوں " (پال کا خط رومیوں کو باب ۳ درس ۷)

اب ہم تاریخ کی کتابوں سے اُس مقدس جھوٹ کا ذکر کرتے ہیں جو عیسائی مذہب میں مروج تھا۔ کتاب کرسچین مائیتھولوجی ان ویلڈ میں مرقوم ہے کہ "کلیسیا کا وہ شریف اور راست باز فرزند یعنی موشیم جس کی سند اور مسلمہ صداقت میں پادریوں کو کبھی کلام نہیں ہوا ہے۔ امر ذیل کی تصدیق کرتا ہے۔ پیروان افلاطون وفیثاغورث نے اس امر کو ایک اصول قرار دیا تھا کہ صدق و پرہیزگاری کے مطالب کی ترقی کی غرض سے دھوکا دینا اور نیز بروقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ یہودیانِ سکنائے مصر نے حضرت عیسٰی کے آنے سے پیشتر اس اصول کو اُن سے (یعنی پیروان افلاطون وفیثاغورث سے) سیکھا اور اخذ کیا تھا جیسا کہ بے شمار تحریرات سابقہ سے بلا حجت واعتراض ثابت ہے اور عیسائیوں پر اس مضر غلطی نے ان دونوں ذریعوں سے اثر کیا۔ جیسا کہ اُن بے شمار کتابوں سے جن کو نامی وگرامی اشخاص کی طرف اتہاماً منسوب کیا ہے ظاہر ہے خلاصہ صدر صرف دوسری صدی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب کہ بے شمار اناجیل وخطوط وغیرہ کے حسب بیان موشیم غلط موضوع ہوئی تھیں اور غلط منسوب کی گئی تھیں۔ مگر چوتھی صدی میں اس مروجہ اصول میں کہ دینی مطالب کی ترقی کے واسطے دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا نہایت ثواب کا کام ہے۔ بہت کم استثناء وقوع میں آئے ہیں۔۔۔ بلانڈل دوسری صدی کے ذکر میں بیان کرتا ہے۔

کہ خواہ مزوروں اور کذابوں کی اشد بے حیائی خواہ معتقدین کی قابل افسوس سریع الاعتقادی کے لحاظ سے یہ ایک نہایت خراب زمانہ تھا اور مقدس جھوٹ میں اور سب زمانوں سے سبقت لے گیا تھا... کیسوبن اس طرح پر شاکی ہے کہ مجھ کو دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں اس بات کے دریافت ہونے سے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی کو اپنے اختراعات سے مدد دینے سے ناموری سمجھتے تھے بدیں غرض کہ ہمارے نئے عقیدہ کو عقلائے کفار گوش دل سے سنیں" (صفحہ ۸۰-۸۲)

اسی کتاب میں یہ بھی بیان ہے "اور جب کبھی معلوم ہوتا تھا کہ انجیل ہر امر میں اہل دین کے مطالب یا حکام ملکی کے اغراض کے جو اُن سے ساز رکھتے تھے موافق نہیں ہے تو ضروری تحریفات کر لی جاتی تھیں اور طرح طرح کے مقدس جھوٹ اور جعل سازیاں کچھ مروج ہی نہ تھیں۔ بلکہ بہت سے پادریوں نے اُن کو جائز قرار دیا تھا" (صفحہ ۵۲)

اس کتاب میں ایک اور مقام پر یہ بیان ہے "اول کی تین صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں بجز اُس کے جو نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے کس واسطے کہ ان اہل سیر کی روایتیں اور حکایتیں جو اُس زمانہ میں گذرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں مگر ان موروثی کرتبوں اور رہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ صدی آئندہ میں اُن سے بھی سبقت لے گیا، جس کا کلام حق کو چھانٹ چھونٹ کر دین کے عام مطالب سے موافق کر دینے میں کوئی ہمسر نہ تھا۔ وہ خود براہ فخر بیان کرتا ہے کہ "جس سے ہمارے دین کی عظمت و نام آوری بڑھے۔ میں نے بیان کر دیا ہے اور جو اُس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو میں نے سب چھوڑ دیا ہے" (صفحہ ۶۶)

متعدد اہل سیر کی تحریرات میں عدیم الامکان ریاضت، عام سفلہ پن کی عیاشی و بدوضعی کی طرف مائل ہے۔ ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ شہواتِ جسمانی اور خوف ایمانی کے مابین غلبہ حاصل کرنے کی صریح کوششیں اکثر قابل تضحیک معلوم ہوتی ہیں۔ گو بعض اُن میں کی لذاتِ دیرینہ سے ثابت ہوئی ہوں۔ لذاتِ جدیدہ کی خواہش اُن میں مستتر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف طبیعت انسانی کے ضعف کی وجہ ہے اور ہم کو صرف اسی وقت رنج آمیز حیرت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ صفات ملکوتی کے حصول کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن کے خام اور بیہودہ عقاید جو لاطینی زبان میں بیان ہوئے ہیں دیا کیتھلک کے ہر وعظ و خطبہ میں مخلوط ہیں اور حواریان ذی الہام کے عقاید اور نیز حضرت مسیح کے ملفوظات کی نسبت زیادہ تر منقول ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اُمید ہے کہ ٹرٹیولین کے خیالات لاطائل "ڈی ہابی ٹیو مولیرس"

اور سنٹ باسل کی "ڈی ویرا ورجی نے ٹی" نوجوان عورتوں کو نہیں دکھلائی جائیں گی۔ تمام بے اعتقاد مصنف جنھوں نے احکام الٰہی کا فلسفہ کی رو سے امتحان کیا ہے۔ دین عیسوی کو کفر بتا کر مضرت پہنچانے میں اس قدر ساعی نہیں ہوئے ہیں جس قدر کہ حضرات اہل سیر ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے چشمہ آب ہی ہی کو زہریلا کر دیا ہے اور ان بے اعتقاد مصنفین نے اُس کا پانی پینے سے لوگوں کو باز رکھا ہے۔ اُن کی سریع الاعتقادی نے جو اس وجہ سے عارض ہوئی تھی کہ وہ طبائع و معاملات انسانی سے محض ناتجربہ کاری اور علوم طبیعی سے بالکل ناواقفیت رکھتے تھے۔ انجیل کی بے شرمانہ تحریفات و تصرفات کی استعانت سے کلیسائے روم میں عجیب و غریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر شائع کر دیا۔ جن کو باوجود داد و فریاد عقل کے خوش اعتقادی اب بھی ہضم کر جاتی ہے۔ صرف اسی قدر مضرت اُن سے نہیں پہنچی ہے اُنھوں نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھل کر دیا۔ اُنھوں نے اس مقولہ کی (جس کو میں موشیم کے الفاظ میں لکھتا ہوں) تلقین کہ دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان ذریعوں سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں ثواب ہے۔ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس مطلق العنان اصول نے دروغ گوئیوں اور جعلسازیوں کے چشمہ کا دہانہ کھول دیا۔ جس کا پانی ابتدائے دین عیسوی کی سرزمین میں مثل طوفان کے چھا گیا اور اُن فریبوں اور باطنی ذخیروں کو جو نی زمانا عیسائیان رومن کیتھلک کو انگشت نما اور بدنام کرتے ہیں رواج دیا۔ اہل سیر میں اول سے لے کر آخر تک سب سے بڑا خاصہ یہ پایا جاتا ہے کہ کفر آمیز سفلگی، سریع الاعتقادی تعصب، اور فریب دہی کے حامی تھے۔ بایں ہمہ ایسے لوگوں کو جانشینان پطرس حواری نے پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں لکھا ہے۔

سر ولیم میور کو مناسب تھا کہ ان حالات پر خیال کر کے اسلام کی نسبت مقدس جھوٹ کے بے جا طور پر تہمت لگانے کی کوشش نہ فرماتے۔ اسلام سرتا پا صدق ہے۔ وہ نہایت درجہ کے صدق اور راست بازی کا دین ہے اور اسی حیثیت سے اور سب دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ فوقیت کے دعوے کا مجاز ہے۔

خطبہ ساتواں

القرآن وھو الھدیٰ والفرقان

انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون (القرآن)

قرآن جناب پیغمبر خدا پر کس طرح نازل ہوا

قرآن مجید جناب پیغمبر خدا پر حضرت موسیٰ کی طرح پتھر کی تختیوں پر کھدا ہوا نہیں نازل ہوا تھا۔ اور نہ اس بات کی ضرورت پڑی تھی کہ اُن کے ٹوٹ جانے کے سبب اُس کے ضائع ہونے کا خوف ہوا ہو۔ اور پھر آنحضرتؐ کے اصحاب کے لیے اُس کی دوبارہ نقل پتھر کی تختیوں پر کھودنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اُس کے نزول کی نسبت کوئی امر عجائبات سے بھرا ہوا نہ تھا۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دل سینا کا پہاڑ تھا اور مسلمانوں کے دل پتھر کی لوحیں تھیں۔ خدا فرماتا ہے کہ "بے شک وہ اُتارا ہوا ہے عالموں کے پروردگار کا۔ اُس کو اُتارا ہے روح الامین نے اوپر تیرے دل کے تاکہ تو ہو ڈرانے والوں میں سے (اُس کو اُتارا ہے)، عربی زبان واضح میں اور بے شک وہ ہے اگلوں کے صحیفوں میں۔

وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین وانہ لفی زبر الاولین (سورۂ شعراء)

حضرت عائشہ صدیقہ نزول وحی کی کیفیت اس طرح بیان کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کیونکر آتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کبھی تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے پس پھر مجھ سے منقطع ہو جاتی ہے اور میں نے یاد رکھا جو کہا۔ اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں مجھ سے

عن عائشہ ان الحارث بن ھشام سأل رسول اللہ صلعم فقال یا رسول اللہ کیف یاتیک الوحی فقال رسول اللہ صلعم احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس ھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد

(عیت منہ ما قال واحیانا یتمثل لی الملک کلام کرتا ہے ۔ پس میں یاد رکھتا ہوں جو کہتا ہے ۔
رجلا فیکلمنی فاری ما یقول ..(متفق علیہ)

جو طریقہ نزول وحی کا اس حدیث میں رسول خدا نے بتایا اُس میں کوئی عجیب امر یا اسرار نہیں ہے ۔ لیکن بالفعل ہم اس مضمون کو اور وحی کی حقیقت کے بیان کو چھوڑ دیتے ہیں ۔ کیونکہ ہمارا ارادہ ہے کہ جب پیغمبر خدا کی سوانح عمری کے اس مقام پر پہنچیں ۔ جب کہ آنحضرت پر اولاً وحی نازل ہوئی تھی اُس وقت ہم اُس کو شرح و بسط سے بیان کریں گے ۔

وحی یعنی قرآن مجید جب نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا یا نہیں

آنحضرت کے زمانہ سے پیشتر اور نیز آنحضرت کے زمانہ میں ملک عرب میں کوئی معین یا باقاعدہ طریقہ تعلیم کا جاری نہیں تھا ۔ عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب ۔ اُن کی تحصیل کے لئے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم کے پانے کی ضرورت نہ تھی وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے اُسی وجہ سے اُس زمانہ میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے اُن کی تعداد نہایت محدود تھی ۔ پہلے یعنی جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے ۔ پچھلوں کے مقابلہ میں اُمی کہلاتے تھے ۔ اگرچہ ان دونوں قسموں کے لوگوں میں بہت ہی کم فرق تھا ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرت کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا ، نہ وہ خود لکھ سکتے تھے اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے ۔ اور اسی سبب سے آنحضرتؐ کا لقب اُمی ہو گیا تھا ۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق بے شمار معتبر اور مستند روایات اور احادیث سے ہوتی ہے اور اُس کے برخلاف ایک بھی ایسی روایت نہیں پائی جاتی جو کسی قدر بھی معتبر ہو ۔ درحقیقت اگر آنحضرت کو لکھنا پڑھنا آتا ہوتا اُن کے صحابہ، رفقا اور متبعین اس امر میں کسی طرح سکوت اختیار نہ کرتے اور اُن کے ازواج مطہرات اور اُن کے عزیز و اقربا اور بالخصوص اُن کے چچا جنھوں نے اُن کو پالا تھا بے خبر نہیں رہ سکتے تھے اور نہ ایسی جرأت ہو سکتی تھی کہ اپنے قبیلہ کے سامنے خلاف واقعہ اپنے آپ کو اُمی فرماتے اور قرآن مجید میں بھی اپنے تئیں اسی لقب سے ظاہر کرتے ۔ کیونکہ ایسی صورت میں مخالفین کو اُس کی گرفت کا آسان موقع ہاتھ آجاتا اور عقاید اسلام کی تصدیق پر اُن کو ہرگز یقین نہ آتا ۔ قطع نظر اس کے ایک ایسی خفیف بات کے چھپانے سے جناب پیغمبر خدا کو کیا فائدہ تھا ۔ اُن کا لکھا پڑھا ہونا منصب نبوت کے کسی

طرح مخالف نہ تھا اور نہ اُس سے قرآن مجید کی شان اور اُس کے معجزہ ہیں اور بے مثل فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق آسکتا تھا۔ کیونکہ حروف کے لکھ لینے یا پڑھ لینے سے کوئی انسان فصیح و بلیغ نہیں ہوسکتا خصوصًا ایسے فصیح و بلیغ جس کا مثل عرب کے بڑے بڑے فصحا میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

اسلام کے مورخوں میں سے کسی کو اس بات کا انکار نہیں ہے کہ اُس زمانہ میں فن تحریر کا عرب میں رائج تھا اور کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے اور اوروں کا لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے۔ اُس زمانہ کے بڑے بڑے شاعر اپنے قصیدوں کو کعبہ کے دروازوں اور دیواروں پر آویزاں کرتے تھے چنانچہ قصائد سبعہ معلقہ اسی نام سے مسلمانوں میں معروف و مشہور ہیں اُن کا قول صرف اس قدر ہے کہ فنِ تحریر کا رواج تھا مگر بہت کم لوگ اُس کو جانتے تھے اور بمقابلہ نہ جاننے والوں کے اُن کی تعداد بہت قلیل تھی۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وحی جو آنحضرت پر وقتًا فوقتًا نازل ہوتی تھی دو قسم کی تھی۔ اوّل وہ تھی جس کے بجنسہٖ الفاظ پیغمبر خدا پر نازل ہوتے تھے اور بجنسہٖ وہی الفاظ پیغمبر خدا پڑھ سناتے تھے۔ دوسری وہ جس کا مطلب پیغمبرؐ خدا پر القا ہوتا تھا اور پیغمبرؐ خدا اپنے الفاظ میں اُس کو بیان فرماتے تھے۔ اول قسم کی وحی کو ہم اصطلاحًا وحی متلو یا قرآن یا کلام اللہ کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے وحی کو وحی غیر متلو یا حدیث۔

جب کہ قرآن مجید کی کوئی آیت پیغمبر خدا پر نازل ہوتی تھی تو آنحضرتؐ کسی کاتب کو بلواتے تھے اور بجنسہٖ وہی الفاظ جو بذریعہ وحی کے القا ہوتے تھے لکھوا دیتے تھے تاکہ لوگ اُس کو بخوبی یاد کرلیں اور وہ محفوظ رہیں۔ خود قرآن مجید کی اکثر آیتیں جیسے کہ "الم ذلک الکتاب" اور آیت "لا یمسہ الا المطھرون" اس پر دلالت کرتی ہیں گو کہ پچھلی آیت کی دوسری حقیقت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات نازلہ کے لکھ لینے کی رسم اوائل ایام نزول وحی سے اختیار کی گئی تھی کیونکہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آنحضرتؐ کے مکہ سے ہجرت کرنے سے پیشتر یعنی اُس زمانہ میں جب کہ اسلام کا آغاز تھا اور ایک ضعف کی حالت میں تھا اُن معدود لوگوں کے پاس جو ایمان لے آئے تھے اُن وحیوں کی نقلیں موجود تھیں اور حضرت عمرؓ کے خاندان میں بھی اُن کے مسلمان ہونے سے پہلے اُس کی ایک نقل تھی اس لیے کہ اُن کی بہن مسلمان ہوگئی تھیں۔

جب کوئی قرآن کی آیت ایسی نازل ہوتی تھی کہ اُس کے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہوتی تھی تو سمجھا جاتا تھا کہ نئی سورت شروع ہوئی ہے چنانچہ

عن ابن عباس قال کان رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزل علیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (رواہ ابوداؤد)

ابوداؤد نے ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم سورۃ کا علیحدہ ہونا نہیں جانتے تھے جب تک کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نازل ہو۔

پوری سورۃ وقت واحد میں نازل نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض آیتیں کسی وقت اور بعض آیتیں کسی وقت نازل ہوتی تھیں اور اسی وجہ سے کسی سورت کی آیتیں بہ ترتیب لکھی نہیں جاتی تھیں بلکہ جُدا جدا چمڑوں یا اونٹ کی ہڈیوں یا کھجور کی چھال پر لکھی جاتی تھیں۔

اس بات کے ثبوت میں کہ جو کچھ چمڑوں یا ہڈیوں یا کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا گیا تھا وہ بالکل محفوظ اور متعدد لوگوں کے قبضہ میں تھا۔ چار معتبر حدیثیں موجود ہیں۔

پہلی حدیث ابن عباس کی ہے جو بخاری میں منقول ہے "ابن عباس نے کہا کہ میں

عن ابن عباس قال جمعت المحکم فی عہد رسول اللہ صلعم فقلت لہ وما المحکم قال المفصل (بخاری باب تعلیم الصبیان القرآت)

نے محکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جمع کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ محکم کیا۔ اُنھوں نے کہا مفصل"۔

دوسری حدیث قتادہ کی بھی بخاری میں موجود ہے قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے

حدثنا قتادۃ قال سئلت انس بن مالک من جمع القران علی عہد النبی صلعم قال اربعۃ کلھم من الانصار ابی بن کعب معاذ ابن جبل وزید بن ثابت وابو زید۔ (بخاری باب القراء)

انس بن مالک سے پوچھا کہ آنحضرت کے زمانہ میں قرآن کس نے جمع کیا، کہا چار شخص نے جو چاروں انصار تھے ابی بن کعب۔ معاذ بن جبل۔ زید بن ثابت۔ ابوزید۔

تیسری حدیث انس کی بخاری میں موجود ہے انس کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عن انس قال مات النبی صلعم ولم یجمع القرآن غیر اربعۃ ابو درداء معاذ بن جبل وزید بن ثابت وابوزید (بخاری باب القراء)

نے وفات کی اور چار شخصوں کے سوا کسی نے قرآن نہیں جمع کیا ابو وردار۔ معاذ بن جبل۔ زید بن ثابت۔ ابوزید۔

اور **چوتھی** وہ حدیث ہے جس میں بیان ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت میں زید ابن ثابت نے جب قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کرنا چاہا تو قرآن مجید کی تمام آیتیں جو مختلف وقتوں میں نازل ہوئی تھیں اور

مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی تھیں اور مختلف اشخاص کے قبضہ میں تھیں اُن سب کو منگا کر اکٹھا کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تحریرات تھیں اور سب موجود اور محفوظ تھیں۔

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کیونکر ہوئی اور کس نے کی؟

ہم کو واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب خود جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اور اُن کی ہدایت اور حکم کے موافق عمل میں آئی تھی۔ جیسے کہ ابن عباس کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے ابن عباس نے حضرت عثمان سے کہا کس چیز نے تم کو آمادہ کیا۔ انفال کی طرف کہ وہ مثانی میں سے ہے اور براءۃ کی طرف کہ وہ مائین میں سے ہے تمھارے اس ارادہ کا پھر اُن دونوں کو ملا دیا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہیں لکھا۔ اور اُن دونوں کو سبع طوال میں رکھا۔ اس بات پر تم کو کس چیز نے آمادہ کیا۔ عثمان نے کہا۔ حضرت پر بہت سی آیتوں والی سورتیں ایک مدت میں اُترتی تھیں۔ اور جب آپ پر کچھ اُترتا تھا تو آپ اُن میں سے کسی کو جو لکھا کرتے تھے بلا کر فرماتے تھے۔ کہ ان آیتوں کو اُس سورت میں رکھو جس میں ایسا ایسا ذکر کیا گیا ہے۔ اور انفال اُن میں سے ہے جو اول مدینہ میں اُتری۔ اور براءۃ سب سے آخیر میں اُتری۔ اور اس کا قصہ اُس کے قصہ سے ملتا ہوا تھا۔ پھر آنحضرت کا انتقال ہوگیا اور آپ نے بتایا نہیں کہ وہ اُس سے ہے۔ پس اسی وجہ سے میں نے اُن دونوں کو ملا دیا۔ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہیں لکھی۔ اور ان دونوں کو سبع طوال میں رکھا۔

وعن ابن عباس قال قلت لعثمان ما حملکم علی ان عمدتم الی الانفال وھی من المثانی والی البراءۃ وھی من المائین فقرنتم بینھما ولم تکتبوا بسم اللہ الرحمن الرحیم ووضعتموھا فی السبع الطوال ما حملکم علی ذلک قال عثمان کان رسول اللہ صلعم مما یاتی علیہ الزمان ینزل علیہ السور ذوات العدد وکان اذا انزل علیہ شیئ دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھولاء الایات فی سورۃ التی یذکر فیھا کذا وکذا وکانت الانفال من اوائل ما نزل بالمدینۃ وکانت براءۃ من اخر القرآن نزولا وکانت قصتھا شبیھۃ بقصتھا فقبض رسول اللہ صلعم ولم یبین لنا انھا منھا فمن اجل ذلک قرنت بینھما ولم اکتب سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم فی السبع الطوال (رواہ احمد والترمذی وابو داؤد)

بخاری کی ایک اور روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابن مسعود نے ستر سورتیں خود آنحضرت کے منہ سے سُن کر یاد کرلی تھیں چنانچہ اُس میں لکھا ہے کہ عبد اللہ نے خطبہ پڑھا اور کہا کہ بخدا میں نے آنحضرت کے

عن شقیق بن سلمۃ قال خطبنا عبد اللہ فقال واللہ لقد اخذت من فی رسول اللہ

صلعم بضعا وسبعين سورة. منہ سے کچھ اوپر ستر سورتیں لیں (یعنی سیکھیں)

(بخاری باب تالیف القرآن)

ایک اور روایت میں بخاری اُن لوگوں کے نام بیان کرتا ہے۔ جنھوں نے قرآن مجید کو حفظ کر لیا تھا۔ اور اُن کے نام یہ ہیں عبداللہ ابن مسعود۔ سلام۔ معاذ بن جبل۔ ابی ابن کعب۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ منجملہ مقتولین جنگ یمامہ کے جو پیغمبر خدا کی وفات کے تھوڑے ہی بعد ہوئی تھی۔ ستر شخص ایسے شہید ہوئے تھے۔ جن کو قرآن مجید بالکل حفظ تھا۔

ان تمام روایتوں سے دو امر بخوبی ثابت ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ گو جناب پیغمبر خدا کی حیات میں قرآن مجید چمڑے وغیرہ پر کیسی ہی بے ترتیبی سے لکھا ہوا موجود ہو۔ مگر جن لوگوں نے کہ پوری سورتیں یاد کر لی تھیں۔ اُن میں آیتوں کی بالکل ترتیب تھی اور وہ ترتیب یقینی آنحضرتؐ کی ہدایت اور حکم کے موافق تھی۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کو ترتیب وار حفظ کر لیا تھا۔ اس سے یہ دلیل مستنبط ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرتؐ ہی کے فرمانے سے لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی۔

جناب پیغمبر خدا خود بھی قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی اُس کے پڑھتے رہنے کی ہمیشہ ہدایت کرتے تھے

اس مضمون کی نسبت ہم کو کچھ زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اُن معتبر اور مستند حدیثوں کا نقل کر دینا کافی ہے۔ جن سے امر مذکورہ کا ثبوت ہوتا ہے اور جن سے پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے پڑھنے اور یاد رکھنے میں جس ترتیب سے کہ پیغمبر خدا نے فرما دیا تھا کس قدر لوگوں کو توجہ تھی اور حدیثیں یہ ہیں۔

پہلی حدیث بخاری کی ہے۔ اُس میں بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان سے روایت ہے۔

عن عثمان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ	کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں اچھا وہ شخص ہے۔ جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔

(رواہ البخاری)

دوسری حدیث مسلم کی ہے عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ہم لوگ صفہ میں تھے۔ پس فرمایا کہ تم لوگوں میں سے کس کو یہ پسند ہے کہ ہر روز صبح کو بطحان یا عقیق جائے اور دو اونٹنیاں لائے بغیر اس کے مرتکب جرم ہو یا قطع رحم کرے ہم لوگوں نے کہا یا رسول اللہ یہ تو ہم سب لوگ چاہتے ہیں آپ نے فرمایا: یا پس تم لوگ مسجد میں ہر صبح کو آکر دو آیتیں کتاب اللہ کی نہیں سیکھتے یا نہیں پڑھتے، جو دو اونٹنیوں سے اُن کے لئے بہتر ہیں اور تین تین سے بہتر ہیں، اور چار چار سے بہتر ہیں اور جتنی ہوں اُتنی اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔

عن عقبة بن عامر قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم ونحن فی الصفة فقال ایکم یحب ان یغدو کل یوم الی بطحان والعقیق فیاتی بناقتین کوماوین فی غیر اثم ولا قطع رحم فقلنا یا رسول الله کلنا نحب ذلك قال افلا یغدو احدکم الی المسجد فیعلم او یقرأ آیتین من کتاب الله خیر له من ناقتین وثلث خیر له من ثلث واربع خیر له من اربع ومن اعدادهن من الابل (رواه مسلم)

تیسری حدیث اور بخاری دونوں کی ہے عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو قرآن کا ماہر ہو وہ پاکیزہ بزرگ نیک لوگوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اُس میں دقت اُٹھاتا ہے اور وہ اُس پر شاق ہے اُس کو دوہرا ثواب ہے۔

عن عائشة قالت قال رسول الله صلعم الماهر بالقرآن مع السفرة الکرام البررة والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران (متفق علیه)

چوتھی حدیث بھی مسلم اور بخاری دونوں میں موجود ہے، ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رشک کے قابل صرف دو شخص ہیں ایک وہ جس کو خدا نے قرآن دیا ہو (یعنی اُس کو قرآن پڑھنا آتا ہو) اور وہ برابر دن رات تلاوت کرتا رہے اور ایک وہ جس کو خدا نے مال دیا اور وہ برابر دن رات خرچ کیا کرے (یعنی خیرات دیا کرے)

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلعم لا حسد الا علی اثنین رجل آتاه الله القرآن فهو یقوم به آناء اللیل وآناء النهار ورجل آتاه الله مالا فهو ینفق منه آناء اللیل وآناء النهار (متفق علیه)

پانچویں حدیث کو بھی مسلم اور بخاری دونوں نے نقل کیا ہے ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اُس کی مثال ترنج کی سی ہے اس کا مزا بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی۔ اور جو مسلمان قرآن نہیں

عن ابی موسیٰ قال قال رسول الله صلعم مثل المؤمن الذی یقرأ القرآن مثل الاترجة ریحها طیب

وطعمها طیب ومثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل التمرۃ لا ریح لها وطعمها حلو ومثل المنافق الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلۃ لیس لها ریح وطعمها مر ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الریحانۃ ریحها طیب وطعمها مر (متفق علیہ)

پڑھتا اس کی مثال چھوارے کی سی ہے۔ خوشبو نہیں اور مزہ میٹھا ہے اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا اُس کی مثال اندرائن کی سی ہے خوشبو کچھ نہیں اور مزا کڑوا۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے۔ اُس کی مثال ریحانہ کی ہے۔ خوشبو اچھی اور مزا کڑوا۔

چھٹی حدیث کو ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ ابوہریرہ کہتے ہیں فرمایا رسول

عن ابی هریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم تعلموا القرآن فاقرؤہ فان مثل القرآن لمن تعلم فاقرأ وقام بہ کمثل جراب محشو مسکا تفوح ریحہ کل مکان ومثل من تعلمہ فرقد وھو فی جوفہ کمثل جراب اوکی علی مسک (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکھو قرآن اور پڑھاؤ۔ کیونکہ جو شخص قرآن سیکھے اور پڑھے اور اُس پر قائم رہے۔ اُس کے لئے قرآن ایسا ہے جیسے ایک کیسہ مشک سے بھرا ہوا۔ اُس کی خوشبو ہر جگہ پھیلتی ہے اور جو شخص قرآن سیکھ کر سو گیا ہو اور وہ اُس کے پیٹ میں ہو وہ مثل ایک کیسہ کے ہے جو مشک بھر کر بند کر دیا ہو۔

ساتویں حدیث کو بیہقی نے نقل کیا ہے۔ ابن عمر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلعم ان هذہ القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید اذا اصابہ الماء قیل یا رسول اللہ ما جلاءها قال کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن (رواہ البیہقی)

نے فرمایا کہ دلوں کو بھی مورچہ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو لگتا ہے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ پھر وہ صاف کیونکر ہو فرمایا موت کو بہت یاد کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے سے۔

آٹھویں حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ ممبر پر مجھ سے

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال لی رسول اللہ صلعم علی المنبر اقرأ علیّ قلت اقرأ علیک وعلیک انزل قال انی احب ان اسمعہ من غیری فقرأت سورۃ النساء حتی اتیت الی هذہ الآیۃ فکیف اذا جئنا

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قرآن سناؤ۔ میں نے کہا آپ کے آگے میں پڑھوں اور آپ پر تو نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ دل پسند ہے کہ دوسرے سے سنوں۔ پس میں نے سورہ نساء پڑھی یہاں تک کہ میں اس آیت پر آیا۔ فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھؤلاء شہیدا یعنی

من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھٰؤلاء شہیدا قال حسبک الآن فالتفت الیہ فاذا عیناہ تذرفان۔ (متفق علیہ)

کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھ کو ان سب گواہوں پر گواہ لائیں گے، آپ نے فرمایا اچھا بس۔ میں نے جو آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ تو آپ کی آنکھیں آنسو گرا رہی تھیں۔

نویں حدیث ابوداؤد میں بیان ہوئی ہے۔ ابو سعید کہتے ہیں کہ میں ضعیف مہاجروں کے

عن ابی سعید الخدری قال جلست فی عصابۃ من ضعفاء المہاجرین وان بعضہم لیستتر ببعض من العری وقاری یقرء علینا اذ جاء رسول اللہ صلعم فقام علینا فلما قام رسول اللہ صلعم سکت القاری فسلم ثم قال ما کنتم تصنعون قلنا کنا نستمع الی کتاب اللہ تعالیٰ فقال الحمد للہ الذی جعل من اُمتی من اُمرت ان اصبر نفسی معہم قال فجلس وسطنا لیعدل بنفسہ فینا ثم قال بیدہ ھکذا فتحلقوا وبرزت وجوھہم لہ فقال ابشروا یا معشر صعالیک المہاجرین بالنور التام یوم القیمۃ تدخلون الجنۃ قبل اغنیاء الناس بنصف یوم وذلک خمسمائۃ سنۃ (رواہ ابوداؤد)

ایک گروہ میں بیٹھا تھا۔ اور اُن میں سے بعض بعض سے بوجہ عریانی چھپتے۔ اور ایک قاری ہم پر قرآن پڑھتا تھا اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اور کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھڑے ہوئے تو قاری چپ ہوگیا۔ آپ نے سلام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے۔ ہم لوگوں نے کہا خدا کی کتاب سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے میری اُمت میں سے ایسے لوگوں کو کیا جن کے ساتھ مجھے صبر کرنے کا حکم ہے کہا ابو سعید خدری نے کہ پھر آنحضرتؐ ہم لوگوں کے بیچ میں بیٹھ گئے تاکہ اپنے کو ہم لوگوں کے برابر کریں۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ پس لوگ گردا گرد بیٹھ گئے اور سب کا منہ آنحضرت کی طرف تھا پس فرمایا کہ اے مفلس مہاجرین تم کو خوش خبری ہو نور کامل کی قیامت کے دن۔ تم لوگ جنت میں مال داروں سے آدھے دن پہلے جاؤ گے اور یہ پانچ سو برس کا ہوگا۔

نازل ہونا قرآن کا سات قرائتوں میں یا قرأت مختلفہ میں

اختلاف قرأت ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے سبب سے عیسائی مصنفوں کو نہایت دھوکا پڑا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں اختلاف قرأت ہے اُسی طرح اختلاف قرأت قرآن مجید میں بھی ہے حالانکہ وہ دونوں بالکل مختلف ہیں اور جو اسباب کہ عہد عتیق اور عہد جدید میں قرأت مختلفہ کے پیش آئے ہیں۔ اُس سے قرآن مجید کی قرأت سبعہ سے زمین و

آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہم قرآن مجید کی قرأت سبعہ یا اختلاف قرأت کو انھیں معنوں میں لیں جن معنوں میں کہ عیسائیوں نے لیا ہے تو بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اختلاف قرأت مطلق نہیں ہے۔

عہد عتیق اور عہد جدید میں جو اختلاف قرأت ہے اُس کی بنیاد اور اُس کے اسباب اور اُس کے نتائج رورنڈ مسٹر ہارن نے یہ بیان کئے ہیں کہ دو یا زائد قرأت مختلفہ میں صرف ایک ہی قرأت صحیح ہو سکتی ہے اور باقی یا تو کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی مگر قرآن میں یہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ تمام اختلاف قرأت اُس معنی میں جس میں کہ مسلمانوں نے اس اصطلاح کو قرار دیا ہے۔ جس قدر قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح اور سب درست ہیں گو ظاہر میں یہ امر کیسا ہی تناقض معلوم ہوتا ہو۔

رورنڈ مسٹر ہارن نے عہد عتیق اور عہد جدید میں قرأت مختلفہ کے واقع ہونے کے یہ اسباب بیان کئے ہیں (۱) "ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) منقول عنہ میں سقم اور غلطیوں کا موجود ہونا۔ (۳) کاتبوں کا بدون کسی کافی سند کے متن کی عبارت کی اصلاح کی خواہش کرنا (۴) قصداً تحریفات کا کرنا جو کسی فریق کے حصول مدعا کے واسطے کی گئی ہوں"۔ ان اسباب کو قرآن مجید کی اختلافِ قرأت سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں جو اختلاف قرأت ہیں اُن کے اسباب حسب تفصیل ذیل ہیں۔

اول:۔ تمام قرآن مجید یا اُس کی سورتیں ایک وقت میں نازل نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ کوئی آیت کسی سورت کی کسی وقت میں اور کوئی آیت کسی وقت میں نازل ہوئی تھی۔ ایک سورت ابھی ختم ہونے نہیں پائی تھی کہ دوسری سورت نازل ہونی شروع ہوئی اور ایسی چند آیتیں نازل ہوئیں جن کا مضمون اُس سورت کی آیتوں سے جو پہلے نازل ہو چکی تھیں محض مختلف تھا اور یہ سورت بھی نامکمل رہ کر ایک اور سورت نازل ہونی شروع ہو گئی اور اسی طرح سلسلہ جاری رہا تمام آیتیں جس طرح پر نازل ہوئیں علیحدہ علیحدہ چمڑوں کے ٹکڑوں پر اور بے ترتیبی سے لکھی ہوئی رہیں۔ اگرچہ پیغمبر خدا نے تمام آیتوں اور سورتوں کی ترتیب لوگوں کو بتلا دی تھی تاہم لوگوں کو جن کے پاس قرآن مجید کی آیتوں کی نقلیں منتشر حالت میں موجود تھیں۔ اُن سب کو اس کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس سبب سے آیتوں کو بہ ترتیب پڑھنے میں اختلاف واقع ہوا۔ بعض لوگوں نے بعض آیتوں کو اُن آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا، جن سے وہ ٹھیک طور پر علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔

دوم:- نقطوں کا اختلاف۔ قدیم تحریر میں جس کے نمونے اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ نقطوں کے دینے کا بہت کم رواج تھا۔ فعل مضارع کے پہلے حرف "ی" غائب کے صیغہ پر اور حرف "ت" حاضر کے صیغہ پر آتی ہے۔ لکھنے میں ان دونوں حرفوں کی ایک ہی صورت ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ پہلے حرف کے نیچے دو نقطے ہوتے ہیں اور دوسرے حرف کے اوپر دو نقطے ہیں۔ نقطوں کے لکھنے کا قدیم تحریر میں رواج نہ ہونے سے کسی نے اُس حرف کو "ی" پڑھا اور کسی نے "ت" اور علماء نے اُس کو اختلاف قرأت قرار دیا۔

سوم:- عرب کی مختلف قوموں میں جو مختلف اقطاع میں رہتی تھیں مختلف لہجے تھے اور ہر ایک قوم اپنے لہجہ میں قرآن مجید کی آیتوں کو پڑھتی تھی اور اختلاف کو بھی علماء نے اختلاف قرأت میں داخل کیا ہے۔

چہارم:- اعراب کا اختلاف۔ قدیم تحریر میں لفظوں پر اعراب دینے کا بھی دستور نہ تھا اور نہ اہلِ عرب کو کہ عربی خود اُن کی مادری زبان تھی۔ اعراب دینے کی ضرورت تھی۔ مگر بعض دفعہ جملوں کے دو طرح پر ربط دینے سے اعراب میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے لوگ بعض الفاظ کے اعراب میں اختلاف رکھتے تھے۔ مثلاً وضو کی آیت میں جو لفظ "ارجلکم" واقع ہے۔ بعضوں نے خیال کیا کہ اُس کا عطف "وجوھکم" پر ہے جو اُسی میں واقع ہے اور اسی سبب سے اُنھوں نے "ارجلکم" کے "ل" کو مفتوح پڑھا اور بعضوں نے اس کا عطف "رؤسکم" پر خیال کیا۔ اور "ارجلکم" کے "ل" کو مکسور پڑھا۔ اگرچہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں مگر علماء نے اس کو بھی اختلاف قرأت میں داخل کیا۔ حالانکہ درحقیقت یہ ایک بحث نحو کے قواعد سے متعلق ہے نہ اختلاف قرأت سے۔

پنجم:- عربی زبان سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی مادہ کے افعال کے لئے عربی زبان میں متعدد ابواب ہوتے ہیں۔ اور اُن ابواب سے ایک ہی مادہ کے مختلف طرح پر صیغے مشتق کئے جاتے ہیں اور گو وہ لکھنے میں ایک ہی صورت کے ہوں مگر اُن کا تلفظ مختلف ہو جاتا ہے اس وجہ سے بعض لفظوں کو قرآن مجید کے کسی شخص نے کسی باب سے مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا اور کسی نے دوسرے باب سے مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا۔ عرب میں بعض قومیں اُن ابواب میں سے کسی باب کا استعمال کرتی تھیں اور بعض قومیں کسی باب کا۔ اور اسی سبب سے ان الفاظ کے تلفظ میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ اس قسم کا اختلاف بھی بہت ہی شاذ و نادر قرآن مجید میں ہے۔ علمائے اسلام نے اس کو بھی اختلاف قرأت میں داخل کیا حالانکہ وہ

وہ صرف عربی زبان کے قواعد صرف سے متعلق ہے۔

اس بیان سے واضح ہوگا۔ کہ کتب عہد عتیق اور عہد جدید پر عیسائی عالموں نے جن معنی کو اختلاف قرأت کا اطلاق کیا ہے۔ اور جو اسباب اُس کے بیان کئے ہیں۔ اُس سے وہی معنی قرآن مجید کے اختلاف قرأت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ اگر اختلاف قرأت کے وہی معنی قرار دیں جو عیسائی عالموں نے قرار دیئے تو اس کا قرآن مجید کی نسبت استعمال کرنا صریح غلطی اور خطا ہے۔

جو امور کہ ہم نے اوپر بیان کئے ہیں اُن کی توضیح کے لئے ہم چند حدیثوں کو اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

پہلی حدیث ابو داؤد اور بیہقی کی ہے۔ اُس نے جابر سے بیان کیا ہے کہ جابر کہتے

عن جابر قال خرج علینا رسول اللہ صلعم ونحن نقرء القرآن وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرؤا فکل حسن وسیجیی اقوام یقیمونہ یقام القدم یتعجلونہ ولا یتاجلونہ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان)

ہیں کہ آنحضرتؐ ہم لوگوں کے سامنے تشریف لائے اور ہم لوگ قرآن پڑھ رہے تھے اور ہم میں عربی و عجمی دونوں قسم کے لوگ تھے۔ پس فرمایا کہ پڑھو سب اچھا ہے اور آئندہ ایسی قومیں آئیں گی۔ کہ اُس کو سیدھے سے پڑھیں گی تیر کے سیدھے کی مانند جلدی کریں گی اور ٹھیر کر نہ پڑھیں گی۔

دوسری حدیث ترمذی کی ہے اُس نے ابی ابن کعب سے بیان کیا ہے۔ ابی ابن کعب نے

عن ابی ابن کعب قال لقی رسول اللہ صلعم جبرئیل فقال یا جبرئیل انی بعثت الی امة امیین منھم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والجاریة والرجل الذی لم یقرء کتاباً قط قال یا محمد ان القرآن انزل علی سبعة احرف (رواہ الترمذی)

کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے ملے پس فرمایا کہ اے جبرئیل میں مبعوث ہوا ایک جاہل اُمت کی طرف جس میں بوڑھے اور بڑھیا اور لڑکا و لڑکی اور ایسے آدمی ہیں جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی جبرئیل نے کہا۔ اے محمدؐ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔

تیسری حدیث بخاری اور مسلم کی ہے اُن دونوں نے ابن عباس سے بیان کیا ہے کہ رسول

عن ابن عباس ان رسول اللہ صلعم قال اقرانی جبرئیل علی حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ ویزیدنی حتی انتھی

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ کو جبرئیل نے قرآن پڑھایا ایک حرف پر پھر میں نے اُن سے دوبارہ کر پڑھوایا پس میں زیادہ برابر پڑھواتا رہا اور وہ زیادہ کرتے گئے کہ سات حرف

الی سبعة احرف قال ابن شہاب بلغنی تلك السبعة الاحرف انما ھی فی الامر یکون واحدا لا یختلف فی حلال ولا حرام - (متفق علیہ)

(یعنی قرأت) تک پہنچے ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو یہ ساتوں حرف معلوم ہوئے سو مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ کسی حلال و حرام میں اُن سے اختلاف نہیں پڑتا۔

چوتھی حدیث بخاری اور مسلم کی ہے اُن دونوں نے حضرت عمرؓ سے بیان کیا ہے۔ عمر

عن عمر بن الخطابؓ قال سمعت ھشام بن حزام یقرأ سورۃ الفرقان علی غیر ما اقراءھا وکان رسول اللہ صلعم اقرئنیھا فکدت ان اعجل علیہ ثم امھلتہ حتی انصرف ثم لببتہ بردائہ فجئت بہ رسول اللہ صلعم فقلت یارسول اللہ انی سمعت ھذا یقرء سورۃ الفرقان علی غیر ما اقرأتنیھا فقال رسول اللہ صلعم اقراء فقراء القراءۃ التی سمعتہ یقرأ فقال رسول اللہ صلعم ھکذا انزلت ثم قال لی اقراء فقرأت فقال ھکذا انزلت ان القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ما تیسر منہ (متفق علیہ)

بن خطاب نے کہا کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سورہ فرقان پڑھتے سُنا۔ خلاف اس کے جس طرح میں پڑھتا ہوں اور مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پس قریب تھا کہ میں اُن پر جلدی کروں پھر میں نے ان کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ پھر کر چلے پھر میں اُن کو چادر پکڑ کر رسول اللہ صلعم کے پاس لایا اور کہا کہ یا رسول اللہ میں نے ان کو سورہ فرقان اور طرح سے پڑھتے سُنا۔ اُس طرح سے نہیں جس طرح آپ نے مجھ کو پڑھایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا اُن کو چھوڑ دو کہ پڑھیں پس اُنھوں نے اسی طرح پڑھا جیسا کہ میں اُن سے سُن چکا تھا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح اتری ہے۔ پھر مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے پڑھا تو فرمایا اسی طرح اُتری ہے۔ قرآن سات حرفوں پر اُترا ہے جس طرح آسان ہو پڑھو۔

پانچویں حدیث حدیث بخاری کی ہے اُنھوں نے ابن مسعود سے بیان کیا ہے کہ ابن مسعود

عن ابن مسعود قال سمعت رجلا قرأ وسمعت النبی صلعم یقراء خلافھا فجئت بہ النبی صلعم فاخبرتہ فعرفت فی وجھہ الکراھة فقال کلاکما محسن فلا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا ھلکوا

(رواہ البخاری)

کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے سُنا۔ اور رسول اللہ صلعم کو اُس کے برخلاف پڑھتے سُنا۔ پس میں اُس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا۔ اور اس بات کی اطلاع کی۔ پس میں نے حضرت کے چہرہ پر ناگواری دیکھی۔ پھر آپ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو سو اختلاف مت کرو۔ تم سے پہلوں نے اختلاف کیا تو ہلاک ہوئے۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا اُس سے ہر شخص کو معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کے اختلاف قرات اور توریت اور انجیل کے اختلاف قرآت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور وہ اختلاف قرآت جس کو ہم نے مد اول میں داخل کیا ہے یعنی آیتوں کا آگے پیچھے اور اُلٹ پلٹ پڑھنا وہ اختلاف حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت میں قریب قریب معدوم ہو گیا تھا جب کہ زید ابن ثابت نے قرآن مجید کے مختلف حصوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور جب حضرت عثمان کی خلافت کے عہد میں جنھوں نے زید ابن ثابت کے جمع کئے ہوئے قرآن مجید کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھیں اس اختلاف کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

جس میں حاضر اور غائب کے صیغوں کا اختلاف جو صرف تی اور تے کے لفظوں کے سبب سے تھا وہ باقی رہا۔ موجودہ قرآنوں میں اختلاف قرأت بھی لکھا جاتا ہے نہایت احتیاط سے حاشیہ پر اُن اختلافات کو لکھ دیا جاتا ہے۔ مگر قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو ظاہر ہے۔ کہ وہ اختلافات نہایت قلیل اور شاذ و نادر ہیں اور معہذا اُن سے اصلی مطلب اور احکام قرآن مجید میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔

تلفظ کا اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کوششیں کامیاب ہوئی ہیں۔ قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اور اُسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا اُس کو پڑھا کرتے تھے۔ لیکن جو کہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ اور قوموں سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا۔ مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے۔ مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید کے پڑھنے میں محسوس ہوگا، نہ اُس کے املا میں اور اسی لئے وہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آ سکتا اس کا اندازہ کرنے کو اُن لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔

اعراب کا اختلاف بھی چند مقام میں جو بلحاظ قواعد صرف و نحو کے وقوع میں آیا ہے اب تک موجود ہے۔ اور اُسی قسم کے قرآن مجید کے حاشیوں پر لکھ بھی دیا جاتا ہے اور قرآن مجید کی تفسیروں میں اُس کی نسبت ہر ایک امر کی تشریح کی جاتی ہے۔ ابواب کے اختلاف سے جو صیغوں میں تلفظ کا اختلاف ہے۔ وہ بھی بعض بعض جگہ موجود ہے۔ اُس کی بھی تصریح اسی قسم کے قرآن مجید کے حاشیوں پر کی جاتی ہے اور تفسیروں میں اُن پر پوری بحث ہے۔

مگر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد میں کچھ اثر واقع نہیں ہوتا۔ اور جو الزام کہ عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں تصرف کرنے اور کمی و بیشی کرنے کا یا بعض آیتوں کو چھپا ڈالنے کا .... عائد نہیں ہو سکتا۔ علم ادب کی ایک شاخ ہے جو بالتخصیص قرآن مجید کی عبارت پڑھنے سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کا نام علم تجوید ہے۔ اُس پر بہت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور علمائنے شرح وبسط سے اُس کی شرحیں کی ہیں۔

قرآن مجید کی آیات وناسخ ومنسوخ ہونے کا بیان

عیسائی عالموں نے الفاظ ناسخ و منسوخ کے معنی سمجھنے میں جس کا اطلاق علمائے اسلام نے بطور اصطلاح کے آیاتِ قرآنی پر کیا ہے۔ بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اُنھوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے۔ کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ اُن میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا بیکار کر دیا ہے۔ اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ اسلام نے جو دینیات کے مسائل کے محقق ہیں۔ ان معنوں سے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں مختلف معنی قرار دیئے ہیں۔ مسلمانوں کا اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فرض ہے کہ خدا تعالیٰ علیم اور علّام الغیوب ہے۔ یعنی اس کو ماضی اور حال اور استقبال کا یکساں علم ہے پس اگر ناسخ و منسوخ کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ اللہ تعالےٰ نے ایک اپنے حکم سابق کو کسی حکم مابعد سے بدیں وجہ کہ اس پہلے حکم میں کچھ نقصان تھا منسوخ کر دیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حکم سابق کے وقت خدا تعالیٰ کی صفت علم کامل میں کچھ نقصان تھا اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کُفر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ علمائے اسلام نے جن معنوں میں لفظ ناسخ و منسوخ کو استعمال کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کا لفظ اصطلاحًا دو چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ ایک نبی سابق کی ایسی شریعت پر جو دوسرے نبی کی شریعت سے تبدیل ہو گئی ہو۔ مثلاً حضرت موسٰی کی شریعت سے پہلے ایک مرد اپنی زوجہ کی حیات میں اُس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا حضرت موسٰی نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی زوجہ کی زندگی میں اُس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد کر سکتا ہے۔ حضرت موسٰی نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی زوجہ کو طلاق دیدے اور گھر سے باہر نکال دے۔ اس حکم کو بقول عیسائیوں کے

حضرت عیسیٰ نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا۔کہ مرد اپنی زوجہ کو کسی صورت سے طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ اُس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو۔آنحضرت نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا۔ لیکن اس پر یہ قید لگائی ہے۔کہ اگر بغیر کسی اشد ضرورت اور معقول وجہ کے ایسا کرے تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا۔

الفاظ ناسخ و منسوخ کا استعمال جو علمائے اسلام نے شریعت انبیائے سابقین کی نسبت کیا ہے اور جس کا یہ مقصود ہے کہ ناسخ سے وہ شریعت مراد ہے جو شریعت نبی سابق کو غیر واجب العمل کر دے اور منسوخ سے وہ شریعت سابق مراد ہے جو غیر واجب العمل ہو گئی ہو۔ان معنوں میں تو قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔کیونکہ قرآن مجید کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی۔اور نہ نازل ہوگی جو شریعت اسلام کو غیر واجب العمل کر دے۔مگر ہم انبیائے سابقین کی شریعت کے منسوخ ہونے پر زیادہ بحث نہیں کریں گے، بلکہ صرف اس مختصر بیان پر ختم کریں گے کہ علمائے اسلام نے شریعت انبیائے سابقین پر بھی ناسخ و منسوخ ہونے کا اطلاق اُن معنوں میں نہیں کیا ہے۔جو عیسائی خیال کرتے ہیں۔

جو کچھ کہ ہم نے اوپر بیان کیا اس سے ظاہر ہوگا کہ قرآن مجید کی وہ آیت جس کو ہم ذیل میں لکھتے ہیں قرآن مجید کی ایک آیت کے دوسری آیت کے منسوخ ہونے سے کچھ علاقہ نہیں ہے اور نہ اُس سے اس بات پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت قرآن مجید کی دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے کیونکہ اُس آیت میں جو کچھ بیان ہے وہ انبیائے سابقین کی شریعت کے ناسخ و منسوخ ہونے سے متعلق ہے نہ قرآن مجید کی ایک آیت کے دوسری آیت سے۔اور وہ آیت یہ ہے۔

مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ٥ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا الم تعلم ان اللہ علی کل شیئ قدیر۔	اہل کتاب جو کافر ہوئے اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمھارے خدا کی طرف سے کوئی بھلائی اُترے۔اور خدا خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے اور خدا بڑی فضیلت والا ہے۔ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں۔تو اُس سے اچھی لاتے ہیں یا اُس کے برابر۔کیا تو یہ نہیں جانتا کہ خدا ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔

(سورہ بقر آیت ۹۹ و ۱۰۰)

مذکورہ بالا آیتوں سے کوئی ذی فہم شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اُن سے قرآن مجید کی ایک آیت کا

قرآن مجید کی دوسری آیت سے منسوخ ہونا پایا جاتا ہے۔ بلکہ صاف اُس میں اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اور اہل کتاب جو اس بات کے مخالف تھے کہ اُن کی شریعت کے برخلاف کوئی حکم نہ ہو، اُس کی نسبت خدا نے کہا کہ ہم جس آیت یعنی حکم شریعت اہل کتاب کو منسوخ کرتے یا بُھلاتے ہیں تو اُس سے بہتر یا اُسی کی مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس آیت سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے بلکہ اُس کو صریح شریعت اہل کتاب یا رسوم مشرکین سے علاقہ ہے جن کی طرف خاص اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی و بیشی ہوگئی ہے۔

دوسرے ناسخ و منسوخ کی اصطلاح کا اطلاق علماء نے قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث نبوی پر بھی کیا ہے۔ لیکن نہ اُن معنوں میں جو عیسائی سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ایسے احکام ہیں جو امر واحد سے علاقہ رکھتے ہیں مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں اور جب کہ وہ حالت باقی نہیں رہتی تو وہ حکم جو اس حالت سے متعلق تھا غیر واجب التعمیل ہو جاتا ہے اور دوسرا حکم جو حالت تبدیل شدہ سے مناسب ہو صادر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں علمائے اسلام حکم اول پر منسوخ اور حکم ثانی پر ناسخ کا اطلاق کرتے ہیں مگر اس کے یہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ حکم اول میں کسی قسم کا نقص تھا بلکہ وہ حالت خاص جس کے واسطے وہ حکم مناسب تھا باقی نہیں رہی۔ اس لئے وہ حکم بھی واجب التعمیل نہیں رہا۔ لیکن درحقیقت منسوخ نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر احیاناً وہی حالت پھر ظہور پذیر ہو تو وہی پہلا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ اور دوسرا حکم واجب التعمیل نہ رہے گا۔

مثلاً جب شراب پینے کی امتناع کا حکم نازل ہوا تو آنحضرتؐ نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کا بھی جو عرب میں بالتخصیص شراب پینے کے لئے مخصوص تھے منع فرمایا۔ مگر جب شراب پینے کی امتناع کا حکم عموماً سب لوگوں کو معلوم ہوگیا اور اُس کا رواج بھی اُٹھ گیا اُس وقت آنحضرتؐ نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کی اجازت دیدی۔ اسی قسم کی ایک یہ مثال ہے کہ جب تک مسلمان مکہ میں رہے جہاں کفار و قریش کی حکومت تھی اور مسلمان اُن کے محکوم تھے اُس وقت تک اُن کو اپنے حکام کے ہاتھ سے ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم رہا۔ لیکن جب کہ مسلمان اُن کی عملداری کو چھوڑ کر دوسرے ملک

میں چلے گئے تو اُس وقت جہاد کرنے کے احکام صادر ہوئے۔ ان دونوں مثالوں میں علمائے اسلام نے اصطلاحًا حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ سمجھا ہے لیکن اگر پہلی صورتیں پھر پیش آئیں تو وہی پہلے حکم واجب التعمیل ہوں گے۔

مختلف امور میں بعض احکام شریعت حضرت موسیٰ کے ایسے تھے کہ جب تک خاص احکام اُن کی نسبت آنحضرتؐ پر نازل نہیں ہوئے آنحضرتؐ نے انھیں حکموں پر عمل کیا۔ مگر جب خاص حکم نازل ہوئے تو اُن کے مطابق کاربند ہوئے۔ اور علماء نے اُن احکام موسوی پر بھی منسوخ اور ان احکام خاص پر ناسخ کا اطلاق کیا۔ ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحیں ہیں جو علماء نے مقرر کی ہیں۔ محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ الفاظ ناسخ و منسوخ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت مستعمل نہیں ہوئے ہیں۔

جعفر کی حدیث میں جو یہ روایت ہے کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ "میرا کلام قرآن مجید کو منسوخ نہیں کرتا ہے مگر قرآن مجید کا کلام میرے کلام کو منسوخ کرتا ہے اور قرآن مجید کی ایک آیت ایک آیت کو منسوخ کرتی ہے۔" اور ابن عمر کی حدیث میں جو یہ روایت ہے کہ "میرا ایک کلام میرے دوسرے کلام کو منسوخ کرتا ہے۔ جس طرح کہ قرآن کی بعض آیتیں قرآن کی بعض آیتوں کو منسوخ کرتی ہیں۔" ان حدیثوں کی معتبر سند نہیں ہے اس لئے تسلیم کے قابل نہیں ہیں۔

اس باب میں ابن ماجہ کی حدیث نہایت صحیح اور معتبر ہے جو اُن دونوں حدیثوں کے برخلاف ہے اور جن سے اُن لوگوں کی رائے کی جو قرآن کی ایک آیت سے دوسری آیت کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں بخوبی تردید ہوتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ قال سمع النبی صلعم قوما یتدارؤن فی القرآن فقال انما ھلک من کان قبلکم بھذا ضربوا کتاب اللہ بعضہ ببعض وانما نزل کتاب اللہ یصدق بعضہ بعضًا فلا تکذبوا بعضہ ببعض فما علمتم منہ فقولوا بہ وما جھلتم فکلوہ الی عالمہ (رواہ احمدؒ ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو سُنا کہ قرآن میں جھگڑا کرتے ہیں۔ پس فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی سے ہوئے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا (یعنی رد کیا) اور خدا کی کتاب تو اس لئے اُتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو۔ پس بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو۔ اُس میں سے جو جانو وہ کہو اور جو نہ جانو اُس کو اُس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔

اس حدیث سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی کسی

آیت کی ناسخ ہے نہ کوئی آیت منسوخ ہے۔

مگر عالموں کا یہ اختلاف محض لفظی بحث پر مبنی ہے کیونکہ دونوں فریق یعنی وہ لوگ جو ناسخ ومنسوخ کے ہونے کے قائل ہیں اور جو لوگ اُس کے قائل نہیں ہیں۔ دونوں کے مباحثوں سے ایک ہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس مقام پر اُن پہلی دو حدیثوں کے نامعتبر اور غیر مستند ہونے پر بحث کرنی بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں فریقوں کا بہ لحاظ حقیقت حال کے ایک ہی عقیدہ ہے۔

ایک زمانہ کے بعد جب کہ فقہائے اسلام نے قرآن مجید سے اوامر اور نواہی کا استنباط شروع کیا اور کتب فقہ کا تالیف ہونا شروع ہوگیا تو انھوں نے الفاظ ناسخ ومنسوخ کو اور بھی زیادہ وسیع اصطلاح میں استعمال کرنا شروع کیا جس پر نہ تو اُن الفاظ کے لغوی اور لفظی معنی کا اور نہ ان معنوں کا جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ٹھیک اطلاق ہو سکتا ہے۔

مثلاً اُنھوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے اور پھر کوئی خاص آیت اُن کو ایسی ملی کہ جس سے اُس عام حکم میں کسی حالت میں استثناء پایا جاتا تھا تو انھوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اُس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اُس کا ناسخ قرار دیا۔ حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے۔ چنانچہ ہم ایک مثال سے اس امر کی زیادہ تر تشریح اور توضیح کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک یہ آیت ہے کہ اور جو لوگ تم میں سے وفات پاتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیاں۔ وصیت کر جائیں اپنی بیبیوں کے لئے فائدہ دینا ایک برس تک بن نکالے۔ پس اگر نکل جائیں پس نہیں گناہ ہے تم پر اُس چیز میں کہ کریں وہ اپنے حق میں کچھ بہتری اور اللہ غالب دانا ہے۔

والذین یتوفون منکم ویذرون
ازواجاً وصیۃً لازواجھم متاعاً الی
الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح
علیکم فیما فعلن فی انفسھن من
معروف واللہ عزیز حکیم (سورہ بقر آیت ۲۴۰)

اس آیت کے صاف اور سیدھے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اپنے مرنے کے بعد ازواج چھوڑ جائیں اُن کے ایک برس کے نان ونفقہ کے لئے وصیت کر جائیں تاکہ عورت (جو کہ اس جہان میں اپنے تمام حوائج ضروری میں اپنے خاوند کی محتاج ہوتی ہے) اپنے رنج ومایوسی کے ایام میں خاوند کے مر جانے سے مصیبت اور تکلیف میں نہ پڑے۔ ہمارے فقہا نے بیان کیا کہ اس آیت سے تین حکم

نکلتے ہیں (۱) شوہر پر واجب ہے کہ زوجہ کے سال بھر کے نان ونفقہ کی وصیت کر جائے (۲) زوجہ شوہر متوفی کی جائداد میں سے ایک سال سے زیادہ کے نان ونفقہ کی مستحق نہیں ہے (۳) زوجہ شوہر کی وفات کی تاریخ سے سال بھر تک کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی۔

جب کہ فقہائے اپنی ذہانت سے یہ قرار دیا کہ اس آیت سے یہ تین مسئلے نکلتے ہیں تو اُن کو ایک اور آیت نظر پڑی جو ذیل میں مندرج ہے۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف واللہ بما تعملون خبیر ولا جناح علیکم فیما عرضتم بہ من خطبۃ النساء او اکننتم فی انفسکم علم اللہ انکم ستذکرونھن ولکن لا تواعدوھن سرا الا ان تقولوا قولا معروفا۔

(سورہ بقرہ آیت ۲۳۴ و ۲۳۵)

اور جو لوگ تم میں سے وفات پاتے ہیں اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں تو انتظار کرائیں (یہ عورتیں) اپنی جانوں کو چار مہینے اور دس دن۔ پس جب پہنچیں اپنی مدت کو پس تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اُس چیز میں کہ وہ اپنے حق میں بھلائی سے کوئی بات کریں۔ اور خدا اُس چیز سے خبر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو اور نہیں گناہ ہے تم پر اس بات میں کہ اشارۃً تم نے عورتوں سے پیغام نکاح کیا ہو یا تم نے اپنے دل میں چھپا رکھا ہو۔ خدا جانتا ہے کہ تم ان کو یاد کروگے مگر اُن سے خفیہ وعدہ مت کرو بجز اس کے کہ اچھی بات کہو۔

اس آیت میں انھیں فقہاء نے اُس میعاد کی تصریح اور تعین پائی جس میں عورت کو شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے سے نکاح کرنا نہیں چاہیے۔ اور اُنھوں نے سمجھا کہ یہ تعینِ میعاد پہلی آیت کے تیسرے حکم سے جو اُنھوں نے از خود اپنی ذہانت سے قرار دے لیا تھا مختلف ہے تو اُنھوں نے پہلی آیت کے تیسرے حکم کو بہ لفظ منسوخ تعبیر کیا اور پچھلی آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا۔

اُس کے بعد اُن کو ایک اور آیت نظر پڑی جو ذیل میں مندرج ہے۔

ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون بھا او دین

(سورہ نساء آیت ۱۴)

اور اُن کے لئے چوتھائی حصہ ہے تمھارے ترکہ میں سے اگر تمھارے کوئی اولاد نہ ہو۔ پس اگر کوئی ہو تو اُن کے لئے آٹھواں ہے تمھارے ترکہ میں سے بعد وصیت کے جو تم نے کی ہو یا قرضہ ہو۔

اس آیت سے انھوں نے یہ دیکھا کہ بیوہ عورت کے لئے اس آیت میں صاف صاف معین حصہ شوہر کے ترکہ میں سے معیّن ہے تو انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پہلی آیت سے جو اُنھوں نے پہلا اور

دوسرا حکم استخراج کیا تھا وہ دونوں حکم بھی اس آیت سے منسوخ ہو گئے اور یہ آیت اُن کی ناسخ ہے۔

ہر سمجھ دار آدمی یہ بات جانتا ہے کہ مذہب اسلام میں فقہاء کا ایسا درجہ نہیں ہے جیسا کہ عیسائی مذہب میں پوپ کا درجہ ہے جس کو عیسائی خطا اور نسیان سے مبرا سمجھتے ہیں مسلمانوں کے مذہب میں قرآن مجید ہر شخص کی دست رس میں ہے اور ہر شخص کو اس میں حق بات تلاش کرنے کا اختیار ہے۔ ہر مسلمان اس بات کا مجاز ہے کہ اگر وہ چاہے تو مذکورہ بالا تینوں مسئلوں کو جو فقہا نے مذکورہ بالا آیت سے اخذ کئے ہیں اور جو درحقیقت ایک مسئلہ بھی ان مسئلوں میں سے اس آیت سے اخذ نہیں ہو سکتا، نہ مانے اور صاف کہدے کہ ان آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ایک دوسرے کی ناسخ و منسوخ نہیں ہے۔ پس کسی آیت کو ناسخ اور کسی کو منسوخ قرار دینا صرف فقہاء کی رائے ہے جو اُنھوں نے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقہ کی تسہیل کے لئے اختیار کی ہے مگر اُس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے لازم نہیں آتی۔

مگر افسوس یہ ہے کہ عیسائی عالموں نے جو سمجھا ہے اُس میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے۔ مشہور و معروف مورخ گبن اور ہمارے زمانہ کے بڑے عالم سر ولیم میور نے ناسخ و منسوخ کی اصطلاحوں کے صحیح اور اصلی معنوں سے جن میں ہمارے فقہاء نے ان کو مستعمل کیا تھا ناواقفیت کی وجہ سے صریح مغالطہ کھایا ہے اور وہ خیالات بیان کئے ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ "مرضی الہی کے دائمی اور کامل انداز کی بجائے آیات قرآن (مجید) محمد (صلعم) کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں۔ ہر وحی اُن کی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول سے کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیل یا ترمیم ہو گئی ہے رفع ہو گیا ہے"۔

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے مگر مسلمان اس اجتماع ضدین کی تطبیق کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ تاہم بمجبوری ان کو معترف ہونا پڑا ہے کہ قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں"۔

اس خطبہ کے شروع میں ہم نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دو قسم کی وحی نازل ہوتی تھی۔ اول وحی متلو یعنی کلام اللہ۔ دوم وحی غیر متلو یعنی حدیث۔ یہ ممکن ہے کہ بعض شخصوں نے غلطی سے دوسری قسم کی وحی کو پہلی قسم کی وحی سمجھا ہو اور اُن کو قرآن مجید میں نہ پاکر یہ گمان

کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہو گئی ہیں۔ اور جو کہ اُن کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا خود اُس کی غلطی ہے۔ علاوہ اس کے اس بات کے فرض کر لینے کے لئے کہ کوئی آیت ایسی تھی جس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی اور اس لئے قرآن مجید سے خارج رکھی گئی تھی کوئی سند نہیں ہے۔ چنانچہ ہم اس امر کی نسبت اس خطبہ کے اخیر میں پوری بحث کریں گے۔

کیا جناب پیغمبرِ خدا قرآن مجید کی کوئی آیت بھول گئے تھے

ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جناب پیغمبر خدا کو تمام قرآن من اولہ الی آخرہ جو نازل ہوا تھا، یاد تھا اور کبھی کوئی آیت آنحضرت نہیں بھولے نہ آپ کے دل سے محو ہوئی۔ اور تمام آیتیں جو آپ پر نازل ہوتی تھیں آپ کاتبوں سے لکھوا دیتے تھے اُس کی سند میں قرآن مجید کی ایک آیت کا اور بخاری کی ایک حدیث کا لکھ دینا کافی ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے کہ "ہم تجھ کو پڑھا دیں گے۔

سنقرئك فلا تنسیٰ الا ماشاء الله سو تو نہ بھولے گا مگر جو خدا چاہے۔"

(سورہ سبح اسم آیت ۶)

بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر اس طرح پر کی ہے (ہم تجھ کو پڑھا دیں گے) جبرئیل کی زبان

(سنقرئك) علی لسان جبرئیل او سنجعلك قاریا بالھام القراۃ (فلا تنسیٰ) اصلا من قوۃ الحفظ مع انك امی لیکون ذلك آیۃ اخری لك ... (الا ماشاء الله) نسیانہ بان نسخ تلاوتہ وقیل المراد بہ القلۃ والندرۃ لما روی انہ علیہ السلام اسقط آیۃ فی الصلوۃ فحسب ابی رض انھا نسخت فسالہ فقل نسیتھا

سے یا تجھ کو قاری کریں گے قرأت کے الہام سے (پس تو نہ بھولے گا) ہرگز حافظہ کی قوت سے باوجود اس کے کہ تو اَن پڑھ ہے تاکہ یہ ایک نشانی ہو دوسری تیرے لئے (مگر جو چاہے) اُن کا بھلا دینا اس طرح پر کہ اُس کی تلاوت منسوخ کر دی اور کہا گیا ہے کہ اُس سے مراد کم ہونا اور نادر ہونا ہے اس لئے کہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک آیت نماز میں چھوڑ دی۔ پس ابی رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ وہ منسوخ ہو گئی۔ سو حضرت سے پوچھا آپ نے فرمایا کہ میں بھول گیا۔ یا بھولنے کی مطلقاً نفی مراد ہے۔ کیونکہ قلت

او نفی النسیان واسا فان القلة تستعمل للنفی (بیضاوی) کا لفظ نفی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بیضاوی نے اول تو یہ لکھا ہے کہ "فلا تنسیٰ" سے یہ مطلب ہے کہ پیغمبر صاحب قرآن کو ہرگز نہیں بھولنے کے۔ "الا ماشاء اللہ" کے لفظ میں اُس نے تین رائیں قائم کی ہیں۔ ایک یہ کہ منسوخ شدہ آیت کو بھول جائیں گے۔ یہ صرف اس کی رائے ہے قرآن مجید سے اس پر کوئی نص نہیں ہے۔ دوسری رائے اُس نے ایک حدیث پر قائم کی ہے کہ آپ ایک آیت پڑھنی بھول گئے تھے۔ اگر ہم اُس حدیث کو صحیح تسلیم کرلیں تو بھی اُس سے بھول جانا کسی آیت کا یعنی دل سے محو ہو جانا ثابت نہیں ہو سکتا۔ تیسری رائے اُس کی نسیان سے قطعی انکار کی ہے۔ یہ رائے صحیح ہے گو کہ جو وجہ اُس نے لکھی ہے وہ خود اُس کے دل کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

قرآن مجید کا طرز بیان یہ ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے قادر مطلق ہونے کے اظہار کے لئے ہر ایک حکم اور ہر ایک امر کے ساتھ جملہ استثنائیہ فرماتا ہے مگر اُس سے درحقیقت یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقع بھی ہو گا بلکہ اُس سے محض اظہار قدرت مراد ہوتا ہے اس کی سینکڑوں مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ پس اس مقام پر بھی جملہ استثنائیہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ درحقیقت آنحضرتؐ کسی آیت کو بھول گئے تھے یا بھول جائیں گے۔ بلکہ صرف اظہار قدرت کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم قرآن کا کوئی جزو نہیں بھولو گے۔ لیکن جس کو کہ خدا چاہے۔ زمخشری جو علم عربیت کا بہت بڑا عالم ہے۔ یہی بات لکھتا ہے کہ اس جملہ سے استثناء مراد نہیں ہے اور اُس کی مثال اس طرح پر دی ہے۔ کہ مثلاً کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے کہ جو کچھ میری ملکیت میں ہے اُس میں تو بھی شریک ہے۔ مگر جو خدا چاہے۔ تو اس طرح کہنے سے کسی چیز کا استثناء کرنا شریعت سے مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس مقام پر بھی جملہ استثنائیہ سے کسی آیت کا مستثناء کرنا مقصود نہیں ہے۔

فی الکشاف کما تقول لصاحبك انت سھیمی فیما املك الا ماشاء اللہ لا یقصد استثناء شیء (کشاف)

بخاری میں اسی کے متعلق دو حدیثیں حضرت عائشہ سے مذکور ہیں۔ پہلی حدیث یہ ہے کہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو مسجد میں پڑھتے سُنا پس کہا کہ خدا اُس پر رحم

عن عائشہ سمع النبی صلعم رجلا یقرأ فی المسجد فقال یرحمہ اللہ لقد

اذکرنی کذا اٰیۃ من سورۃ کذا

(بخاری باب نسیان القرآن)

کرے۔ مجھ کو یہ آیتیں اُس سورۃ سے یاد دلائیں۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عن عائشۃ قالت سمع رسول اللہ صلعم رجلا یقرأ فی سورۃ باللیل فقال یرحمہ اللہ لقد اذکرنی کذا و کذا اٰیۃ کنت اُنسیتھا من سورۃ کذا

(بخاری باب نسیان القرآن)

نے ایک شخص کو ایک سورۃ پڑھتے سُنا رات کو پس فرمایا کہ خدا اُس پر رحم کرے مجھ کو فلاں فلاں آیتیں یاد دلائیں جن کو میں فلاں سورۃ سے بھول گیا تھا۔

اول تو ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسجد میں ہوا تھا اور اس بات پر یقین نہیں ہو سکتا کہ حضرت عائشہ خود موجود تھیں۔ کیونکہ اُس کا کوئی اشارہ اُن حدیثوں میں نہیں ہے۔ اور اس لیے یہ حدیثیں قابل استدلال نہیں۔ دوسری وجہ ان حدیثوں کے قابل استدلال نہ ہونے کی یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں نہیں بیان کیا کہ وہ آیت کونسی تھی جس کو آنحضرتؐ بھول گئے تھے اور نہ یہ بیان کیا ہے کہ کس سورۃ کی وہ آیت تھی۔ قطع نظر اس کے مسلمان جو نسیان سے انکار کرتے ہیں اُس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی آیت آنحضرت کے سینہ مبارک سے محو نہیں ہو گئی تھی کہ ہمیشہ کے واسطے معدوم ہو گئی ہو۔ اگر اس نسیان کو جو ان حدیثوں میں مذکور ہے تسلیم بھی کر لیں تو اُس کا نتیجہ صرف اتنا ہے کہ جس وقت اُس شخص نے وہ آیت پڑھی اُس وقت آنحضرتؐ کو اُس کا خیال نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خوب یاد دلایا۔ یہ امر بمقتضائے بشریت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم بشریت سے آنحضرت کو مبرا نہیں کرتے ہیں۔ اُس آیت کا یاد آجانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کے سینۂ مبارک سے وہ آیت محو نہیں ہوئی تھی۔

قرآن مجید حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں کس طرح جمع ہوا

قرآن مجید کے جمع ہونے کا صحیح اور کامل بیان حضرت ابوبکر کی خلافت میں بخاری کی ایک صحیح اور معتبر حدیث میں مذکور ہے جس کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور وہ حدیث یہ ہے۔

عن زید ابن ثابت قال ارسل الی ابوبکرؓ عند مقتل اھل الیمامۃ فاذا

زید ابن ثابت کہتے ہیں کہ مجھ کو ابوبکر نے اہل یمامہ کے قتل کے زمانہ میں بُلا بھیجا۔ عمر بن خطاب بھی وہاں موجود

عمرؓ بن الخطاب عنده قال ابوبکرؓ ان
عمرؓ اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة
بقرأ القرآن وانی اخشیٰ ان استحر
القتل بالقراء بالمواطن فیذھب کثیر من
القرآن وانی اری ان تأمر بجمع القرآن
قلت لعمر کیف تفعل شیئاً لم یفعله رسول اللہ
صلعم قال عمر ھذا واللہ خیر فلم یزل عمر یرا
جعنی حتی شرح اللہ صدری لذلك ورأیت
فی ذلك الذی رای عمر قال زید قال
ابوبکر انك رجل شاب عاقل لا نتهمك
وقد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی
اللہ علیه وسلم فتتبع القرآن فاجمعه فواللہ
لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان
اثقل علی مما امرنی به من جمع القرآن
قال قلت لابی بکر کیف تفعلون شیئاً لم
یفعله رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم
قال ھو واللہ خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی
حتی شرح اللہ صدری للذی شرح له
صدر ابی بکر وعمر فتتبعت القرآن اجمعه
من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی
وجدت آخر سورة التوبة مع ابی خزیمة
الانصاری لم اجدھا مع احد غیره "لقد
جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما
عنتم" حتی خاتمة براءة وکانت الصحف
عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاته

تھے ابوبکر نے کہا کہ عمر میرے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کے
دن قرآن کے قاری کثرت سے قتل ہو گئے اور میں ڈرتا
ہوں کہ اور موقعوں میں بھی قاری کثرت سے مقتول ہوں
تو قرآن بہت سا جاتا رہے گا۔ اور میری یہ رائے ہوئی ہے کہ
تم قرآن کے جمع کرنے کا حکم کرو۔ میں نے عمر سے کہا تم
وہ کام کیونکر کرو گے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے نہیں کیا۔ عمر نے کہا خدا کی قسم یہ عمدہ بات ہے۔ عمر اسی
طرح مجھ سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا
سینہ اس کے لئے کھول دیا اور میں نے بھی اس کام میں
وہ فائدہ دیکھا جو عمر نے سوچا تھا۔ زید کہتے ہیں کہ ابوبکر نے کہا
تم جوان عاقل آدمی ہو تم پر ہم بدگمانی نہیں کر سکتے۔ اور تم رسول
اللہ صلعم کے لئے وحی لکھا کرتے تھے۔ پس قرآن کی جستجو کرکے
اُس کو جمع کرو۔ سو خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کے ہٹا دینے کو
کہتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا جتنا کہ قرآن کے جمع کرنے
کا حکم گراں معلوم ہوا میں نے ....
ابوبکر سے کہا تم لوگ وہ کام کیونکر کرو گے جس کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ ابوبکر نے کہا خدا کی قسم یہ
اچھا کام ہے۔ ابوبکر اسی طرح اصرار کرتے رہے یہاں تک
کہ خدا نے میرا سینہ اُس کے لئے کھول دیا جس کے لئے
ابوبکر و عمر کو خیال دلایا تھا۔ پس میں قرآن کو تلاش کرکے
جمع کرنے لگا۔ ہڈیوں اور سفید پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے
سینہ سے یہاں تک کہ سورہ توبہ کا اخیر میں نے ابو خزیمہ
انصاری کے پاس پایا اور کسی کے پاس نہیں۔ "لقد جاءکم
رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم" سے براۃ کے آخیر
تک۔ اور سب قرآن ابوبکر کے پاس تھے یہاں تک کہ خدا

ثم عند حفصۃ بنت عمر (رواہ البخاری)	نے ان کو وفات دی۔ پھر عمر کے پاس تھے اُن کی زندگی تک پھر حفصہ کے پاس جو عمر کی بیٹی تھیں۔

مذکورہ بالا حدیث سے تین امر کی قرار واقعی تصریح ہوتی ہے۔

اوّل:۔ حضرت عمر کے اس کہنے سے کہ یمامہ میں بہت سے قرآن کے قاری قتل ہو گئے ہیں۔ اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اور مقاموں میں سخت لڑائی ہو اور قرآن کے قاری بہت مارے جائیں تو اکثر حصہ قرآن کا ضائع ہو جائے گا۔ اس قول سے پایا جاتا ہے کہ اُس وقت تک بہت سے قاری جن کو قرآن مجید جس قدر کہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا تھا بخوبی یاد تھا موجود تھے۔

دوم:۔ ہم کو بدرجہ یقین ثابت ہوتا ہے۔ کہ بہت سے لوگوں کو قرآن مجید حفظ یاد تھا۔

سوم:۔ اس میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں تھی جو تلاش کے بعد چمڑے ہاڈیوں یا اور کسی چیز پر لکھی ہوئی نہ ملی ہو۔

ان تمام بیانوں سے جو اوپر مذکور ہوئے اور نیز عبد العزیز بن رفیع کی حدیث سے جس کو ہم ابھی نقل کریں گے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ زید ابن ثابت نے کل قرآن مجید کو بے کم وکاست جمع کر لیا تھا اور یہ قرآن جو بالفعل ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ بجنسہٖ وہی ہے۔ کوئی چیز اس میں چھوٹی ہوئی نہیں ہے۔

عن عبد العزیز بن رفیع قال دخلت انا وشداد بن معقل علی ابن عباس فقال له شداد بن معقل اترک النبی صلعم من شئ قال ماترک الا ما بین الدفتین قال ودخلنا علی محمد بن الحنفیۃ فسألناہ فقال ماترک الا ما بین الدفتین (بخاری)	عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقل ابن عباس کے پاس گئے۔ شداد نے اُن سے کہا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چھوڑا۔ ابن عباس نے کہا کچھ نہیں چھوڑا۔ مگر دو دفتیوں کے درمیان میں (یعنی قرآن) کہا اور گئے ہم محمد بن حنفیہ کے پاس اور اُن سے بھی پوچھا۔ انھوں نے کہا۔ کچھ نہیں چھوڑا۔ مگر دو دفتیوں کے درمیان میں۔

حضرت عثمانؓ جامع الناس علی القرآن کی خلافت میں قرآن مجید کی نقلوں کا تقسیم ہونا

وہی قرآن جس کو زید ابن ثابت نے جمع کیا تھا حضرت عثمانؓ کی خلافت تک محفوظ چلا آتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت میں اُس کی متعدد نقلیں مختلف ممالک میں بھیجیں۔ چنانچہ یہ امر نہایت تفصیل کے ساتھ بخاری کی حدیث میں مذکور ہے اور وہ حدیث یہ ہے :-

عن انس بن مالک ان حذیفۃ بن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اھل الشام فی فتح ارمینیۃ واذربیجان مع اھل العراق فافزع حذیفۃ اختلافھم فی القرأۃ فقال حذیفۃ لعثمان یا امیر المومنین ادرک ھذہ الامۃ قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیھود والنصاری فارسل عثمان الی حفصۃ ان ارسلی الینا بالصحف ننسخھا فی المصاحف ثم نردھا الیک فارسلت بھا حفصۃ الی عثمان فامر زید ابن ثابت وعبد اللہ ابن الزبیر وسعد بن العاص وعبد الرحمٰن بن الحارث بن ھشام فنسخوھا فی المصاحف وقال عثمان للرھط القرشین الثلثۃ اذا اختلفتم انتم وزید ابن ثابت فی شی من القراٰن (وفی حدیث "فی عربیۃ من عربیۃ القراٰن" باب نزل القراٰن بلسان قریش) فاکتبوہ

حذیفہ بن یمان عثمان کے پاس آئے اور وہ عراق والوں کے ساتھ اہل شام سے لڑے تھے۔ آرمینیہ و آذربیجان کی فتح میں۔ تو حذیفہ کو ان لوگوں کا قرأۃ قرآن میں مختلف ہونا رنج دہ ہوا۔ حذیفہ نے عثمان سے کہا اے امیر المومنین اس امت کی خبر لو قبل اس کے کہ قرآن میں مختلف ہو جس طرح یہود و نصاریٰ مختلف ہوئے۔ عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحیفے ہمارے پاس بھیج دو ہم نقل کر کے واپس بھیج دیں گے۔ حفصہ نے عثمانؓ کے پاس وہ صحیفے بھیج دیے۔ عثمان نے زید بن ثابت و عبداللہ بن الزبیر و سعد بن العاص و عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا۔ سو ان لوگوں نے اُن کو مصحفوں میں نقل کیا۔ اور عثمان نے تین قریشی گروہوں سے کہا کہ جب تم لوگ اور زید ابن ثابت قرآن کی کسی چیز میں اختلاف کرو (اور ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کی کسی عربیت کے متعلق اختلاف کرو دیکھو باب نزول القرآن بلسان قریش)، تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو، کیونکہ قرآن اُنھیں کی زبان میں اُترا ہے۔ پس اُن لوگوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب صحیفوں کو مصحفوں میں نقل کر لیا تو عثمان نے صحیفے حفصہ کے پاس واپس بھیج دیے۔ اور جو قرآن کے نسخے نقل ہوئے۔ اُن

بلسان قریش فانما نزل بلسانهم ففعلوا
حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد
عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی کل افق
بمصحف مما نسخوا وامر بما سواہ من القرآن
فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق قال ابن شهاب
واخبرنی خارجة بن زید بن ثابت انه سمع
زید بن ثابت قال فقدت آیة من الاحزاب
حین نسخنا المصحف وقد کنت اسمع رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرء بها
فالتمسناها فوجدناها مع خزیمة بن ثابت
الانصاری "من المؤمنین رجال صدقوا
ما عاهدوا اللہ علیه" فالحقناها فی
سورتها فی المصحف (رواہ البخاری)

کو ملک کے ہر ایک حصہ میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اُس کے سوا جو کچھ کہ کسی صحیفہ یا مصحف میں ہو سب جلا دیا جائے ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی کہ اُنھوں نے زید بن ثابت سے سُنا وہ کہتے تھے۔ کہ میں نے "احزاب" کی ایک آیت نہیں پائی قرآن کی نقل کرتے وقت۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو پڑھتے سُنا تھا۔ پس ہم نے اُس کی جستجو کی پس خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس یہ آیت پائی۔ "من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا اللہ علیه" پس اُس کو اس کی سورت میں مصحف میں ملا دیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ جملہ "اختلافهم فی القرأت" سے وہی اختلاف قرأت مراد ہے جس کا بیان شرح و بسط سے اوپر ہو چکا ہے۔ اور جملہ "فی عربیة من عربیة القرآن" جس کو ہم نے دو خطوط ہلالی میں لکھا ہے اور جو ایک اور حدیث کا ٹکڑا ہے۔ اس مطلب کو زیادہ تر واضح کرتا ہے حضرت عثمان کی خلافت میں جو نقلیں ہوئی تھیں وہ بالکل مطابق اصل کے تھیں اور اُن میں کسی طرح تغیر و تبدل یا کمی و بیشی نہیں کی گئی تھی۔ لہجہ یا صیغوں کے تلفظ کا جو اختلاف عرب کی زبانوں میں تھا۔ اُس کا بھی کچھ نشان نہ تھا۔

زید ابن ثابت کی پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ توبہ کا اخیر حصہ خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا تھا۔ لیکن اس روایت میں بیان ہے کہ سورہ احزاب کی ایک آیت خزیمہ انصاری کے پاس سے نکلی تھی۔ ان دونوں بیانوں میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ جس زمانہ میں زید ابن ثابت نے قرآن کو جمع کیا تھا۔ اُس زمانہ میں سورہ توبہ کا آخری حصہ بھی خزیمہ کے پاس سے ملا ہوگا اور سورہ احزاب کی آیت بھی اُنھیں کے پاس سے نکلی ہوگی۔ اس آخری روایت سے یہ سمجھنا کہ احزاب کی آیت بروقت نقل کرنے قرآن کے دستیاب ہوئی تھی یہ غلطی ہے کیونکہ یہ ذکر بھی

اس روایت میں اُسی وقت کا ہے کہ حضرت ابوبکر کے وقت میں زید ابن ثابت نے قرآن جمع کیا تھا۔ اور اگر فرض کریں کہ یہ ذکر اُس وقت کا ہے جب کہ قرآن کی نقلیں ہوتی تھیں تو بھی ممکن ہے کہ اُس جمع کئے ہوئے قرآن میں سے وہ آیت کسی طرح خراب ہوگئی ہو اور پھر تلاش سے خزیمہ کے پاس سے ملی ہو۔ یا ابن شہاب کو یا حضرت انس کو اس روایت کے بیان کرنے میں کچھ اشتباہ واقع ہوا ہو۔

قرآن مجید کا اپنے طرز میں کامل ہونا اس کے الہامی الاصل ہونے کو ثابت کرتا ہے

اس موقع پر ہم بشپ ڈرلٹن کے بیان کو جو ایک عالم اور فاضل آدمی تھا نظر انداز نہیں کرسکتے وہ بیان کرتا ہے کہ "یونانی توریت اور انجیل سے بالکل جہالت اور وحشیانہ پن ظاہر ہوتا ہے اور جملہ عیوب سے جن کا کسی زبان میں پایا جانا ممکن ہے بھری ہوئی ہیں۔ مگر ہم کو از روئے فطرت کے خود بخود یہ توقع ہوتی ہے کہ الہامی زبان کا سلیس اور لطیف عمدہ پر اثر ہونا چاہیئے۔ اور اُس کا عام کلام کی قوت اور اثر سے بھی متجاوز ہونا ضرور ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہوسکتی جس میں کسی قسم کا نقص ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو افلاطون کی سی لطافت اور سسرو کی سی بلاغت کا متوقع ہونا چاہیئے۔"

اب چونکہ قرآن مجید اپنی طرز میں کامل ہے اس واسطے اُس کا الہامی الاصل ہونا لازم آتا ہے اور اسی طرح اُس کا الہامی الاصل ہونا اُس کے کامل النوع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ انسان سے جو خود ضعیف البنیان اور مرکب من الخطاء والنسیان ہے کوئی کامل اور بے عیب شے پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی امر کی نسبت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیتیں دعویٰ کرتی ہیں۔

پہلی آیت یہ ہے خدا فرماتا ہے کہ "اور اگر تم شک میں ہو اُس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری پس لاؤ اُسی کی سی ایک سورۃ اور بلاؤ اپنے گواہوں کو خدا کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پس اگر نہ کرو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو بچو اُس آگ سے جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ جو کافروں کے

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا

الناس والحجارۃ اعدت للکافرین۔ لئے تیار کی گئی ہے۔

(سورہ بقر، آیت ۲۱و۲۲)

دوسری آیت یہ ہے خدا فرماتا ہے کہ "کہدے کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا پر اتفاق کریں کہ اس قرآن کا مثل لائیں تو نہ لا سکیں

بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان گے۔ گو ایک دوسرے کے مددگار رہوں"

بعضھم لبعض ظھیرا (سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۰)

ان آیتوں کا مقصود و مدعا وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ انسان ضعیف البنیان کی بنائی ہوئی کوئی چیز کامل النوع نہیں ہو سکتی۔ بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جو خود ذات کامل ہے ہر شے کامل النوع کا مخرج ہے اور یہ امر اس بات پر غور کرنے سے اور بھی زیادہ واضح اور غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ قدرت کی سب سے زیادہ سادہ اور سب سے کم پیچیدہ اشیاء میں سے ایک چیز کی بھی کسی مصنوعی شے نے ہمسری نہیں کی ہے۔ سبقت لے جانا تو درکنار۔

اگرچہ یہ بات ممکن ہے کہ انسان کوئی ایسی چیز بنائے جو اور مصنوعی چیزوں کے وسیع دائرہ میں یکتائی کا دعویٰ کرے اور باوجود اس کے کہ اور اشخاص اُس کی خوبی تک پہنچنے کے لئے بہت کچھ جد و جہد کریں اور اُس تک نہ پہنچ سکیں تاہم اُس کو کامل النوع کہنا ٹھیک اور جائز نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کی خوبی چار چیزوں سے ثابت ہوتی ہے (۱) اُس کے نہایت صاف اور شستہ دل پر اثر کرنے والی اور چھانے والی فصاحت و بلاغت سے (۲) اس کے اصول متعلق بہ دینیات سے (۳) اُس کے اخلاقی اصول سے (۴) قانون سیاست اور انتظام مدن کے اصول سے جو اُس میں مندرج ہیں۔ ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو محض اہل عرب سے متعلق تھی۔ کیونکہ قرآن مجید انھیں کی زبان میں نازل ہوا تھا اور وہی دعوے بے مثلی کر رہے تھے۔ باقی تین چیزیں تمامی جہان کی طرف خطاب کی گئی تھیں اور ہم اپنے مخالفوں اور حریفوں کے روبرو جرأت اور اعتماد سے دعوے کرتے ہیں کہ کسی غیر الہامی شخص نے اُس کا مثل نہ تو پیدا کیا ہے اور نہ کوئی قیامت تک پیدا کر سکے گا۔

جو اصول کہ ہم نے اوپر بیان کئے اُن سے مشہور مؤرخ گبن محض ناواقف تھا اور اسی ناواقفی کے سبب سے اُس نے مغالطہ کھایا ہے جہاں اُس نے یہ بیان کیا ہے کہ "پیغمبر خدا حرارت مذہبی یا جوش کی حالت میں اپنی رسالت کی صداقت کو اپنے قرآن کی خوبی پر منحصر کرتے ہیں۔

اور انسان اور ملائک دونوں کو اپنے قرآن کے ایک صفحہ کی بھی خوبیوں کی برابری کرنے کے لئے قسم دلاتے ہیں اور جوش سے دعوے کرتے ہیں کہ ایسا بےنظیر کلام صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہو سکتا ہے۔ یہ دلیل نہایت استحکام کے ساتھ ایک سرگرم عرب کی طرف خطاب کی گئی ہے جس کا دماغ ایمان اور کیفیت کے واسطے موزوں ہے اور جس کا کان سُریلی آوازوں سے مسرت اندوز ہوتا ہے اور جس کی بےعلمی انسانی ذہانت کے ایجادوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ طرزبیان کی فصاحت اور بلاغت ترجمہ کے ذریعہ سے یورپ کے کافروں تک نہیں پہنچ سکتی وہ اُس کے قصے اور احکام اور بیان کی اُس بے انتہا ناموزوں بےربطی کو جس سے کسی قسم کا تصور و خیال بہت کم پیدا ہوتا ہے جو کبھی تو خاک پر غلطاں ہوتا ہے اور کبھی بادلوں کے پار ہو جاتا ہے نہایت بےصبری کے ساتھ پڑھتے ہیں۔" مگر ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کی بےمثل فصاحت و بلاغت کا دعویٰ محض اہل عرب کے واسطے مخصوص تھا نہ اور ملک کے لوگوں کے لئے اس لئے مسٹر گبن کا بیان کچھ اِس دعوے کے مخالف نہیں ہو سکتا۔

پھر یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ "اگر قرآن کی تحریر استعداد انسانی سے متجاوز ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈی موستھنیز کی فلپکس کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنی چاہیئے" مگر ہم کسی ایسی مصنوعی شے کے وجود کے امکان کا اوپر اقرار کر چکے ہیں جس کو خوبی سے کوئی اور چیز ہمسری نہ کر سکے اور جو اُسی نوع کی اور مصنوعی اشیاء کے تمام دائرہ میں ہمیشہ دعوے یکتائی کرتی رہے بایں ہمہ یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ وہ اپنی نوع میں کامل ہو۔

یہی مؤرخ پھر بیان کرتا ہے کہ "اوصافِ الٰہی کا بیان رسول عرب کی قوت مدرکہ کو اعزاز بخشتا ہے۔ لیکن اُن کے بلند ترین خیالات صحیفہ ایوب کی ذی شان سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اُسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں۔"

ہم مسٹر گبن کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ مسٹر گبن میں قرآن مجید اور صحیفہ ایوب کے باہمی تفرق کی نسبت حکم دینے کا مادہ نہیں ہے۔ لیکن ہم بدوں خوف اعتراض کے کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم عربی دانوں نے قرآن مجید کو بلحاظ فصاحت و بلاغت کے بےمثل قرار دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اُس سے سبقت نہیں لے گئی اور نہ لے جا سکے گی۔ لبید سا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورہ بقر کی چند آیتوں کو سُن کر متحیر ہو گیا اور اُس کی بلاغت کا انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا اور آنحضرت کی رسالت کو قبول کر لیا۔

چند اور عیسائی عالموں نے بھی اسی کے موید رائیں قرآن مجید کی نسبت لکھی ہیں جن کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ "میرے نزدیک قرآن مجید میں سچائی کا جوہر اُس کے تمام معانی میں موجود ہے جس نے کہ اس کو وحشی عربوں کی نظروں میں بیش بہا کردیا تھا۔ سب سے آخیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب یعنی قرآن سب سے اول اور سب سے آخیر جو عمدگیاں ہیں وہ اپنے میں رکھتا ہے اور ہر قسم کے اوصاف کا بانی ہے بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف کی بنا صرف اُسی سے ہوسکتی ہے۔"

مسٹر گاڈفری ہگنز لکھتے ہیں کہ "حضرت مسیح کی انجیل کی طرح قرآن مجید غریب آدمی کا دوست اور غم خوار ہے۔ بڑے آدمیوں اور دولت مند آدمیوں کی ناانصافی کی ہر جگہ مذمت کی گئی ہے وہ آدمیوں کی باعتبار مدارج کے توقیر نہیں کرتا ہے۔ یہ امر اُس کے مصنف کی لازوال نیک نامی کا موجب ہے (خواہ وہ محمد عرب کے نامی پیغمبر ہوں یا اُس کے تیسرے خلیفہ عثمان) (واضح ہو کہ گاڈفری ہگنز کا یہ اعتقاد تھا کہ قرآن حضرت عثمان کا تصنیف کیا ہوا ہے) کہ اس میں ایسا ایک بھی کوئی حکم نہیں بتلایا جاسکتا ہے جس میں پولٹیکل خوشامد و رواداری کی طرف ذرا سا بھی میل ہو اور جس طرح کہ ویسٹ منسٹر ریویو نے منصفانہ رائے وہی ہے کہ اگر کسی خود مختار مشرقی حاکم کو کوئی چیز کبھی روک سکتی ہو تو وہ غالباً قرآن مجید کی ایک بے تکلف آیت کسی باجرأت مظلوم کی زبانی ہوگی۔"

ایک اور مصنف نے کوارٹرلی ریویو میں قرآن مجید کی نسبت یہ مضمون لکھا ہے کہ "اُن تبدیلات مضامین میں جو مثل برق کے تیز و طرار ہیں اس کتاب کی ایک نہایت بڑی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اور گیتھ کا یہ قول بجا ہے کہ جس قدر ہم اُس کے قریب پہنچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ ہمیشہ دور کھچتی جاتی ہے۔ یعنی زیادہ اعلےٰ معلوم ہوتی ہے وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے پھر متعجب کرتی ہے اور آخر کار فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے۔"

وہی مصنف ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ "شادی اور غم محبت اور بہادری اور جوش کے وہ عظیم الشان اظہارات جن کی محض ضعیف آواز ہائے بازگشت اب ہمارے کانوں پر اثر کرتی ہیں محمد کے وقت میں پوری پوری آواز رکھتے تھے اور محمد کو سب سے زیادہ نامی اور گرامی لوگوں سے کچھ ہمسری ہی کرنی نہیں پڑی تھی، بلکہ اُن پر فوقیت حاصل کرنی تھی اور اپنے کلام کو اپنی رسالت

کی علامت اور دلیل گردانتا پڑا تھا"۔

ایک اور مقام پر یہی مصنف لکھتا ہے کہ "ہم دفعتہً ازراہ ترجیح اس عجیب کتاب کی ماہیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہان سے بڑا جہان اور روم کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی اور جس قدر زمانہ کہ روم کو اپنی فتوحات حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا اُس کا دسواں حصہ بھی اُن کو نہ لگا۔ ایسی کتاب جس کی اعانت سے جملہ بنی سام میں یہی لوگ بہ حیثیت سلاطین یورپ میں آئے تھے جہاں کہ اہل فنیشیا تاجروں کی حیثیت سے اور یہود پناہ گیروں یا قیدیوں کی طرح پر آتے تھے۔ یہی لوگ مع اپنے پناہ گیروں کے یورپ کو انسانیت کی روشنی دکھلانے کے واسطے آئے تھے۔ یہی لوگ جب کہ تاریکی محیط ہو رہی تھی یونان کی مُردہ عقل اور علم کو زندہ کرنے اور اہل مغرب اور اہل مشرق کو فلسفہ۔ طب۔ ہئیت اور نظم لکھنے کا خوش نما اور دلچسپ فن سکھلانے اور علوم جدیدہ کے بانی مبانی ہوئے تھے۔ اور ہم لوگوں کو غرناطہ کی تباہی کے دن پر ہمیشہ کے واسطے رُلانے کو آتے تھے۔

مسٹر سیل اس طرح پر لکھتے ہیں کہ "یہ بات علی العموم مسلّم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے انتہا کی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اور زبانوں کی بھی کسی قدر آمیزش ہے گو وہ آمیزش بہت ہی قلیل ہے۔ وہ لاکلام عربی زبان کا نمونہ ہے اور زیادہ پکّے عقیدہ کے لوگوں کا یہ قول ہے اور نیز اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا۔ (گو بعض فرقوں کی مختلف رائے ہے) اور اسی واسطے اس کو لازوال معجزہ قرار دیا ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنی ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لئے اکیلا کافی ہے اور خود محمدؐ نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لئے اسی معجزہ کی طرف رجوع کیا تھا اور بڑے بڑے فصحائے عرب کو (جہاں کہ اُس زمانہ میں اس قسم کے ہزار ہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ شغل اور حوصلہ تھا کہ طرز تحریر اور عبارت آرائی کی لطافت میں لائق اور فائق ہو جائیں) علانیہ کہلا بھیجا تھا اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ بھی بنا دو۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ اس کتاب کی خوبی تحریر کی اُن ذی لیاقت لوگوں نے دراصل تعریف و توصیف کی تھی جن کا اصل کام میں مبصر ہونا مسلّم ہے منجملہ بے شمار مثالوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہوں۔ لبید ابن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمدؐ کے زمانہ میں سب سے

بڑے زباں آوروں میں تھا. خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا دیہ رتبہ نہایت اعلیٰ تصنیف کے واسطے مرعی تھا، اور کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں کسی اپنی تصنیفات کو پیش کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی آیتیں اُس کے مقابلہ میں لگائی گیئں تو خود لبید (جو اُس زمانہ میں مشرکین میں سے تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر بحر تحیر میں غوطہ زن ہوا اور فی الفور مذہب اسلام قبول کر لیا۔ اور بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبیؐ ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں ... قرآن کا طرز تحریر عموماً خوش نما اور رواں ہے بالخصوص اُس جگہ جہاں کہ وہ پیغمبرانہ وضع اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر اور بعض مقامات میں مبہم ہے اور مشرقی ڈھنگ کے موافق پُرحیرت صنعتوں سے مرصع اور روشن اور پُرمعنی جملوں سے مزین ہے اور اکثر جگہ اور علی الخصوص اُس مقام پر جہاں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان ہے نہایت عالی درجہ اور رفیع الشان ہے۔

سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مورخوں کی غلطیاں قرآن مجید کی نسبت

عیسائی عالموں نے قرآن مجید کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اگرچہ وہ صریحًا لغو اور بیہودہ ہے تاہم اُس پر نظر ڈالنے اور اُن غلطیوں کو بیان کرنے سے درگذر نہیں کی جا سکتی۔

مسلمان بادشاہ ہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کرتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے۔ یورپ کی زبان میں جس قدر اُس کے ترجمے ہوئے وہ غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کئے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شائع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت پر جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اُس کے ساتھ لگی ہوتی تو اُس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا ہے جن کی وساطت سے یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی"۔

مگر ہم بعض عیسائی مصنفوں کے جیسے کہ مسٹر سیل ہیں شکر گذار ہیں کہ انھوں نے قرآن مجید کے انگریزی میں ترجمہ کرنے میں بہت کوشش کی ہے ۔ اگر اس میں کہیں غلطی ہے تو مفسرین کی صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز نہ کرنے کے سبب سے ہے جو درحقیقت مسٹر سیل کے لئے ایک نہایت مشکل کام تھا ۔

مگر اُن عیسائی عالموں پر تعجب ہوتا ہے جنھوں نے عجیب عجیب خیالات اور ایسے خیالات جن کی کچھ بنیاد نہیں معلوم ہوتی قرآن مجید کی نسبت ظاہر کئے ہیں ۔ ہمفری پریڈو ڈین آف نارو چ نے لکھا ہے کہ "محمد (صلعم) لوگوں کو سکھاتے تھے کہ اس کتاب (یعنی قرآن) کا اصلی مسودہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے اور جبرئیل میرے پاس ایک ایک سورۃ کی نقل جس کی لوگوں میں شائع کرنے کی حسب موقع ضرورت ہوا کرتی ہے لایا کرتے ہیں"۔

یہ بیان ایک ایسا بیہودہ بیان ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے ۔ جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گذرتا ہے ۔ تو وہ متعجب اور متحیر رہ جاتے ہیں ۔ کہ یہ کہاں سے اور کیونکر لکھا گیا ہے ۔

مشہور مؤرخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "وجود قرآن بقول آنحضرت کے یا اُن کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے ۔ اُس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلک اول پر لے آئے تھے"۔

لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اُس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق ایک فلسفی مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہنچا ۔

ڈین پریڈو کی نادرست مگر دلچسپ ایجادیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں ۔ اُن کا بیان ہے کہ "محمد (صلعم) کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی اور اُنھوں نے اُس کو ایک صندوق میں رکھا تھا جس کا نام صندوق رسالت تھا اور ابوبکر نے جو اُن کے جانشین ہوئے سب سے اول اُس کو جمع کیا ۔ کیونکہ جب مسیلمہ نے انھیں کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا دعوے کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی اُمید میں اسی طرح اُس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اُس کی ایک کتاب بنا کر اپنے متبعین میں شائع کی ۔ اُس وقت

ابوبکر نے ۔محمد (صلعم) کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا"۔

یہ چند مثالیں منجملہ اُن سینکڑوں بیہودہ باتوں کے جو عیسائی مصنفوں کی جملہ تحریرات میں اسلام کی نسبت پائی جاتی ہیں ۔سر ولیم میور نے ایک معقول قاعدہ منصفی کا برتا ہے اور اپنے استدلات میں مسلمانوں کی دینیات سے کسی قدر واقفیت ظاہر کی ہے ۔لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انھوں نے بحث کے واسطے صرف اُن روایتوں کو منتخب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں. یا اُن کے مطلب اور مقصد میں مختلف الرائے ہیں ۔

اُنھوں نے اولاً اپنی تمام لیاقتوں کو اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا ہے کہ محمد صلعم کے عہد میں نوشت وخواند عرب میں معدوم نہ تھی اور "وحی بالعموم کھجور کے پتوں یا چمڑے یا پتھروں یا اور ایسی بے جوڑ اشیاء پر جو سر دست دستیاب ہوتیں ...... لکھ لی جایا کرتی تھی" مگر اس امر سے ہم نے خود اقرار کیا ہے اور کسی مسلمان کو اس سے کبھی انکار نہیں ہوا بلکہ اس کو توہم قرآن مجید کے لفظ بہ لفظ محفوظ ہونے کا جیسا کہ پیغمبر خدا پر نازل ہوا تھا سب سے قوی دلیل خیال کرتے ہیں ۔

سر ولیم میور آیات کے منسوخ ہونے کی نسبت کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کرتے ہیں جو کہ حسب قاعدہ اسلام درست نہیں ہے اور اُس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے مثلاً اُن کا بیان ہے کہ "اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مدعا تھا جو ایسے حالات کی وجہ سے عارضی ہوا تھا جس کی عظمت بہت جلد جاتی رہی اور یہ امر مشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ آیا پیغمبر صاحب کا منشا اس قسم کی آیات سے اُن کی عام عظمت یا اُن کی ترویج تھی یا نہیں ۔قرینہ اس کو نہیں چاہتا کہ اُن حصوں کے نگاہ رکھنے کی اُنھوں نے کوشش کی ہو"۔

یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنی نہ سمجھنے کے سبب یا غلط سمجھنے کے سبب ہوئی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں اُن معنوں میں قرآن مجید کی مطلق کوئی آیت منسوخ نہیں ہے ،اور اگر اُس لفظ کے وہ معنی لئے جائیں جس میں مسلمان فقیہوں نے اُس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب بھی کوئی آیت عارضی مدعا کی قرآن مجید میں موجود نہ تھی اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی ۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں مارکسی اور ویلس سے مندرجہ ذیل روایتیں نقل

کرتے ہیں" - ایک روایت ہے کہ عبداللہ ابن مسعود نے محمد صلعم کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا اور صبح کو اُس کو کاغذ پر سے اُڑا ہوا پایا۔ جس کی نسبت پیغمبر صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اُڑ گئی - اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزہ نما مضمون اور اضافہ کر دیا گیا کہ اُس آیت کا اُڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا"

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا بھی نام معلوم نہیں گروشیس کے کبوتر کی مانند ایک صریح ایجاد ہے اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور "بلا شک بناوٹ ہے"

سر ولیم میور نے ایک نئی اصطلاح "وحی کامل" کی مسلمانوں کے مذہب میں قائم کی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے موافق ہے اور پھر اُس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "وحی کامل" سے میری مراد بلا شک اُس وحی سے ہے جو محمد (صلعم) کے آخر زمانہ میں موجود اور مروّج تھی۔ علاوہ اُس کے جو شاید ضائع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو"

اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں - شاید "آیات محکم" کا ترجمہ سر ولیم میور نے "وحی کامل کیا ہو لیکن آیات محکم" کے وہ معنی نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے بیان کئے ہیں۔ لیکن اگر ہم سر ولیم میور کی اصطلاح کو تسلیم کریں تو وحی کامل کا اطلاق اُن سب وحیوں پر ہو گا جو جناب پیغمبر خدا پر نازل ہوئی تھیں - اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضائع یا غارت یا غیر مستعمل نہیں ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی ترتیب کی نسبت سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "قرآن جس طرح کہ ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (صلعم) نے اُس کے ہمیشہ اسی تسلسل میں پڑھنے کے واسطے فرمایا ہو - مضامین کی ابتر ملاوٹ" زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی کسی جزو کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو بعض اوقات اُس آیت سے پیشتر واقع ہونا جو بہت عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہوئی ہو۔ کسی احکام کا ایسے احکام کے پیچھے ملحق ہونا جو اُس کی تنسیخ یا ترمیم کرتا ہو۔ یا کسی دلیل کا دفعتۃً ایسے فقرہ کے حائل ہو جانے سے منقطع ہو جانا جو اُس کے مقصد کے موافق نہ ہو یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی رہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی کامل ترتیب محمد (صلعم) کی حیات میں مستعمل اور مروّج تھی"

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اُس طرز میں جس میں کہ قرآن مجید ہے ایسی باقاعدہ ہے اور بلحاظ معنی کے اپنی طرز خاص میں ایسی منظوم ہے کہ اُس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ بہت سی کتابیں محض اُس علاقہ کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے مابین موجود ہے۔ قرآن مجید کی عبارت ایسی موجز اور مختصر ہے کہ دو آیتوں کے علاقہ باہمی کی جن کے معنی بادی النظر میں ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے ہیں کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور اُن لوگوں کو جو اُس سے ناواقف ہوتے ہیں "گونجنے والی، اور سامعہ خراش۔ ابتر۔ خام۔ بے مہری۔ مکرر بیانی۔ طول کلام۔ اور الجھاوٹ بنہایت خام اور مہمل" جیسا کہ سرولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ وہ خدا کا کلام ہے اور بجنسہ وہی الفاظ لکھ لئے گئے ہیں۔ کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے۔ تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے اُن کو محذوف رکھتا ہے مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا۔ عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ شان نزول آیتوں کی اُن کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے مگر مسلمانوں کو ایسا نہیں ہوتا۔

ہم افسوس سے بیان کرتے ہیں کہ سرولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں ہیں۔ اگر وہ کسی مخصوص آیتوں کا نشان دیتے جن میں اُن کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جابجا بے ربطی ہو یا اُن براہین کا جو اُن کے نزدیک دفعتہً کسی ایسے فقرہ کے حائل ہوجانے سے منقطع ہو گئے ہوں جو اُن کے مدعا سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اُس وقت ہم یقیناً صاحب موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے اور آیات کے واقعی علاقہ باہمی کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ بلحاظ سرولیم میور کے اُس بیان کے "جو کسی احکام کے پیچھے کسی ایسے احکام کے ملحق ہونے کے باب میں ہے جو اُس کی ترمیم یا تنسیخ کرتا ہو"۔ بارہا ہم لکھ چکے ہیں کہ اُن اصلی معنوں کی ناواقفیت جن میں کہ علماء اسلام نے اصطلاحات ناسخ و منسوخ کو در اصل استعمال کیا تھا ایسے لئیق مصنف کے قلم سے ایسا بیان نکلا ہے۔

حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں قرآن مجید کے یکجا جمع ہونے کے طریقہ کو بیان کر کے سرولیم میور حضرت عثمان کی خلافت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اصلی جلد جو پہلی دفعہ

مرتب ہوئی حفصہ کے گھر میں دستیاب ہوئی اور ایک پُر غور نظر ثانی عمل میں آئی۔ اگر زید اور اُن کے ساتھیوں میں کوئی اختلاف پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی اس وجہ سے کہ محاورہ قریش سے واقف تھے۔ اور اس نئے مجموعہ کی اس طرح سے مکیّ زبان میں تطبیق کر دی جس میں کہ پیغمبر صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا"

سر ولیم میور نے جو کچھ کہ بیان کیا ہے اُس کا مخرج دریافت کرنے میں ہم نہایت حیران ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے۔ مذکورہ بالا بیان میں تین جملے علانیہ اعتراض کے قابل ہیں۔ (۱) نظر ثانی (۲) اس طرح سے تطبیق کر دی۔ (۳) نیا مجموعہ۔ کسی قسم کی روایت سے ہم کو ثابت نہیں ہوتا کہ زید کے جمع کئے ہوئے قرآن مجید پر کبھی نظر ثانی ہوئی ہو۔ جس حدیث میں کہ اس امر کا تذکرہ ہے اور جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اُس میں یہ الفاظ ہیں۔ "ننسخوھا فی المصاحف" یعنی اُنھوں نے اُس کی چند نقلیں کر لیں۔ مگر اس میں پُر غور نظر ثانی کا کچھ ذکر نہیں۔

اس حدیث میں یہ عبارت بھی ہے کہ "اذا اختلفتم انتم و زید ابن ثابت فی شی من القرآن" یعنی جب کہ تم میں اور زید ابن ثابت میں قرآن مجید کے اندر کسی چیز میں اختلاف واقع ہو۔ اگرچہ وہ چیز جس میں کہ اُن کو اختلاف واقع ہو بہت سے احتمالات کی گنجائش رکھتی ہے۔ لیکن ہم اُس کے بعد ہی اُس کی تشریح پاتے ہیں جہاں کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فکتبوہ بلسان قریش" یعنی اُس کو قریش کی زبان میں لکھو۔ اب یہ صریح ظاہر ہے کہ وہ چیز اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ بخاری کی حدیث سے جو نقل کی گئی ہے یہ امر اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ "فی عربیۃ من عربیۃ القرآن" یعنی اگر تم کو قرآن کی عربیت کی کسی عربیت میں اختلاف ہو۔ ان لفظوں سے زیادہ تر تلفظ اور مد اور ادغام اور نون ہائے تنوین سے علاقہ معلوم ہوتا ہے جو عربی عبارت کے پڑھنے میں مختلف قومیں عرب کی استعمال کرتی ہیں۔ اس جملہ کے کہ "اس طرح سے مکیّ زبان سے تطبیق کر دی" یہ معنی ہیں کہ کچھ اختلاف واقع ہوا تھا اور جامعین نے اس کو بدل دیا۔ مگر حدیث سے یہ بات نہیں پائی جاتی۔ بے شک جامعین کو کہا گیا تھا کہ اگر کچھ اختلاف تم میں ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو۔ لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ درحقیقت اُن میں اختلاف واقع ہوا تھا۔ پس سر ولیم کا یہ کہنا کہ "انھوں نے مکیّ زبان سے تطبیق کر دی" صحیح نہیں ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ سرولیم میور نے لفظ "نیا مجموعہ" کس بنا پر استعمال کیا ہے اور کس جگہ سے اُن کو یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ اس امر کی نسبت وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں اس طرح پر تحریر فرماتے ہیں کہ "اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے واسطے کہا گیا ہے کہ قرآن اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے زبان عربی کی سات مختلف زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود محمد (صلعم) ہی اس خیال کے بانی اور مؤید ہوئے ہوں، بدیں غرض کہ ایک ہی آیت قرآنی کی مختلف الالفاظی کی دقت رفع ہو جائے" یہ عبارت ایک ایسی طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جو تقوٰی۔ نیکی، صداقت، صاف باطنی۔ راست بازی کے واسطے ممتاز ہوں۔ دغا۔ فریب اور ریاکاری کا الزام لگانا بر اِن جائز کے معینہ قوانین اور اخلاق اور تہذیب کے مسلم اصول کے خلاف ہے۔ ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں اور اُس پر زیادہ بحث نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاک باز اور تقوے شعار ہیں، گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں، جیسے کہ خود اپنے ہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ معہذا کیا سرولیم میور اس بات سے ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مد اور ....
اور بغیر ادغام اور با نون تنوین اور بغیر نون تنوین پڑھنے سے جو عرب کی مختلف قوم کے مختلف طریقے سے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت لفظ میں یا معنی میں کچھ نہیں ہوتا۔ یا لفظ کا ایک ہی مادہ مختلف صورت سے بلا تبدیل اصلی مادہ لفظ اور معنی کے پڑھا جا سکتا ہے جیسے کہ سورہ الحمد میں لفظ "مالک" کا ہے قدیم تحریر میں اس کی یہ صورت ہے "ملک" یہ لفظ ملک بھی پڑھا جاتا ہے۔ ملّاک بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ لام کی تشدید سے۔ اور مالک بھی پڑھا جا سکتا ہے پس اگر اس لفظ کو کسی عرب نے کسی طرح پڑھا ہو یا باوصف اختلاف تلفظ کے کوئی تبدیل مادہ لفظ یا معنی میں نہیں ہے۔ لیکن قریش کی زبان میں مالک کا لفظ جاری تھا۔ اس کا قائم رکھنا کون سے اعتراض کا مقام ہے۔

سرولیم میور نے جو کچھ لکھا وہ مقتضائے اس مقصد کا تھا جس مقصد سے انھوں نے کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو اُن کے قلم سے نکلی ہے وہ یہ ہے کہ "دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو" اور ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تک ایسی رہے گی اور اس امر کی تصدیق اُس پیشین گوئی سے

ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے خدا فرماتا ہے "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون
یعنی تحقیق ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم بالتحقیق اُس کی حفاظت کریں گے۔

سر ولیم میور اپنے بیانات کے اثنا میں فرماتے ہیں کہ " اگر ابو بکر کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو ایسی جلدی وہ کیونکر خراب ہو جاتا اور اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہوتا " ہم نہایت صاف طور سے اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکر کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ وہ کسی نظر ثانی کا محتاج ہوا تھا اور نہ اس میں نظر ثانی کی گئی تھی بلکہ صرف اُس کی نقلیں کی گئی تھیں۔

قرآن مجید میں اختلاف کے اسباب جو سر ولیم میور نے بیان کئے ہیں وہ صحت سے بالکل معرا ہیں۔ ہم قرأت مختلفہ کے ذیل میں جس قدر کہ اس مضمون کی نسبت بیان کرنا ممکن تھا شرح وبسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

سر ولیم میور آگے چل کر بیان فرماتے ہیں کہ " لیکن جب کہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید جس حیثیت سے اس کو پیغمبر صاحب نے چھوڑا تھا۔ اب بجنسہ ویسا ہی موجود ہے۔ اس دعویٰ کے واسطے کہ خود پیغمبر صاحب ہی نے بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے "۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ جب تک یہ بات ثابت نہ ہو کہ درحقیقت بعض آیتیں ایسی تھیں کہ پیغمبر خدا نے اُن کو خارج کر دیا تھا اُس وقت بلاشبہ یہ بات کہ جس حیثیت سے قرآن پیغمبر صاحب نے چھوڑا تھا بجنسہ ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ حدیث عبدالعزیز سے اوپر بیان ہو چکا ہے اور تمام وحی قرآنی جو آنحضرت پر نازل ہوئی تھیں قرآن میں موجود ہیں اس بات کی کافی دلیل ہے کہ پیغمبر خدا نے نہ کسی آیت کو تبدیل کیا ہے اور نہ کسی آیت کو خارج کیا ہے۔ مگر ہم کسی جگہ وعدہ کر چکے ہیں کہ اس مضمون پر کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کریں گے پس اس جگہ اس وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔

سر ولیم میور اپنے مذکورہ بالا دعوے کی تصدیق پر مندرجہ ذیل سندیں پیش کرتے ہیں اور اُن بیانات کو کاتب الواقدی سے نقل کرتے ہیں کہ " عمر نے اُبی ابن کعب کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے ہم بہ تحقیق بعض آیات کو جو اُبی کے پڑھنے میں شامل ہیں۔ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اُبی کہا کرتا ہے کہ میں نے پیغمبر صاحب کو یوں فرماتے سنا ہے اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبر صاحب نے قرآن مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں مگر اصل یہ ہے

کہ قرآن مجید کے وہ حصے اُبی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں"۔

سر ولیم میور نے جیسا کہ اُن کی تمام تحریر سے پایا جاتا ہے اس مضمون کو چھوڑ دیا ہے اور جو کچھ اُنھوں نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمر سے منقول ہے سراسر خلاف ہے اور اس عبارت کا کہ "بعض آیات کو جو اُبی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" اُس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے۔ ہم اس حدیث کو بجنسہٖ بے کم و کاست ذیل میں مندرج کرتے ہیں اور وہ حدیث یہ ہے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں اُبی بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں اور ہم لوگ اُبی کا قول چھوڑ دیتے ہیں اور وہ یہ بات ہے کہ اُبی کہتے ہیں میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا۔ اور حالانکہ اللہ تعالےٰ نے کہا ہے۔ "ما ننسخ من آیۃ او ننسھا"۔

حدثنا عمرو بن علی قال حدثنا یحیی قال حدثنا سفیان عن حبیب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال قال عمر اقرأنا ابی واقضانا علی وانا لندع من قول ابی وذلک ان ابیا یقول لا ادع شیئا سمعتہ من رسول اللہ صلعم وقد قال اللہ تعالیٰ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا (بخاری کتاب التفسیر)

اُس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اُس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمر بعض آیات قرآنی کو جن کو ابی پڑھا کرتے تھے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات استخراج کرنے سے متعلق ہے۔ ابی قرآن مجید کی ہر ایک آیت سے جو حکم متخرج ہوتا تھا استخراج کرتے تھے اور جملہ احکام متخرجہ کو صحیح خیال کرتے تھے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ ظواہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں اُن کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضرور نہیں، جیسے کہ اہل ظواہر کا مذہب ہے لیکن حضرت علی مرتضےٰ کی رائے اُس کے برخلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ ابی سب سے عمدہ قرآن پڑھنے والا ہے اور حضرت علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی ہیں یعنی سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام و قوانین متخرج کرسکتے ہیں اس واسطے ہم چھوڑ دیتے ہیں اُبی کے قول کو یعنی جو اُبی نے قرآن سے حکم کا استخراج کیا ہے اُس کو چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت علی سے اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری اس تشریح کی تصدیق خود اسی حدیث کے اس جملہ سے ہوتی ہے کہ "اقضانا علی" کیونکہ اگر یہ

حدیث محض قرأت مختلفہ سے متعلق ہو تو یہ جملہ اُس کے بقیہ حصہ سے کچھ علاقہ نہ رکھے گا۔

ہمارے اس بیان کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بخاری نے جو مسلمانوں کے ہاں نہایت نامی اور مقدس اور مستند محدثین میں سے ہے۔ اس حدیث کو اُس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ وہ احکامات ناسخ و منسوخ سے بحث کرتا ہے نہ اُس جگہ جہاں کہ اُس نے قرأت مختلفہ کا بیان کیا ہے۔ مگر بخاری نے اسی حدیث کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں اُس مقام پر بھی بیان کیا ہے جہاں کہ اُس نے قاریوں کے باہمی اختلاف پر بحث کی ہے۔ چنانچہ اُس حدیث کو بھی ہم نقل کرتے ہیں اور اس بات پر بھی بحث کریں گے کہ اُن دونوں حدیثوں میں سے کون سی حدیث صیح ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔

حدثنا صدقۃ ابن الفضل قال اخبرنا یحیٰی عن سفین عن حبیب بن اُبی ثابت عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال قال عمرؓ علیؓ اقضانا وابی اقرئنا وانا لندع من لحن ابی وابی یقول اخذتہ من فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا اترکہ لشی قال اللہ تعالیٰ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا (بخاری باب القراء)

ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا علیؓ ہم لوگوں میں سب سے بڑے قاضی ہیں اور ابی ہم لوگوں میں سب سے بڑے قاری ہیں اور ہم لوگ اُبی کی قرأت کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابی کہتے ہیں کہ میں نے اُس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے لیا ہے۔ پس اُس کو کسی طرح نہ چھوڑوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا (یعنی جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بُھلا دیتے ہیں تو اُس سے اچھی یا اُس کے برابر بلاتے ہیں)۔

اس حدیث میں وہ لفظ جس کا ترجمہ ہم نے قرأت کیا ہے "لحن" ہے مگر جو کہ قرآن مجید اور اُس کی آیتوں کا ایک ہی لحن ہے اس لئے آیات قرآنی کی تلاوت پر بھی لحن کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ پچھلی حدیث دو وجہ سے مشکوک ہے۔ اول یہ کہ گو اس حدیث کے اور نیز حدیث ماسبق دونوں کے راوی ایک ہیں مگر پہلی میں لفظ "قول" اور دوسری میں لفظ "لحن" مستعمل ہوا ہے۔ اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ صدقہ ابن فضل اس حدیث کے راوی نے لفظ "لحن" کو بجائے "قول" کے براہ غلطی استعمال کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث میں دو جملے ہیں ایک "علی اقضانا" اور دوسرا "ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا"۔ ان دونوں جملوں کو قرآن کی قرأت مخصوص سے قابل قیاس کوئی علاقہ نہیں ہے اس واسطے ہماری رائے ہے کہ صدقہ نے پہلی حدیث کے سمجھنے میں

اور اس دوسری حدیث کے بیان کرنے میں علانیہ غلطی کی ہے۔ لیکن بالغرض اختتام حجت تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ پچھلی حدیث بھی صحیح ہے تو اس سے زیادہ اس کے اور کچھ معنی نہیں ہو سکتے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ مرتضیٰ کے لحن کو اُبی کے لحن پر ترجیح دی۔ بہرکیف سر ولیم میور نے براہِ زبردستی اس سے یہ نتیجہ مستنبط کیا ہے کہ "حضرت عمر نے کہا کہ ہم بالتحقیق بعض آیات کو، جو اُبی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں۔"

سر ولیم میور واقدی سے ایک اور روایت نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "ابن عباس نے کہا کہ مجھ کو عبداللہ ابن مسعود کا پڑھنا پسند ہے کیونکہ محمد (صلعم) ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن جبرئیل سے پڑھوایا کرتے تھے اور اپنی وفات کے سال میں اس کو دو مرتبہ پڑھوایا تھا اور عبداللہ دونوں مرتبہ حاضر تھے اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوتی تھی اُس کو مشاہدہ کیا تھا۔"

اس روایت کے اخیر حصہ کی کوئی معتبر سند نہیں ہے اور نہ ہم اس کو کسی مستند اور صحیح حدیث میں پاتے ہیں اور اگر بالفرض وہ واقدی میں موجود بھی ہو جس میں کہ ہم کو ہمیشہ شک رہے گا تب بھی وہ اعتبار کے مستحق نہیں ہے کیونکہ تمام نامعتبر اور بے سند روایتیں جو واقدی میں ہیں ٹام مور کے قصہ لالہ رُخ سے کچھ زیادہ اعتبار کی مستحق نہیں ہیں۔ اور اگر ہم بغرض اتمام حجت اُس کی اصلیت تسلیم کر لیں تو بھی سر ولیم میور کا فرض کیا ہوا یہ عقیدہ کہ "قرآن مجید میں شاید بعض ایسی آیتیں نہ موجود ہوں جو ایک زمانہ میں نازل ہوئی ہوں۔ مگر بعد کو منسوخ یا ترمیم ہو گئی ہوں" کیونکر ثابت ہوتا ہے۔ باقی رہی یہ آیت کہ "ما ننسخ من اٰیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا" اُس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ شریعت یہود سے علاقہ رکھتی ہے نہ آیات قرآن سے۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیوں کے ضمن میں بعض روایات کو قرآن مجید کی آیتوں کے اخراج یا عدم اندراج کی تمثیلات کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

اول بیر معونہ کی روایت کو لکھا ہے کہ "بیر معونہ پر ستر مسلمانوں کے شہید ہونے پر محمد (صلعم) نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں کے پیغام کے پہنچنے کا دعویٰ کیا جس کو مختلف راویوں نے کسی قدر اختلاف کے ساتھ اس طرح پر نقل کیا ہے۔ "بلغوا قومنا عنا انا لقینا ربنا فرضی عنا ورضینا عنہ (کاتب الواقدی)، تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے

اُس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کردی گئی۔

اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے۔ مزید براں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ "تمام مسلمان اُس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے۔ اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کردی گئی" محض بے بنیاد ہے اور کسی معتبر اور مستند روایت میں پایا نہیں جاتا۔ اور اگر بالفرض ہم اُس کو صحیح تصور کریں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحی غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھا تھا اور درحقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی۔

دوسری روایت سر ولیم میور نے متعلق احکام زنا کے لکھی ہے کہ "عمر کی نسبت کہا گیا ہے کہ اپنی خلافت میں اہل مدینہ سے اس طرح گفتگو کی" اے لوگو اس بات کی احتیاط رکھو کہ اس آیت کو نہ بھول جاؤ جو زنا کی نسبت سنگساری کا حکم دیتی ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم دو سزاؤں کو یعنی بیاہے اور بے بیاہے اشخاص کے زناکاری کی بابت کتاب اللہ میں نہیں پاتے ہیں تو اس کا میں یہ جواب دیتا ہوں کہ میں نے پیغمبر صاحب کو زنا کی پاداش میں سنگسار کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اس پر ہم نے اُن کے بعد عمل درآمد کیا ہے۔ اور واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ کہدیں گے کہ عمرؓ نے ایک نئی بات قرآن میں درج کردی، تو میں نے اُس کو قرآن میں درج کردیا ہوتا۔ کیونکہ میں نے بہ تحقیق اس آیت کو پڑھا ہے کہ " والشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ، (کاتب الواقدی اور مسلم)

اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے اصلی حدیث کی غلط بیانی اور غلط نمائی ہے اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ کہ " والشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ " اصل حدیث میں نہیں ہے اور نہ اس بات کی کوئی سند ہے کہ کبھی مسلمانوں نے اُس کو قرآنی آیت سمجھا ہو، دوسرے اس فقرہ کی عبارت ایسی ناقص اور خراب ہے کہ قطع نظر عربوں سے کوئی عجمی ادنے درجہ کا عربی داں بھی اُس کو نہ لکھے گا۔ چہ جائے اس کے کہ وہ خدا کا کلام ہو۔ مگر ہم اس امر کو ابتدا سے بیان کریں گے اور اس بیان کے اثنا۔ میں اصلی حدیث کو بھی نقل کریں گے، جس سے ثابت ہوگا کہ عربی فقرہ مذکورہ بالا اُس میں نہیں ہے۔

قرآن مجید میں زنا کی سزا یہ ہے۔ اور تمھاری عورتوں میں سے جو زنا کریں تو اُن پر چار واللاتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم گواہ لاؤ۔ پس اگر وہ گواہی دیں تو اُن کو گھروں میں روک فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم فان شھدوا رکھو، یہاں تک کہ وہ اپنی موت سے مریں، یا خدا اُن کے

فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفھن الموت — لئے کوئی راہ نکالے۔

اویجعل اللہ لھن سبیلا

(سورہ نساء آیت ۱۹)

دوسری آیت جس میں زنا کی سزا کی تفصیل ہے وہ یہ ہے۔

الزانی والزانیۃ فاجلدوا کل واحد — زانی اور زانیہ ہر ایک کو اُن میں سے سو کوڑے

منہما مایۃ جلدۃ (سورہ نور آیت ۲) — مارو۔

بعد اس کے پیغمبر خدا نے زنا کے باب میں اس طرح فرمایا۔ جو ذیل کی روایت میں بیان ہوا ہے۔

عن عبادۃ بن الصامت قال ... — عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ کہا ....

قال خذوا عنی قد جعل اللہ لھن سبیلا — لو مجھ سے۔ خدا نے اُن کے لئے رستہ نکالا۔ ثیب ثیب

الثیب بالثیب والبکر بالبکر الثیب جلد — کے ساتھ اور باکرہ باکرہ کے ساتھ ثیب کو سو کوڑے مارے

مایۃ ثم رجم بالحجارۃ والبکر جلد — جائیں گے پھر سنگسار کیا جاتا ہے۔ اور باکرہ کو سو کوڑے

مایۃ ثم نفی سنۃ (مسلم باب حد الزنا) — مارے جائیں گے۔ پھر ایک برس جلا وطن کر دینا کافی ہے۔

اور اس میں کچھ شک نہیں کہ خود پیغمبر صاحب نے یہودی مرد اور عورت کو جو زناکاری کے مجرم قرار پائے تھے۔ یہودی شریعت کے موافق سنگسار کرنے کی اجازت دی تھی اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیں کہ یہودی کے سوا اور کسی کو بھی آنحضرتؐ نے سنگسار کیا تھا، تو بھی اس بات کا ثابت کرنا غیر ممکن ہے کہ بعد نزول اُس آیت کے جس میں زنا کی سزا کا حکم ہے۔ آنحضرتؐ نے ایسا حکم دیا ہو۔ اسی طرح مسلم کی اس حدیث کی نسبت جو اوپر مذکور ہے ثابت کرنا مشکل ہے کہ وہ حدیث سورہ نور کی آیت کے بعد کی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زنا کی سزا کی نسبت اختلاف رائے ہوا جس کا ہونا ضرور تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں اور ایک حدیث کی بنا پر جو اوپر مذکور ہوئیں تین مختلف رائیں پیدا ہوئیں۔

اول :- سورہ نساء کی آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ "اُن کو اپنے مکانوں سے باہر نہ جانے دو۔ یہاں تک کہ موت اُن کو ٹھکانے لگائے یا اللہ تعالےٰ اُن کے واسطے کوئی سبیل نکال دے۔" اس آیت کے آخیر لفظوں سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ سبیل یہی ہے۔ جو مسلم کی حدیث میں

بیان ہوئی ہے کہ بیاہے ہوئے اشخاص کو بجرم زنا سو دُرے لگانے چاہئیں اور سنگسار کرنا چاہیے اور کنوارے شخصوں کو سو دُرّے لگانے چاہئیں اور ایک سال کے واسطے جلاوطن کردینا چاہئے۔ کچھ عجب نہیں ہے کہ لوگوں نے اس حکم کو ایک جزو قرآن سمجھا ہو۔

دوم:۔ بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ سورہ نسار کی آیت سورہ نور کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے اور زنا کی سزا خواہ اُس کا مرتکب کوئی بیاہا ہوا شخص ہو خواہ کنوارا سو دُرے قرار پائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے مسلم کی حدیث کی کچھ وقعت نہیں کی اور اُس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) یہ کہ یہ محقق نہیں ہے کہ وہ قول آنحضرت کا جو مسلم کی حدیث میں ہے سورۂ نور کی آیت کے بعد کا ہے (۲) یہ کہ جب تک کسی امر میں کوئی خاص حکم نازل نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت یہود کی شریعت کے موافق عمل فرمایا کرتے تھے اور اس لئے مسلم کی حدیث حجت کے قابل نہیں ہوسکتی۔

سوم:۔ بعض لوگ اس بات کو تو تسلیم کرتے تھے کہ سورہ نسار کی آیت تو سورہ نور کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے۔ مگر چونکہ سورہ نسار کی آیت میں کوئی قطعی سزا مذکور نہیں ہے اس لئے مسلم کی حدیث میں جو سزا ہے وہ بیاہے ہوئے شخصوں کے لئے سزا ہے اور سورۂ نور کی آیت میں جو سزا ہے وہ کنوارے لڑکوں کے لئے سزا ہے۔ مسعودی کی بھی اسی قسم کی رائے معلوم ہوتی ہے۔

یہ اختلاف رائے آج تک چلا آتا ہے کیونکہ معتزلی اور خارجی جو مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں اور معتزلی فرقہ کے لوگ عربیت میں بہت بڑا عالی درجہ رکھتے ہیں۔ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا نہیں ہے اور خطبہ کے راقم کو بھی گو وہ ان دونوں فرقوں سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا ہے بلکہ سُنی مذہب کی بھی یہی رائے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر وہ رائے رکھتے تھے جس کا ہم نے تیسری قسم میں بیان کیا ہے اور اس لئے جب کہ وہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اکثر اشخاص کے سامنے یہی بیان کیا اور شاید اپنی تمام سلطنت میں یہی حکم دیا ہو۔

واقدی نے اس حدیث کو زیادہ افراط و تفریط کے ساتھ لکھا ہے اور سرولیم میور نے اپنی کتاب میں اُس کو بجنسہٖ نقل کیا ہے۔ اصل حدیث جو مسلم میں منقول ہے ہم ذیل میں مع ترجمہ کے لکھتے ہیں۔

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بیٹھے تھے کہا کہ

قال عمر بن الخطاب وهو جالس على منبر
رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله بعث
محمدا صلى الله عليه وسلم بالحق انزل
عليه الكتاب فكان مما انزل الله عليه آية
الرجم قرأناها ووعيناها وعقلناها فرجم
رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجمنا
بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان
يقول قائل ما نجد الرجم في كتاب الله تعالى
فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم
في كتاب الله حق على من زنا اذا احصن
من الرجال والنساء اذا قامت البينة او
كان الحبل او الاعتراف۔ (مسلم باب حد الزنا)

اما قوله صلى الله عليه وسلم فقد جعل
الله لهن سبيلا فاشارة الى قول الله تعالى
فامسكوهن في البيوت حتى يتوفهن الموت
او يجعل الله لهن سبيلا فبين النبي صلعم
ان هذا هو ذلك السبيل واختلف العلماء في
هذه الآية فقيل هي محكمة وهذا الحديث
مفسر لها وقيل منسوخة بالآية التي في
اول سورة النور وقيل ان آية النور في
البكرين وهذه الآية في الثيبين

(نووی)

قوله فكان مما انزل الله عليه آية الرجم
قرأناها ووعيناها وعقلناها اراد بآية
الرجم "الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما

اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق بھیجا۔ اُن پر مقرر کئے
ہوئے حکم اُتارے سو اُن چیزوں میں سے جو اُن پر اللہ نے
اتاریں رجم کا حکم تھا۔ ہم نے اُس کو پڑھا اور متعین کیا اور
خیال کیا۔ سو رجم کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ہم
نے اُن کے بعد رجم کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ گذر جانے
پر کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو خدا کے مقرر کئے ہوئے
احکام میں نہیں پاتے پس تو گمراہ ہوں گے اُس فرض کے
چھوڑنے سے جس کو خدا نے اُتارا اور رجم حق ہے خدا کے مقرر
کئے ہوئے حکم میں اُس شخص پر جس نے زنا کیا ہو اور بیاہا
ہوا ہو۔ مردوں اور عورتوں میں سے۔ جب دلیل قائم ہو
جائے۔ یا حمل رہ گیا ہو یا خود اُن کو اقرار ہو۔

(مسلم باب حد الزنا)

لیکن آنحضرت کا قول کہ "خدا نے اُن کے لئے رستہ نکالا"
اللہ کے اس قول کی طرف "فامسکوھن فی البیوت حتی
یتوفھن الموت او یجعل اللہ لھن سبیلا" (یعنی پس اُن
کو روک رکھو گھروں میں یہاں تک کہ موت اُن کو اُٹھالے یا
خدا اُن کے لئے رستہ نکالے) اشارہ ہے پس نبی صلی اللہ علیہ
وسلم نے اُس رستہ کا بیان کر دیا۔ اور عالم لوگ مختلف ہوئے
ہیں اس حکم میں پس کہا گیا کہ وہ محکم ہے اور یہ حدیث اُس
کی مفسر ہے۔ اور کہا گیا وہ منسوخ ہے اُس حکم سے جو سورہ
نور کے اول میں ہے۔ اور کہا گیا کہ "نور" کا حکم باکرہ کے
باب میں ہے اور یہ حکم ثیبہ کے باب میں ہے۔ (نووی)

حضرت عمر کا یہ قول "کہ اُن چیزوں میں سے جو خدا نے
اُن پر اُتاریں رجم کا حکم تھا ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کیا
اور خیال کیا۔ اس سے مراد رجم کا یہ حکم ہے "الشیخ والشیخۃ اذا

البتة " (نووی) زینا فارجموهما البتة " (یعنی جب بوڑھا اور بوڑھی زنا کریں تو اُن کو ضرور سنگ سار کرو)

وفی ترک الصحابة کتابة هذه الآیة دلالة ظاهرة ان المنسوخ لا یکتب فی المصحف (نووی)

اور صحابہ نے جو اُس حکم کا لکھنا چھوڑ دیا تو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ منسوخ قرآن میں نہیں لکھا جاتا۔ (نووی)

قوله فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب الله فیضلوا بترک فریضة هذا الذی خشیة قد وقع من الخوارج ومن وافقهم (نووی)

حضرت عمر کا یہ قول کہ " میں ڈرتا ہوں کہ جب زیادہ زمانہ گذر جائے تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حکم میں نہیں پاتے پس لوگ گمراہ ہوں گے ایک فرض کے چھوڑنے سے " یہ ڈر جو حضرت عمر کو تھا خارجیوں اور ان کے موافقوں سے اُس کا ثبوت بھی ہو گیا (نووی)

واجمع العلماء علی وجوب جلد الزانی البکر مائة ورجم المحصن وهو الثیب لم یخالف فی هذا واحد من اهل القبلة الا ما حکی القاضی عیاض وغیره عن الخوارج وبعض المعتزلة کالنظام واصحابه فانهم لم یقولوا بالرجم (نووی)

اور اجماع کیا ہے عالموں نے اس پر کہ جو زانی بکر ہو اُس کو کوڑے پٹنا واجب ہے اور بیاہا ہوا اور ثیب ہو اُس کو سنگسار کرنا واجب ہے اور اس امر میں اہل قبلہ میں سے ایک شخص نے بھی اختلاف نہیں کیا سوائے اس کے کہ قاضی عیاض وغیرہ نے خارجیوں اور بعض معتزلہ سے جیسے نظام اور اُس کے متبعین سے نقل کیا ہے کیونکہ یہ لوگ رجم کے قائل نہیں ہیں (نووی)

اس ترجمہ میں ہم نے لفظ "آیت" اور "کتاب" کے ترجمہ میں "حکم" کا لفظ مستعمل کیا ہے۔ ہم اس باب میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ یہ الفاظ خود قرآن مجید اور احادیث میں ان معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں مگر ہمارا مخالف اس ترجمہ پر معترض ہونے کا مجاز ہے اور کہہ سکتا ہے کہ الفاظ "آیت" اور "کتاب" ہی کیوں نہ مستعمل کئے اس لئے ہم دوسرا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس میں "آیت" کا ترجمہ "آیت" اور "کتاب" کا ترجمہ "قرآن" کیا ہے۔ اُس ترجمہ کے پڑھنے والوں پر ظاہر ہو گا کہ اگر اس طرح پر ترجمہ کیا جائے تو حدیث کیسی مہمل اور بے معنی ہو جاتی ہے۔

دوسرا ترجمہ

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بیٹھے تھے یہ کہا کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق بھیجا اُن پر قرآن اُتارا۔ سو اُن چیزوں میں سے جو اُن پر اللہ نے اُتاریں رجم کی آیت تھی۔ ہم نے اُس کو پڑھا اور متعین کیا اور خیال کیا سو رجم کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ہم نے اُن کے بعد رجم کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ گذر جانے پر کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو قرآن میں نہیں پاتے۔ پس تو گمراہ ہوں گے اُس فرض کے چھوڑنے سے جس کو خدا نے اُتارا اور رجم حق ہے قرآن میں اُس شخص پر جس نے زنا کیا ہو اور بیاہا ہوا ہو۔ مردوں اور عورتوں میں سے جب دلیل قائم ہو جائے یا حمل رہ گیا ہو یا خود ان کو اقرار ہو (مسلم)

کیا اس حدیث کے یہ دو فقرے کہ "ہم قرآن میں رجم کا حکم نہیں پاتے" اور یہ فقرہ کہ "بے شک رجم قرآن میں ہے" ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں؟

اس لفظی بحث کو چھوڑ کر اب ہم اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ عبارت جس کو سر ولیم میور واقدی سے نقل کرنا بیان کرتے ہیں کہ "اور واللہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہہ دیں گے کہ عمر نے ایک نئی چیز قرآن میں درج کر دی تو میں اس کو قرآن مجید میں درج کر دیتا۔ کیونکہ بہ تحقیق میں نے اس آیت کو سُنا ہے۔ "والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة"

اپنی تصنیفات کا حجم بڑھانے کی نیت سے اور نیز اپنی کامل آگہی کی غرض سے ہمارے مفسرین اور اہل سیر نے تمام مہمل اور بیہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے بہ کمال آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے اور ہم اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام محققین مسلمان اُن کو مہمل تصور کرتے ہیں اور اسلام اُن کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

نووی مسلم کی شرح میں لکھتا ہے کہ لفظ "حکم" سے جس کی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے منجملہ ان احکامات کے جو پیغمبر خدا پر نازل ہوئے تھے آیت رجم بھی تھی اور ہم نے اس آیت کو دیکھا پڑھا اور سمجھا تھا اور وہ آیت الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة ہے۔ اس کے بعد نووی یہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ آیت مذکورہ کا قرآن مجید میں کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس

لئے تیقن کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیات منسوخ شدہ قرآن مجید میں درج نہیں کی گئی تھیں۔

مگر ہر ذی فہم شخص سمجھتا ہے کہ نووی کا یہ بیان نہ تو کوئی حدیث نبوی ہے اور نہ کوئی مذہبی ہے۔ بلکہ ایک مفسر کی محض رائے ہے۔ معہذا یہ رائے بھی تسکین بخش نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر یہ اعتراض عاید ہوتے ہیں۔ (۱) یہ کہ نووی نے اس امر کے ثبوت کی کوشش بھی نہیں کی کہ آیت مذکورہ درحقیقت قرآنی آیت تھی (۲) یہ کہ وہ اس بات کی بھی کوئی دلیل نہیں پیش کرتا کہ حضرت عمر کی مراد اسی آیت سے تھی (۳) اُس نے ان دونوں باتوں کو بلا دلیل غلطی سے صحیح تصور کر کے یہ نتیجہ باطل مستنبط کیا ہے کہ آیات منسوخ شدہ قرآن مجید میں درج نہیں ہوتی تھیں افسوس ہے کہ ہماری اکثر کتب سیر و تفاسیر ایسی ہی روایات اور احادیث سے مملو ہیں جو مفروضات باطل پر مبنی ہیں اور بجز مصنف ہی کے قیاسات کے اور کسی چیز سے اُن کی تائید نہیں ہوتی۔ عیسائی مصنف اُن کی تحقیق سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور ان کو صحیح حدیثیں تصور کر لیتے ہیں اور بجال شوق اسلام کی نسبت بے اصل الزامات اُن پر مبنی کرتے ہیں۔ اس مقام پر ہم کو اس امر سے کہ رجم کا حکم اسلام میں ہے یا نہیں۔ زیادہ بحث نہیں ہے۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ جس کو آیت رجم کہا جاتا ہے وہ کبھی قرآن کی آیت نہیں تھی اور نہ کبھی قرآن مجید سے خارج کی گئی تھی۔

آیتوں کے اخراج اور عدم اندراج کی بابت سر ولیم میور نے تیسری مثال مارکسی کی نقل کی ہوئی روایت بیان کی ہے جو سونے کی گھاٹی کے باب میں تھی اور جو قرآن میں مندرج ہونے سے رہ گئی ہے۔ چوتھی تمثیل میں وہ عبداللہ ابن مسعود کے اُس قصہ کو پیش کرتے ہیں۔ جس میں کہ انھوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے رات کو اپنے ورقوں میں سے ایک آیت کو غائب پایا۔ پانچویں تمثیل میں اُس آیت کا ذکر کرتے ہیں جو مکہ کے معبودان مجازی کے بارہ میں تھی۔ لیکن ہم اُن کے نہایت شکرگذار ہیں کہ انھوں نے خود یہ بات کہکر کہ یہ سب روایتیں غلط اور موضوع ہیں اس جھگڑے کو چکا دیا ہے۔ پس ہم کو مردہ کے مارنے کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔

خُطبہ آٹھواں

احوال بیت اللہ الحرام والسوانح اللتی مضت فیہا قبل الاسلام

خانہ کعبہ اور اُس کے گذشتہ حالات اسلام سے پہلے

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین (القرآن)

عرب کے ملک میں، جو نہایت، قدیم روایت اُس زمانہ سے جب کہ قرآن مجید کا ذکر بھی نہ تھا برابر چلی آتی ہے اور جس کو عرب کی تمام قومیں بغیر کسی شبہ اور اختلاف کے پشت در پشت مانتی چلی آئی ہیں اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا اور اُن کے بیٹے حضرت اسمٰعیل اُن کے شریک تھے۔

اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (سورہ بقر آیت ۱۲۱) "جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل نے اس گھر کی بنیادیں اٹھائیں تو انھوں نے یہ دعا مانگی کہ اے ہمارے پروردگار اس گھر کو ہم سے قبول کر بے شک تو اس دعا کو سنتا اور دلی نیت کو جانتا ہے۔"

اس دعا سے جو اس کے بنانے والوں نے کی اور قرآن مجید کی اور بہت سی آیتوں سے جو اس کے بعد ہیں بخوبی ظاہر ہے کہ یہ خدا کے واسطے یعنی اُس کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا جیسے کہ اس زمانہ میں لوگ مسجد بناتے ہیں۔

قرآن مجید میں کعبہ کو بالتصریح مسجد کہا گیا ہے ایک جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ "مشرک

ان المشرکین نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا (سورہ توبہ آیت ۲۸) ناپاک عقیدہ کے ہیں وہ اس برس کے بعد سے اس بزرگ مسجد (یعنی کعبہ) کے پاس نہ آئیں"۔

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاءاللہ (سورہ فتح آیت ۲۷)

اور ایک اور جگہ خدا نے فرمایا کہ "خدا نے اپنے رسول کو یہ سچا خواب دکھلایا بالکل ٹھیک کہ بے شک تم داخل ہو گے اس بزرگ مسجد (یعنی کعبہ) میں انشاءاللہ"۔

جس زمانہ میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں اُس زمانہ میں کعبہ کے گرد وہ مکانات نہیں تھے جواب ہیں اور جو حرم کہلاتے ہیں اور جن کا مطلب یہ ہے کہ مسجد داخل حد حرم ہے لیکن خاص کعبہ وہ مسجد ہے جس کو حضرت ابراہیم نے بنایا اور اسی خاص عمارت کو قرآن مجید میں مسجد الحرام کہا ہے۔

قرآن مجید میں کوئی خاص زمانہ کعبہ کی تعمیر کا نہیں بتایا ہے صرف دو صفتیں اُس کی بیان ہوئی ہیں ایک "بیت العتیق" یعنی نہایت پُرانا قدیم گھر۔ دوسرے "اول بیت وضع للناس" یعنی سب سے پہلا گھر جو آدمیوں کے لئے خدا کی عبادت کرنے کو بنایا گیا۔ جس قاعدہ پر حال کے زمانہ کے مؤرخ پُرانے زمانہ کا حساب لگاتے ہیں۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سنہ کی بیالیسویں صدی میں یعنی حضرت عیسٰی سے اُنیسویں صدی ماقبل میں کعبہ بنا تھا۔ پس اگر اسی حساب کو صحیح مانا جائے تو بھی ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں جہاں تک کہ اس کا حال معلوم ہوا ہے کعبہ سے پہلے کوئی گھر خدا کی عبادت کے لئے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ سب سے اول کعبہ بنا تھا۔

ہم صرف عربی کی روایت اور قرآن مجید کی آیت ہی کو اس بات کے ثبوت کے لئے کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا ہے پیش کرنے پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اُس کے ثبوت کے لئے ایسی دلیلیں بھی ہیں جو واقعی ایک حقیقت ہیں اور جن کو اُن لوگوں نے لکھا ہے جن کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ امر مذکورہ کا ثبوت مفصلہ ذیل مقدمات کے ملانے اور ان سے نتیجہ نکالنے سے بخوبی حاصل ہوتا ہے۔

مقدمہ اوّل ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو اسی نواح میں یعنی حجاز میں بسایا جہاں اب کعبہ ہے

ہم اس کے ثبوت کے لئے ایسی مذہبی یا تاریخی روایتوں پر جو متنازعہ ہیں اور جن کے الفاظ کے معنی یا مصداق پر بحث ہے توجہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ایسے واقعات پر استدلال

کرتے ہیں جو سب کو تسلیم ہیں یا جو جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان کو ایسے لوگوں نے تحقیق کیا ہے جن کو اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے تھے ۱۔ نبایوث، ۲۔ قیدار۔ ۳۔ ادبئیل، ۴۔ بلسام، ۵۔ مشماع، ۶۔ دوماہ، ۷۔ مسا، ۸۔ حدر، ۹۔ تیما، ۱۰۔ یطور، ۱۱۔ نافیس ۱۲۔ قیدماہ، اور یہ سب حجاز میں آباد تھے جہاں مکہ ہے۔

پہلا:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا نبایوث عرب کے شمال مغربی حصہ میں آباد ہوا۔ ریورنڈ گاڑی پی کاری ایم اے نے اپنے نقشہ میں اُس کا نشان ۲۸ و ۳۰ درجہ عرض شمالی اور ۳۶ و ۳۸ درجہ طول شرقی کے درمیان میں لگایا۔

دوسرا:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا قیدار نبایوث کے پاس جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا ریورنڈ مسٹر فاسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں اور زیادہ ثبوت اس کا حال کے جغرافیہ میں شہر الحذر اور بنت سے پایا جاتا ہے جو اصل میں القیدا اور نبایاث ہیں اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اُس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اُس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ یورنیس اور بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں۔ گیڈری یعنی قیدری وری یعنی مخفف قیدری اور گدرو ناتئ یعنی قیداری کدرتیتی یعنی قیدری چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول صفحہ ۲۲۸ میں مندرج ہے۔ پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد تھا۔

رورنڈ گاڑی پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶ و ۲۷ درجہ عرض شمالی و ۲۷ و ۳۰ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔

تیسرا:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا ادبئیل ہے بموجب سند جوزیفس کے ادبئیل بھی اپنے ان دونوں بھائیوں کے ہمسایہ میں آباد ہوا تھا۔

چوتھا:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا بسام ہے مگر اُس کی سکونت کے مقام کا پتہ نہیں ملتا۔

پانچواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مشماع ہے ریورنڈ مسٹر فاسٹر کا یہ قیاس صحیح ہے کہ عبرانی میں جس کو مساع لکھا ہے اُسی کو یونانی ترجمہ سٹواجنٹ میں مسما اور جوزیفس نے مسماس

بطلیموس نے مسمیز لکھا ہے اور عرب میں اُسی کی اولاد بنی مسما کہلاتی ہے پس کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا قریب نجد کے اولاً آباد ہوا تھا۔

چھٹا:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا دوماہ تھا مشرقی اور مغربی جغرافیہ داں قبول کرتے ہیں کہ یہ بیٹا تہامہ میں آباد ہوا تھا۔

ساتواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مسا تھا ریورنڈ مسٹر فاسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ بیٹا مسو پوٹیمیا میں آباد ہوا مگر یہ صحیح نہیں ہے کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا جب حجاز سے نکلا تو یمن میں آباد ہوا اور یمن کے کھنڈرات میں اب تک مسا کا نام قایم ہے ریورنڈ گاڑی پی کاری نے اپنے نقشہ میں اس مقام کا نشان ۱۲ درجہ اور ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ طول شرقی میں قائم کیا ہے۔

آٹھواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا حدر تھا اور عہد عتیق میں حداد بھی اس کا نام ہے یمن میں شہر حدیدہ اب تک اُسی کا مقام بتلارہا ہے اور قوم حدیدہ جو یمن کی ایک قوم ہے اُسی کے نام کو یاد دلاتی ہے۔ زہیری مورخ کا بھی یہی قول ہے اور ریورنڈ فاسٹر بھی اُسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا تیما تھا اُن کی سکونت کا مقام نجد ہے اور بعد کو رفتہ رفتہ خلیج فارس تک پہنچ گئے۔

دسواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا یطور ہے ریونڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ اس کا مسکن جدور میں تھا جو جبل کسیونی کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق میں واقع ہے۔

گیارھواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا نافیش تھا ریورنڈ مسٹر فارسٹر توریت اور جوزیفس کی سند سے لکھتے ہیں کہ عربیا ڈزرٹا میں اُن کی نسل اسی نام سے آباد تھی۔

بارھواں:۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا قیدماہ تھا اُنھوں نے بھی یمن میں سکونت اختیار کی تھی غرض کہ اہل جغرافیہ کی تحقیقاتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسمٰعیل اور اُن کی اولاد کا مسکن حجاز تھا۔

مقدمہ دوم حجرِ اسود اور قربانی کی رسم کو اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص ابراہیمؑ سے تعلق ہے

خود حضرت ابراہیم اور تمام اُن کی اولاد میں یہ رواج تھا کہ خدا کی عبادت کی جگہ پر بطور ایک نشان کے لنبا بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے اور اس کو مذبح یعنی قربانی گاہ اور بیت اللہ قرار دیتے تھے اور وہاں خدا کی عبادت بجالاتے تھے۔ اور اُس کے نام پر قربانی کرتے تھے پس کعبہ میں اسی رسم کا برابر جاری چلا آنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس معبد کی اصل ابراہیم سے ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ پتھر اور قربانی اور بیت اللہ نام رکھنے کی رسم ابراہیم سے چلی آتی ہے توریت مقدس سے جس کی قدامت میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا ثابت ہوتی ہے۔

کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ، میں لکھا ہے کہ "تب خداوند نے ابراہیم کو دکھلائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اُس نے وہاں خداوند کے لئے جو اُس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا" اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہاں سے ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے نام سے اُس کو موسوم کیا۔

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی آٹھویں آیت میں ہے کہ بلوطستان ممری میں جو جبرون میں ہے۔ ابراہیم جا رہا اور وہاں خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا۔

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے لئے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا۔

یہ طریقہ اُن کی اولاد میں بھی جاری تھا چنانچہ کتاب پیدائش باب ۲۶ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ بیر شبع میں اسحاق پسر ابراہیم کو خدا دکھلائی دیا اور اُس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اُس کو موسوم کیا۔"

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا اُس کی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے۔

کتاب خروج باب ۲۵ میں لکھا ہے کہ "اگر میرے لئے پتھر کا مذبح بنا دے تو تراشے ہوئے

پتھر کا مت بنائیو کیونکہ اگر تو اُسے اوزار لگا دے گا تو اُسے ناپاک کرے گا۔

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ "اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اُٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے موافق بارہ ستون بنائے گئے۔

اور کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۸ و ۱۹ و ۲۲ میں لکھا ہے کہ" یعقوب صبح سویرے اُٹھا اور اُس پتھر کو جسے اُس نے اپنا تکیہ کیا تھا لے کے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اُس کے سر پر تیل ڈالا۔

اور اُس مقام کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا۔

اور کہا کہ" یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا"۔

ان آیتوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیم اور اُس کی اولاد کا یہ طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لئے مذبح ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر کر بناتے تھے۔ کبھی اُس کے ساتھ کوئی مکان بھی بنا دیتے اور کبھی پتھر کھڑا کرنے کے بعد بناتے تھے اور اُس کو بیت اللہ کہتے تھے۔

بالکل یہی حالت کعبہ کی اور حجر اسود کی ہے جو ایک بن گھڑا لمبا پتھر ہے پہلے صرف حجر اسود کھڑا کیا تھا۔ پھر جب وہاں کعبہ بنایا تو اُس کے کونہ میں اُس کو لگا دیا۔

توریت میں صرف بنی اسرائیل کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں اور بنی اسمٰعیل کا اُس میں ذکر نہیں ہے مگر ملکی روایتوں یا جاہلیت کے اشعار میں اُن کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ارزقی کی کتاب اخبار مکہ سے پایا جاتا ہے کہ بن گھڑا پتھر کھڑا کر کے خدا کی عبادت گاہ بنانا صرف بنی اسرائیل ہی میں نہ تھا بلکہ بنی اسمٰعیل میں بھی بکثرت رائج تھا۔

چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ" بنی اسمٰعیل و جرہم جو مکہ میں رہتے تھے وہاں رہنے کی اُن کو گنجایش نہ ہوئی تو وہ ملک میں نکلے اور معاش کی تلاش میں پڑے پس لوگ خیال کرتے ہیں کہ اولاً پتھر کا پوجنا بنی اسمٰعیل میں اس طرح شروع ہوا کہ جب اُن میں سے کوئی مکہ سے جاتا تو حرم کے پتھروں میں سے ایک پتھر اُٹھا لیتا حرم کو بزرگ سمجھ کر اور مکہ اور کعبہ کے شوق میں جہاں اُترتے تو اس پتھر کو رکھ لیتے اور اُس کے گرد مثل کعبہ کے طواف کرتے پھر اُس

ان بنی اسمٰعیل وجرہم من ساکنی مکۃ ضاقت علیھم مکۃ فتفسحوا فی البلاد والتمسوا المعاش لیزعمون ان اول ما کانت عبادۃ الحجارۃ فی بنی اسمٰعیل انہ کان لا یظعن من مکۃ ظاعن منھم الا احتملوا معھم من حجارۃ الحرم تعظیما للحرم

وصيابة بمكة وبالكعبة حيث ماحلوا وضعوه فطافوا بة كالطواف بالكعبة حتى سلخ ذلك بهم الى ان كانوا ايعبدون ما استحسنوا من الحجارة واعجبهم من حجارة الحرم خاصة حتى خلفت الخلوف بعد الخلوف ونسوا ما كانوا علية واستبدلوا بدين ابراهيم واسمعيل وغيرہ فعبدوا الاوثان (صفحہ ۷۲)

کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ۔ کہ جو پتھر اچھا دیکھتے اور جو حرم کا پتھر عجیب اور اچھا معلوم ہوتا ، اُس کی عبادت کرتے اسی طرح پشتوں پر پشتیں گذر گئیں اور بھول گئے جو بات پہلی تھی اور ابراہیم اور اسمٰعیل کے دین کو بدل دیا اور بتوں کو پوجنے لگے ۔

مسلمانوں کی کتابوں میں اس پتھر کی نسبت نہایت قصہ آمیز روایتیں لکھی ہیں اور ترمذی اور ابن ماجہ و دارمی میں بھی چند عجیب عجیب روایتیں آئی ہیں ۔ جیسا کہ یہ پتھر نہایت پرانا ہے اور حضرت ابراہیم کے ساتھ منسوب ہونے سے قدیمی ہونے پر تقدس اور زیادہ ہو گیا ہے ویسے ہی لوگوں نے اس کی نسبت جیسا کہ پرانی باتوں کی نسبت دستور ہے قصہ آمیز اور تعجب انگیز روایتیں بنالی ہیں ۔ قرآن مجید میں اس پتھر کا مطلق ذکر نہیں ہے ۔ اگر درحقیقت وہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ روایتوں کے بنانے والوں نے بیان کیا ہے تو ممکن نہ تھا کہ باوجودیکہ قرآن مجید میں کعبہ کے بننے کا ذکر ہے اور اس پتھر کا ذکر نہ کیا جاتا ۔ جس قدر روایتیں اس پتھر کی نسبت آئی ہیں سب مجروح و مرجوح ہیں اور کسی کی سند قابل اعتبار کے نہیں ہے اور نہ اُن کا سلسلہ درستی اور صحت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے مگر اُن روایتوں کا خلاصہ بیان کرنا خصوصاً اُن کا جو ترمذی و ابن ماجہ و دارمی میں ہے خالی از لطف نہ ہوگا ۔

روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ یہ پتھر حضرت جبرائیل بہشت سے لائے تھے اور وہ اول اول دودھ کی مانند سفید تھا ۔ لیکن انسان کے گناہوں نے اُسے سیاہ کر دیا " ایک روایت کا یہ مضمون ہے کہ وہ بہشت میں کے جواہرات میں کا ایک لعل بے بہا ہے خدا نے اُس کی چمک دمک لے لی ہے ۔ اگر نہ لیتا تو تمام دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک منور ہو جاتی ، ایک اور روایت میں ہے کہ " قیامت کے دن اس پتھر کے دو آنکھیں اور ایک زبان ہوگی جن کے ذریعہ سے وہ اُن کو پہچان لے گا اور اُن کے نام بتا دے گا جنھوں نے اس دنیا میں اُس کو بوسہ دیا ہے ۔"

ایک لامذہب نے اس روایت کو سُن کر کہا کہ جب دنیا میں اُس کی آنکھیں نہیں ہیں تو قیامت

میں آنکھیں ملنے سے وہ کیونکر شناخت کرے گا ایک احمق مسلمان نے جواب دیا کہ خدا کی قدرت سے۔ لامذہب بولا کہ پھر آنکھیں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ بالفرض اگر کوئی ان روایتوں کو صحیح تسلیم کرے تو ان کے الفاظ کے لغوی معنی نہیں لئے جائیں گے، بلکہ ان کو بطور استعارہ قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں ان کا مقصود یہ ہوگا کہ کسی آدمی کے افعال جو اس نے دنیا میں کئے ہیں قیامت میں پوشیدہ نہیں رہیں گے۔ اس قسم کے مضامین کو استعارہ میں بیان کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اُس کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے ہاتھ گواہی دیں گے کہ اُس نے اُن سے کیا لیا ہے اور اُس کی زبان اُن سب باتوں کو بیان کرے گی جو اُس کے ہونٹوں سے نکلی ہیں اور جس زمین پر وہ اِترا اِترا کر غرور اور تکبر کی چال سے چلا تھا وہ اُس کی گواہی دے گی۔ ان سب روایتوں کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان کی زندگی کا ہر ایک کام خدا سے مخفی نہ رہے گا۔ اگرچہ اب بھی مخفی نہیں ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک روایت بھی صحیح نہیں اور اُن موضوع روایتوں نے ایسی خرابی ڈال دی ہے کہ اصلی و صحیح بات بھی تاریکی میں پڑ گئی ہے۔ مگر ازرقی نے ایک روایت کتاب اخبار مکہ میں لکھی ہے۔ اگر اُس کے زوائد اور مبالغہ آمیز باتوں سے جو اُس میں شامل ہیں قطع نظر کی جائے تو اُس سے اصلیت اُس کی کسی قدر معلوم ہوتی ہے۔ بعد ایک قصہ بیان کرنے کے اُس میں لکھا ہے کہ "حجر اسود کو اللہ تعالیٰ نے طوفان نوح کے زمانہ میں ابو قبیس پہاڑ کو سپرد کر دیا تھا اور اُس کو سمجھا دیا تھا کہ جب تو میرے خالص دوست یعنی ابراہیم کو دیکھے کہ وہ میرا گھر بناتا ہے تو تو اس پتھر کو نکال دیجیو ہر ایک شخص اس روایت سے سمجھ سکتا ہے کہ صحیح بات صرف اس قدر ہے کہ یہ پتھر جبل ابوقبیس میں کا جو مکہ کے پاس ہے ایک پتھر ہے حضرت ابراہیم نے مثل اپنی عادت و طریقہ کے اول اس پتھر کو بطور مذبح کے کھڑا کیا۔ جب اُن کی اولاد یہاں مستقل رہنے لگی تو انھوں نے مکان مذبح بھی بنایا اور اُس پتھر کو اُس کے کونہ میں لگا دیا۔

وکان اللہ عزوجل استودع الرکن ابا قبیس حین غرق اللہ الارض زمن نوح وقال اذا رأیت خلیلی یبنی بیتی فاخبر له الخ (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۲۲)

اُسی کتاب میں یہ بھی ایک ٹھیک روایت لکھی ہے کہ "وہ دو دفعہ آتش زدگی میں جلنے کے سبب سے اس قدر کالا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ زمانہ جاہلیت میں قریش کے زمانہ میں ایک عورت کے ہاتھ سے کعبہ کے

وانما شدة سواده لانه اصابه الحریق مرة بعد مرة فی الجاهلیه والاسلام

فاما حریقه فی الجاهلیة فانه ذهبت
امرأة فی زمن قریش تجمر الکعبة فطارت
شرارة فی استار الکعبة فاحترقت الکعبة
واحترق الرکن الاسود واسود وتوهنت
الکعبة فکان هو الذی هاج قریشا علی هدمها
وبناءها واما حریقه فی الاسلام ففی عصر
ابن الزبیر ایام حاصرة الحصین بن نمیر
الکندی احترقت الکعبة واحترق الرکن فتفلق
ثلاث فلق حتی شعبه ابن الزبیر بالفضة
فسواده لذلك (صفحہ ۳۲)

پردہ میں خوشبو جلاتے وقت آگ لگ گئی تھی جس کے سبب سے کعبہ اور حجر اسود دونوں جل گئے تھے اور حجر اسود کالا ہو گیا تھا اور ایک دفعہ زمانہ اسلام میں ابن زبیر کے کے وقت میں کعبہ میں آگ لگی تھی اور حجر اسود جل کر تین ٹکڑے ہو گیا تھا اور ابن زبیر نے اُس کے گرد چاندی کا حلقہ چڑھا دیا تھا۔

یہ پتھر جو کعبہ کے کونہ میں لگایا گیا تھا اس سے مقصود اُس پتھر کی پرستش نہ تھی بلکہ صرف اس لئے لگایا گیا تھا کہ کعبہ کا طواف (جس کی حقیقت ہم بیان کریں گے) شروع ہونے اور ختم ہونے کی نشانی ہو۔ چنانچہ کتاب اخبار مکہ ارزقی میں لکھا ہے کہ جب ابراہیم کو حکم ہوا کہ خدا کا گھر بنا دے اور جب وہ بناتے بناتے وہاں پہنچے جہاں اب حجر اسود ہے تو انھوں نے اسمٰعیل سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ وہ لوگوں کے لئے ایک نشانی ہو اور اسی سے طواف شروع کیا کریں وہ ایک پتھر لائے ابراہیم نے اُس کو پسند نہیں کیا پھر ابراہیم کو یہ پتھر مل گیا پھر ابراہیم نے اسمٰعیل کے اس سوال کے جواب میں کہ یہ پتھر کہاں سے آیا کہا کہ اُس نے دیا جس نے تیرے پتھر کے بھروسہ پر مجھے نہیں رکھا۔

حدثنی جدی قال حدثنا سفیان بن
عیینة عن مجاهد عن الشعبی قال لما
امر ابراهیم ان یبنی البیت وانتهی الی موضع
الحجر قال لاسمٰعیل ائتنی بحجر یکون علما
للناس یبتدون منه الطواف فاتاه بحجر
فلم یرضه فاتی ابراهیم بهذا الحجر ثم
قال اتانی به من لم یکلنی علی حجرك
(کتاب اخبار مکہ صفحہ ۲۹)

مقتدر باللہ ابوالفضل جعفر ابن معتضد کے عہد میں جو سنہ ۲۹۵ ہجری میں خلیفہ ہوا تھا قرامطہ حجر اسود کو کعبہ سے اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ مدت بعد پھر لا کر رکھ دیا۔

مقدمہ سوم کعبہ بلا شبہ بیت العتیق ہے

ملکی اور مذہبی روایتوں کے سوا غیر مذہب مؤرخوں کی تحقیقات سے بھی کعبہ کا نہایت قدیم زمانہ سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے مسٹر گبن جیسا کہ وہ نہایت مشہور مؤرخ ہے ویسا ہی نہایت بڑا عالم اور فلسفی ہے اُس نے اپنی تاریخ میں کعبہ کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ کعبہ کی صحیح قدامت سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مؤرخ نے تھمیوویت اور سیبین کے بیان میں ایک مشہور معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام اہل عرب تعظیم کرتے تھے" اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیمی زمانہ (ابراہیم کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے۔

سر ولیم میور صاحب اس پر ایک معترضانہ تقریر لکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اُس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اُس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیم و اسمٰعیل سے ہے۔ کیونکر قیاس ہو سکتا ہے۔ عرب کی یہ روایت مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہ تھی، بلکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے بہت مدت پہلے اہل مکہ کی عام رائے تھی ورنہ قرآن میں بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اُس کا ذکر نہ ہوتا اور نہ بعض مقامات کے نام جو کعبہ کے گرد واقع ہیں ابراہیم و اسمٰعیل سے متعلق کئے جاتے جیسا کہ وہ متعلق کئے گئے ہیں؛

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے بلا شبہ یہاں غلطی کی ہے۔ جو کچھ ڈایوڈرس نے لکھا ہے اُس سے عرب کی اُس قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ہوتا ہے اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پیشتر اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ کو اور اُن تمام مراسم کو جو کعبہ سے علاقہ رکھتی ہیں۔ ابراہیم سے تعلق ہے اُس کی اصلیت و صحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنی جرہم نے اور تمام مختلف عرب کی قوموں نے اُس کو ابراہیم اور اسمٰعیل سے منسوب کیا تھا۔ عرب ایک بت پرست قوم تھی اور ابراہیم بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھے اس لئے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیم و اسمٰعیل سے نفرت کرتیں اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیم یا اسمٰعیل سے منسوب نہ کرتیں باوجود اس مغایرت و منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ کعبہ کو اور اُس کے مراسم کو ابراہیم اسمٰعیل سے تعلق ہے علانیہ اُس کی صحت و اصلیت

کی دلیل ہے نہ اس کے برخلاف جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے۔ اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے پیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لئے دلیل ہے نہ ہمارے مخالف کے لئے۔

مقدمہ چہارم سر ولیم کے اعتراضوں کی تردید

سر ولیم میور نے اپنی کتاب مسمی لائف آف محمد میں بلا کسی دلیل اور بغیر کسی ثبوت کے ان تمام واقعات سے جن سے کسی مؤرخ نے انکار نہیں کیا انکار کیا ہے اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جو اُن کے دل میں آئی حقیقت واقعہ قرار دیا ہے جن کی تردید ہم کرنا چاہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے خیال کی فرضی سچائی قائم کرنے کو جو فی نفسہ سچ نہیں ہے حسب تفصیل ذیل وجوہات قائم کی ہیں۔

اول:۔ انھوں نے یہ بات فرض کرلی ہے کہ مکہ کے قریب اسمٰعیل کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے۔ سب بناوٹ اور قصہ ہے اور ہر قسم کی تواریخی سچائی اور احتمال سے مبرا ہے۔

لیکن اس بات کے کہنے سے پہلے سر ولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بات بیان کرتے کہ اہل عرب کو اگر وہ نسل میں اور رسومات میں اور مذہب میں یقطان اور اسمٰعیل سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کی کیا ضرورت پیش آتی تھی اور کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمن اور سخت عداوت رکھتے تھے اور روزانہ جنگیاں اور باہمی لڑائیاں کرتے تھے۔ اس ایک بات پر متفق ہو گئے تھے۔

عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یقطان عرب کا مورث اعلیٰ تھا ان تمام باتوں کی کس طرح سر ولیم میور تردید کرتے ہیں کیونکہ ایسے موقع پر بلا قابل ثبوت کے صرف انکار کردینا کافی نہیں ہے۔

یونانی مؤرخ اہل جغرافیہ حجاز میں اسمٰعیل کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں۔ یونانی مؤرخوں نے حجاز کی اُن قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں۔ اُن سب واقعی باتوں کو سر ولیم میور کس طرح معدوم کرتے ہیں۔

دوم:۔ وہ فرماتے ہیں کہ صرف از راہ خود پسندی کہ "اس عقیدہ باطل کے اصلی اجزا میں کسی بات

کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ جو حضرت ابراہیم سے متعلق ہو، حجر اسود کا بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منا میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا اُن خیالات اور اصول سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے جو غالباً ان کی اولاد کو اُن سے پہنچیں یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں یا اُن کو بت پرستی کے اس اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا اور وہاں سے بنی جرہم یا بنی قطورہ یا ازروایت یا کوئی اور قوم جو یمن سے نقل مکان کرکے مکہ میں آباد ہوئی تھی اپنے ساتھ لائی تھی۔

مگر ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیم یا بنی اسرائیل کی تمام رسمیات سے جو اُن کے ہاں جاری تھیں یک لخت چشم پوشی کرلی ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسمیات میں اور بنی اسرائیل کی رسمیات میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔

حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب، اور موسیٰ بناتے تھے (دیکھو کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷، و ۸ باب ۱۳ ورس ۸ و باب ۲۶ ورس ۲۵ و باب ۲۸ ورس ۱۸ و ۱۹ و ۲۲ کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۵ و باب ۲۴ ورس ۴) بوسہ کے خاص فعل کی نسبت ہم جدا لکھیں گے اس مقام پر جو سر ولیم میور نے اس کا ذکر کیا اُس سے ایک عام مقصود بیان کرنا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی پتھر کی تعظیم، مگر انھوں نے ان پتھروں کی اُس تعظیم کو فراموش کردیا جو ابراہیم و اسحاق و یعقوب و موسیٰ کرتے تھے۔ یہ سب بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس جانتے تھے خدا کے نام سے اُن کی تعظیم کرتے تھے۔ یعقوب نے ان پر تیل ڈالا (دیکھو پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۹) جو اُس زمانہ کے دستور کے موافق غایت الغایت تعظیم پرستش کے قریب تھی۔ یعقوب نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی دیکھو کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۲۲ خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمھاری شرم گاہ اُس کے اوپر ننگی نہ ہوجائے (دیکھو کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۶) پس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیم میں جاری نہ تھا جس کے سبب سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو (اگر وہ ہو بھی) بنی ابراہیم کی رسم سے جدا کرکے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔

ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیم کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ) جس نے مقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر

بنایا (دیکھو کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۴ و کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۱ ورس ۲۹)

اور وہ کون تھا (یعنی داود) جس نے خرمن گاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر و لکڑی و لوہا و پیتل اُس کے بنانے کو جمع کیا (دیکھو کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۲)

اور وہ کون تھا (یعنی سلیمان) جس نے بعد کو خرمن گاہ ارنان یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا (دیکھو کتاب تاریخ ایام دوم باب ۳)

پس کعبہ کی بنا کو اور اُس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیم کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بُت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔

مکہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے (جس کی حقیقت ہم بیان کریں گے) سر ولیم میور کو اس رسم کی نسبت ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اُس وقت مناسب تھا جب کہ اولاً وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے یہ بات ثابت کر لیتے کہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب نے جو مذبح اور بیت اللہ بنائے تھے۔ ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے اس واسطے کہ توریت سے موسیٰ کے وقت سے پیشتر صرف خدا کے نام یا عبادت کے لئے اُن گھروں کا بننا تو معلوم ہوتا ہے مگر اُس سے عبادت کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا اور ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی قوی دلیل ہے کہ اُس زمانہ میں خدا کی عبادت کا طریقہ یہی تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے اور اسمٰعیل کی اولاد نے اپنے دادا کے اُسی طریقہ کو اور اُسی ہیئت کو اب تک قائم رکھا ہے۔

ہم کو اُمید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ حج خانہ کعبہ کا نہیں ہوتا حج کو خانہ کعبہ سے کچھ تعلق نہیں ہے پس یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانہ کعبہ کا حج ہوتا ہے۔

عرفات۔ ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیم اور اُس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے ہزاروں جگہ توریت میں آیا ہے کہ خدا ابراہیم کو مرئی ہوا خدا اسحاق کو مرئی ہوا خدا یعقوب کو مرئی ہوا خدا موسیٰ کو مرئی ہوا۔ پس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں جس پہاڑ پر جو قریب مکہ کے ہے۔ خدا ابراہیم و اسمٰعیل کو مرئی ہوا اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے، معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے عرفات کو کیا سمجھا جو اُس کی نسبت کہا کہ اُس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بُت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ یہ خاص امر ابراہیم کی نسل میں مروج تھا اس مقام پر ہم اس کے مطلب پر کہ خدا کیونکر دکھائی دے سکتا

ہے بحث نہیں کرنا چاہتے اور نہ ان الفاظ کے مطلب و مراد سے بحث منظور ہے بلکہ یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیم کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا اور اس لیے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اُس کا خاص تعلق ابراہیم سے ثابت ہوتا ہے۔

یہی مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے پہاڑ تلے کا میدان ہے اُس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں اُس کی تسبیح کرتے ہیں اس خدائے قدوس کو یاد کرتے ہیں اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے، جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بُت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیم سے۔

منا کا مقام صرف قربانی کے لیے ہے وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی۔ تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے اور اس لیے قربانی نذر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیم اور یعقوب و اسحٰق اور موسیٰ اور داؤد اور سلیمان کی قربانی اور مذہب اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اس قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اُس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھی مذہب اسلام میں وہ قربانی غریب و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں پس اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بُت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے۔ تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ہر ذی عقل اُس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا (اس امر کی تحقیق کہ مذہب اسلام میں قربانی کیا چیز ہے ہم جُدا گانہ لکھیں گے)

کسی ملک کو مذہب اسلام نے مقدس نہیں ٹھیرایا بلکہ مقدس جگہ کو جو خاص خدا کی پرستش کو مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی مقدس ٹھیرایا ہے یہ بھی ابراہیم ہی کا طریقہ تھا اور برابر اُس کی اولاد میں چلا آتا تھا جہاں وہ خانہ خدا یا مذبح بناتے تھے اُس کو مقدس ٹھیراتے تھے۔ موسیٰ کو خدا نے کہا کہ سینا پہاڑ کے لیے حد ٹھیرا، اور اُس کو مقدس کر (کتاب خروج باب ۱۹ ورس ۲۳) وہ کون تھا (یعنی خدا) جس نے کہا کہ "مقام مقدس مرا احترام نما ئید (سفر لویان باب ۲۶ ورس ۲) اسی

طرح بیت المقدس کو مقدس ٹھیرایا خانہ کعبہ کے لیے بھی جب سے وہ بنا ایک حد ٹھیرائی گئی جو حرم کہلاتی ہے اور اُس کو اس مقدس نام کے ادب کے لیے جس کے نام پر وہ پاک جگہ بنائی گئی. مقدس ٹھیرایا تھا یہ بھی ایک نہایت عمدہ ثبوت اس بات کا ہے کہ بیت اللہ کو اور حرم کو مقدس ٹھیرانا خاص ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے نہ بُت پرستوں کی رسم ہے۔

ہاں سر ولیم میور کی ایک بات کو میں تسلیم کروں گا کہ رجب اور ذیقعدہ اور ذیحجہ اور محرم کے چار مہینوں کا مقدس ٹھیرانا زمانہ جاہلیت کی رسم تھی اُن کو مقدس اس مراد سے ٹھیرایا تھا کہ اُن مہینوں میں زمانہ جاہلیت میں عرب لڑائی نہیں لڑتے تھے۔ عرب کی تو میں نہایت مفسد اور خانہ جنگ تھیں برسوں تک آپس میں لڑائی جاری رہتی تھی اور اُن چار مہینوں میں عام قوموں کو مکہ میں آنا اور حج کرنا اور کعبہ کے بتوں کو پوجنا ہوتا تھا۔ پس اُن سب قوموں نے آپس میں عہد کر لیا تھا کہ ان دنوں میں لڑائی موقوف رہے گی۔ پس یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے ان مہینوں کا اشہر حرم نام رکھا تھا۔ مگر سر ولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی اُن کو مقدس مانا ہے حالانکہ مذہب اسلام نے اُن کی تقدیس کو رد کر دیا ہے اور کوئی مہینہ مسلمانی مذہب میں مقدس نہیں رہا ہے اسلام نے کہا کہ چار مہینے جو مقدس ٹھیرائے گئے ہیں اُن میں تم لڑائی کی ابتدا مت کرو لیکن اگر کافر لڑیں تو لڑو۔

خدا تعالیٰ سورۂ توبہ میں فرماتا ہے کہ "گنتی مہینوں کی اللہ کے نزدیک برس کے بارہ مہینے ہیں خدا کے مقرر کیے ہوئے حکم میں جب سے کہ آسمان و زمین پیدا کیا (یعنی لوند کے مہینہ کا اس میں حساب نہیں ہے) اُن ہی میں سے چار مہینے وہ ہیں جن کو اہل عرب اشہر حرم کہتے ہیں یہی ٹھیک حساب ہے اب خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان چار مہینوں پر کچھ حصر نہیں ہے بلکہ تم اُن بارہ کے بارہ مہینوں میں آپس میں مت لڑو۔ اور تمام کافروں سے لڑو جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں۔ پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب اسلام میں اشہر حرم نہیں مانے جاتے بلکہ بارہ کے بارہ مہینے ایک سے ہیں۔

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شہرًا فی کتاب اللہ خلق السموات والارض منھا اربعۃ حرم ذلک الدین القیم فلا تظلموا فیھن انفسکم وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ (سورۂ توبہ)

ضمیر فیھن کی اثنا عشر شہرا کی طرف راجع ہے نہ اربعۃ کی طرف۔

سوم:۔ وہ فرماتے ہیں کہ "عرب کے خاص طریقے سیبینؔ ازم اور بُت پرستی اور پتھر کی پرستش تھی۔ اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا۔"

ؔ مذہب صابیہ ۱۲

ہم کو اس بات کے قبول کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو طریقے مکہ میں جاری تھے۔ اُن میں بہت کچھ رسومات بت پرستی کی شامل ہو گئی تھیں۔ سیبین ازم یعنی صابئین کا مذہب بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہا تھا اس میں ہزاروں باتیں کفر و شرک اور کواکب کی پرستش کی داخل ہو گئی تھیں اور وہ بگڑا ہوا مذہب اور بت پرستی آپس میں مل کر زمانۂ جاہلیت میں اُس نے نہایت عجیب صورت پیدا کی تھی۔ مگر جو خاص باتیں ابراہیم کے مذہب کی اُن میں پائی جاتی تھیں اُن کو بھی سر ولیم میور بُت پرستی سے منسوب فرماتے ہیں یہی اُن کی غلطی ہے۔ خانہ کعبہ کو اور ابراہیمی اور اسمٰعیلی نماز کے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ کہتے ہیں (اور جس کی اصل ہم بیان کریں گے) سیبین ازم یا بُت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ پتھر یا حجر اسود کی پرستش جس کو سر ولیم میور خاص عرب کا دستور بیان کرتے ہیں (اگر درحقیقت وہ پتھر کی پرستش ہی ہو) خاص ابراہیم کا طریقہ تھا جیسا کہ ہم ابھی ثابت کر آئے ہیں۔ یہ طریقہ خاص ابراہیم سے پیدا ہوا اور یعقوب و اسحاق اور اسمٰعیل اور موسیٰ نے اُس کی پیروی کی جو بن گھڑے اور ننگے پتھروں کو ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے اور اُن پر تیل چڑھاتے تھے۔ خواہ یوں کہو کہ مہادیو کی پنڈے کی طرح اُن پتھروں کی پرستش کرتے تھے۔ غرضیکہ جو کچھ اُن کی نسبت کہو ہم تسلیم کرلیں گے مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیمی نہ تھا بلکہ خاص عرب کے بُت پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور بیان کرتے ہیں تسلیم نہیں ہو سکتا کیونکہ اُن کی غلطی علانیہ ثابت ہے۔

ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصوں کے بعد سر ولیم میور نے مکہ کی ابتدا اور مکہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے اور ہر ایک بات کو بلا دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد سر ولیم میور بالطبع (جو درحقیقت ایسا ہی ہونا ضرور تھا) اپنے عالی دماغ اور تر و تازہ موج زن ذہن کے ایجادات کو عرب کی واقعی تاریخ سے مطابق کرنا ناممکن پاتے ہیں۔ مگر جس طرح کہ سر ولیم کا خیال بہت بلند اور فکر بہت تیز ہے اُس کی بہ نسبت اُن کے قلم تیز رفتار کی جولانی بھی کچھ کم نہیں ہے پس وہ ایک لمحہ میں اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں پر غالب آتے ہیں۔ مگر چونکہ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی وہ باتیں نہ تواریخی واقعات ہیں۔ اور نہ عرب کی مختص المقام روایتیں اور نہ کتاب مقدس کی سچی باتیں بلکہ صرف سر ولیم کے عجیب و غریب کام کرنے والے خیال کی ایجادیں ہیں اور کسی قسم کی معتبر سند اور ہر ایک قسم کی تائید و تصدیق سے مبرا ہیں۔ اس وجہ سے ہم ان کو اپنے اس خطبہ میں ذکر کرنا محض بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

تعمیر ابراہیم

پرانی باتوں کے ساتھ ہمیشہ قصے وکہانیاں لوگ ملا دیتے ہیں ان کو مقدس ومتبرک بنانے کو ایسے ایسے واقعات اُن کے ساتھ منسوب کرتے ہیں جن کی کچھ بھی اصل نہیں ہوتی۔ مذہب اسلام میں بھی لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ مکہ کی نسبت جو حالات روایتوں میں مذکور ہیں اُن کا بھی یہی حال ہے قرآن مجید میں بہت تھوڑے لفظ ہیں اور نہایت مختصر ان کا مطلب ہے کہ ابراہیم نے خدا کی عبادت کے لئے مسجد بنائی اور خدا سے دعا کی کہ تو اُس کو اپنے مبارک نام پر قبول کر۔ مگر مورخین نے اس پر وہ حاشیے چڑھائے اور وہ واقعات لگائے کہ نعوذ باللہ خدا کو بھی معلوم نہ تھے۔ پس ایک منصف شخص کا یہ کام نہیں ہے۔ کہ اُن جھوٹی باتوں کو جن کو ہم خود جھوٹا کہتے ہیں۔ مذہب اسلام قرار دے اور پھر اس پر اعتراضات کی بنا قائم کرے کیونکہ وہ تو بنائے فاسد علی الفاسد ہے اور نہ اُس شخص کو جس کے دل میں اسلام کی جانب سے کچھ شبہ پیدا ہو یہ مناسب ہے کہ اُن جھوٹی روایتوں سے ڈگمگا دے کیونکہ وہ تو خود جھوٹی ہیں۔ مگر جو واقعات کہ مبالغہ آمیز تقدس کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اُن میں اصلی واقعات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر عقلمند ومنصف کو لازم ہے کہ اُن اصلی واقعات کو اُن جھوٹی باتوں سے بمقدور چھانٹ لے۔ اور پھر اُس پر جو وہ چاہے اپنی رائے قائم کرے۔

تمام روایتیں جو مکہ کی نسبت کتابوں میں مندرج ہیں۔ سب کی سب نامعتمد وغیر مستند ومشتبہ ہیں اور اُن میں سچی اصلی بات کے ساتھ بہت کچھ جھوٹ اور قصے کہانیاں شامل کر دیئے ہیں مگر جس قدر کہ سچ ہے وہ اُن سے بخوبی ممیز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم اس خطبہ میں اُسی قدر پر اکتفا کریں گے، جس قدر کہ ہمارے نزدیک سچ ہے۔

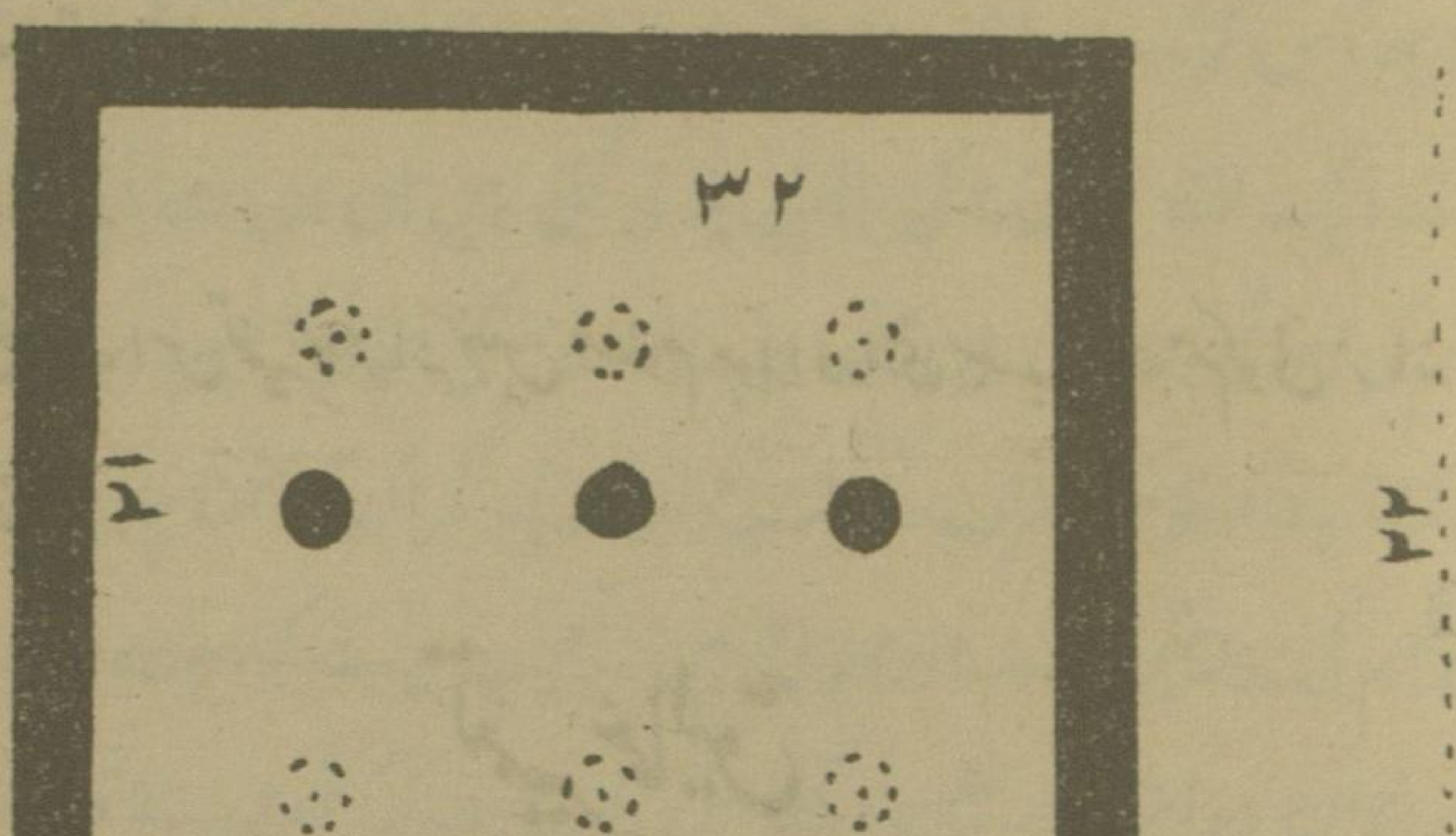
حضرت ابراہیم نے بیت اللہ بنانے کو پہاڑ کی گھاٹی میں جہاں اس قسم کی عمارتیں بنانے کو بالطبع جگہ پسند کی جاتی ہے۔ جگہ پسند کی اور زیادہ تر پسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چشمہ زمزم کے نہایت قریب تھی وہاں انہوں نے حضرت اسمٰعیل کی شرکت سے کعبہ یعنی مسجد بنائی کتابوں میں اس کا ارتفاع لو ذرعہ اور ایک طرف کا عرض بیس اور ایک طرف کا بائیس اور ایک طرف کا طول اکتیس اور ایک طرف کا بتیس لکھا ہے

فبنا البیت وجعل طوله فی السماء تسعة اذرع وعرضه فی الارض اثنین و ثلاثین ذراعا من الرکن الاسود الی الرکن الشامی الذی عند الحجر من وجهه وجعل عرض ما بین الرکن الشامی الی الرکن

الذرعی الذی فیہ الحجر اثنین وعشرین ذراعا وجعل طول ظہرہا من الرکن الغربی الی الرکن الیمانی احد وثلاثین ذراعا وجعل عرض شقہا الیمانی من الرکن الاسود الی الرکن الیمانی عشرین ذراعا (کتاب اخبار مکہ ازرقی صفحہ ۳۱)

اگر یہ پیمایش صحیح ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نیک زمانہ میں پیمایش کے آلات نہ تھے اور قائمے زاویے نہیں نکل سکتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے ہر مقابل کے ضلعے مساوی نہیں بن سکے۔

جو پیمایش کہ مذکور ہوئی ہے۔ اُس کے مطابق ہم اس مقام پر نقشہ کعبہ کا ثبت کرتے ہیں جس سے اُس کی قطع بخوبی معلوم ہو گی۔ دائیں طرف جو حصہ نقطوں سے گھرا ہوا ہے حضرت ابراہیم کے وقت میں وہ بھی کعبہ میں داخل تھا۔ قریش نے تعمیر کے وقت اُس قدر چھوڑ دیا تھا۔ کعبہ کے اندر جو نقطہ دار نشان ہیں وہ اُن ستونوں کے ہیں جو قریش نے بنائے تھے وہ اب نہیں ہیں بعوض اُس کے عبداللہ ابن زبیر نے تین ستون بنائے ہیں جن کے سیاہ نشان بیچ میں بنے ہوئے ہیں۔ غرض کہ جس قدر سیاہ سیاہ ہے وہ اب موجود کعبہ ہے۔



تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیواریں ہی دیواریں بنی تھیں چھت نہیں تھی اور دروازہ زمین سے ملا ہوا تھا اور اُس میں نہ کواڑ چڑھے تھے نہ کنڈی لگی تھی اور بلاشبہ اس زمانہ کی حالت ایسی تھی کہ اس سے زیادہ تعمیر مکان میں گو وہ خدا ہی کا گھر بنایا گیا ہو اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عمارت کے ایک بیرونی گوشہ پر طواف کے شمار کرنے کو جس سے اُس کی ابتدا اور انتہا معلوم ہو سکے ایک لنبا پتھر لگا دیا جو حجر اسود کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کے قیاس کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ پتھر غالباً اُسی قسم کا پتھر ہے جیسا کہ ابراہیم خدا کی عبادت کے لئے کھڑا کر لیا کرتے تھے جس کو مذبح یا قربانی گاہ

یا اثر کہتے ہیں۔اس چار دیواری کے اندر ایک کنواں کھودا تھا جس کو خزانہ کعبہ کہتے تھے اور جو کچھ نذر و نیاز کعبہ میں آتی تھی وہ اُس میں رکھ دیتے تھے تاکہ چوری سے محفوظ رہے۔

تعمیر بنی جرہم

کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت اسمٰعیل اُس کے محافظ رہے جب اُن کا انتقال ہوا تو بنی جرہم کو اُس میں مداخلت ہوئی۔کیونکہ وہ اُن کے قریب تر رشتہ دار تھے اور بنی اسمٰعیل کے خیر خواہ و محافظ تھے۔مضاض ابن عمرو جرہمی جو نانا اسمٰعیل کے بیٹے کا تھا اُس نے اپنے ہاتھ میں سب اختیار لے لیا۔بنی جرہم کے اختیار کے زمانہ میں پہاڑی نالہ آیا اور کعبہ میں پانی چڑھ گیا اور کعبہ ڈھے گیا جس کو بنی جرہم نے اُنھیں بنیادوں پر جو ابراہیم نے بنائی تھیں اور اُسی صورت پر پھر بنا لیا اُس کی بلندی زمین سے نو ذرعہ تھی۔

قالوا وتوفی اسمٰعیل ودفن فی الحجر کانت امہ قد دفنت فی الحجر ایضا وترک ولدہ امن ملة ابنة مضاض بن عمرو الجرھمی فقام مضاض بامر ولد اسمٰعیل ومنھم لانھم بنو ابنتہ فلم یزل امر جرھم یعظم بمکة ویستفحل حتی دوا البیت وکانت ولاتہ وحجابہ وولاة الاحکام بمکة فجاء سیل فدخل البیت فانھدم فاعادتہ جرھم علی بناء ابراھیم وکان طولہ فی السماء تسعة اذرع۔

(کتاب اخبار مکة صفحہ ۴۸)۔

ہم کو کسی تاریخ سے اس تعمیر کا زمانہ نہیں معلوم ہوا اور اسی سبب سے ہم کوئی زمانہ اس کی تعمیر کا قرار نہیں دے سکتے۔

تعمیر عمالیق

عرب میں جو لوگ آباد ہوئے وہ تین ناموں سے مشہور ہیں۔ایک عرب البائدہ۔ایک عرب العاربہ اور ایک عرب المستعربہ۔عرب البائدہ وہ لوگ کہلاتے تھے جن میں عاد و ثمود اور جرہم الاولیٰ۔اور عمالیق اولیٰ تھے۔وہ قومیں برباد ہو گئیں اور تاریخ کی کتابوں میں اُن کا بہت کم حال ملتا ہے اور یہ سب قومیں ابراہیم سے اور بناء کعبہ سے پہلے تھیں۔

عرب العاربہ کی وہ قومیں ہیں جن کی نسل یقطان یا قحطان سے چلی ہے اور تمام قبائل عرب اسی نسل میں ہیں۔حمیر بھی انھیں کا ایک قبیلہ ہے اور بنی حمیر میں بھی ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے تھا جو مکہ میں بستا تھا۔اس پچھلی قوم نے بنی جرہم پر غلبہ پا لیا تھا اور کعبہ کی مختار ہو گئی تھی اُسی زمانہ میں

اس قوم عمالیق ثانی نے کعبہ کو پھر بنایا جو غالباً پہاڑوں کے نالے چڑھ آنے سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

بعض مؤرخوں نے ان دونوں قوموں میں تمیز نہیں کی اور عرب البائدہ میں جو قوم عمالیق تھی اُس کی نسبت تعمیر کعبہ کو خیال کیا اور جو کہ وہ قوم بنی جرہم سے پہلے تھی اس لئے لکھ دیا کہ عمالیق نے قبل بنی جرہم کے تعمیر کعبہ کی تھی حالانکہ اُس زمانہ میں نہ ابراہیم تھے نہ کعبہ تھا۔

مؤرخوں کی اس غلطی میں پڑنے کا سبب ان کا ایک اور غلط خیال بھی ہے مسلمانوں میں بہت سی ایسی روایتیں جو دیوپری کے قصہ سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں موجود ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ کعبہ پہلے عرش کے نیچے چار ستون کے چوکھمبے کی طرح بنایا گیا تھا۔ اُس کے ستون زبرجد کے تھے اور یاقوت احمر کی پچی کاری سے ڈھنکے ہوتے تھے۔ اس گھر کا نام تو بیت المعمور ہوا پھر خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین پر اسی کے مقابل اتنا ہی بڑا اور اسی شکل کا گھر بناؤ انھوں نے بنایا اور وہ اُس جگہ بنایا تھا جہاں اب کعبہ ہے مگر افسوس ہے کہ وہ فرشتے اچھے انجنیر نہ تھے۔ حضرت آدم کے پیدا ہوتے ہوتے وہ گھر نہ رہا تھا کہ حضرت آدم کو پھر بنانا پڑا مگر نوح کے طوفان نے پھر اُس کو ڈھا دیا تب نوح نے بنایا پھر اسی طرح ٹوٹتا ڈھتا رہا۔ یہ سب جھوٹی روایتیں قرآن مجید کے ایک لفظ "عتیق" کی بنا پر بنا لی گئی ہیں جن میں سے ایک جگہ کی بھی کچھ اصل نہیں ہے۔ اسی قسم کی جھوٹی روایتیں ہیں جنھوں نے اسلام کی سچائی کو چھپا دیا اور ہر سمجھ دار کے دل میں جب وہ غور کرتا ہے اسلام کی طرف سے شبہ ڈال دیا۔ مگر اُن کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام مشتبہ نہیں ہے بلکہ اس قسم کی روایتیں مشتبہ اور جھوٹی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور نادان مؤرخ ان روایتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جب کہ انھوں نے قدامت مکہ ایسی پرانی فرض کرلی جو آدم سے بھی پرانی ہے تو اب ان کو اس بات کے کہنے میں کہ جرہم سے پہلے عمالیق نے تعمیر کی تھی کچھ باک نہیں رہا۔

ایک فرانسیسی مؤرخ نے اپنی کتاب موسومہ "ڈائی کرائیکن ڈراسٹ مکہ" میں حضرت علی کی روایت سے لکھا ہے کہ پہلے بنی جرہم نے اور اُس کے بعد عمالیق نے (یعنی عمالیق ثانی نے) کعبہ کی تعمیر کی۔

عمالیق ثانی کی تعمیر کا زمانہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی سے ایک صدی پیشتر وہ لوگ مکہ پر قابض تھے اس لئے کہ حذیمہ بادشاہ دوم خاندان

حیرہ کی ایک نہایت سخت لڑائی عمالیق سے ہوئی تھی جس میں عمالیقوں نے شکست فاش کھائی اور یہ واقعہ سنہ عیسوی سے تخمیناً سو برس پیشتر ہوا تھا۔

تعمیر قصیٰ

ایک مدت بعد پھر کعبہ میں کچھ نقصان آ گیا اور بجز اُس کے کہ سیلاب سے نقصان پہنچا ہو۔ جو اب بھی کبھی آ جاتا ہے اور کوئی سبب نقصان کا معلوم نہیں ہوتا۔ اُس وقت قصی ابن کلاب نے اُس کو بنایا۔ اگرچہ اس تعمیر کا زمانہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہے۔ مگر جو کہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ قصی چھ پشت پیشتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اس لئے غالباً یہ تعمیر دو سو برس پیشتر آنحضرت صلعم کی ولادت سے ہوئی تھی۔

تعمیر قریش

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کا سن شریف تخمیناً بارہ چودہ برس کا ہو گا یعنی تیسری دہائی ماقبل سال اظہار نبوت میں کعبہ کے غلاف میں آگ لگی اور کعبہ کی دیواریں آتش زدگی کے سبب بودی ہو گئیں اور کئی جگہ سے پھٹ بھی گئیں اسی عرصہ میں پہاڑی نالوں کی جنھیں عرب سیل عوارم کہتے ہیں کثرت ہوئی اور ایک نالہ نہایت زور و شور سے آیا اور خانۂ خدا پانی سے بھر گیا اور دیواریں پھٹ گئیں اور گرنے کو ہوئیں تب قریش نے اُس کے بنانے کی فکر کی۔

فلما احترقت الکعبۃ توھنت جدرانھا من کل جانب وتصدعت وکانت الحجارۃ الاربعۃ مظلۃ والسیول متواترۃ والمکۃ سیول عوارم فجاء سیل عظیم علی تلک الحال فدخل الکعبۃ و صدع جدرانھا واخافھم ففزعت من ذلک قریش فزعا شدیدا وھابوا ھدمھا وخشوا ان مسوھا ان ینزل علیھم العذاب (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۰۷)

معلوم ہوتا ہے کہ قریش فن تعمیر عمارت سے بہت کم واقف تھے اور وہ اس فکر میں تھے کہ اس کو کون بنادے اور کیونکر بناویں اس درمیان میں رومیوں کا جو اُس زمانہ میں عیسائی اور رومن کیتھلک مذہب کے تھے ایک جہاز بندرگاہ مکہ میں آیا اُس زمانہ میں جدہ بندرگاہ نہ تھا، بلکہ شعیب بندرگاہ تھا اور وہاں وہ جہاز ٹوٹ گیا

فبینا ھم علی ذلک ینظرون ویتشاورون اذ اقبلت سفینۃ الروم حتی اذا کانت بالشعیبۃ وھی یومئذ ساحل مکۃ قبل جدۃ انکسرت فسمعت بھا قریش فرکبوا الیھا فاشتروا خشبھا واذن لاھلھا ان یدخلوا مکۃ فیبیعون ما

معهم من متاعهم ان لا یعشروهم ... نکان فی السفینة رومی نجار بناء یسمی باقوم فلما قدموا بالخشب مکة قالوا لو بنینا بیت ربنا فاجمعوا لذلك وتعاونوا علیه وترادوا فی النفقة (کتاب اخبار مکة صفحه ۱۰۷)

جب قریش نے یہ بات سنی تو وہاں گئے اور اُس کی لکڑی مول لے لی اور جہاز والوں کی خاطر داری کی اور کہا کہ تم مکہ میں آؤ اور اپنا اسباب بیچ لو ہم تم سے محصول بھی نہیں لینے کے۔ اُس جہاز میں ایک عیسائی رومن کیتھلک انجنیر بھی تھا اور باقوم اُس کا نام تھا اُس سے خواہش کی کہ وہ خدا کے گھر کو بنائے۔ پس لوگوں نے اُس کام میں مدد کی اور اخراجات جمع کرنے کی تدبیر شروع کی۔

فنقلوا الحجارة ورسول الله یومئذ غلام لم ینزل علیه الوحی ینقل معهم الحجارة علی رقبته . (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۷)

سب لوگ مل کر پتھر ڈھوتے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس زمانہ میں اگرچہ تھوڑی عمر تھی مگر آنحضرتؐ بھی پتھر ڈھونے میں شریک تھے۔

فلما اجتمع لهم ما یریدون من الحجارة والخشب وما یحتاجون الیه عدوا الی هدمها ... فهابت قریش هدمه وقالوا من یبدا بهدمه فقال الولید بن المغیرة انا ابدءکم فی هدمه انا شیخ کبیر فان اصابنی امر کان قد دنا اجلی وان کان غیر ذلك لم یرزانی فعلا البیت وفی یده تهلة یهدمها ... فهدمت قریش معه حتی بلغوا الاساس الاول الذی رفع علیه ابراهیم واسمعیل القواعد من البیت (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۰ و ۱۰۹)

جب کہ پتھر و لکڑی سب جمع ہو گئی تو انھوں نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر سب وہم و سواس میں گرفتار تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر ڈھا دیں گے تو خدا جانے کیا آفت آئے گی۔ ولید ابن مغیرہ نے اپنا دل کڑا کیا اور کہا کہ میں ڈھانا شروع کرتا ہوں میں بڈھا تو ہو ہی گیا ہوں اگر کچھ آفت آتے گی تو مرنے کو تو ہو ہی رہا ہوں۔ چنانچہ ولید ابن مغیرہ کعبہ کی دیوار پر چڑھا اور کدال سے ڈھانا شروع کیا۔ پھر سب ڈھانے لگے اور بنیاد تک جس پر سے حضرت ابراہیم نے چنائی شروع کی تھی برابر کر دیا۔

فلما اجمعوا ما اخرجوا من النفقة قلت النفقة ان تبلغ لهم عمارة البیت کله فتشاوروا فی ذلك فاجمع رایهم علی ان یقصروا عن القواعد ویحجروا ما یقدرون علیه من بناء البیت ویترکوا بقیته فی الحجر علیه جدار مدار یطوف الناس من ورائه ففعلوا ذلك وبنوا فی بطن الکعبة اساسا یبنون علیه من شق الحجر وترکوا

جب سب ڈھا چکے تو معلوم ہوا کہ جو کچھ سامان انھوں نے جمع کیا ہے وہ اُس سب کے بنانے کو کافی نہیں ہے۔ قریش نے کعبہ کی عمارت کو بہ نسبت سابق کے دو چند مرتفع بنایا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر و مصالح وغیرہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ غالبًا لکڑی اس قدر نہ تھی جس سے کل کعبہ کی چھت بن سکے اس

من وراءه من بناء البیت فی الحجر ستة اذرع و شبر فبنوا علی ذلك (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۹)

لئے انھوں نے اس کو چھوٹا کر کے بنایا چھ ذرعہ اور ایک بالشت زمین حجر کی طرف چھوڑ دی اور اُس طرف عرض میں ایک جدید بنیاد کھود کر دیوار چُن لی جو اب ہمارے نقشہ میں سیاہ بنی ہوئی ہے۔

فلما وضعوا ایدیهم فی بناءها قالوا ارفعوا بابها من الارض واکبسوها حتی لا تدخلها السیول ولا ترقی الا بسلم ولا یدخلها الا من اردتم ان کرهتم احدا دفعتموه ففعلوا ذلك۔ (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۹)

اُنھوں نے کعبہ کو چار ذرعہ اور ایک بالشت کرسی دیدی اور اس قدر کرسی پر دروازہ بنایا تاکہ نالے کا پانی پھر اندر نہ گھسے اور کوئی شخص بغیر سیڑھی کے نہ چڑھ سکے اور اس حکمت سے جس کو چاہیں نہ جانے دیں۔ (حال کے زمانہ میں کعبہ کے اندر جانے کو داخلی کہتے ہیں)۔

حتی انتهوا الی موضع الرکن فاختلفوا فی وضعه وکثر الکلام فیه وتنافسوا فی ذلك ... فقال ابو امیة بن المغیرة یا قوما انما اردنا البر ولم نرد الشر فلا تحاسدوا ولا تنافسوا فانکم اذا اختلفتم تشتت امورکم وطمع فیکم غیرکم ولکن حکموا بینکم اول من یطلع علیکم من هذا الفج قالوا رضینا وسلمنا فطلع رسول الله صلی الله علیه وسلم قالوا هذا الامین قد رضینا به فحکموه فبسط رداءه ثم وضع فیه الرکن فدعا من کل ربع رجلا فاخذوا باطراف الثوب ... فرفع القوم الرکن وقام النبی صلی الله علیه وسلم علی الجدر ثم وضعه بیده (کتاب اخبار مکة صفحه ۱۰۹ و ۱۱۰)

جب بناتے بناتے وہاں پہنچے جہاں حجر اسود لگانا تھا تو آپس میں جھگڑا و تکرار ہوئی۔ ایک قبیلہ کہتا تھا کہ ہم کھڑا کریں گے دوسرا کہتا تھا کہ ہم کھڑا کریں گے۔ بڑی خیر ہوئی کہ ابو امیہ بن مغیرہ کے سمجھانے سے سب لوگ اس بات پر راضی ہو گئے کہ جو سب سے پہلے اس رستہ سے آئے وہی فیصلہ کے لئے حکم بدا جائے۔ اُن سب کی خوش قسمتی یہ ہوئی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے تشریف لائے۔ اگرچہ حضرت کی عمر چھوٹی تھی۔ مگر سب امین امین کہکر چلّا اٹھے۔ آنحضرت نے بتائید روح القدس وہ فیصلہ فرمایا کہ سب متحیر ہو گئے۔ آپ نے ردائے مبارک بچھائی اور حجر اسود کو اس میں رکھا اور سب قوموں کے سرداروں کو کہا کہ سب مل کر چادر پکڑ کر اٹھا دیں اور وہاں تک لے چلیں جہاں لگانا ہے۔ سب نے اسی طرح مل کر اٹھایا اور جب کونے کے پاس لائے تو آنحضرت نے اس کو وہاں رکھ دیا۔ متقدمین و متاخرین علماء اس واقعہ کو واقعہ قبل بعثت کہتے ہیں۔ مگر میں ان لفظوں سے متفق نہیں ہوں کیونکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم وقت ولادت سے ہی مبعوث تھے۔ النبی نبی ولو کان فی بطن امہ۔

فبنوا حتی ارفعوا اربعة اذرع وشبرا ثم کبسوھا ووضعوا ابابھا مرتفعا علی ھذا الذرع ... فقال لھم یاقوم الرومی اتحبون ان تجعلوا سقفھا مکبسا او مسطحا فقالوا ابل ابن بیت ربنا مسطحا قال فبنوہ مسطحا وجعلوا فیہ ست دعائم فی صفین فی کل صف ثلاث دعائم ... وجعلوا ارتفاعھا من خارجھا من الارض الی اعلاھا ثمانیة عشر ذراعا وکانت قبل ذلک تسعة اذرع فزادت قریش فی ارتفاعھا فی السماء تسعة اذرع اخر ... وجعلوا میزابھا یسکب فی الحجر وجعلوا درجة من خشب فی بطنھا فی الرکن الشامی یصعد منھا الی ظھرھا (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۱۰)

جب کہ یہ تنازعہ رفع ہوگیا تو تعمیر شروع ہوئی جتنا کہ کعبہ پہلے زمین سے بلند تھا قریش نے اُس سے دوگنا بلند کردیا۔ یعنی زمین سے اٹھارہ ذرعہ اور پہلے صرف نو ہی ذرعہ تھا۔ جب دیوارین بن چکیں تو باقوم نے پوچھا کہ اس کی چھت کیسی بناؤں۔ بنگلہ نما یا چورس۔ سب نے کہا کہ ہمارے خدا کے گھر کی چھت چورس بناؤ۔ تب باقوم نے اُس کے عوض میں چھ ستون کھڑے کئے اور چورس چھت بنادی غالباً اس قدر لمبی لکڑی نہ تھی کہ پورا شہتیر پڑجاتا اسی سبب سے بیچ میں ستون بنانے کی ضرورت ہوئی اور شاید اسی وجہ سے باقوم نے بنگلہ نما بنانی چاہی ہوگی تاکہ قینچی پڑ جائے اور بیچ میں ستون بنانے نہ پڑیں۔ اُس کی چھت کا پرنالہ اُس جگہ میں ڈالا جو چھوڑ دی گئی تھی اور کعبہ کے اندر ایک کاٹ کی سیڑھی چھت تک بنائی اور چھت میں ایک روشن دان رکھا جس سے کعبہ کے اندر اُجالا بھی رہے اور اس میں سے جب ضرورت ہو کعبہ کی چھت پر چڑھ جائیں۔

تعمیر عبداللہ ابن زبیر

معاویہ بن ابی سفیان کے بعد جب یزید نے اپنے تئیں اپنے باپ کا جانشین کیا تو عبداللہ ابن زبیر نے اُس سے بیعت میں یعنی اُس کو خلیفہ تسلیم کرنے میں تامل کیا اس پر حصین بن نمیر یزید کی طرف سے فوج لے کر مکہ پر چڑھ گیا اور کئی دن تک عبداللہ ابن زبیر سے لڑائی ہوتی رہی۔ عبداللہ ابن زبیر کے سب لوگ کعبہ کے گرد خیموں میں پڑے ہوئے تھے اور حصین بن نمیر ابوقبیس پہاڑ پر سے گوپن میں پتھر مارتا تھا اور غلاف کعبہ اُس کے صدمہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ اتفاق سے ایک خیمہ میں آگ لگ گئی، ہوا تیز چل رہی تھی کعبہ میں بھی جا لگی اور تمام کعبہ جل گیا۔ اُس کی دیواروں میں کاٹ لگا ہوا تھا اُس کے جلنے سے تمام دیواروں کے پتھر ایسے ہوگئے کہ کبوتر کے بیٹھنے سے بھی

گر پڑتے تھے اور کئی جگہ سے دیواریں شق ہو گئیں۔ یہ واقعہ تیسری ربیع الاول ۶۴ھ ہجری کو ہوا اُس کے دس گیارہ دن بعد یزید مر گیا۔ جب یہ خبر مکہ میں پہنچی تو ابن زبیر نے حصین بن نمیر سے کہا کہ دیکھو کعبہ بھی جل گیا امیر بھی مر گیا پھر ہم سے کیوں لڑتے ہو کیا معلوم کہ نیا خلیفہ کیا کرے گا اس پر حصین بن نمیر مع اپنے لشکر کے پانچویں ربیع الثانی ۶۴ھ ہجری کو مکہ سے شام کو چلا گیا۔ تب ابن زبیر نے مکہ کے ذی وجاہت اور شریف لوگوں کو بلایا۔

فلما ادبر جیش حصین بن نمیر وکان خروجہ من مکۃ لخمس لیال خلون من ربیع الآخر سنۃ اربع وستین دعا ابن زبیر وجوہ الناس واشرافہم و شاورہم فی ھدم الکعبۃ (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۰)

فامر ابن الزبیر بھدمہا فما اجترأ احد علی ذلک فلما رای ذلک علاھا ھو بنفسہ یاخذ المعول وجعل یھدمہا ویرمی بحجارتہا فلما راوہ انہ لم یصبہ شیٔ اجترأوا فصعدوا ویھدموھا

(کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۱)

وکان ھدمہا یوم السبت نصف من جمادی الآخرۃ سنۃ اربع وستین ولم یقرب ابن عباس مکۃ حین ھدمت الکعبۃ حتی فرغ منہا وارسل الی ابن الزبیر لا تدع الناس بغیر قبلۃ نصب لہم حول الکعبۃ الخشب واجعل علیہا الستور حتی یطوف الناس من ورائہا ویصلون علیہا ففعل ذلک ابن الزبیر (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۲)

فلما ھدم ابن الزبیر الکعبۃ وسواہا بالارض کشف عن اساس ابراھیم فوجدہ وادخل فی الحجر نحوا من ستۃ اذرع وشبر (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۲)

ثم وضع البناء علی ذلک الاساس ووضع حذاء البنات باب الکعبۃ علی مدماک علی الشاذروان اللاصق

اور کعبہ کے ڈھانے میں مشورہ کیا۔ بہت وہمی اور وسواسی باتیں جو ایسے موقع پر ہوتی ہیں ہوئیں آخرکار ابن زبیر نے کعبہ کے ڈھانے کا حکم دیا مگر کسی کو ڈھانا شروع کرنے کی بوجہ توہم و وسواس و خوف کے جرأت نہ ہوئی تو خود ابن زبیر کدال لے کر اوپر چڑھ گئے اور ڈھانا شروع کر دیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ابن زبیر پر کچھ آفت نہیں پڑی تو اوروں کو بھی جرأت ہوئی۔ اور سب چڑھ گئے اور ڈھانے لگے جمادی الاول ۶۴ھ ہجری تک سب کعبہ ڈھا دیا گیا۔ مگر ابن عباس اپنے خوف یا وہم یا کعبہ کا منہدم کرنا خلاف طبع ہونے کے سبب مکہ میں نہ آئے۔ ابن زبیر نے بموجب فہمائش ابن عباس کے کعبہ کے چاروں طرف تختہ بطور دیوار کے کھڑا کر دیا اور کپڑے سے منڈھ دیا اور اندر اندر کام ہوا کیا لوگ اُس تختہ کی دیوار کی گرد طواف کیا کئے اور نماز پڑھا کئے۔ جب کہ کعبہ بالکل ڈھ کر زمین کے برابر ہو گیا اور حضرت ابراہیم کے ہاتھ کی بنیاد رکھی ہوئی نکل آئی تو ضرور بالطبع ابن زبیر کو رغبت ہوئی ہو گی کہ کل تعمیر ابراہیم پر تعمیر کی جائے اور جس قدر کہ قریش نے بہ سبب

بالارض وجعل لہا باب آخر بازائہ فی ظہر الکعبۃ مقابلۃ (کتاب اخبار مکۃ صفحہ ۱۴۳)

قالوا وکانت الکعبۃ یوم ھدمھا ابن الزبیر ثمانیۃ عشر ذراعاً فی السماء فلما ان بلغ ابن الزبیر بالبناء ثمانیۃ عشر ذراعاً قصرت مجال الزیادۃ التی زاد من الحجر فیہا واستسمج ذلک اذ صارت عریضۃ لا طول لہا فقال قد کانت قبل قریش تسعۃ اذرع حتی زادت قریش فیہا تسعۃ اذرع طولاً فی السماء فانا ازید تسعۃ اذرع اخری فبناھا سبعۃ وعشرین ذراعاً فی السماء وھی سبعۃ وعشرون مدماکاً وعرض جدارھا ذراعان و جعل فیہا ثلث دعائم وکانت قریش فی الجاھلیۃ جعلت فیہا ست دعائم (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۴)

امر ابن الزبیر ابنہ عباد بن عبد اللہ بن الزبیر وجبیر بن شیبۃ بن عثمان ان یجعلوا الرکن فی ثوب وقال لہم ابن الزبیر اذا دخلت فی الصلوٰۃ صلوٰۃ الظہر فاحملوہ واجعلوہ فی موضعہ فانا اطول الصلوٰۃ فاذا فرغتم فکبروا حتی اخفف صلوتی وکان ذلک فی حر شدید فلما اقیمت الصلوٰۃ کبر ابن الزبیر وصلی بہم رکعۃ خرج عباد بالرکن من دار الندوۃ وھو یحملہ ومعہ جبیر بن شیبۃ بن عثمان ودار الندوۃ یومئذ قریبۃ من الکعبۃ فخرقا بہ الصفوف حتی ادخلاہ فی الستر الذی دون البناء وکان الذی وضعہ فی موضعہ ھذا عباد بن عبد اللہ بن الزبیر واعانہ علیہ جبیر بن شیبۃ فلما اقروہ فی موضعہ وطوق علیہ الحجارات کبروا فخفف ابن الزبیر صلوتہ وتسامع الناس بذلک (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴)

نہ میسر ہونے سامان کے چھوڑ دیا تھا وہ بھی تعمیر میں شامل کیا جائے چنانچہ ابن زبیر نے ایسا ہی کیا اور کل بناء ابراہیم پر تعمیر کعبہ شروع ہوئی۔ ایک نہایت عمدہ تجویز جو ابن زبیر نے کی تھی وہ یہ تھی کہ کعبہ کے دو دروازے رکھے جائیں ایک جانب شرق جو قدیم سے تھا اور دوسرا جانب غرب۔ تاکہ جو لوگ شرقی دروازہ سے کعبہ میں داخل ہوں وہ غربی دروازے سے نکل جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور جو کرسی قریش نے باقوم کی صلاح سے دی تھی وہ بھی موقوف کردی اور زمین پر دروازوں کو قائم کیا مگر بلندی اُس کی قریش کی بلندی سے بھی نو ذرعہ بڑھادی یعنی ستائیس ذرعہ کردی اور بلاشبہ جب کہ کعبہ لنبا ہوگیا تھا تو اس کا اس قدر اونچا کرنا بھی نہایت ضرور تھا قریش نے کعبہ کے اندر چھ ستون قائم کئے تھے چھت پاٹنے کو ابن زبیر نے صرف تین ستون بنائے غالباً ان کو بہ نسبت قریش کے لکڑی لمبی مل گئی تھی۔

حجر اسود رکھے جانے کا ایک عجیب حال کتابوں میں لکھا ہے جس کی کچھ وجہ ہمارے خیال میں نہیں آتی ابن زبیر نے لوگوں کو ایک دھوکے میں رکھا اور اپنے بیٹے عباد اور جبیر ابن شیبہ کو سمجھا دیا کہ جب میں نماز پڑھانے کھڑا ہوں گا۔ تو بڑی نماز پڑھاؤں گا اُس وقت تم حجر اسود کو

جو دارندوہ میں قریب کعبہ کے رکھا ہوا ہے ایک کپڑے میں لپیٹ کرے آنا اور جو جگہ اس کے کھڑا کرنے کی ہے وہاں کھڑا کر دینا جب کھڑا کر چکو تو پکار کر اللہ اکبر کہنا پس میں نماز کو ختم کردوں گا چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا کہ جب ابن زبیر نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے اور ایک رکعت پڑھا چکے تو عباد اور جبیر حجر اسود کو کپڑے میں لپیٹ کر دارندوہ میں سے لے آئے جماعتوں کو چیر کر تختوں کی دیوار کے اندر لے گئے اور اُن دونوں نے حجر اسود کو اُس کی معین جگہ میں کھڑا کر دیا اور پھر پکار کر اللہ اکبر کہا تب ابن زبیر نے اپنی نماز ختم کی۔ اس بات پر لوگوں نے بہت کانا پھوسی کی اور بعض لوگ علانیہ ناراض ہوئے۔ مگر ہم نہیں سمجھتے کہ ابن زبیر کو ایسا کرنے سے کیا فائدہ تھا اور کیوں ایسا دھوکا دینے کی ضرورت ہوئی تھی حقیقت میں کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔ لوگوں نے اپنے قیاسات اس پر لگائے اور انھیں قیاسات کو بطور واقعہ کے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اپنی روایتوں میں بیان کیا بہر حال کچھ ہی ہوا خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ حجر اسود کھڑا ہو گیا۔

تعمیر حجاج بن یوسف

عبداللہ ابن زبیر کی حکومت مکہ میں بہت جلد ختم ہونے والی تھی اور تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اس بنا کو بہت زیادہ قیام نہ ہوگا۔ چنانچہ عبد الملک ابن مروان جب خلیفہ ہوا تو اُس نے حجاج کو مع فوج کے عبداللہ ابن زبیر کے مقابلہ کے لئے بھیجا اس لڑائی میں عبداللہ ابن زبیر مارے گئے اور حجاج مکہ میں چلا آیا تب اس نے عبد الملک کو لکھا کہ کعبہ میں ابن زبیر نے ایسی چیزیں بنادی ہیں جو پہلے نہ تھیں اور ایک نیا دروازہ بھی بنایا ہے عبد الملک نے لکھا کہ اس دروازہ کو بند کر دو اور جس قدر ابن زبیر نے زیادہ بنادیا ہے وہ سب توڑ دو چنانچہ حجاج نے چھ ذراع اور ایک بالشت کعبہ کو توڑ دیا اور قریش کی بنیاد پر وہاں دیوار بنادی اور وہ نیا دروازہ بھی بند کر دیا اور باقی سب چیز بدستور بنی رکھی اب کعبہ کی جو عمارت ہے وہ ابن زبیر کی بنائی ہوئی ہے صرف وہ دیوار جو حجر کی جانب ہے اور غربی

حتی قتل ابن الزبیر رحمہ اللہ ودخل الحجاج مکۃ فکتب الی عبد الملک ابن مروان ان ابن الزبیر زاد فی البیت ما لیس منہ واحدث فیہ بابا آخر فکتب الیہ عبد الملک ابن مروان ان سد بابھا الغربی الذی کان فتح ابن الزبیر واھدم ما کان زاد فیہ من الحجر واکبسھا بہ علی ما کانت علیہ فھدم الحجاج منھا سبعۃ اذرع وشبرا مما یلی الحجر وبناھا علی اساس قریش الذی کانت استقصرت علیہ وکبسھا بما ھدم منھا وسد الباب الذی فی ظھرھا وترک سائرھا لم یحرک منہ شیئا

نكل شيء فيها اليوم بناء ابن الزبير الا الجدار الذي في الحجر فانه بناء الحجاج وسد الباب الذي في ظهرها وما تحت عتبة الباب الشرقي الذي يدخل منه اليوم الى الارض اربعة اذرع وشبر وكل هذا بناء الحجاج والدرجة التي في بطنها اليوم والبابان اللذان عليها اليوم هما ايضا من عمل الحجاج (كتاب اخبار مكه صفحه ۱۴۵ و ۱۴۶)

دروازہ کا تیغہ اور شرقی دروازہ کی چار ذرعہ ایک بالشت اونچائی اور کعبہ کے اندر کی سیڑھی اور اُس کے دونوں روشن دان حجاج کے بنائے ہوئے ہیں۔

فلما فرغ الحجاج من هذا كله وفد بعد ذلك الحارث بن عبد الله ابن ربيعة المخزومي على عبد الملك ابن مروان فقال له عبد الملك ما اظن ابا خبيب يعني ابن الزبير سمع من عائشة ما كان يزعم انه سمع منها في امر الكعبة فقال الحارث انا سمعته من عائشة قال سمعتها تقول ماذا قال سمعتها تقول قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم ان قومك استقصروا في بناء البيت ولولا حداثة عهد قومك بالكفر اعدت فيه ما تركوا منه ... وقال رسول الله صلعم جعلت لها بابين موضوعين على الارض بابا شرقيا يدخل الناس منه وبابا غربيا يخرج الناس منه قال عبد الملك بن مروان انت سمعتها تقول هذا قال نعم يا امير المومنين انا سمعت هذا منها قال فجعل ينكث منكسا بقضيب في يده ساعة طويلة ثم قال وددت والله اني تركت ابن الزبير وما تحمل من ذلك (كتاب اخبار مكة صفحه ۱۴۶)

مورخ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ ابن زبیر نے کعبہ کی تعمیر میں جو کچھ نیا بنایا تھا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق تھا جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے کیا تھا چنانچہ حجاج جب کعبہ کو توڑ تاڑ کر قریش کی تعمیر کے برابر کر چکے تو حارث ابن عبداللہ عبدالملک کے پاس گئے ان سے عبدالملک نے پوچھا کہ ابن زبیر نے کوئی بات کعبہ کی نسبت حضرت عائشہ سے سُنی تھی۔ حارث بن عبداللہ نے کہا کہ میں نے خود حضرت عائشہ سے سُنا ہے کہ اُن سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تیری قوم نے کعبہ کی تعمیر میں کمی کردی اگر تیری قوم کا زمانہ کفر کے زمانہ سے نیا بدلا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ میں پھر کعبہ میں ملا دیتا .... رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اُس میں دو دروازے بنا دیتا ایک شرقی دروازہ جس میں سے لوگ اندر جاتے اور ایک غربی دروازہ جس سے لوگ باہر نکل جاتے عبدالملک نے پوچھا کہ

تم نے خود یہ بات سنی ہے انھوں نے کہا کہ ہاں اے امیرالمومنین میں نے خود یہ بات سنی ہے عبدالملک یہ سُن کر ہاتھ کی لکڑی پر سر ٹیک کے بڑی دیر تک سوچ میں گئے اور پھر کہا کہ بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ میں نے ابن زبیر کے برخلاف کیا۔

یہ زمانہ جب کہ اس حدیث کا چرچا ہوا ایسے فتنہ وفساد کا زمانہ تھا کہ روایت کی صحت پر بہت کم یقین ہوتا تھا خلافت میں سخت سے سخت واقعات گذر چکے تھے حضرت امام حسین کی نسبت واقعہ کربلا ہو چکا تھا مدینہ منورہ میں قتل ہو چکا تھا مکہ معظمہ میں محاربات ہو چکے تھے اور عبداللہ ابن زبیر قتل ہو چکے تھے اور ہر ایک واقعہ کے ساتھ ایک جدا فرقہ قائم ہو گیا تھا جو ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف تھا۔

بے شک ہمارا دل اور غالباً ہر ایک کا دل اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہو گا کہ کعبہ بنائے ابراہیم پر بنایا جاتا اور دو دروازے اس میں بنائے جاتے، جن پر نہایت عمدہ اور مفید کام تھا، مگر یہ بات کہ آنحضرت نے ایسا فرمایا تھا اُس کی صحت پر یقین نہیں ہو سکتا۔ اول تو اس معاملہ میں حضرت عائشہ کو مخاطب کرنے اور اُس فعل کو جو ایام جاہلیت میں ہوا تھا۔ خاص حضرت عائشہ کی قوم کا فعل قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ فعل تمام قوم قریش نے بمجبوری کیا تھا جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے۔ دوسرے یہ کہ بعد فتح مکہ تمام قریش اسلام لے آئے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنےٰ اشارہ پر جان دینے کو موجود تھے۔ خانہ کعبہ کے تمام بتوں کو جن کی پرستش اُن کے باپ دادا نے صدہا سال تک کی تھی توڑ ڈالا تھا اور نکال کر پھینک دیا تھا۔ پس کعبہ کو بڑا کر دینے اور حضرت ابراہیم کی بنیاد پر لوٹا بنا دینے میں کون سی مشکل تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے "لولا حداثۃ عہد قومك بالکفر لاعدت فیہ ماترکوا منہ" پس یہ حدیث کسی طرح صحیح اور قابل وثوق نہیں ہو سکتی بلکہ اس بات سے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بنار ابراہیم سے جس قدر زمین خانہ کعبہ کی تعمیر سے خارج رہ گئی تھی اُس کی کچھ پرواہ نہیں فرمائی ثابت ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی کوئی خاص وضع یا اُس کے لئے کوئی خاص قطع مقصود اور مدار علیہ نہ تھی بلکہ صرف وہ ایک مسجد تھی جو حضرت ابراہیم نے بنائی تھی جب وہ ڈھ گئی اور دوبارہ بنائی گئی تو جس طرح سے بن گئی، بن گئی۔ یہ کچھ ضرور نہ تھا کہ بعد بن جانے کے خواہ نخواہ پھر توڑ کر اُسی قدر بنائی جاتی کہ حضرت ابراہیم نے بنائی تھی، جیسے کہ عبدالملک ابن مروان نے اپنی نادانی یا حضرت عبداللہ ابن زبیر کی عداوت سے اس بنی ہوئی عمارت کو پھر توڑ کر ویسا ہی کر دیا جیسا قریش نے ایام

جاہلیت میں بنایا تھا۔

غلاف کعبہ

حضرت ابراہیم کے وقت میں اور اس کے بعد کعبہ کی دیواریں ویسی ہی دکھائی دیتی تھیں۔ جیسی کہ بنی تھیں مگر سنہ عیسوی سے چھ سو برس پیشتر اسعد حمیری نے کعبہ کی دیواروں پر غلاف چڑھایا اس لئے خواب میں دیکھا کہ وہ کعبہ کو کپڑا پہنا رہا ہے۔ جب جاگا تو اس نے انطاع کا غلاف چڑھایا مگر پھر اس نے وہی خواب دیکھا تب اس نے یمن کے کپڑے کا جو عمدہ ہوتا تھا غلاف چڑھا دیا تب سے کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم جاری ہوگئی اور جس کے قبضہ اقتدار میں کعبہ رہتا آیا وہ ہر سال پرانے غلاف پر نیا چڑھاتا گیا اور اس سبب سے مختلف قسم کا بہت سا کپڑا کعبہ کی دیواروں پر چڑھ گیا تھا اور اسی توبرتو کپڑے کے سبب کئی دفعہ آگ لگ گئی تھی۔ اور خانہ کعبہ جل گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر کے وقت تک پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کا دستور تھا اور اسی سبب سے ان کے عہد میں بھی کعبہ میں آگ لگ گئی تھی اس کے بعد سے پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کی رسم جاتی رہی بلکہ ہر سال پرانا غلاف اتار کر نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے اور کعبہ کے خادم پرانے غلاف کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بطور تبرک کے تقسیم کرتے ہیں اور حاجی ان ٹکڑوں کو نہایت شوق سے لاتے ہیں اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے دوستوں کو دیتے ہیں۔ اکثر مسلمان جن کے پاس یہ ٹکڑے ہوتے ہیں اپنے ساتھ کفن میں رکھ کر قبر میں لے جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس کی برکت سے عذاب سے بچیں گے مگر مسلمانوں کے یہ سب اوہام وخیالات ہیں مذہب اسلام ایسی باتوں سے جو کچے سوت سے بھی زیادہ بودی ہیں پاک وصاف ہے۔ مذہب اسلام سے نہ یہ بات پائی جاتی ہے کہ غلاف کعبہ کچھ متبرک ہوجاتا ہے نہ یہ پایا جاتا ہے کہ اس کے قبر میں ساتھ لے جانے سے بجز اس کے کہ وہ بھی مثل جسم وکفن کے خاک ہوجائے اور کچھ نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے اسلام کی رو سے اگر کچھ نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے تو وہ صرف اعتقاد توحید سے ہوسکتا ہے نہ کسی اور چیز سے۔

وکان ھو (ای اسعد الحمیری وھو تبع) اول من کسا الکعبۃ ... اری فی النوم انہ یکسوھا فکساھا الانطاع ثم اری ان یکسوھا فکسوھا الوصایل ثیاب حبرۃ من عصب الیمن وجعل لھا بابا یغلق (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۷۳ و ۱۷۴)

اس میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا کہ زمانہ اسلام میں بھی کعبہ پر غلاف چڑھائے گئے۔ اگرچہ

كسا البيت في الجاهلية الانطاع ثم كساه النبي صلعم الثياب اليمانية ثم كساه عمر وعثمان القباطي ثم كساه الحجاج الديباج ويقال اول من كساه الديباج يزيد بن معاوية ويقال ابن الزبير ويقال عبد الملك بن مروان (كتاب اخبار مكه صفحه ۱۷۷)

کتابوں میں روایتیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اُن کے بعد ابو بکر صدیق و عمر و عثمانؓ نے بھی کعبہ پر غلاف چڑھایا مگر ہم کو جہاں تک شبہ ہے وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی نسبت شبہ ہے کیونکہ جو روایتیں اس باب میں ہیں وہ درجہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں بااینہمہ اُن کے تسلیم کرلینے میں کچھ زیادہ بحث نہیں ہے غرضکہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر صدیق نے یمن کے کپڑے کا جو نہایت عمدہ ہوتا تھا کعبہ کو غلاف چڑھایا اور عمرؓ و عثمانؓ نے قباطی کپڑے کا غلاف چڑھایا پھر دیباج کے کپڑے کا غلاف چڑھایا گیا بعضوں کا قول ہے کہ دیباج کا غلاف سب سے اول یزید بن معاویہ نے چڑھایا۔ بعضے کہتے ہیں کہ عبد الملک ابن مروان نے، بعضے کہتے ہیں حجاج بن یوسف نے۔ غرضکہ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ تمام خلفائے بنی اُمیہ اور عباسیہ و دیگر خلفاء کے عہد میں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کا بڑا اہتمام رہا اور سب چڑھاتے رہے۔ زمانۂ حال میں سلطان روم کی جانب سے نہایت عظیم وشان سے بہت عمدہ غلاف سیاہ رنگ کا جس میں بعض آیات قرآنی نہایت خوش خط بناوٹ میں بنی ہوئی ہوتی ہیں چڑھایا جاتا ہے۔

اسلام کی رو سے جو کچھ بحث اس پر ہو سکتی ہے وہ اس قدر ہو سکتی ہے کہ "ما هذا التعبد الكعبة او لتحسينها فالاول كفر على مذهب الاسلام والثاني امر لا باس به" یعنی یہ کام کس ارادہ سے کیا جاتا ہے کعبہ کی پرستش کے لئے یا اُس کی خوبصورتی اور آرائش کے لئے اگر پہلی نیت سے کیا جاتا ہے تو تو اسلام کی رو سے کفر ہے اور اگر دوسرے ارادہ سے کیا جاتا ہے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

آرائش کعبہ کی ایسی ہی ہے جیسی کہ ہم اور تمام مسجدوں کی آرائش کرتے ہیں مگر چونکہ کعبہ ایک نہایت قدیم مسجد ہے اور ایسے بانی اسلام کے ہاتھ سے بنی ہے جس نے سب سے اول یہ کہا کہ لا احب الافلين۔ اني وجهت وجهي للذي فطر السموات والارض حنيفا وما انا من المشركين۔ اس لئے اس کی قدر ہم کو بہ نسبت اور مسجدوں کے زیادہ کرنی ضرور ہے۔ کیونکہ سب سے پہلی خدا کی پرستش کی نشانی ہے۔

اصنام کعبہ

اساف ونایلہ:۔ بنی جرہم کے زمانہ میں صفا ومروہ کے پہاڑوں پر دوبُت رکھے گئے۔ صفا پر جوبُت تھا وہ مرد کی شکل تھا اور اساف اُس کو کہتے تھے۔ دوسرا بُت جو مروہ پر تھا وہ عورت کی شکل کا تھا اور نایلہ اُس کو کہتے تھے۔ جو روایتیں حقارت آمیز ان کی نسبت پائی جاتی ہیں وہ قدیم نہیں ہیں۔ غالبًا اسلام کے زمانہ کی بنائی ہوئی ہیں۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں انسان تھے اور بنی جرہم اُن کو دیوتا سمجھتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد اُن کے دوبُت بنائے گئے اور پرستش ہونے لگی۔ فتح مکہ کے روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اور بتوں کے ساتھ توڑ ڈالا۔

نہیک ومطعم:۔ یہ بھی دوبُت تھے۔ نہیک کو صفا پر نصب کیا گیا تھا اور مطعم کو مروہ پر۔

ہبل:۔ یہ ایک بہت بڑا بُت خانہ کعبہ کے اندر تھا۔ کعبہ کے اندر داہنی طرف جو خزانہ کا کنواں تین ذرعہ گہرا حضرت ابراہیم کا کھودا ہوا تھا۔ اُس پر یہ بُت کھڑا کیا گیا تھا۔ عمرو بن لحی اس کو ارض جزیرہ سے لایا تھا۔ احد کی لڑائی میں ابوسفیان نے فتح ہونے کے لئے اسی بُت سے مدد چاہی تھی۔

مناۃ:۔ یہ بھی بڑا بت تھا اور سمندر کے کنارہ پر قدید کے پاس عمرو بن لحی نے نصب کیا تھا اور یہ دونوں بت قبیلہ ازد وغسان کے کہلاتے تھے اور بعضوں کا قول ہے کہ آوس وخزاج وغسان کے کہلاتے تھے جو ازد کی شاخیں ہیں۔ بعضوں کا یہ قول ہے کہ وہ صرف قبیلہ ہذیل کا ایک پتھر تھا اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بن گھڑا ایک لمبا پتھر ہو۔

لات وعزیٰ:۔ لات ایک بن گھڑا پتھر تھا جس میں لوگ خیال کرتے تھے کہ شان باری کے کرشمہ نے حلول کیا ہے اور عزیٰ تین درخت تھے۔ جس میں ذات باری کا حلول سمجھ کر پوجتے تھے جیسے کہ ہمارے زمانہ میں بھی بہت سے مسلمان اسی طرح پر درختوں کی جو درگاہوں میں ہوتے ہیں۔ پرستش کرتے ہیں ہمارے شہر دہلی میں کبھی شاہ بولا کی بڑ پر کبھی منتوں کے ناڑے باندھے جاتے تھے۔ لات تہامہ میں تھا اور عزیٰ طائف میں۔

ذات الواط:۔ یہ بھی ایک بہت بڑا سرسبز وشاداب درخت حنین میں تھا، جس کو لوگ پوجتے تھے۔

ذوالکفین: ۔ یہ بھی ایک بت تھا۔ جس کو عمر بن حممہ نے بعد فتح مکہ جلایا تھا۔

سواع: ۔ یہ ایک مشہور بُت قبیلہ ہذیل کا جس کو عمر بن العاص نے بعد فتح مکہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے توڑا تھا۔

ود: ۔ ایک بت بنی کلب کا دومۃ الجندل میں تھا۔

یغوث: ۔ پہلے اس کو بنی مراد پوجتے تھے پھر بنی عطیف پوجنے لگے۔

یعوق: ۔ بنی ہمدان میں تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔

نسر: ۔ بنی حمیر آل ذی الکلاع کے پوجنے کا بت تھا۔

علاوہ ان بتوں کے مشہور روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بُت بنے ہوئے تھے اور نہایت استحکام کے ساتھ سیسہ سے جڑکر کھڑے کئے تھے جو فتح مکہ کے دن سب توڑ ڈالے گئے۔

تصاویر خانہ کعبہ

خانہ کعبہ میں فرشتوں کی اور حضرت ابراہیم کی اور حضرت مریم کی حضرت عیسیٰ کو گود میں لئے ہوئے تصویریں تھیں غالباً حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویر باقوم نے بنائی ہوگی جب کہ اس نے قریش کے زمانہ میں کعبہ بنایا تھا۔ جب رسول خدا صلعم کعبہ میں داخل ہوتے تو آپ نے حضرت ابراہیم کی تصویر کو دیکھکر فرمایا کہ خدا ان کو مارے ابراہیم کو تیروں سے شگون لیتا اور فال دیکھتا بنایا ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(ادرک دای عطا ابن ابی رباح) فیھا دای فی البیت) تمثال مریم مزدقا فی حجرھا عیسیٰ ابنھا قاعدا مزوقا (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۱۲)

نے حضرت مریم کی تصویر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا کہ سب تصویروں کو مٹادو مگر مریم کی تصویر کو چھوڑ دو۔ اگر یہ واقعات صحت کو پہنچے تو اس کی وجہ صاف پائی جاتی ہے۔ فرشتوں کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پس ان کی تصویر بنانا محض جھوٹ اور خلاف واقع تھا۔ حضرت ابراہیم کی تصویر ایسے فعل کی حالت کی بنائی تھی جو شرک میں داخل ہے اور بلاشبہ حضرت ابراہیم اُس سے پاک تھے۔ صرف مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویر ایسی تھی جس میں کوئی اشارہ کفر یا شرک یا کذب کا نہ تھا اور نہ وہ پرستش کے لئے بنائی گئی تھی اُس کے چھوڑ دینے میں کچھ حرج نہ تھا۔

زمزم

جب سے کعبہ کا نام ہے اُسی کے ساتھ اس چشمہ کا نام بھی چلا آتا ہے بلکہ یہی چشمہ مکّہ کی آبادی اور کعبہ کے اس جگہ بننے کا سبب ہے۔ اگرچہ یہ چشمہ مدت سے خشک ہو گیا ہے مگر اُس کی جگہ ایک کنواں کھودا گیا ہے جو چاہ زمزم کے نام سے مشہور ہے۔

عرب کی سرزمین نہایت خشک ہے یا پہاڑ ہیں یا ریگستان ہے برسات وہاں بہت کم ہوتی ہے۔ کوئی دریا اُس میں نہیں بہتا اس سبب سے پانی کی بہت قلت ہے کہیں کہیں جنگلوں میں یا پہاڑوں کی تلیوں میں یا پہاڑ کے اونچے غاروں میں پانی جمع ہو جاتا ہے اور لوگ پانی کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ جہاں پانی مل گیا۔ وہیں تنبو تان دیئے اور آباد ہو گئے۔ جب وہاں کا پانی خشک ہو گیا وہاں سے چل دیئے۔ دوسری جگہ جہاں پانی مل گیا ڈیرے ڈال دیئے۔ یہی طریقہ قدیم سے عرب کے صحرانشین بدوؤں کا تھا۔

اونچے مقاموں میں جو پانی جمع ہو جاتا تھا اور زمین یا پہاڑوں کے نیچے نیچے سوتوں کی راہ سے پانی کے نکلنے کا کوئی رستہ مل جاتا تھا تو اپنے مخزن سے دور جاکر بطور چشمہ کے نکل آتا تھا مگر ایسی ایسی سوتیں ایسی ضعیف ہوتی تھیں کہ سطح زمین سے اگر تھوڑے نیچے بھی ہوں تو معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اور اگر کہیں کھُل بھی جاتی تھیں تو تھوڑی سی چیز کے پڑ جانے سے ڈھک جاتی تھیں حال کے زمانہ میں بھی بدو اس طرح کے پانی کی سوتوں کو تھوڑے سے کنکر پتھر کانٹوں کے ڈالنے سے اس طرح پر چھپا دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا نشان نہیں ملتا۔

زمزم کی نسبت ایسی ایسی دور از کار روایتیں مشہور ہیں جن میں سے ایک بھی معتبر اور مذہب اسلام کے بموجب صحیح نہیں ہے جتنا کہ یہ چشمہ پرانا ہے اور اُسی قدر تقدس آمیز اور تعجب خیز مبالغہ سے وہ روایتیں بنائی گئی ہیں۔ اصلیت اس چشمہ کی صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت ہاجرہ زوجہ حضرت ابراہیم مع اپنے بیٹے اسمٰعیل کے بسبب اُس نزاع اور حسد کے جو قدرتی ایک شوہر کی دو بیویوں میں ہوتا ہے سر بصحرا نکال دی گئیں اور یہاں پہنچیں تو پانی جو اُن کے پاس تھا ہو چکا پیاس کی شدت ہوئی بسبب نہ ملنے پانی کے مایوسی طاری ہوئی اس گھبراہٹ میں ہر چہار طرف پانی کی تلاش کرتی تھیں اسی جستجو میں اتفاقاً کنکروں اور پتھروں کے نیچے پانی کا نشان معلوم ہوا اور اُن کے ہٹانے سے پانی نکل آیا۔ اُنھوں نے اس تائید غیبی پر خدا کا شکر ادا کیا اور وہ اُن

کے بیٹے پانی پی کر سیراب ہوئے۔

جس طرح کہ عرب کے چشمے چند مدت تک جاری رہتے تھے اور پھر خشک ہو جاتے تھے اسی طرح یہ چشمہ بھی کسی مدت کے بعد خشک ہو گیا اور کسی کو اُس کی طرف خیال بھی نہیں رہا۔ اور سینکڑوں برس اُس پر گذر گئے مگر عام الفیل کے بعد عبد المطلب جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ جہاں وہ چشمہ تھا وہاں کنواں کھود کر پانی نکالا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے کھودنا شروع کیا۔ اُس پر بعض لوگ مانع ہوئے۔ اور فساد پر آمادہ ہوئے۔ مگر کسی نہ کسی طرح وہ فساد رفع ہوا اور عبد المطلب اپنے مقصد پر کامیاب ہوئے۔ جو قصے کتابوں میں اس کنوئیں کی نسبت اور عبد المطلب کو اس خاص مقام دریافت ہونے کی نسبت لکھے ہیں اُن میں سے کسی کی کچھ صحت نہیں ہے کچھ عجیب نہیں ہے کہ اُنھوں نے خواب میں دیکھا ہو کہ کنواں کھودتا ہوں اور اس سبب سے کنواں کھودنے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ یہ کنواں پہاڑ میں کھودا گیا ہے۔ جس میں سے سوتیں مشکل سے نکلتی ہیں۔ چنانچہ اُس میں صرف تین سوتیں نکلی تھیں ۲۲۳ھ و ۲۲۴ھ میں اس کا پانی خشک ہو گیا تھا اس لئے دو ذرعہ اور کھودا گیا تھا مگر ۲۲۵ھ میں کثرت سے بارش ہوئی اور اس سبب سے کنوئیں میں بہت سا پانی ہو گیا۔

خلافت ہاروں رشید میں بھی یہ کنواں بسبب کمی پانی کے قریب دو ذرعہ گہرا کیا گیا تھا اور مہدی اور محمد بن الرشید کی خلافت میں بھی گہرا ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسا کہ تمام کنوؤں کا حال ہے ویسا ہی اس کا بھی حال ہے اور تمام عجائب اور غرائب روایتیں جو اس کے پانی کے قبل قیامت نہ سوکھنے کی ہیں وہ سب موضوع ہیں جن کی کچھ بھی اصلیت اسلام میں نہیں ہے۔

زمزم کا کنواں اس وجہ سے کہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا ہے جس میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پانی پیا ہے۔ بلاشبہ قابل ادب اور عزت کے ہے۔ لیکن اس کے پانی کے فضائل میں جو روایتیں ہیں وہ سب بے سند اور ضعیف ہیں اور اکثر موضوع۔ حاجی جو زمزم کا پانی چھوٹی چھوٹی زمزمیوں میں بھر کر بطور تبرک کے ہندوں کی مانند دور دور لے جاتے ہیں اور سب لوگ بطور تبرک کے اس کو رکھتے ہیں اور اس پانی کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور بغرض اظہار ادب کھڑے ہو کر پیتے ہیں اُس کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے جیسے اور کنوؤں کا پانی وہ بھی ویسا ہی کنوئیں کا پانی ہے مزہ میں میٹھا نہیں ہے۔ بلکہ

مل ملاتا ہے جس وقت کھینچیں اگر اُسی وقت پی لیں تو شاید پینے کے قابل ہو الّا رکھا رہنے سے زیادہ مل ملا ہو جاتا ہے (یعنی قدرے کھاری ہے)

اسماء کعبہ

کعبہ کا اصلی نام بیت اللہ ہے یعنی خانہ خدا یہ ایک نہایت قدیم طریقہ حضرت ابراہیم کے وقت سے جاری تھا کہ جہاں وہ کوئی نشان خدا کی عبادت کے لئے قائم کرتے تھے اُس کو "بیت المال" یعنی خانۂ خدا کہتے تھے۔ مگر چونکہ وہ عمارت جو حضرت اسمٰعیل نے بنائی تھی بشکل کعب تعمیر ہوئی تھی۔ اس لئے کعبہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔

کعبہ کا نام بیت عتیق اور مکہ وبکہ وام القریٰ بھی آیا ہے۔ پچھلے تینوں نام تغلیبًا کعبہ پر اطلاق ہوتے ہیں ورنہ وہ تمام حرم یا شہر پر صادق آتے ہیں۔

کتابوں میں کعبہ کے اور نام بھی لکھے ہیں "ام رحم" الباسہ "الحاطمہ" مگر یہ سب وہ نام ہیں جو لوگوں نے بعض صفات کے خیال سے گھڑ لئے ہیں۔

عمال کعبہ

جس وقت کعبہ بنایا گیا اس وقت وہ حضرت اسمٰعیل کے قبضہ میں بطور تولیت کے رہا اور اُن کی وفات کے بعد ان کی اولاد اس مقدس مسجد کی سب سے بڑی محافظ تھی مگر بنی اسمٰعیل اور بنی جرہم میں نہایت قریب قرابت تھی اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد بجز قیدار کے عرب کے مختلف مقامات میں جا بسی تھی اس وجہ سے خدا کے گھر کی حفاظت اسمٰعیل کی اولاد سے نکل کر بنی جرہم کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ ایک مدت دراز کے بعد بنی عمالیق جو حمیر کے خاندان سے تھے اُس پر غالب آگئے تھے اور خانہ خدا کے مالک مطلق ہو گئے تھے۔ اس موقع پر بنی اسمٰعیل اور بنی جرہم آپس میں متفق ہوئے اور عمالیق کو خانہ خدا سے بے دخل کر دیا اور پھر دوسری مرتبہ بنی جرہم اس مقدس معبد کے مالک ہو گئے۔

پھر بنی بکر اور بنو حزہ بنی جرہم کے مقابلہ کو کھڑے ہوئے اور دونوں نے اپنی اپنی فوجوں کو جمع کر کے دفعۃً بنی جرہم پر حملہ کیا اور بہت بڑی سخت لڑائی کے بعد بنی جرہم بالکل مغلوب ہو گئے اور بھاگ گئے اور حفاظت اس معبد کی بنی حزہ کے پاس آگئی پہلا شخص جس نے کہ مکہ کی حفاظت،

مکہ کی حکومت اور کعبہ کا انتظام اپنے ذمہ لیا عمر بن الحی تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے اول کعبہ کے اندر ھبل بت کو کھڑا کیا تھا۔

چند مدت بعد قصی ابن کنانہ نے جو اجداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہیں بنو بکر اور بنو حزہ پر چڑھائی کی خوب مقابلہ ہوا مگر ان قوموں کو شکست ہوئی اور قصے نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ پشت اوپر تھا۔ حکومت مکہ اور تولیت کعبہ کی اُن سے چھین لی اور خود حاکم اعلیٰ ہوگیا اور اب قریش کعبہ کی ہر ایک بات کے مالک ہوگئے۔

قصی کے بعد عبدالدار اُن کا بیٹا اُن کی جگہ سردار ہوگیا اور جو خاص خاص عہدے خود عبدالدار سے متعلق تھے وہ اُن کے بھائی عبدمناف کو مل گئے۔

کعبہ کے متعلق پانچ بڑی خدمتیں تھیں:۔

اول:۔ سقیاء رفادہ۔ یعنی حاجیوں کو پانی اور کھانا دینے کا عہدہ۔

دوم:۔ قیادہ۔ یعنی لڑائی کے وقت فوج کی سپہ سالاری کرنا۔

سوم:۔ لوا:۔ یعنی علم بردار ہونے کا عہدہ۔

چہارم:۔ حجاب۔ یعنی کعبہ کی حفاظت کا عہدہ۔

پنجم:۔ دول الندوہ۔ یعنی دارالندوہ میں پریسیڈنٹ یا صدر انجمن ہونے کا استحقاق۔

عبدمناف کی وفات کے بعد اُن کے وارثوں میں ایک خاندانی نزاع پیدا ہوا جس کی وجہ سے ان عہدوں کی تقسیم اس طرح پر ہوگئی۔

ہاشم کو سقیا و رفادہ کا عہدہ ملا۔

عبدالدار کے بیٹے شیبہ نے کعبہ کی حفاظت اور دارالندوہ کی صدر انجمنی اور علم بردار ہونے کا عہدہ اپنے قبضہ میں رکھا۔

ہاشم نے بڑی فیاضی اور سیر چشمی ودریا دلی کے ساتھ حاجیوں کی خبرگیری کی خدمت ادا کی چنانچہ سر ولیم میور تسلیم کرتے ہیں کہ ہاشم نے جو اس طرح پر حاجیوں کی تواضع کے لئے مامور کیا گیا تھا شاہانہ عظمت کے ساتھ اس کو ادا کیا خود اُن کے پاس بڑی دولت تھی اور قوم قریش کے بہت سے آدمیوں نے تجارت کے ذریعہ سے بہت سی دولت جمع کی تھی۔ ہاشم نے مثل قصی اپنے دادا کے قوم قریش سے التجا کی کہ تم خدا کے ہمسایہ اور اُس کے گھر کے محافظ ہو، جو حاجی اُس کے مکان کی تقدس کی تعظیم کرنے کو آتے ہیں وہ اُس کے مہمان ہیں اور یہ مناسب ہے کہ سب سے پہلے

ان مہانوں کی خاطر تواضع کرو تم کو خاص خدا نے منتخب کیا ہے۔ اور اس بڑے رتبہ کے ساتھ تم معزز ہو پس خدا کے مہانوں کی تعظیم کرو اور اُن کو تر و تازہ کر دو۔ کیونکہ وہ نہایت دور دراز شہروں سے اپنے لاغر اور خراب وخستہ اونٹوں پر سوار ہو کر تمھارے پاس نہایت تھکے ہوئے اور پریشاں آتے ہیں، اُن کے بال بکھرے ہوئے اُن کا جسم دور دراز کے رستہ سے گرد و غبار میں آلودہ ہوتا ہے پس تم مہان نوازی کے ساتھ اُن کی دعوت کرو۔ اور ان کو بہت سا پانی دو۔

ہاشم نے اپنے پاس سے بہت سا روپیہ خرچ کر کے ایک عمدہ نظیر قائم کی اور تمام قوم قریش نے بھی نہایت مستعدی سے مدد کی اور ہر ایک شخص نے اپنے مقدور کے موافق چندہ دیا اور تمام قوم قریش پر ایک معین محصول لگایا اور حاجیوں کے جم غفیر کے لئے حوضوں میں کافی پانی کعبہ کے قریب کنوئیں سے بھروایا اور عرفات کے رستہ میں چمڑے کے عارضی حوض بنائے جب کہ حاجی منا اور عرفات کو روانہ ہوتے تھے۔ اُس روز کھانا تقسیم ہونا شروع ہوتا تھا اور جب تک وہ ہجوم منتشر نہ ہوتا تھا اُس وقت تک برابر کھانا تقسیم ہوتا رہتا تھا غرضکہ پانچ چھ روز تک گوشت اور روٹی اور مکھن اور جو سے جو مختلف طور پر پکائے جاتے تھے اور چھواروں سے جو عرب کا نہایت عمدہ اور پسندیدہ کھانا ہے ان کی تواضع ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح پر ہاشم نے مکہ کی نام آوری کو بخوبی قائم رکھا مگر خود ہاشم کا نام ایک بہت اعلیٰ درجہ کی خیرات سے اور بھی زیادہ مشہور ہو گیا اور جس نام آوری سے اہل وطن کی بہت سی ضرورتوں کو رفع کیا جو مدت دراز کے قحط کے سبب سے نہایت تنگ آ گئے تھے۔ یعنی ہاشم نے ملک شام کا سفر اختیار کیا۔ اور وہاں بہت بڑا ذخیرہ روٹیوں کا خرید کیا اور اُن کو ٹوکروں میں بھر کر اور اونٹوں پر لاد کر مکہ کو لائے اور وہاں اونٹ ذبح کئے گئے اور بھونے گئے اور تمام لوگوں کو کھانا تقسیم کیا گیا۔ فاقہ زدگی اور گریہ وزاری دفعۃً خوشی اور افراط طعام سے مبدل ہو گئی اور گویا قحط کے بعد اُن کو ایک نئے سرے سے زندگی حاصل ہو گئی۔

ہاشم کے بعد مطلب کو سقایہ و رفادہ کی خدمت ملی اور اُن کے بعد عبدالمطلب ابن ہاشم کے پاس وہ خدمت آئی اور انہی کے عہد میں ابرہۃ الاشرم نے جو اصحاب الفیل کہلاتا ہے۔ کعبہ کے ڈھانے کے قصد سے فوج کشی کی تھی۔ عبدالمطلب کے بعد یہ خدمت زبیر بن عبدالمطلب کو پہنچی مگر ان سے بخوبی کام نہ چلا تو انھوں نے ابوطالب اپنے بھائی کو وہ خدمت دے دی۔ اُنھوں نے بھی خیال کیا کہ یہ کام نہایت مشکل ہے اور اُس میں بہت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بھائی عباس کے سپرد کر دی۔ لیکن حضرت عباس کو اس قدر مقدور نہ تھا کہ وہ عہدہ سقایہ و رفادہ کا کام

خوبی اور شہرت سے انجام دے سکتے۔ اس لئے یہ عہدے ان کے خاندان سے منتقل ہو کر عبدمناف کی دوسری شاخ میں چلے گئے۔

واقعہ اصحاب فیل

مکہ کے واقعات میں یہ واقعہ بھی ایک بہت بڑے واقعات میں گنا جاتا ہے۔ اس کا واقعہ عظیم متصور ہونا نہ اس وجہ سے ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ درحقیقت ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ مثل اس کے کبھی نہ ہوا ہو۔ بلکہ اس کی عظمت صرف ہمارے مفسروں اور جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کی بدولت ہے جنھوں نے سیدھے سیدھے واقعہ کو ایک عجیب گھڑت اور الف لیلہ کے قصوں سے عجیب تر قصہ کرکے بیان کیا ہے۔

نمش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

میں اپنے اس خطبہ میں ان لغو اور بیہودہ روایتوں پر اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین نے اس قصہ کی بابت بیان کئے ہیں۔ بحث کرنا نہیں چاہتا جس میں ایک لمبا جداگانہ مباحثہ ہے۔ مگر جو واقعہ کہ گذرا اُس کو صاف صاف لفظوں میں بیان کردیتا ہوں۔

کتابوں میں مذکور ہے کہ اصحاب فیل سے پہلے تبع نے تین دفعہ کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر ظلمت و آفت میں گرفتار ہوتے رہے وہ قصے چنداں مشہور نہیں ہیں مشہور قصہ اصحاب فیل کا ہے۔ ابرہۃ الاشرم جو ایک عیسائی حاکم یمن کا تھا اُس نے صنعا، یمن میں قریب غمدان کے ایک عظیم الشان کنیسہ یعنی گرجا بنایا تھا اور قلیس اس کا نام رکھا تھا اور یہ بات چاہی کہ لوگ کعبہ کا حج چھوڑدیں اور اس کنیسہ کا حج کیا کریں اور اس لئے اُس نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا اور مع فوج کے اور چند ہاتھیوں کے روانہ ہوا اور مغمس میں اُترا اُس وقت قریش اور کنانہ اور خزاعہ اور ہذیل سب لڑنے کو تیار ہوئے مگر انھوں نے ابرہۃ الاشرم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پائی ابرہۃ الاشرم نے کہلا بھیجا کہ مجھے تم سے جدال و قتال منظور نہیں ہے بلکہ صرف کعبہ ڈھانا مقصود ہے اس گفتگو میں چند روز گذرے اور اسی درمیان میں ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی تمام لشکر برباد ہوگیا بہت سے مرگئے اور بہت سے اُسی حالت میں پھر گئے خدا تعالےٰ نے ان پر ایسی آفت ڈالی کہ جو بدارادہ انھوں نے کیا تھا اُس پر کامیاب نہیں ہوئے۔

مفسرین نے اس قصہ کو عجیب طرح سے رنگا ہے قرآن مجید میں دو لفظ آئے ہیں طیرا اور بحجارۃ ان دونوں لفظوں کی مناسبت سے جو مفسرین وضاعین نے جو قصہ چاہا ہے بنا لیا ہے جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

اسی سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو چکے تھے جو اس بے نظیر اصلاح کا ذریعہ ہونے والے تھے جو قیامت تک بے نظیر رہے گی عبد المطلب اور ابو طالب ان کی پرورش میں معروف تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن شریف اس حد کو پہنچا جس میں اُس منصب کے ادا کرنے کا وقت منحصر تھا جس کے لئے آنحضرت پیدا ہوئے تھے تب آپ نے اپنے فطرتی منصب نبوت کو اختیار کیا اور خدائے واحد کی پرستش کا وعظ فرمانا شروع کیا اور بوجہ اُن مصائب کے جو اس کام میں پیش آئے وطن چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنا پڑا مکہ اب اپنے تئیں محفوظ سمجھتا تھا اور خوشی اور اطمینان کے ساتھ اپنے بتوں کی پرستش میں مشغول تھا کہ دفعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا محاصرہ کیا اور بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے اس کو فتح کر لیا اُس کے بتوں کو توڑا اور پھر خدائے واحد کی پرستش کو قائم کیا جو قیامت تک محمد رسول اللہ کے نام نامی کے ساتھ قائم رہے گی۔

خطبہ نواں

حَسَبہٖ وَنَسَبہٖ عَلَیہِ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلام

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَنُوحًا وَّاٰلَ اِبرَاھِیمَ وَاٰلَ عِمرَانَ عَلَی العٰلَمِینَ
(القرآن)

عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں نہایت اکھڑ گنوار جاہل بن لکھے اور بن پڑھے تھے علم ادب بھی جس کو ٹھیک ٹھیک علم ادب کہتے ہیں اُن میں نہ تھا اور نہ اور کسی فن کو اچھی طرح جانتے تھے ہاں دو باتیں اُن میں بے مثل تھیں۔ ایک نہایت مؤثر اور پُر مطلب گنواری فصاحت جو بالتخصیص دہقانیوں میں پائی جاتی تھی اور اس سبب سے اس کے مضامین طبعی جوشوں پر مبنی ہوتے تھے اور دلوں پر زیادہ اثر کرتے تھے۔ دوسرے بے مثل اور بے نظیر حافظہ۔ اگرچہ بن لکھے پڑھوں کا حافظہ ہمیشہ قوی ہوتا ہے مگر عرب والوں کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اسی قوت حافظہ کے سبب وہ اپنی قوموں کی تمام نسلوں کو یاد رکھتے تھے اور نسلوں کے یاد رکھنے کو نہایت فخر سمجھتے تھے جو رفتہ رفتہ ایک علم ہوگیا اور "علم الانساب" اُس کا نام پڑ گیا۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ اپنے نسب پر بہت فخر کرتے تھے اور ہر موقع پر اُس کا ذکر کرنے اور اُس پر شیخی بگھارنے سے نہ چوکتے تھے اور اس سبب سے اُن کو صرف اپنا ہی نسب نامہ بھی یاد رکھنا کافی نہ تھا۔ اپنے مخالفوں اور رقیبوں اور ہم سایوں کا نسب نامہ یاد رکھنا بھی ضروری ہوتا تھا تاکہ اپنی شیخی کے سامنے دوسرے کی شیخی نہ چلنے دیں لکھنا اُن کو آتا نہ تھا اس لیے اُن کے نسب نامے لکھے ہوئے نہ تھے۔ جہاں تک یاد تھی یا جو باتیں یاد رکھنے کے قابل تھیں وہ سب برزبان یاد تھیں اُن کا حافظہ ہی اُن کے لیے لوح محفوظ تھا۔ حافظہ کیسا ہی قوی ہو مگر تمام پشتوں کا بترتیب یاد رکھنا ایک غیر ممکن بات تھی اس سبب سے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور معروف اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے باقی لوگوں کے نام جس قدر یاد رہ سکتے تھے اُس قدر رہتے تھے ان مشہور آدمیوں کے نام یاد رہنے کا یہ بھی بڑا سبب تھا کہ ان کے نام اور اُن کے حالات شعروں

میں ہوتے تھے. جو بڑے بڑے معرکوں اور میلوں اور لڑائیوں میں نہایت فخر کے ساتھ پڑھے جاتے تھے ان سب رسموں اور عادتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو اور اپنے ہمسایہ اور اپنے مخالف اور رقیب کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قوم اور کس نسل کا ہے اور کسی کو ایسی جرأت اور ایسی طاقت نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے یا جھوٹ موٹ اپنے آپ کو کسی ایسی نسل کا جس کا درحقیقت وہ نہیں ہے کہنے لگے۔ مگر با ایں ہمہ سلسلہ وار تمام پشتوں کو بتلا دینا ہر ایک کو نام بنام مورث اعلیٰ تک گن دینا ایک غیر ممکن امر تھا اس لئے ہر شخص اپنے باپ دادا کے نام وہاں تک بیان کر سکتا تھا جہاں تک یاد ہوتے تھے۔ پھر بیچ کی پشتوں کو چھوڑ کر اُن کے نام لے دیتا تھا جن کے نام اشعار میں مذکور ہوتے تھے۔ پس جس مؤرخ نے ایسے لوگوں کا پورا سلسلہ وار نسب نامہ بیان کرنا چاہا اُس کو یہ سب دقتیں پیش آئیں اور یہ ایسی مشکلیں تھیں جن کا حل ہونا کچھ آسان نہ تھا۔

ایک اور مشکل عرب کے نسب ناموں میں یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور اس لئے مؤرخ دھوکے میں پڑ جاتے تھے اور پچھلے شخص کو وہ شخص سمجھ جاتے تھے جو اگلوں میں اُسی نام کا کوئی گذرا ہے اور جو پشتیں ان دونوں شخصوں کے درمیان میں فی الحقیقت گذری ہیں اُن کا ذکر چھوٹ جاتا تھا اور جب کہ ایک شخص کے کئی نام ہوتے تھے تو دوسری قسم کا دھوکا پڑتا تھا۔ تجنیس خطی کے سبب سے ایک ہی نام کو بعضوں نے کچھ پڑھا اور بعضوں نے کچھ۔ شام میں اور عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ بجائے باپ کے نام کے اُس شخص کا نام لے دیتے تھے جو نسب نامہ کے اشخاص میں معروف و مشہور ہوتا تھا یا جس سے نسل گنی جاتی تھی۔ چنانچہ سینٹ متی حواری نے اپنی انجیل میں حضرت عیسیٰ کے نسب نامہ میں لکھا ہے کہ "کتاب نسب نامہ عیسےٰ مسیح ابن داؤد . . . . ابن ابراہیم" حالانکہ مسیح سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں ہیں مگر داؤد جو ایک مشہور نام تھا اُن ہی کا بیٹا حضرت مسیح کو بتا دیا اور ابراہیم کا بیٹا داؤد کو کہدیا جس سے نسل چلی تھی اور بیچ کے سب نام چھوڑ دیئے۔

عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنے باپ داداؤں کے ناموں کو جہاں تک اُن کو یاد ہوتے تھے بیان کرتے جاتے اور جب اُن کی یاد کے نام ختم ہو جاتے تھے تو اخیر یاد میں رہے ہوئے شخص کو اُس کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے یا جب وہ ایسے شخص پر پہنچتے تھے جس کو ہر کوئی یقیناً اُسی کی اولاد میں جانتا ہے جس سے نسل چلی ہے تو اُس شخص کو اُسی کا بیٹا کہہ

دیتے تھے اور اس سبب سے مورخوں کو ایسے لوگوں کا سلسلہ وار نسب نامہ لکھنے میں اور بھی مشکل پڑی ہے۔

جب کہ ہم اپنے پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہتے ہیں تو اُس میں بھی یہ سب مشکلات پیش آتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اسی سبب سے کوئی صحیح حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی موجود نہیں ہے۔ یہ بات بے شک انھوں نے فرمائی کہ "ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں" جیساکہ ترمذی نے عبداللہ ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے مگر کرسی نامہ کے طور پر نہ کبھی اپنا نسب نامہ بیان فرمایا اور نہ اُس کے بیان کی ضرورت تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقینی بلاکسی شک وتردد کے جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ قبیلہ قریش سے ہیں اور اس بات پر بھی سب کو یقین تھا کہ قبیلہ قریش کا معد ابن عدنان کی اولاد میں سے عدنان اولاد ہے قیدار ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اور اتنی ہی بات اس امر کے ثبوت کے لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اولاد اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں، کافی تھی گو اُن کے درمیان میں کتنی ہی پشتیں گذری ہوں جن کی تعداد میں اختلاف ہو۔

ہاں اس بات میں کچھ شک نہیں کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو اس میں اختلاف ہوا اسی بنا پر کاتب الواقدی نے ایک قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ "کذب النسابون" یعنی نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ اور مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں ایک روایت بیان کی ہے کہ اسی اختلاف کے سبب جو نسب نامہ میں لوگ کرتے تھے فرمایا ہے کہ معد ابن عدنان سے آگے مت بڑھو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نسب نامہ کے بڑے دور تک ہونے سے اور اُس کے زمانہ دراز میں متعدد رائیں ہونے سے بخوبی واقف تھے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "انا ابن الذبیحین" یعنی میں دو قربانی کئے گئے شخصوں کا بیٹا ہوں اور اس قربانی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن دونوں شخصوں سے اسمٰعیل ابن ابراہیم اور عبداللہ باپ محمد رسول اللہ مراد ہیں۔

ولکن اللہ رای لتنازع الناس فی النسب نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن تجاوز معد ابن عدنان لعلمہ من تباعد الانساب وکثرۃ الآباء فی طول ھذہ الاعصار (مروج الذہب) (مسعودی)

ابو الفدا نے حضرت ام سلمہ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ

وروی عن ام سلمۃ زوجۃ النبی

صلے اللہ علیہ وسلم انہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عدنان ابن ادد بن زید بن برا بن عراق الثری فقالت ام سلمۃ زید ھمیسع و برانبت واسمٰعیل عراق الثری۔

وسلم سے روایت لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدنان بیٹا ادد کا اور وہ بیٹا زید کا اور وہ بیٹا برا کا اور وہ بیٹا عراق الثریٰ کا ہے اور ام سلمہ نے یہ بھی کہا کہ زید اور ہمیسع ایک ہی شخص کا نام ہے اور برانبت اور اسمٰعیل اور عراق الثریٰ ایک ہیں۔

یہ تمام روایتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض غلط اور بے سند ہیں اور ذرا بھی اعتبار کے لائق نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کبھی آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت ذکر نہیں ہوا۔ صرف اُن کے نسب کا یقین کہ قریش ہیں تمام عرب کے دلوں پر جما ہوا تھا اور اُس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ اُس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ پر کچھ بحث ہوتی۔ کئی صدی بعد جب کتابوں کی تحریر کا رواج شروع ہوا اور مؤرخین کو نسب نامہ کی تحقیق میں مجبوری ہوئی تو انھوں نے اپنی کتابوں کے رونق دینے کو جھوٹی روایتیں خود گھڑ لیں یا اُنواہا سنی سنائی اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر بلا تحقیق مندرج کر دیں۔ انا ابن الذبیحین کی روایت نہایت غلط ہے۔ اسمٰعیل کبھی قربان نہیں ہوئے۔ جیسا کہ ہم نے اپنے اس خطبہ میں ثابت کیا ہے جو عرب کے تواریخی جغرافیہ پر لکھا ہے اور عبداللہ کی قربانی کا بیان محض غلط ہے۔

ہاں بلاشبہ ترمذی نے جو روایت عبداللہ ابن مسعود سے بیان کی ہے وہ کسی قدر اعتبار کے

عن عبد اللہ ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لکل نبی ولاۃ من النبیین وان ولی ابی وخلیل ربی ثم قرا ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین آمنوا واللہ ولی المؤمنین (رواہ الترمذی)

لایق ہے۔ عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک نبی کے لئے ایک مربی نبیوں میں سے ہوتا ہے اور میرا مربی میرا باپ میرے پروردگار کا دوست (یعنی ابراہیم) ہے پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ سب سے زیادہ دوست ابراہیم کے وہ ہیں جنھوں نے اُس کی پیروی کی ہے اور یہ نبی یعنی محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ سب ایمان والوں کا دوست ہے۔ پانچ شخص ہیں جن کے تحقیق کئے ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔ ایک بیہقی۔ دوسرے ابن ہشام۔ تیسرے ابن الاعرابی۔ چوتھے برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی علیہ السلام۔ پانچویں الجراء۔

ان میں سے پہلے یعنی بیہقی نے عدنان سے ابراہیم تک دس پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں۔ عدنان

ابن عدد ابن المقوم یاحور بن یارح بن یعرب یشجب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم۔

اور دوسرے شخص ابن ہشام نے اپنی کتاب المغازی و سیر میں نو پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں "عدنان ابن عدد ابن ناحور ابن سود ابن یعرب ابن یشجب ابن نابت ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم"۔

اور اسی کتاب کے دوسرے نسخہ میں گیارہ پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں "عدنان ابن اود ابن سام ابن یشجب ابن یعرب ابن الہمیسع ابن ساتو ابن یاد ابن قیدار ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم"۔

اور تیسرے شخص یعنی ابن الاعرابی نے اس طرح پر نو پشتیں نسب نامہ میں مندرج کی ہیں "عدنان ابن اد ابن اود ابن الہمیسع ابن نابت ابن سلامان ابن قیدار ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم"۔

اول تو ان نسب ناموں کو اسمٰعیل تک سمجھنا غلطی ہے کیونکہ اس کے لکھنے والوں نے جہاں تک اُن کو نام یاد تھے وہاں تک لکھ کر اُس کے مشہور اشخاص قیدار و اسمٰعیل کا نام لے دیا ہے اور بیچ کے نام جو یاد نہ رہے تھے چھوڑ دیئے ہیں۔ جن لوگوں نے اُن کو پورا سمجھا ہے بڑی غلطی کی اور خود اُس زمانہ سے جو عدنان اور ابراہیم کے درمیان میں گذرا ہے اُن کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ نسب نامے خود بھی غلط ہیں۔ ابن ہشام کے دونوں نسخے آپس میں مختلف ہیں اور نابت کے ذریعہ سے اسمٰعیل تک قریش کا نسب نامہ پہنچانا ایک ایسی غلطی ہے جو خود عرب جاہلیت کی روایتوں سے جو تاریخی وقعت کے درجہ کو پہنچ گئی ہیں غلط ثابت ہوتی ہے۔ ابن الاعرابی کے نسب نامہ کا بھی کچھ ثبوت روایتًا یا درایتًا نہیں۔

پس دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک باروخ یا برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا اور دوسرا الجراني کا ابو الفدا نے بھی لکھا ہے کہ جو نسب نامہ الجرانی نے لکھا ہے وہی درست ہے اور وہی اختیار کرنے کے لائق ہے کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کا جو سلسلہ برخیا کاتب الوحی حضرت یرمیا نبی نے اپنے زمانہ تک کا لکھا ہے اُس پر ہم اعتبار نہ کریں خصوصًا اس وجہ سے کہ معد ابن عدنان حضرت یرمیا نبی کے وقت میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں حضرت یرمیا نبی نے اُن کو بچایا تھا اور ساتھ لے گئے تھے۔ اور یہ ایک قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ برخیا کاتب الوحی یرمیا نبی کو معد کا نسب نامہ لکھنے کی اسمٰعیل ابن ابراہیم تک ضرورت پڑی ہوگی۔ یہ شجرہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کا یا یوں کہو کہ معد ابن عدنان کا ابراہیم تک نسب نامہ جو برخیا کاتب الوحی نے لکھا ہمارے

واما الذی ذکرہ الجرانی النسابۃ فی شجرۃ النسب وھو المختار (ابو الفدا)

ہاں کی کتابوں میں بھی مندرج ہے چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں اس کو بعینہٖ نقل کیا ہے۔ ہشام کلبی کی روایت جو واقدی میں ہے اُس میں اسی شجرہ کو بیان کیا ہے مگر ناموں کے تلفظ میں بہ سبب مجانست الفاظ کے اور نقل کے فرق ہوگیا ہے۔ مثلاً ایک نے ایک نام لکھا ہے اقناد کاف اور لون سے دوسرے نے لکھا ہے انتاد فے اور تے سے یا مثلاً ایک نے لکھا ہے عیسیٰ بالیا۔ اور دوسرے نے لکھا عیسر بالراء اور غالباً کاتب نے کشش دار حرف یا کو حرف الراء سمجھ لیا ہے اسی طرح ناموں کے تلفظ و نقل میں اختلاف ہے ورنہ وہ دونوں واحد ہیں اور وہی شجرے ہیں جو برخیا کاتب الوحی نے اپنے زمانہ تک کے لکھے ہیں۔

الجرا کا نسب نامہ درحقیقت اسمٰعیلؑ ابن ابراہیم تک نہیں ہے بلکہ حمل ابن معد ابن عدنان اول تک ہے یعنی وہاں تک کہ برخیا کاتب الوحی نے شجرہ لکھا تھا مگر جو کہ الجرا نے بھی اُن ناموں کو جو برخیا کاتب الوحی نے لکھے تھے چھوڑ کر حسب دستور عرب و شام اُس کے آخیر میں قیدار بن اسمٰعیل اور ابراہیم کا نام لکھ دیا تھا۔ لوگوں کو شبہ پڑا کہ یہ مستقل جداگانہ نسب نامہ ہے حالانکہ درحقیقت وہ برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ ہے۔ ایک اور وجہ غلطی میں پڑنے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ برخیا کاتب الوحی اور الجرا کے نسب نامہ میں مکرر نام آتے ہیں۔ خصوصاً معد اور عدنان کے اور اس سبب سے لوگوں نے اُس کو جداگانہ نسب نامہ خیال کیا۔ حالانکہ مکرر ناموں کا آنا کوئی امر قابل اشتباہ کے نہیں ہے۔ پس اب ہم برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کے نیچے الجرا کا نسب نامہ جو اُس کا تتمہ ہے لگا دیتے ہیں۔ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک پورا ہو جاتا ہے۔ جن وجوہات سے کہ ہم نے الجرا کے نسب نامہ کو برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ بیان کیا اور دونوں کی صحت کو تسلیم کیا اُس کی وجوہات یہ ہیں :-

اول یہ کہ اسمٰعیل سنہ ۲۰۹۴ دنیاوی مطابق سنہ ۱۹۱۰ قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۴۵۷۰ دنیاوی مطابق سنہ ۵۷۰ بعد مسیح کے پیدا ہوئے تھے۔ پس دونوں ولادتوں میں چوبیس سو چھہتر برس کا فاصلہ ہے اور اسمٰعیل سے آنحضرتؐ تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گذرتی ہیں جو ازروئے حساب اُس سلسلہ نسب کے جو علی العموم علوم طبعی کی تحقیقات سے اختیار کیا جاتا ہے بالکل صحیح ہے یعنی قریب تین پشت کے ایک صدی میں۔

دوسرے یہ کہ معد اور میانی دونوں ایک وقت میں تھے چنانچہ مروج الذہب مسعودی جلد ۲

وفيه كان لا رميا معه معد ابن عدنان صفحہ ۱۱۹ میں لکھا ہے کہ معد ابن عدنان کے ارمیانبی
اخبار بطون ذکرها (مسعودی) کے ساتھ جو حالات گذرے ہیں وہ بہت طولانی ہیں۔ وہ
حالات یہ ہیں، کہ جب بخت نصر نے عرب پر حملہ کیا اور عدنان اور بنی جرہم کو شکست دی اور مکہ کو لوٹ
لیا اور صدہا آدمیوں کو پکڑ کر بابل میں لے گیا اُس وقت اللہ تعالیٰ نے معد ابن عدنان کو اس سے بچایا۔
اور ارمیانبی اور برخیا خدا کے حکم سے معد کو اپنے ساتھ لے گئے اور حیران میں اُن کو بحفاظت رکھا
ارمیانبی کا زمانہ سال دنیوی کے حساب سے پینتالیسویں صدی میں یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں تھا
اور جو نسب نامہ ہم نے صحیح قائم کیا ہے۔ اس میں بھی نسلوں کا عام سلسلہ بموجب معد بھی اُسی زمانہ
میں ہوتا ہے جو ایک نہایت قوی دلیل اُس سلسلہ کی صحت کی ہے اور برخیا کاتب الوحی کی تاریخانہ
تحریر اور عام عرب کی مشہور روایت سے عجب طرح پر مطابقت پائی جاتی ہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد جلد ۱ صفحہ ۱۹۲ میں لکھا ہے کہ یہ روایت معد اور
ارمیانبی کی صحیح معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و عدنان میں اٹھارہ پشتیں
ہیں۔ اور نسلوں کے صحیح حساب سے عدنان کی پیدائش ۱۳۰ قبل مسیح سے پہلے کی نہیں ہوسکتی
حالانکہ بخت نصر کے حملوں کا زمانہ ۵۷۸ قبل مسیح میں پایا جاتا ہے۔

مگر سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے یہ شبہ پڑا ہے۔ عدنان بھی دو ہیں اور معد
بھی دو ہیں۔ ایک وہ ہیں جو برخیا کاتب الوحی کے شجرہ میں ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو الجبرادا کے
نسب نامہ میں ہیں۔ پس وہ روایت نسبت پہلے معد ابن عدنان کے ہے۔ سر ولیم میور نے دوسرے
معد ابن عدنان کی نسبت وہ روایت تصور کی ہے۔ عک بلاشبہ معد کا بھائی تھا مگر اس سے پہلے
معد کا نہ دوسرے معد کا جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے۔ عرب کے ضلع حضر موت میں جو قلعہ
قوم عاد کا ازنام حصن الغراب تھا اور جس میں سے ایک کتبہ نکلا جس میں ہود پیغمبر کا ذکر ہے اور اس
میں عک کا بھی نام ہے۔ یہ عک اسی پہلے معد کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک
جو ہمارے مرتبہ شجرہ میں پچاسویں نمبر پر ہے پشتوں کا سلسلہ عموماً تسلیم کیا گیا ہے اور کسی مؤرخ کو
اس میں اختلاف نہیں ہے مگر عدنان سے آگے بلحاظ اُن وجوہات کے جو اوپر مذکور ہوئیں مؤرخوں میں اختلاف
قال البیہقی المذکور وكان شيخنا ابو عبد الله ہے بیہقی کا قول ہے کہ اُس کے اُستاد حافظ ابو عبد اللہ کہتے تھے
الحافظ يقول نسب رسول الله صلى الله عليه کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب عدنان تک صحیح ہے

وسلم صحیحة الی عدنان وما وراء عدنان فلیس فیه شیء نعتمد علیه (ابوالفدا)

اور اُس سے اوپر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر بھروسہ کیا جائے،" مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ قول اگر بیہقی کا صحیح ہو تو اُس کے اُستاد کی ایک رائے و سمجھ ہے کوئی مذہبی حدیث نہیں ہے جس پر یہ استدلال ہو سکے کہ مذہبی روایت کے بموجب اُس کی صحت نہیں ہے۔

بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور یہ اُس کے بھائی اسحٰق کی۔ وہ اَن پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی وطبعی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل محمد رسول اللہ نے نہیں فرمائی تھی اس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گذشتہ حالات وتاریخی واقعات کی نسبت بنی اسرائیل سے روایت کرنے کو منع نہیں فرمایا تھا بلکہ اجازت دی تھی، اور جس کسی بات میں کوئی خاص حکم نہ تھا تو یہود کی تتبع کو جو اہل کتاب تھے مناسب سمجھا تھا۔ پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ ہوا تھا تو بلاشبہ اُنھوں نے یہودیوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور جن کے ہاں تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا بھی سلسلہ جاری تھا مدد لی اور اُن کی کتابوں کی بھی تحقیق کی اور نسب نامہ مرتب کیا اور یہی وجہ ہوتی کہ بہ سبب متشابہ ہونے حروف تہجی عبری کے پھر اس کے دوسرے خط کوفی میں نقل ہونے پھر خط ثلث میں نقل ہونے اور پھر موجودہ خط عربی میں نقل ہونے سے الفاظ کا اُلٹ پھیر وتلفظ کا ادل بدل ہوا اور کاتبین کی غلطی سے کوئی نام رہ گیا کوئی بڑھ گیا جو منشأ اختلاف ہے۔ مگر جب کمال غور و فکر سے اس پر لحاظ کیا جائے تو اُس کی صحت بخوبی ہو سکتی ہے جیسے کہ بقدر اپنے فہم کے ہم نے کی ہے۔ چنانچہ انہی واقعات کا ذکر واقدی نے اپنی کتاب میں کیا ہے کہ میں نے اس بات میں کہ معد اولاد قیدار بن اسمٰعیل میں ہے کسی کا اختلاف نہیں دیکھا اور یہ اختلاف جو آپ کے

ولم ار بینهم اختلافاً ان معد من اولاد قیدار بن اسمٰعیل وهذا الاختلاف فی نسبه یدل علی انه لم یحفظ وانما اخذ ذلك من اهل الکتاب وترجموه لهم فاختلفوا فیه ولو صح ذلك کان رسول اللہ اعلم الناس به فالامر عندنا علی الانتهاء الی معد ابن عدنان ثم الامساك

نسب میں ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اہل عرب کو یا مسلمانوں کو نسب نامہ یاد نہیں تھا اُنھوں نے یہ نسب نامہ اہل کتاب سے لیا ہے اُنھوں نے اُس کو ترجمہ کر دیا۔ اور پھر اُن کو اُس میں اختلاف ہو گیا۔ اور اگر یہ نسب نامہ صحیح ہوتا تو رسول خدا صلی اللہ

عبادواء ذلک. الی اسمٰعیل بن ابراھیم (کاتب الواقدی) علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اُس کے جاننے والے تھے ۔پس ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ معد ابن عدنان تک ٹھہر جانا چاہیئے اور اس سے آگے اسمٰعیل تک کچھ نہ کہنا چاہیئے ۔

واقدی کے اس فقرہ کو سر ولیم میور نے بھی اپنی کتاب لائف آف محمد میں نقل کیا ہے مگر اس میں کوئی ایسی بات جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولاد اسمٰعیل ہونے میں شبہ پڑے نہیں ہے یہ بات سچ ہے کہ ہم کو نسب نامہ ابراہیم تک یاد نہ تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے یہودیوں سے جو ہمارے اسرائیلی بھائی ہیں یا اُن کی کتابوں سے اُس کی تحقیق کرنے پر مدد لی ہے ۔جو وجہ اختلاف ہم نے بیان کی ہے اُسی کی طرف واقدی نے بھی اشارہ کیا ہے یہ بھی سچ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الناس تھے اگر اُن کے سامنے اس کا تذکرہ ہوتا یا اُس کے بیان کرنے کی ضرورت ہوتی یا آنحضرتؐ سے پوچھا جاتا تو خدا کی ہدایت سے بالکل صحیح و درست بتلا دیتے ۔مگر نہ اُس کی ضرورت ہوئی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور اسی وجہ سے ہم کو اور ذریعوں سے تحقیق کرنے کی بھی ضرورت پڑی باقی جو کچھ واقدی نے کہا ہے وہ خاص واقدی کی رائے ہے ۔ اُس کے نزدیک معد بن عدنان تک نسب نامہ کی تحقیقات میں کچھ شبہ نہیں رہا اُس سے زیادہ اُس کو تحقیق نہیں ہوا اس لئے وہ کہتا ہے کہ معد بن عدنان سے زیادہ بیان کرنا کچھ ضرور نہیں مگر ہماری تحقیق یہ ہے کہ برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا لکھا ہوا شجرہ صحیح ہے اور وہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک پہنچا ہوا ہے۔

سر ولیم میور صاحب کا یہ کہنا ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ "یہ بات صاف صاف تسلیم کی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے "مگر ہماری تحقیق اور سر ولیم میور کی تحریر میں اتنا فرق ہے کہ وہ اس عدنان تک عرب کی ملکی روایتوں کا نسب نامہ بتلاتے ہیں جو ہمارے مرتبہ کرسی نامہ میں پچاس نمبر پر ہے اور ہم اُس عدنان تک ملکی روایتوں کا نسب نامہ قبول کرتے ہیں جو اکتالیس نمبر پر ہے اور باقی کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہود کی تاریخ سے لیا ہوا ہے۔

ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی کتابوں اور تحریر میں کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے اور اپنا وقت ضائع کیا ہے اور قوائے عقلیہ و دماغیہ کو صرف کیا ہے ۔جس سے ہم مسلمان کبھی منکر نہیں ہوئے یعنی یہ امر کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے ۔اور جب وہ

اس امر کو نہایت سعی بے حاصل سے ثابت کر چکتے ہیں تو ازراہ طعن ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں بات یہودیوں کے مذہب سے لی ہے۔ گویا مذہب اسلام میں ایسی بات نہیں ہے جو خود وہ اپنے اصول پر قائم ہو۔ بلکہ یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا ہے اور جیسے کہ مذہب عیسائی بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے ویسا ہی مذہب اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے۔ اگرچہ یہ امر کہ کونسا مذہب مسلمانی یا عیسائی زیادہ تر بلکہ بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے ہر ایک پر روشن ہے مگر ہم خوشی سے اس امر مذکور کو تسلیم کریں گے کیونکہ جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اس کو اپنا نہایت فخر سمجھیں گے کہ ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسحاق و اسمٰعیل و موسیٰ و عیسےٰ اور محمد صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا۔ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ "یہودیوں اور عیسائیوں سے کہدے کہ ایک بات کو مان لو جو تمھارے اں بھی وہی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کو مت پوجو" قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ (قرآن) ہم مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی مگر یہودیوں نے ان تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ نہ مانا۔ مگر سچی پیروی موسیٰ و عیسیٰ کی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ خدا تعالیٰ کے اُس وعدہ کا پورا ہونا جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا کہ "میں تمھارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا" کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیل کی نسلیں محمد سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کی تحریروں سے۔ وہ تو اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لئے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں

یاکسی اور ملک کے مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ بنی ہاشم قریش اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ "ابیکم ابراھیم" جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ بیچ بات کو تسلیم نہ کرے۔ چنانچہ ہم اس مقام پر چند رائیں عالم مورخوں کی نقل کرتے ہیں۔ ابو الفدا لکھتا ہے۔ کہ:۔

ونسبہ صلعم الی عدنان متفق علیہ من غیر خلاف وعدنان من ولد اسمٰعیل بن ابراھیم الخلیل علیہ السلام من غیر خلاف لکن الخلاف فی ھذہ الا باء الذین بین عدنان و اسمٰعیل فعد بعضھم منھا نحو اربعین رجلا وعد بعضھم سبعۃ (ابوالفدا)

"نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عدنان تک متفق علیہ ہے بغیر اختلاف کے اور اس میں بھی کہ عدنان اولاد اسمٰعیل ابن ابراہیم میں ہے۔ کچھ اختلاف نہیں ہے لیکن اُن پشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے جو عدنان اور اسمٰعیل کے درمیان میں ہیں۔ پس بعضوں نے تو چالیس پشتوں کے قریب گنی ہیں اور بعضوں نے سات" جن لوگوں نے جس شبہ سے سات گنی تھیں اُس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ پس اصل میں وہ بھی کچھ اختلاف نہ تھا بلکہ صرف سمجھ کی غلطی تھی۔

مشہور مورخ مسٹر گبن جو تمام عالم میں مشہور ہے لکھتا ہے کہ محمد کو حقیر اور بتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے۔ ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے کہ اپنے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں، اس کی خوبیوں کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں اسمٰعیل سے ان کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت سی پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف ونجیب ہیں وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرماں روا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔"

ریورنڈ مسٹر فارسٹر صاحب بھی یہی گواہی دیتے ہیں اور ان کی گواہی ایسی ہے جو غالباً انھوں نے خوشی سے نہ دی ہوگی وہ لکھتے ہیں کہ "اب تک ہم نے قیدار کا سُراغ قدیم جغرافیہ سے لگایا ہے اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیمی روایتوں کو عرب کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت

جس کی تائید میں اور کوئی ثبوت نہ ہو گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو مگر روایت کی جانچ اور پڑتال کے جو قوانین مسلمہ ہیں اُن کے مطابق اُن پر غور کرنے سے اس بات کا انکار کرنا ممکن ہے کہ وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے مطابق ہے۔ خاص عرب کے لوگوں کی یہ خاص قدیمی روایت ہے کہ قیدار اور اُس کی اولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوئی تھی۔ چنانچہ قوم قریش اور خصوصًا مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خاص حضرت محمدؐ نے اسی بنیاد پر کہ اسمٰعیل کی نسل اور قیدار کی نسل میں ہونے کا دعوے کرتے تھے اور خاص حضرت محمدؐ نے اسی بنیاد پر کہ اسمٰعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد ہیں اپنی قوم کی دینی اور دنیوی عظمتوں کے استحقاق پر تائید کی ہے۔

صرف سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں علماء کی متفقہ رائے سے اختلاف کیا ہے ہم اُس اختلاف کے جانچنے پر مستعد و آمادہ ہیں۔ اُنھوں نے صرف اپنی قیاسی باتوں سے اُن حقیقتوں پر اعتراض کیا ہے جو آفتاب کی طرح روشن ہیں اور مذہبی اور دنیوی دونوں طرح کی تاریخ سے بلا کسی شبہ کے ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ سر ولیم میور کہتے ہیں کہ "جو کوششیں ہمیشہ مذہب اسلام کی روایتوں اور عرب کے قصوں کو توریت اور یہودیوں کی روایتوں سے مطابق کرنے کے واسطے لی گئی ہیں اُس کو بھی ہم اُسی سبب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کلیہ کو خاص حضرت محمدؐ کے حالات حیات سے بہت کم تعلق ہے۔ لیکن وہ اُن کے بزرگوں اور عرب کی قدیمی روایتوں سے ایک وسیع اور مؤثر تعلق رکھتا ہے۔ یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیل کی اولاد میں سے خیال کیا جاوے اور غالبًا یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ثابت کئے جائیں اُن کی عین حیات میں پیدا ہوئے تھے اور اس پر محمد کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلہ گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے۔

مگر سر ولیم میور کے اس خیال کی غلطی کیسی علانیہ ظاہر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں ہوا کہ کوئی نسب نامہ ابراہیم تک درست کیا جائے نہ کبھی اس بات کا دھیان ہو کہ آنحضرت کو اولاد ابراہیم ثابت کرنے میں کوشش ہو۔ یہ ایک ایسی بات ثابت شدہ محقق تھی کہ جس میں کسی کو کسی جدید ثبوت کے تلاش کی حاجت نہ تھی۔ کیا آفتاب نصف النہار کے اثبات کا دن دہاڑے کسی کو خیال آسکتا ہے؟ تمام قرآن مجید میں کہیں اس بات

پر زور نہیں ڈالا گیا۔ تمام معتبر کتابیں حدیثوں کی اس مباحثہ سے خالی ہیں۔ چند نامعتبر روایتیں، جو کئی صدی بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئیں اور اُس وقت پیدا ہوئیں اور جب کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور مصنفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ لکھنا چاہا۔ اُن کا بھی سلسلہ سنداً آنحضرت تک نہیں پہنچایا گیا۔ پس یہ قیاس کرنا کیسا غلط قیاس ہے کہ یہ خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے علماء نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ لکھنا چاہا تو اُس کی تحقیقات کی اور اُس کی نسبت جو اُن کی رائے اور تحقیقات ہوئی بلاکسی تامل کے، بلاکسی خیال کے بلاکسی تردد کے بلاکسی دھکڑ پکڑ کے نہایت بے پروائی اور سادگی و صفائی سے لکھ دی۔ جس سے خود یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کے دل میں نہ کبھی اس امر میں شبہ تھا نہ اُن کو تردد تھا نہ کبھی اُن کو اس بات کے ثابت کرنے کی فکر تھی اور نہ کبھی وہ چوری و فریب اُن کے دل میں تھا اور نہ کبھی اُس کے ثبوت کے درپے تھے جس کا قیاس سر ولیم میور نے اپنی رائے میں کیا ہے پس وہ اُن کا قیاس محض غلط ہے اور مطلق اعتبار کے لائق نہیں ہے۔

اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور جو کہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اُسی آفتاب عالمتاب کے ذروں میں سے ہوں، اس لئے اپنے نسب نامہ کو بھی اُس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرور دوجہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرورعالم میں ہے اور جس کے سبب "لحمک لحمی دمک دمی" کا ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے بھی معزز ہو جائے۔

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

نسب نامہ محمد رسول اللہ تا حضرت ابراہیم مع نسب نامہ مؤلف خطبات تا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱ ابنا ابراہیم سنہ ۱۹۱۶ قبل مسیح
۲ اسمٰعیل سنہ ۱۹۱۰ قبل مسیح
۳ قیدار
۴ عوام
۵ عوص اول
۶ مُر
۷ سمائے
۸ زراخ
۹ ناجب
۱۰ معصر
۱۱ ابہام
۱۲ افتاد
۱۳ عیسٰی
۱۴ حسان
۱۵ عنقا
۱۶ ارعوا
۱۷ بلخی
۱۸ بحرے
۱۹ ہری
۲۰ یسن
۲۱ حمران
۲۲ الرعا

۲۳ عبید
۲۴ غنفد
۲۵ عبقی
۲۶ احی
۲۷ ناحور
۲۸ فاجم
۲۹ کالح
۳۰ بدلان
۳۱ یلدرم
۳۲ حدا
۳۳ ناسل
۳۴ ابی العوام
۳۵ تمساویل
۳۶ برو
۳۷ عوص دوم
۳۸ سلامان اول
۳۹ الہمیسع اول
۴۰ اود اول
۴۱ عدنان اول سنہ [illegible] قبل مسیح
۴۲ معد اول سنہ [illegible] قبل مسیح تک
ہمعصر ارمیا نبی
۴۳ حمل

۴۴ نابت
۴۵ سلامان دوم
۴۶ الہمیسع دوم
۴۷ الیسع
۴۸ اود دوم
۴۹ ادو
۵۰ عدنان دوم
۵۱ معد ثانی
۵۲ نزار
۵۳ مضر
۵۴ الیاس
۵۵ مدرکہ
۵۶ خزیمہ
۵۷ کنانہ
۵۸ النضر
۵۹ مالک
۶۰ فہر
۶۱ غالب
۶۲ لوے
۶۳ کعب
۶۴ مرہ
۶۵ کلاب

۶۶ عبد مناف
۶۷ ہاشم
۶۸ عبد المطلب
۶۹ عبد اللہ

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

۲ فاطمہ زہرا
امیر المومنین علیؓ
ابن ابی طالب
بن عبد المطلب

۳ امام حسین
۴ امام زین العابدین
۵ امام محمد باقر
۶ امام جعفر صادق
۷ امام موسیٰ کاظم
۸ امام علی موسیٰ رضا
۹ امام محمد تقی
۱۰ سید موسیٰ مرفع
۱۱ سید ابی عبد اللہ احمد
۱۲ سید محمد اعرج
۱۳ سید محمد احمد
۱۴ سید احمد

۱۵ سید موسیٰ
۱۶ سید احمد
۱۷ سید محمد
۱۸ سید علی
۱۹ سید جعفر
۲۰ سید محمد
۲۱ سید عیسیٰ
۲۲ سید ابو الفتح
۲۳ سید علی
۲۴ سید ایاز حسین
۲۵ سید کاظم الدین حسین
۲۶ سید جعفر

۲۷ سید باقر
۲۸ سید موسیٰ
۲۹ سید شرف الدین حسین
۳۰ سید ابراہیم
۳۱ سید حافظ احمد
۳۲ سید عزیز
۳۳ سید محمد دوست
۳۴ سید برہان
۳۵ سید محمد عماد
۳۶ سید محمد ہادی — سید محمد مہدی
۳۷ سید محمد متقی

۳۸ سید محمد — سید احمد مؤلف ہذہ الخطبات

سید محمد احمد
ولادت
۸ ربیع الاول
سنہ ۱۲۵۹ ہجری
مطابق ۹ مئی
سنہ ۱۸۴۳ء

سید احمد مؤلف ہذہ الخطبات
ولادت
پنجم ذیحجہ سنہ ۱۲۳۲ھ
مطابق ۱۷ اکتوبر
سنہ ۱۸۱۷ عیسوی

۳۹ سید حامد — سید محمود

سید حامد
ولادت
۲۴ صفر
سنہ ۱۲۶۵ھ
مطابق
۲۰ جنوری
سنہ ۱۸۴۹ء

سید محمود
ولادت ۱۱ رجب
سنہ ۱۲۶۶ ہجری
مطابق ۲۴ مئی
سنہ ۱۸۵۰ء

خطبہ دسواں

البشارة المذكورة فى التوراة والانجيل

يجدونه مكتوبا عندهم فى التوراة والانجيل (القرآن)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بشارات کے بیان میں جو توریت اور انجیل میں مذکور ہیں

توریت زوصفت تست معمور انجیل زنام تست مشہور

قرآن مجید کے بموجب ہم مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ توریت اور انجیل دونوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے کی ایسی صاف صاف بشارتیں مذکور ہیں جن میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا۔

خدا تعالیٰ سورہ اعراف میں فرماتا ہے کہ "جو لوگ کہنا مانتے ہیں رسول بن پڑھے

الذين يتبعون الرسول النبى الامى الذى يجدونه مكتوبا عندهم فى التوراة والانجيل يامرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم اصرهم والاغلال التى كانت عليهم فالذين امنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذى انزل معه اولئك هم المفلحون (سورہ اعراف آیت ۱۵۶)

نبی کا جس کا ذکر اپنے پاس لکھا پاتے ہیں توریت اور انجیل میں وہ اُن کو اچھی باتوں کے کرنے کو کہتا ہے اور بری باتوں کے کرنے سے منع کرتا ہے اور ستھری چیزوں کو اُن کے لئے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام کرتا ہے اور اُن کا بوجھ اُن پر سے اُتارتا ہے اور جو مشقتیں اُن کے گلے کا طوق ہو رہی تھیں اُن کو دور کرتا ہے۔ پھر جو لوگ اُس پر ایمان لائے اور اُس کا ادب کیا اور اُس کی مدد کی اور اُس نور کی تابعداری کی جو اُس کے ساتھ اُترا وہی لوگ ہیں نجات پانے والے"

پھر دوسری جگہ خدا تعالیٰ نے سورہ صف میں فرمایا ہے کہ "جب کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے کہ

واذ قال عیسی ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد فلما جاءھم بالبینات قالوا ھذا سحر مبین (سورہ صف آیت ۶)

اے بنی اسرائیل بے شک مجھ کو خدا نے رسول کر کے تمھارے پاس بھیجا ہے تصدیق کرتا ہوا توریت کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوا ایک پیغمبر کی جو میرے بعد ہوگا اور اُس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ پیغمبر (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کے پاس آیا کھلی ہوئی دلیلیں لے کر تو اُنھوں نے کہا یہ تو علانیہ جادو ہے"

مسلمان کل عہد عتیق کو جس میں حضرت موسیٰ کی پانچوں کتابیں اور زبور وصحف انبیاء داخل ہیں توریت کہتے تھے۔ کیونکہ اُن سب کے سرے پر جو کتاب تھی اُس کا نام توریت تھا۔ اور عہد جدید کی کتابوں کو سوائے اعمال وحواریوں کے ناموں کے انجیل کہتے تھے۔ کیونکہ وہ سب کتابیں انجیل کے نام سے موسوم تھیں۔ قرآن وحدیث میں بھی انہی معنوں میں لفظ توریت وانجیل کا وارد ہوا ہے پس قرآن مجید سے یہ تو پایا گیا کہ توریت وانجیل میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔ اور لقب بھی مذکور ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ کس جگہ توریت وانجیل میں یہ ذکر ہے۔ اس سبب سے مسلمان عالموں نے توریت وانجیل میں اُس کی تلاش شروع کی۔ مگر اُنھوں نے عہد عتیق وعہد جدید کی کتابوں کو نہایت ابتر، پریشان حالت میں پایا۔ کیونکہ کوئی اصلی قلمی نسخہ توریت وانجیل کا دنیا میں موجود نہ تھا اور جس قدر نقلیں موجود تھیں وہ آپس میں نہایت مختلف تھیں۔ یہودیوں کے جو بڑے نامی دو مدرسے تھے تو جو کتابیں مشرقی مدرسہ میں مروج تھیں اُن میں اور مغربی مدرسہ کی کتابوں میں نہایت اختلاف تھا اور سامری یونانی زبان میں توریت کے جو ترجمے تھے وہ بھی آپس میں مختلف تھے اور جو ترجمے مشرقی زبانوں میں ہوئے تھے وہ بھی ایسے ہی مختلف تھے اور ہرگز یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سب ایک ہی اصلی کتاب کے ترجمے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمان عالم مذہبی روایتوں اور کلام الٰہی کی تصدیق کے لئے سند مسلسل کے عادی تھے اور ہر مسلمان اپنی مذہبی کتاب اور مذہبی روایت کو اپنے اُستاد اور اپنے اُستاد کے اُستاد (و علیٰ ہذا القیاس) کی زبانی گواہی یا سند سے اصل تک اُس کا ثبوت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قرآن مجید کے بھی مکتوبی نسخوں کے بھروسہ پر نہ تھے بلکہ اُس کے ہر ہر لفظ کی اور زیر و زبر تک کی مسلسل سند اپنے پاس رکھتے تھے۔ مگر توریت وانجیل کی ایسی مسلسل

سند بھی کوئی موجود نہ تھی بلکہ اُن موجودہ نقلوں کی صداقت کے لیے بھی کوئی ایسا سلسلہ ثبوت کا جس سے کچھ شبہ نہ رہے موجود نہ تھا۔ علاوہ اس کے جب مسلمان عالموں نے توریت میں بعض مقام پر ایسی باتیں لکھی ہوئی پائیں جو نہایت اخلاق کے برخلاف تھیں اور بعض ناپاک افعال پاک اور مقدس بزرگوں اور نبیوں کی طرف منسوب تھے جن کا واقع ہونا اُن بزرگوں سے مسلمان کسی طرح یقین نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ خود مذہب اسلام نے اُن کو تعلیم کی تھی کہ تمام انبیاء معصوم تھے اور افعال قبیحہ ایسے پاک اور معصوم بزرگوں سے سرزد ہونے غیر ممکن ہیں تو وہ اُن مقاموں کو دیکھ کر نہایت حیران اور متعجب ہو گئے اور ان کے دل میں اس بات کا شبہ پیدا ہوا کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی ہے۔

اور جب اُن کو قرآن مجید کی یہ آیت یاد آئی کہ "یہودی بدل ڈالتے ہیں لفظوں کو اُن کی جگہ سے" یحرفون الکلم عن مواضعہ (سورہ نساء آیت ۴۸ و سورہ مائدہ آیت ۱۶) تو اُن کا وہ شبہ درجہ یقین کو پہنچ گیا اور اُنھوں نے توریت و انجیل میں زیادہ تر تفتیش کرنے کی ہمت نہ کی اور یہ خیال کر کے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت و انجیل میں تحریف کر دی ہے اور خصوصًا وہ مقامات جہاں جہاں ہمارے پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں تھیں بدل دی ہیں۔ تلاش کرنی چھوڑ دی اور اپنی کم محنتی اور کاہلی اور ہمت چھوڑ دینے کے الزام سے بچنے کے لئے تحریف کے الزام کو بطور سپر کے بنا لیا۔

مگر یہ خیال ان ہی لوگوں کا تھا جو علم اور تحقیق کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچے تھے اور استقلال کے ساتھ تحقیقات بھی نہیں کی تھی۔ بلکہ اوپری اوپری باتوں میں پھنس رہے تھے۔ برخلاف اس کے بڑے بڑے عالم اور فاضل اور دین دار لوگ جن کا نام دنیا میں بھی مشہور تھا اور آخرت میں بھی مشہور ہوگا۔ نہایت استقلال اور تحمل سے اُس کی تحقیقات میں مصروف تھے اور اُس کی جڑ تک پہنچ گئے تھے اُن کا یہ قول تھا کہ قرآن مجید میں جو تحریف کا الزام یہودیوں و عیسائیوں پر خدا نے لگایا ہے اُس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُنھوں نے جان بوجھ کر قصدًا توریت و انجیل کے لفظوں کو بدل دیا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ لفظوں کے معنی پھیر دیتے ہیں۔ چنانچہ امام محمد اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "یحرفون الکلم عن مواضعہ" کی تفسیر میں لکھا ہے "ای یاولونہ علی غیر تاویلہ" پس وہ لوگ تحریف لفظی کے قائل نہ تھے البتہ یہ بات تسلیم کے قابل تھی کہ قلمی نسخوں میں کاتبوں کی سہو اور غلطی سے بہت سی غلطیاں پڑ گئی تھیں۔ اس لئے اُن بزرگوں نے پہلی قسم

کے عالموں کی مانند ہمت نہیں ہاری اور تلاش و تفتیش سے باز نہیں رہے۔ اور خدا تعالےٰ نے اُن کی سعی کو مشکور کیا اور نہایت کامیابی سے انھوں نے توریت اور انجیل میں اور یہودیوں کی روایتوں میں وہ مقام ڈھونڈ نکالے جہاں پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ چنانچہ وہ سب روایتیں ہم مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں اور قرآن مجید کی تفسیروں میں اور کتب سیر و تواریخ میں مندرج ہوتی چلی آتی ہیں۔

اگرچہ میں اُن بزرگ عالموں کی کوشش اور محنت کی نہایت قدر کرتا ہوں اور اُن بزرگوں کا مسلمانوں پر نہایت احسان مانتا ہوں اور اُن کو ہر طرح قابل ادب سمجھتا ہوں۔ مگر میں اپنے اس خطبہ میں اُن سب کا ذکر کرنا ضرور نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جو کچھ اُن عالموں نے اپنی انتھک محنت سے نکالا ہے گو وہ کیسا ہی مفید ہو الا نقص سے خالی نہیں۔

اول:۔ تو یہ نقص ہے کہ وہ بزرگ ایک عام طور پر لکھ دیتے ہیں کہ یہ بشارت توریت میں ہے اور وہ بشارت انجیل میں ہے اور اُس خاص مقام کا جہاں سے وہ مطلب اخذ کیا ہے کچھ پتہ و نشان نہیں بتلاتے۔

دوم:۔ اُن بشارات کے بیان کرنے میں اُس خاص کتاب کا بھی نام نہیں بیان کرتے، جہاں سے وہ بشارت نکالی ہے۔ یعنی یہ نہیں بتلاتے کہ وہ بشارت حضرت موسیٰ کی کتابوں میں ہے یا زبور میں یا صحف انبیاء میں اور جو پرانے قدیم نسخے چلے آتے تھے اور جن میں اختلاف عبارت بھی تھا اور اُن کے جدا جدا نام تھے اُن میں سے بھی کسی نسخے کا نام نہیں بتلاتے کہ کون سے نسخہ میں یہ بشارت تھی اور نہ جس کتاب سے وہ بشارت لکھی ہے، اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں جو مذکورہ بالا نسخوں میں سے کسی کے ساتھ مطابق نہیں ہوتا۔

سوم:۔ اُن کتابوں کے سوا جو اس وقت مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں داخل ہیں اور کتابیں بھی تھیں جو اب دستیاب نہیں ہوتیں یا غیر معتبر اور مشتبہ سمجھی جاتی ہیں اور اس سبب سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بشارتیں جو اُن بزرگوں نے لکھی ہیں اور موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتیں وہ کن نسخوں سے لی گئی ہیں۔ یعنی اُن کتابوں سے جو اب دستیاب نہیں ہوتیں یا اُن سے جو غیر معتبر و مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔

چہارم:۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ بعض بشارتیں کتابوں میں لکھی ہوئی موجود نہ تھیں۔ بلکہ

سینہ بسینہ بطور روایت کے چلی آتی تھیں جیسے کہ انجیل متی میں حضرت مسیح کے ناصری کہلانے کی بشارت کا اس طرح پر ذکر ہے کہ "وہ آیا اور اُس شہر میں رہا جس کو ناصرہ کہتے تھے تاکہ وہ بشارت پوری ہو جو انبیاء کہتے آتے تھے کہ وہ ناصری کہلاتے گا" (متی باب ۲۔ ۲۳) حالانکہ یہ بشارت کسی نبی کی کتاب میں مندرج نہیں ہے پس وہ بشارتیں جن کو مسلمان عالموں نے زبانی روایتوں سے لیا ہے اُن کی بھی کوئی معتبر سند نہیں بتائی گئی تو وہ بھی نقص سے خالی نہیں اور اس لئے اُن کا بھی اس خطبہ میں ذکر کرنا کچھ مناسب نہیں۔

پنجم:۔ بعض بشارتیں اب بھی اُن کتابوں میں موجود ہیں جن کو عیسائی نامعتبر سمجھتے ہیں اور گو ہمارے پاس کافی ثبوت اس بات کا ہو کہ وہ صحیح ہیں۔ لیکن ہم اپنے اس خطبہ میں اُن کا بھی ذکر نہیں کرنے کے، بلکہ صرف اُن ہی بشارتوں کا ذکر کریں گے جو موجودہ مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں موجود ہیں جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں تاکہ کسی کو اس میں دم مارنے کا مقام نہ رہے۔

ششم:۔ علاوہ اس کے موجودہ مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں دو قسم کی بشارتیں موجود ہیں۔ ایک ایسی ہیں کہ اگر بغیر تعصب و طرف داری وضد کے اُن پر غور ہو اور اُن کے معنوں میں تحریف نہ کی جائے تو وہ صاف صاف ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں اور دوسری قسم کی ایسی ہیں کہ اُن سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کے ہونے کی بشارت ہے مگر یہ بات صاف نہیں معلوم ہوتی کہ کس پیغمبر کی بشارت ہے اور اس لئے ہر ایک قوم یہ دعوٰی کرسکتی ہے کہ وہ بشارت ہمارے پیغمبر سے متعلق ہے۔ اس قسم کی بشارتیں بھی جھگڑے سے خالی نہیں اس لئے میں اُن کا بھی اس خطبہ میں ذکر نہیں کرنے کا۔ پس ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے خیال کریں گے کہ بوجوہات مذکورہ بالا جس قدر بشارتوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے اُن کی تعداد بمقابل اُن بشارتوں کے جن کا اس خطبہ میں ذکر کیا ہے بہت زیادہ ہے۔

توریت وانجیل میں آنے والے پیغمبر کی بشارتیں ایسی مہمل اور مجمل طور سے بیان ہوئی ہیں کہ پہیلی اور معمے کی مانند ہوگئی ہیں۔ اور جب تک اُن کی تشریح نہ کی جائے اور اُن کا حل نہ بتایا جائے تو اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پس اگر ہم یکایک جناب پیغمبر خدا محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کو بیان کرنا شروع کردیں تو ضرور بعض لوگوں کے دل میں خیال جائے گا کہ یہ کیسی مجمل اور مشکل بشارت ہے۔ اس لئے ہم اُن بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو حواریوں کے کہنے کے مطابق عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت آئی ہیں اور اُس کے بعد اُن بشارتوں کو لکھیں گے جو توریت اور انجیل میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آئی ہیں۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے اب اس بات سے واقف ہوجائیں گے کہ بشارتوں کے بیان کرنے کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح کنایہ اور اشارہ سے بطور پہیلی یا چیستاں کے بیان ہوتی ہیں دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو بشارتیں ہیں اور جو بشارتیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہیں اُن کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے پیغمبر صاحب کی بشارتیں حضرت عیسیٰؑ کی بشارتوں کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن اور نہایت صاف صاف ہیں جن کی صحت کو مخالف کا دل بھی قبول کرلیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ بشارتیں ہیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں

۱۔ جب احاز یہود کے بادشاہ پر رصین بادشاہ ارم اور پقح بادشاہ رملیا بادشاہ اسرائیل نے چڑھائی کی تو احاز بادشاہ یہودا بہت گھبرایا۔ اُس زمانہ میں حضرت اشعیاہ پیغمبر تھے اُن سے التجا کی۔ انھوں نے احاز کو تسلی دی اور فرمایا کہ تو خوف نہ کر تیرے دشمن تجھ پر غالب نہ ہوں گے۔ اور اُس خوف کے رفع ہونے کی مدت اور اپنے قول کی صداقت کا یہ نشان بتایا ؛ ایک کواری کو حمل رہے گا اور وہ بیٹا جنے گی اور اُس کا نام عمانوئیل رکھا جائے گا اور جب وہ ذرا ہوشیار ہوگا تو جو خوف تجھ کو دشمنوں سے ہے جاتا رہے گا اور تیرے لئے بہت اچھے دن آئیں گے ؛ (یہ مضمون اشعیاہ نبی کی کتاب کے ساتویں باب میں مندرج ہے) پھر اُسی کتاب کے آٹھویں اور نویں باب میں مذکور ہے کہ وہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ' ماہیر شالال ہاشبز ' رکھا گیا اور جب وہ ہوشیار ہوا تو احاز کو دشمنوں کا جو خوف تھا جاتا رہا۔

بایں ہمہ انجیل متی میں لکھا ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی ہے جو کواری مریم سے پیدا ہوئے

ہیں چنانچہ سینٹ متی فرماتے ہیں کہ "جب حضرت مسیح کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوئی تو اس سے پہلے کہ وہ ہم بستر ہوں روح قدس سے حاملہ پائی گئی تب اُس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا نہ چاہا کہ اس کی تشہیر کرے ارادہ کیا کہ اُسے چپکے سے چھوڑ دے۔ وہ ان باتوں کے سوچ میں تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اس پر خواب میں ظاہر ہو کر کہا، اے یوسف داؤد کے بیٹے اپنی جورو مریم کو اپنے ہاں لانے سے مت ڈر کیونکہ جو اُس کے پیٹ میں ہے سو روح قدس سے ہے اور وہ بیٹا جنے گی تو اس کا نام یسوع رکھنا، کیونکہ وہ اپنے لوگوں کو اُن کے گناہوں سے بچائے گا، یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا پورا ہوا کہ دیکھو ایک کواری پیٹ سے ہو گی اور بیٹا جنے گی، اور اس کا نام عمانوئیل رکھیں گے، جس کا ترجمہ یہ ہے خدا ہمارے ساتھ" (انجیل متی باب ۱-۸ لغایت ۲۲)

پس اب غور کرنا چاہیئے کہ یہ کیسی مجمل اور مشتبہ پیشین گوئی ہے اور کس وقت اور کس مطلب کے لئے کی گئی تھی۔ مگر حضرت متی نے اس کو اشارۃً وکنایۃً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت قرار دی ہے۔

۲۔ حضرت میکا نبی نے بہت سی باتیں آئندہ کی اشارات وکنایات میں کہی ہیں کہ یہ ہو گا اور وہ ہو گا اس میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ "اے بیت لحم افراتاہ اگرچہ تو یہودا کے ہزاروں میں چھوٹا ہے۔ لیکن میرے لئے ایک شخص جو بنی اسرائیل میں سلطنت کرے گا اور اُس کا ہونا بہت قدیم زمانہ سے مقرر ہو چکا ہے تجھ میں سے نکلے گا" (کتاب میکاہ باب ۵-۲)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی بھی حضرت مسیح کی ہے کیونکہ جب ہیرود بادشاہ نے سردار کاہنوں اور یہودیوں کے نقیبوں کو جمع کر کے پوچھا کہ مسیح کہاں پیدا ہو گا تو انھوں نے میکاہ نبی کی کتاب کی اس آیت پر استدلال کر کے کہا کہ بیت لحم میں پیدا ہو گا (انجیل متی باب ۲-۳ لغایت ۶) اور جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت لحم میں پیدا ہوئے اور گو دنیاوی سلطنت اُن کو بنی اسرائیل پر نہیں ہوئی مگر سینٹ متی نے سلطنت کو روحانی سلطنت قرار دیا اور اس پیشین گوئی کو حضرت عیسیٰ کے ہونے کی پیشین گوئی ٹھہرایا۔

حضرت ہوشیع نبی نے لغز[۱] و کنایہ میں کچھ فرماتے فرماتے یہ فرمایا کہ "جب اسرائیل بچہ تھا اُس کو

---

[۱] لغز۔ بہ ضم اول و سکون غین معجمہ، بعدہ زائے معجمہ کلام مبہم۔ چیستان۔

میں پیار کرتا تھا اور اپنے بیٹے کو میں نے مصر سے بلایا" (کتاب ہوشیع باب ۱۱-۱)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بھی حضرت عیسیٰ کے متعلق بشارت ہے کیونکہ جب ہیرود نے حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کے بعد اُن کے مار ڈالنے کے لیے اُن کی تلاش کی تو خداوند کے فرشتے نے خواب میں یوسف سے کہا کہ "اُٹھ اس لڑکے کو اور اُس کی ماں کو لے کر مصر کو بھاگ جا"۔ (متی باب ۲-۱۳ لغایت ۱۵) اور جو کہ ہیرود بادشاہ کے مرنے کے بعد حضرت عیسیٰ مصر سے واپس آئے تھے تو صرف اتنے ہی لگاؤ پر سینٹ متی نے اس بشارت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کر دیا (متی باب ۲-۱۹ لغایت ۲۱)

۳۔ حضرت یرمیاہ نبی نے بنی اسرائیل کی مصیبتوں کو بیان کرتے کرتے یہ فرمایا کہ "خداوند فرماتا ہے کہ رامہ میں دھاڑیں مار کر رونے اور نالہ کرنے کی آواز سنائی دیتی ہے کہ راحیل اپنے بیٹوں کے لیے روتی ہے اور تسلی نہیں پاتی، کیونکہ وہ نہیں ہیں (کتاب یرمیاہ باب ۳۱-۱۵)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک بشارت حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔ کیونکہ جب "حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو ہیرود بادشاہ نے اس شبہ میں کہ کون سا بچہ ہے جو عیسیٰ ہوگا بیت لحم اور اُس کی سرحدوں کے سب لڑکوں کو جو دو برس کے اور اُس سے چھوٹے تھے قتل کروایا"۔ (انجیل متی باب ۲-۱۶)

اب سینٹ متی نے صرف اس قدر لگاؤ سے کہ اُن بچوں کے مارے جانے سے رامہ میں رونا اور پیٹنا ہوا فرمایا کہ یہ پیشین گوئی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے (انجیل متی باب ۲-۱۷-۱۸)

۴۔ حضرت اشعیاہ پیغمبر نے یہ بیان کرتے کرتے کہ "اب بیت المقدس (اور شلیم) میں تکلیف باقی نہ رہے گی" یہ بھی فرمایا کہ "تنگی کی ظلمت جس میں زمین مبتلا ہوتی ہے باقی نہ رہے گی جس طرح کہ اگلے زمانہ میں زبولوں کی زمین اور نفتالی کی زمین کو حقیر کر کے آخر کار اسی طرح دریا کے اردن (فرات) کے کنارے جلیل میں بڑے قبیلے ہوں گے جو قوم کہ اندھیرے میں چلتی ہے نور عظیم دیکھے گی اور موت کے سایہ کی زمین کے رہنے والوں پر ایک نور چمکے گا" (کتاب اشعیاہ باب ۱۹-۱ و ۲)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بشارت بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے کیونکہ جب حضرت عیسیٰ نے سُنا کہ حضرت یحییٰ پیغمبر گرفتار ہو گئے تو وہ جلیل کو چلے گئے اور ناصرہ کو چھوڑ کر کفرناحوم میں جو دریا کے کنارے زبولوں اور نفتالی کی سرحدوں میں ہے جا رہے (متی باب ۴-۱۲ و ۱۳)

سینٹ متی نے صرف اتنی بات پر کہ حضرت عیسیٰ دریا کے کنارے جا رہے تھے حضرت اشعیاہ نبی کے اُس قول کو حضرت عیسیٰ کی بشارت قرار دیا (انجیل متی باب ۴-۱۴ الغایت ۱۶)۔

۵۔ حضرت ملاکی نبی نے اسرائیل کو خدا کی عدول حکمی پر ملامت کرتے کرتے یہ فرمایا کہ "اب میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میری برابر راہ کو تیار کرے گا اور جس خداوند کی تفحّص میں یعنی رسول کے عہد اور اُس سے خوش ہو یکایک اپنی ہیکل میں آجائے گا۔ لشکروں کا خداوند فرماتا ہے کہ وہ اب آتا ہے" (کتاب ملاکی باب ۳-۱)

اور جس وقت اشعیاہ نبی نے بنی اسرائیل اور بیت المقدس کو تسلی دی تو اُس وقت یہ فرمایا کہ "پکارنے والا پکارتا ہے کہ بیابان میں خداوند کے لئے ایک راہ تیار کرو اور جنگل میں ایک شاہ راہ میرے خدا کے لئے درست کرو (کتاب اشعیاہ باب ۴۰-۳)

حضرت متی اور مارک اور لوک تینوں حواری اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں بشارتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہیں۔ اس لئے کہ حضرت یحییٰ پیغمبر نے جب لوگوں کو اصطباغ دیا تو انھوں نے گویا حضرت عیسیٰ کے لئے راہ بنائی اور حضرت یحییٰ یہ کہا کرتے تھے کہ "میرے بعد ایک اور آتا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ قوی ہے"۔ پس حضرت یحییٰ کا اصطباغ دینا تو راہ بنانا ہو گیا اور حضرت یحییٰ کا یہ کہنا کہ "میرے بعد ایک اور آتا ہے" پکارنے والی کی آواز ہو گئی اور وہ دونوں بشارتیں حضرت عیسیٰ پر صادق آگئیں (متی باب ۳-او ۲ و ۳ و ۱۱) انجیل مارک باب ۱ ۲ و ۳ و ۴ و ۷ و ۸ (انجیل لوک باب ۳-۲ لغایت ۴)

ہم مسلمان حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو پیغمبر برحق جانتے ہیں۔ مگر یہودی اُن کو پیغمبر نہیں مانتے اور عہد عتیق میں اُن کا کچھ ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی صحیفہ حضرت یحییٰ کا موجود ہے۔ پس جو اقوال حضرت یحییٰ کے انجیلوں میں مذکور ہیں وہ زبانی روایتوں سے لکھے گئے ہیں اور جن لوگوں سے انجیلوں کے لکھنے والوں نے وہ اقوال نے اُن کا نام نہیں بتایا۔ عیسائی یقین کرتے ہیں کہ وہ سب روح القدس کی تائید سے لکھا گیا ہے۔ جس کی صحت یقینی ہے۔ مگر ہم مسلمان جس طرح کہ اپنے پیغمبر کے حوارین یعنی صحابہ و تابعین کے کلام کی سند چاہتے ہیں اُسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے کلام کو سند کا محتاج سمجھتے ہیں۔ "لانفرق بین احد من رسلہ"۔

ان چند بشارتوں کے ذکر کرنے سے جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کی بشارتیں قرار دیا

ہے ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے سمجھ جائیں گے۔ کہ انبیا رسابق بنی لاحق کی بشارت کیسے دھندے لفظوں میں اور کیسے کنایہ اور اشارہ سے گھم گھم میں دیتے تھے جس کا سمجھنا پہیلی اور معمہ اور چیستاں سے بھی زیادہ مشکل ہوتا تھا اور اب ہم اپنے پیغمبر خدا رسول اللہ کی بشارتیں بیان کرتے ہیں جن کو لوگ دیکھیں گے کہ وہ ان کی بہ نسبت کیسی صاف اور روشن ہیں۔

بشارات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم توریت میں سے

بشارت اوّل

حضرت موسٰی کی کتاب میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسمٰعیل کی نسبت یہ وعدہ کیا ہے۔

וּלְיִשְׁמָעֵאל שְׁמַעְתִּיךָ הִנֵּה בֵּרַכְתִּי אֹתוֹ וְהִפְרֵיתִי אֹתוֹ וְהִרְבֵּיתִי אֹתוֹ בִּמְאֹד מְאֹד שְׁנֵים־עָשָׂר נְשִׂיאִם יוֹלִיד וּנְתַתִּיו לְגוֹי גָּדוֹל

וַיֹּאמֶר אֱלֹהִים אֶל־אַבְרָהָם אַל־יֵרַע בְּעֵינֶיךָ עַל־הַנַּעַר וְעַל־אֲמָתֶךָ כֹּל אֲשֶׁר תֹּאמַר אֵלֶיךָ שָׂרָה שְׁמַע בְּקֹלָהּ כִּי בְיִצְחָק יִקָּרֵא לְךָ זָרַע׃

וְגַם אֶת־בֶּן־הָאָמָה לְגוֹי אֲשִׂימֶנּוּ כִּי זַרְעֲךָ הוּא׃

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

وُلِیِشْمَعِیل شِمَعْتِیخا هِنّه بیرَختی اُتُو وهِفْرِیتی اُتُو وهِربیتی اُتُو بِمْئُود مِئُود شِنِیم عاسار نِسِیئِیم یُولِید وُنِتَتِّیو لِغُوی گادُول۔

ویُؤمِر اِلُوهِیم اِلا براهام اِل یرع بِعینیخا عل هنعر وعل آماتخا کُل اَشر تُومِر اِلیخا سارہ شمع بِقُولہ کِی بِیصحق یقارا لیخا زارع وغم اتبن ها آمہ لغوی اَسِمنُو کی زرعخا هُو۔

عربی ترجمہ

قد سمعت دعاءك لاسمعيل وها انا باركته واثمرته وفضلته كثيرا كثيرا ويلد اثني عشر خليفة

واجعله جیلا کبیرا۔

وقال اللّٰہ لا براھیم لا یضیق صدرك علی المولد وعلی امتك کلما تقول لك سارہ فاسمع بقولھا فانہ باسحٰق یدعی نسلك واجعل ابن الامۃ ایضًا امۃ لانہ نسلك ۔

اُردو ترجمہ

میں نے تیری دعا اسمٰعیل کے حق میں قبول کی ہاں میں نے اُسے برکت دی اور اُسے بارآور کیا اور اُسے بہت کچھ فضیلت دی اُس سے بارہ امام پیدا ہوں گے اور اُس کو بڑی قوم کروں گا (توریت کتاب اول باب ۱۷-۲۰)

کہا اللہ نے ابراہیم سے تیری نظروں میں بُرا نہ معلوم ہو اس لڑکے اور اپنی لونڈی کی وجہ سے جو کچھ تجھ سے سارہ کہے اُس کی بات مان لے کیونکہ اسحٰق سے تیری نسل کہلائے گی اور اس لونڈی کے لڑکے کو بھی ایک قوم کروں گا کیونکہ وہ تیری نسل ہے (توریت کتاب اول باب ۲۱-۱۲و۱۳)

ان آیتوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح بشارت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل کو برکت دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس طرح پر پورا ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اسمٰعیل کی اولاد سے تھے تمام دنیا کے لئے دنیا کے ختم ہونے تک نبی مقبول مقرر کیا۔

جو ہمارے مخالف ہیں وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ خدا نے اسمٰعیل سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کی اولاد میں بارہ سردار پیدا ہوں گے۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا بارہ سرداروں کے تھے پیدا ہوئے اور جس برکت دینے کا اسمٰعیل سے وعدہ ہوا تھا وہ دنیاوی برکت تھی نہ روحانی۔

مگر یہ تاویل کسی طرح صحیح نہیں ہوتی۔ ہر ایک منصف مزاج ان آیتوں کو پڑھ کو معلوم کرے گا کہ ان آیتوں میں جدا جدا تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ میں نے اس کو برکت دی" دوم یہ کہ "اُسے بارآور کیا۔ اور اُسے بہت کچھ فضیلت دی" سوم یہ کہ "اُس کو بڑی قوم کروں گا" پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان تینوں جدا جدا لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اولاد کا زیادہ ہونا۔

جب کہ حضرت اسحٰق بیر شبع میں پہنچے تو خدا تعالیٰ نے خواب میں اُن سے یہ وعدہ کیا تھا

کہ "تیرے باپ ابراہیم کا خدا ہوں تو مت ڈر میں تیرے ساتھ ہوں۔ تجھ کو برکت دوں گا اور اپنے بندہ ابراہیم کے سبب تیری نسل کو بہت کروں گا" (توریت کتاب اول باب ۲۶۔۲۴)

جس مضمون کا وعدہ کہ حضرت اسمٰعیل سے کیا گیا اور جو لفظ برکت کا اسمٰعیل کے وعدہ میں استعمال ہوا اسی مضمون کا وعدہ اسحاق سے کیا گیا اور وہی لفظ برکت کا اسحاق کے وعدہ میں بھی بولا گیا۔ پس یہ کہنا کسی قدر تعجب کی بات ہے کہ اسمٰعیل سے جو وعدہ تھا وہ تو دنیاوی تھا اور اسحٰق کا جو وعدہ تھا وہ روحانی تھا۔

ہم کو اس بات پر بھی غور کرنی چاہیئے کہ خدا نے حضرت ابراہیم سے کیا وعدہ کیا تھا۔ توریت میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کنعان میں پہنچے تو خدا نے اُن سے کہا کہ یہ زمین تیری اولاد کو دوں گا۔ (توریت کتاب اول باب ۱۲۔۷)

اور جب کہ حضرت لوط حضرت ابراہیم سے جُدا ہو گئے تو پھر خدا نے ابراہیم سے کہا کہ آنکھیں کھول اور چاروں طرف دیکھ کہ یہ تمام زمین جو تو دیکھتا ہے۔ تیری اولاد کو دوں گا اور تیری اولاد کو زمین کی ریت کی مانند کروں گا۔ جو کوئی ریت کے ذروں کو گن سکے تو تیری اولاد کو بھی گن سکے گا (توریت کتاب اول باب ۱۳۔۱۴ و ۱۵ و ۱۶)

پھر ایک دفعہ خدا نے ابراہیم سے وعدہ کیا کہ تیری اولاد اتنی ہو گی جتنے آسمان کے ستارے جن کو گن نہیں سکتا (توریت کتاب اول باب ۱۵۔۵)

پھر خدا نے ابراہیم سے ایک اور پختہ وعدہ کیا کہ یہ زمین مصر کے دریا سے فرات کے دریا تک تیری اولاد کو دوں گا (توریت باب ۱۵۔۱۸)

اور جب کہ حضرت ابراہیم ضعیف ننانوے برس کے ہو گئے تھے تب پھر خدا نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا کہ تجھ میں اور مجھ میں یہ وعدہ ہوتا ہے کہ تجھ کو زیادہ سے زیادہ کروں گا۔ تو بہت سی قوموں کا باپ ہو گا۔ تجھ سے قومیں پیدا ہوں گی۔ تجھ سے بادشاہ نکلیں گے اور تیری اولاد سے بھی یہ ہمیشہ کا عہد ہو گا۔ اور کنعان کی زمین بوراثت دائمی تجھ کو دوں گا (توریت کتاب اول باب ۱۷۔۳ و ۴ و ۵ و ۷ و ۸)

یہ تو وعدے تھے جو خدا نے حضرت ابراہیم سے کئے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے اسحٰق و یعقوب سے کیا وعدہ کیا تھا۔

توریت میں لکھا ہے کہ جب یعقوب بیرشبع سے حاران کی جانب روانہ ہوئے۔ تو ایک

مقام پر پتھر سرہانے رکھ کر سو رہے۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی آسمان تک لگی ہوئی ہے اور خدا کے فرشتے اُس پر اُترتے چڑھتے ہیں اُس پر خدا نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق کا خدا ہوں۔ یہ زمین جس پر تو سوتا ہے تجھ کو اور تیری اولاد کو دیتا ہوں۔ تیری اولاد زمین کی ریت کے برابر ہو گی اور چاروں طرف پھیل جائے گی (توریت کتاب اول باب ۲۸-۱۲ و ۱۳ و ۱۴-)

یہ بات بھی زبور سے ثابت ہے کہ خدا نے جو ابراہیم سے عہد کیا تھا وہی بعد کو بھی قائم رہا اور وہ صرف کنعان کی زمین دینے کا عہد تھا۔ چنانچہ زبور داؤد میں خدا کا کلام اس طرح لکھا ہے کہ" وہ عہد جو میں نے ابراہیم سے کیا اور اسحٰق سے اُس کی قسم کھائی اور یعقوب کے ساتھ بمنزلہ قانون کے مقرر کیا اور اسرائیل سے عہد دائمی کیا اور کہا کہ زمین کنعان تجھ کو دیتا ہوں تاکہ تیری میراث کا حصہ ہو" (زبور ۱۰۵-۹ و ۱۰ و ۱۱)

اب دیکھو کہ اسی وعدہ کا پورا کرنا خدا نے بتلایا۔ چنانچہ توریت میں لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ مواب کے جنگل میں پسگہ پہاڑ پر چڑھے جو یریحو کے سامنے ہے تو خدا نے موسیٰ سے کہا کہ" یہ وہ زمین ہے جس کی نسبت میں نے بقسمیہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب سے وعدہ کیا تھا کہ تمھاری اولاد کو دوں گا پس یہ زمین میں تجھ کو آنکھوں سے دکھلا دیتا ہوں مگر تو وہاں نہیں جانے کا" (توریت کتاب پنجم باب ۳۴-۴)

اب یہ تمام وعدے جو خدا نے ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے ساتھ کئے تھے ہم نے منتخب کر کے ہر منصف مزاج پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیئے ہیں اور اُس کے بعد ہم دو سوال کرتے ہیں۔ اول یہ کہ جو وعدے خدا نے ابراہیم کی اولاد کے لئے کئے ہیں وہ وعدے اسمٰعیل اور اسحاق دونوں کے حق میں کیوں نہیں سمجھے جاتے؛ حالانکہ خود خدا نے بھی کہا ہے کہ اسمٰعیل بھی ابراہیم کی اولاد ہے۔ جیسا کہ باب ۲۱ آیت ۱۲ میں مذکور ہے۔

دوسرا سوال ہمارا یہ ہے کہ جو وعدہ خدا نے اسحٰق و یعقوب کی نسبت کیا تھا یعنی ملک کنعان دینے اور اولاد زیادہ کرنے کا اُس میں کیا ایسی چیز ہے جس سے وہ روحانی قسم کا سمجھا جاتا ہے۔ اور جو وعدہ اسمٰعیل کی نسبت کیا تھا اُس میں کس چیز کی کمی ہے جس سے وہ دنیاوی سمجھا جاتا ہے۔

جو لوگ کہ انصاف سے ان باتوں پر نظر کرتے ہیں وہ بہ یقین جانتے ہیں کہ خدا نے اسحٰق

سے بھی برکت کا وعدہ کیا اُن کی اولاد میں انبیار پیدا ہوئے - ملک فتح کئے - کنعان بھی فتح کیا۔
اسمٰعیل سے بھی خدا نے برکت کا وعدہ کیا - اُس کی اولاد میں سب سے آخر ایک پیغمبر آخرالزمان
پیدا کیا - تمام دنیا کو اس سے برکت دی - اسمٰعیل کی اولاد نے بھی ملک فتح کئے - کنعان کو جو غیر
خدا پرستوں کے ہاتھ چلا گیا تھا - پھر فتح کیا اور ابراہیم ہی کی نسل میں پھر اُس ورثہ کو لے آئے
اور جب تک خدا کی مرضی ہے - وہ ابراہیم کا ورثہ اُن کے حصہ میں رہے گا - اگرچہ بقائے اصلی صرف
خدا کی ذات کو ہے - ؎ کل شئی ما خلا اللہ زائل

بشارت دوم

خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بہت سے احکام بتلائے اس میں یہ بھی فرمایا۔

נָבִיא מִקִּרְבְּךָ מֵאַחֶיךָ כָּמֹנִי יָקִים לְךָ יְהוָה אֱלֹהֶיךָ אֵלָיו תִּשְׁ
מָעוּן׃

נָבִיא אָקִים לָהֶם מִקֶּרֶב אֲחֵיהֶם כָּמוֹךָ וְנָתַתִּי דְבָרַי בְּפִיו
וְדִבֶּר אֲלֵיהֶם אֵת כָּל־אֲשֶׁר אֲצַוֶּנּוּ׃

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

نَابِی مِقِرِبِخَا مِاَحِیخَا کَامُونِی یَاقِیم لِخَا یَہوَاہ اِلُوہِیخَا اِلَاوُ تِشَاعُون : نَابِی اَقِیم لَاہِم
مِقِرِب اَحِیہِم کَامُوخَا وَنَتَّنِی دِبَارَای بِفِیُو وِدِبِّر اِلِیہِم اِث کُل اَشِر اِصَوِّیُّو۔

عربی ترجمہ

الہك الموجود یقیم لك نبیا من بینك من اخوتك مثلی له تسلمون : نبی من بین اخوتھم
اقیم لھم مثلك والقی کلامی بفیه وکل ما آمرہ یقول لھم۔

اُردو ترجمہ

قائم کرے گا تیرا معبود تیرے لئے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں سے مجھ سا - اُس کو
مانیو - اُن کے بھائیوں میں سے نبی تیرا سا قائم کروں گا - اور اپنا کلام اُس کے منہ میں دوں گا اور
جو کچھ میں اُس سے کہوں گا وہ اُن سے کہہ دے گا (توریت کتاب پنجم باب ۱۸ - ۱۵ و ۱۸)

ان آیتوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ایسی صاف اور ایسی مستحکم بشارت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی مثل موسیٰ کے مبعوث کرے گا اور کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل ہیں اور بنی اسمٰعیل میں بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نبی نہیں ہوا اور اُس سے صاف ثابت ہوگیا کہ یہ بشارت ہمارے ہی جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

علاوہ اس کے ان آیتوں میں دو لفظ ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔ اول یہ کہ "اپنا کلام اُس کے منہ میں دوں گا" دوم کہ "مثل تیرے" یعنی موسیٰ کے ان دونوں لفظوں کا مصداق سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔

یہودی اور عیسائی دونوں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل پر سوائے عشرہ موسیٰ کے جو وحی آتی تھی اُس کے لفظ وہی نہیں ہیں جو توریت زبور وصحف انبیاء میں لکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ انبیاء کو صرف مطلب القا ہوتا تھا اور پھر وہ اس کو اپنی زبان و محاورہ میں لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اناجیل اربعہ جو اب معتمد اور قابل سند عیسائیوں میں تسلیم ہوتی ہیں۔ اُن کے الفاظ تو وہ ہیں ہی نہیں جو حضرت عیسیٰ کی زبان مبارک سے نکلے تھے کیونکہ حضرت عیسیٰ کی عبرانی زبان تھی اور وہ انجیلیں یونانی میں تحریر ہوئی ہیں۔ ہاں البتہ قرآن مجید ایسا ہے کہ اس کے لفظ پیغمبر کے منہ میں رکھے گئے اور وہی لفظ پیغمبر نے لوگوں کو پڑھ کر سنائے۔ پس یہ الفاظ اس بشارت کے کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا"۔ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پر صادق ہی نہیں آتے۔

اب دوسری بات پر غور کرو کہ حضرت موسیٰ کی مانند کونسا پیغمبر ہوا ہے بنی اسرائیل میں تو کوئی پیغمبر مثل حضرت موسیٰ کے نہیں ہوا۔ کیونکہ حضرت عزیر پیغمبر نے جب توریت کو بعد قید بابل کے تحریر فرمایا تو اُس میں یہ لکھا ہے کہ۔

וְלֹא-קָם נָבִיא עוֹד בְּיִשְׂרָאֵל כְּמֹשֶׁה אֲשֶׁר יְדָעוֹ יְהוָה פָּנִים
אֶל-פָּנִים:

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

دِلُوقَام نَابِی عود بیسرَائیل کمُوشِہَ اشِر ىدَاعُو یہوا پانیم اَلِ پانیم۔

عربی ترجمہ

وما قام نبی وما بعد باسرائیل کموسی الذی عرف اللہ بالمشافہہ۔

اردو ترجمہ

اور پھر قائم نہ ہوا کوئی نبی بنی اسرائیل میں موسٰی کی مانند جس نے پہچانا اللہ کو رو بدرو۔ (توریت کتاب پنجم باب ۳۴-۱۰)

پس اب بنی اسرائیل کے بھائیوں میں دیکھنا چاہیئے کہ کون پیغمبر ہوا وہ بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہاں اب یہ دیکھنا باقی رہا کہ وہ مثل حضرت موسٰی کے ہیں یا نہیں۔ سو مفصلہ ذیل باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمدؐ ہی ایسے پیغمبر ہیں جو مثل موسٰی کے ہوتے ہیں۔

۱۔ حضرت موسٰی نے اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے اپنے وطن سے ہجرت کی۔ اسی طرح حضرت محمدؐ کو بھی اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔

۲۔ حضرت موسٰی نے بھی ہجرت کر کے شہر یثرب میں جس کو اب مدینہ کہتے ہیں اور جو یثرون بانی شہر کے نام پر کہلاتا تھا پناہ لی۔ اسی طرح حضرت محمدؐ نے بھی اپنے وطن مکہ سے ہجرت کر کے اُسی شہر مدینہ میں پناہ لی۔

۳۔ حضرت موسٰی پر کلام خدا کا بلفظہ نازل ہوا جو دس احکام ہیں۔ حضرت محمد پر بھی کلامِ خدا کا بلفظہ نازل ہوا موجود ہے اور کلام اللہ کہلاتا ہے۔

۴۔ حضرت موسٰی کو بھی کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت محمدؐ کو بھی وحدانیت خدا کے وعظ کرنے سے جو کافر مانع ہوں اُن سے جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ البتہ جہاد حضرت موسٰی کا نہایت سخت قاتل خونریز تھا۔ اور حضرت محمد کا جہاد نہایت ملائم اور امن چاہنے والا اور امن دینے والا اور جانوں کا بچانے والا تھا۔

۵۔ حضرت موسٰی نے اپنی متفرق اور پامال قوم کو مصر سے نکال کر یک جا جمع کیا۔ حضرت محمدؐ نے بھی تمام متفرق اور مختلف عرب کی قوموں کو جو آپس میں نہایت دشمن اور کینہ ورتھیں جن کے باہم ہر سال خون کے نالے بہتے تھے اکٹھا کر دیا، بلکہ یک دل و یک جان کر دیا اور اس پر

عمدہ بات یہ کہ سب کو ایک خدائے واحد ذوالجلال کی پرستش کرنے والا کر دیا کہ کوئی اُس کے مقابل نہ تھا۔

۶ ۔ حضرت موسٰی نے ملک فتح کئے اور بنی اسرائیل میں دنیاوی بادشاہت بھی قائم کی۔ حضرت محمدؐ نے بھی ملک فتح کئے اور بنی اسمٰعیل میں دنیاوی بادشاہت بھی قائم کردی اگرچہ اتنا فرق ہے ۔کہ حضرت موسٰی کا اصلی مقصد بادشاہت قائم کرنی اور ملک کنعان پر قبضہ کرنے کا تھا۔

اور حضرت محمد کا مقصد دنیاوی بادشاہت کا نہ تھا اصلی مقصد کے ساتھ وہ بھی اتفاق سے قائم ہو گئی تاکہ توریت کی بشارت مثل موسٰی کے پوری ہو جائے۔

۷ ۔ حضرت موسٰی کو خداتعالیٰ کی جانب سے شریعت عطا ہوئی اور ایک کتاب دی گئی (یعنی توریت) جس میں تمام احکام شریعت کے ہیں ۔حضرت محمد کو بھی شریعت عطا ہوئی اور ایک کتاب دی گئی (یعنی قرآن) جس میں تمام احکام شریعت کے ہیں ۔ اور غالبًا کوئی اور پیغمبر سوائے حضرت موسٰی اور حضرت محمدؐ کے ایسا نہیں ہوا۔ جس کو ایسا قانون شریعت عطا ہوا ہو۔ کیونکہ تمام انبیائے بنی اسرائیل اور خود حضرت عیسٰی سب کے سب موسٰی کی شریعت کے تابع تھے۔ کسی کو خاص شریعت عطا نہیں ہوئی تھی۔

۸ ۔ عیسائی مصنفوں نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ حضرت محمدؐ مثل موسٰیؑ کے تھے۔ مسٹر رینان نے حضرت عیسٰیؑ کے حالات زندگی کے بیان میں لکھا ہے کہ حضرت موسٰی اور حضرت محمدؐ صرف غور ہی کرنے والے اور سوچنے والے نہ تھے بلکہ وہ دونوں کام کرنے والے بھی تھے اور اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کے لئے کام تجویز کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ سے اُن دونوں نے انسانوں پر حکومت کی۔

۹ ۔ کوارٹرلے ریویو نمبر ۲۵ میں جو آرٹیکل اسلام پر چھپا اُس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے کہ حضرت محمدؐ کو اپنے وطن میں رہنا مشکل معلوم ہوا اور اس لئے اُنھوں نے ہجرت کی تاکہ کسی دوسرے مقام پر جا کر وعظ کریں۔ جیسے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسٰی اور اور نبیوں نے ہجرت کی تھی۔

اُن کے پیروؤں نے اطاعت اور وفاداری کا وعدہ کیا اور جب یہ ہو چکا تو اُنھوں نے اُن میں سے بارہ آدمی منتخب کئے ۔حضرت عیسٰیؑ نے بھی بارہ حواری چنے ۔حضرت موسٰی نے

بھی بنی اسرائیل کی قوم میں سے اپنی بہ نسبت زیادہ عمر کے لوگ منتخب کیے تھے۔

سنہ ہجری میں آخیر مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چالیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مکہ میں آئے اور کوہ عرفات پر مثل حضرت موسیٰ کے اُن کو برکت دی اور اپنی اخیر نصیحتیں کیں اور خصوصًا یہ نصیحت فرمائی کہ کمزوروں اور مفلسوں اور عورتوں کو پناہ دو اور سود خوری سے پرہیز کرو۔

آنحضرتؐ نے بھی مثل حضرت موسیٰ کے آخیر مرتبہ مسلمانوں سے پوچھا کہ میں نے کسی کا کچھ نقصان تو نہیں کیا اور کسی کا کچھ قرض تو مجھ پر نہیں ہے؟ انتہیٰ۔

یہ سب تمثیلیں وہ تھیں جو کوارٹرلے ریویو میں لکھی ہیں۔ پس اب سوائے اُس کے جو براہ تعصب اس صاف اور روشن بشارت سے آنکھ بند کرے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے۔

جو آیتیں توریت کی ہم نے اوپر بیان کی ہیں اُن میں سے ایک کے یہ الفاظ ہیں کہ "قائم کرے گا تیرا معبود موعود تیرے لئے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں سے" اس لفظ "تجھ میں سے" پر ہم نے خطبات احمدیہ میں جو انگریزی زبان میں چھپی ہے کچھ بحث نہیں کی تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ دوسری آیت میں یہ لفظ نہیں تھا اور اس میں نہایت صفائی سے بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل میں سے نبی مبعوث ہونا ظاہر تھا۔ اور جب کہ حضرت موسیٰ کی پانچویں کتاب کے چونتیسویں باب کی دسویں آیت سے جو اوپر لکھی گئی صاف ثابت تھا کہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی مثل موسیٰ کے نہیں ہوا تو صاف متیقن ہو گیا تھا کہ بنی اسمٰعیل میں سے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں نبی موعود ہونے والا تھا۔ مگر مولوی چراغ علی صاحب نے اپنے رسالہ بشارت مثل موسیٰ میں اُس پر بحث کی ہے وہ ارقام فرماتے ہیں۔ کہ لفظ "تجھ میں سے" اصل صحیح نسخہ توریت میں نہ تھا، بلکہ کاتبوں کی غلطی سے یہ لفظ بڑھ گیا ہے اور اُس کے ثبوت پر نہایت مضبوط تین دلیلیں پیش کی ہیں۔

اوّل:۔ یہ کہ اسی آیت کو پطرس حواری نے اعمال حوارین میں نقل کیا ہے۔ اور اُس میں یہ فقرہ "تجھ میں سے" نہیں ہے۔

دوسرے:۔ یہ کہ استیفان حواری نے بھی اس آیت کو نقل کیا ہے۔ اس میں بھی وہ فقرہ نہیں ہے۔

تیسرے:۔ یہ کہ توریت کے یونانی ترجمہ میں جو سپٹوا ایجنٹ کہلاتا ہے اور نہایت قدیم اور بہت معتبر ترجمہ ہے اُس میں بھی یہ فقرہ نہیں ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم صحیح نسخوں میں یہ الفاظ نہ تھے۔

وہ یہ بھی اتہام فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں جو ضمیر واحد کی ہے وہاں اصل میں جمع کی تھی جیسے کہ اُن حواریوں کی تحریروں اور یونانی ترجمہ سے پایا جاتا ہے۔

میں نے اس بحث کو جناب مولانا و بالفضل اولینا جناب مولوی عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی کے سامنے پیش کیا جو عبرانی زبان اور توریت مقدس کے بہت بڑے عالم ہیں اور غالبًا ہم مسلمانوں میں آج تک عبرانی اور کالڈی زبان اور توریت وزبور وصحف انبیاء کا ایسا کوئی عالم نہیں گذرا۔ جناب ممدوح نے فرمایا کہ ترجموں کی طرف ہم کو التجا لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے اور جب کہ یونانی ترجمہ توریت کا حضرت عیسیٰؑ سے پیشتر ہوچکا تھا تو حواریوں نے بھی غالبًا اُسی ترجمہ سے نقل کیا ہوگا۔ تو پس گویا دلیل صرف ایک یونانی ترجمہ پر عود کرتی ہے اور ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ترجمہ کے استدلال سے اصل متن پر کچھ الزام لگائیں، مگر جن لفظوں پر بحث ہے وہ ہمارے مطلب کے بہت زیادہ مفید و مؤید ہیں۔

آیت جس کے لفظوں پر بحث ہے یہ ہے کہ "قایم کرے گا تیرا معبود موجود تیرے لئے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں مجھ سا اُس کو مانیو"۔ یہ قول حضرت موسیٰ کا ہے اور مخاطب اس کا کوئی شخص خاص نہیں ہے۔ بلکہ کل قوم بنی اسرائیل ہے اور تمام قوم جو جنس واحد ہے اسی کی طرف ضمیر خطاب واحد کا استعمال کیا ہے۔

اب اس مقام پر حضرت موسیٰؑ کو یہ بتانا تھا کہ وہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں ہونے کا بلکہ برادران بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔ پس اگر اس مقام پر صرف یہی کہا جاتا کہ تیرے بھائیوں میں سے ہوگا تو یہ بات بخوبی روشن نہ ہوتی کہ بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر قوم کو صرف یہ کہا جائے کہ تمہارے بھائیوں میں سے ہوگا تو اس وقت یہ احتمال کہ اسی قوم میں سے کوئی ہو زائل نہیں ہوتا۔ اس لئے اولاً حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ "تجھ میں سے" اور پھر اُس کا بدل واقع ہوا "تیرے بھائیوں میں سے" تو اس سے صاف متحقق ہوگیا۔ کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا نہ بنی اسرائیل میں سے۔ پس اسی طرز کلام سے بنی اسرائیل میں سے اُس نبی موعود کے مبعوث ہونے کا احتمال بالکل زائل ہوجاتا ہے اور الفاظ کہ "تیرے

بھائیوں میں سے " الفاظ " تجھ میں سے " کا بیان تصور نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ اگر مقصود یہ ہوتا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہوگا تو خود الفاظ " تجھ میں سے " ہی زیادہ تر اس مطلب کا بیان کرتے تھے بہ نسبت الفاظ " تیرے بھائیوں میں سے " کے پس کسی طرح یہ پچھلے الفاظ پہلے الفاظ کی تفسیر اور بیان نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ وہ پہلے الفاظ کے بدل واقع ہوئے ہیں جن سے اُس نبی موعود کا بنی اسمٰعیل سے ہونا معین ہو جاتا ہے ۔

انقلس نے جو نہایت قدیم ترجمہ کالڈی زبان کا ہے اس مقام پر ترجمہ بصیغہ واحد کیا ہے ۔ یعنی بجائے اس کے کہ " تیرے بھائیوں میں سے " اُس نے ترجمہ کیا ہے " تیرے بھائی میں سے " اس کا سبب یہ ہے کہ عبرانی میں جو لفظ " ماحیخا " ہے اُس کے حرف یا کو اگر علامت اضافت سمجھیں تو ترجمہ بصیغہ واحد ہونا چاہیئے ۔ اور اگر علامت جمع سمجھیں تو ترجمہ بصیغہ جمع ہونا چاہیئے ۔ بہر حال ایک بڑے یہودی عالم کی یہ رائے ہے کہ وہ حرف یا علامت اضافت ہے اور جب ترجمہ بصیغہ واحد ہو تو صاف بنی اسرائیل کے بھائی کوئی دوسری قوم ہونی چاہیئے اور اس صورت میں بنی اسمٰعیل میں سے نبی موعود کا ہونا متعین ہو جاتا ہے ۔ اور " ماحیخا " کا بجز بدل ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا ۔

مولوی چراغ علی صاحب نے اپنے رسالہ بشارت مثل موسٰی میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ کہنا کہ بموجب محاورہ توریت کے بھائیوں کے لفظ سے ہمیشہ بنی اسرائیل ہی مراد ہوتے ہیں محض غلط ہے ۔ بلکہ کتاب استثناء باب ۲۳ - ۸ میں بنی قطورہ پر اور کتاب استثناء باب ۲ - ۴ و باب ۲ - ۸ و باب ۲۳ - ۸ و صحیفہ اشعیاہ باب ۲ - ۱۲ و صحیفہ عبدیا آیت ۱۰ میں بنی عیشاؤ پر اور کتاب پیدائش باب ۱۶ - ۱۲ و باب ۲۵ - ۱۸ میں بنی اسمٰعیل پر لفظ بھائیوں کا بولا گیا ہے ۔ اور چونکہ ان میں سے بجز اسمٰعیل کے اور کسی کو برکت نہیں دی گئی تھی اس لئے بنی اسمٰعیل ہی میں سے نبی موعود کا مبعوث ہونا متعین اور منحصر ہو گیا تھا ۔

بشارت سوم

حضرت موسٰی پیغمبر اور حضرت حبقوق نبی نے نبی عربی حجازی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دی ہے ۔

וַיֹּאמַר יְהוָה מִסִּינַי בָּא וְזָרַח מִשֵּׂעִיר לָמוֹ הוֹפִיעַ מֵהַר פָּארָן׃

וְאָתָה מֵרִבְבֹת קֹדֶשׁ מִימִינוֹ אֵשְׁדָּת לָמוֹ׃

אֱלוֹהַּ מִתֵּימָן יָבוֹא וְקָדוֹשׁ מֵהַר־פָּארָן סֶלָה כִּסָּה שָׁמַיִם הוֹדוֹ וּתְהִלָּתוֹ מָלְאָה הָאָרֶץ׃

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے:۔

وَیُومِرْ یَہْوَا مِسِینَائِی بَا وَزَارَحْ مِسِعِیرْ لَامُو ہُوفِیعَ مِہَرْ پَارَان وِاَتَا مِرِبْبُوتِ قُودِشْ مِیمِینُو اِیشْ دَاتْ لَامُو۔

اُلُوہَ مِتِیمَان یَابُو وِقَادُوش مِہَرْ پَارَان سلہ کِسَّہ شَمَایِم ہُودُو وِتْہِلَاتُو مَالِئَا ہَاارِص۔

عربی ترجمہ

وقال ان اللہ طلع من سینا۔ واشرق لھم من السعیر ومن جبل فاران تجلے۔ بیمینہ شریعۃ بیضاء بجند الملائکۃ اتی۔ یاتی اللہ من جنوب والقدوس من جبل فاران۔ زین السموات الارض بحمد ملئان۔

اُردو ترجمہ

اور کہا خدا سینا سے نکلا اور سعیر سے چمکا اور فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں شریعت روشن ساتھ لشکر ملائکہ کے آیا (توریت کتاب پنجم باب ۳۳-۲)

آئے گا اللہ جنوب سے اور قدوس فاران کے پہاڑ سے آسمانوں کو جمال سے چھپا دیا اُس کی ستایش سے زمین بھر گئی (کتاب حقوق باب ۳-۳)

ان آیتوں میں جو کوہ فاران سے خدا کا ظاہر ہونا اور شریعت کا اُس کے ہاتھ میں ہونا بیان ہوا۔ وہ علانیہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مبعوث ہونے اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی کہ وہی شریعت ہی بشارت ہے۔

یہ بات عرب کے قدیم جغرافیہ سے اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق اور تسلیم سے اور توریت کے محاورات سے بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ مکہ معظمہ کے پہاڑوں کا نام فاران ہے۔ چنانچہ امر مذکورہ کے ثبوت کی کافی دلیلیں ہم بیان کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۸۶۹ء کے کوارٹرلی ریویو میں اسلام پر ایک آرٹیکل چھپا ہے جو ایک بہت بڑے عالم یہودی زبان جاننے والے کا لکھا ہوا ہے۔ اُس کے صفحہ ۲۹۹ میں لکھا ہے کہ سیفر نے اُن خاص

آیتوں کی جن میں سینا اور سعیر اور فاران کی بشارت مذکور ہے اس طرح تشریح کی ہے کہ "خدا سینا سے نکلا" یعنی عبرانی زبان میں شرع دی گئی (جس سے مراد توریت ہے)، اور سعیر سے چمکا یعنی یونانی زبان میں بھی شریعت دی گئی (جس سے مراد انجیل ہے اور مسلمان کل عیسائیوں کو رومی کہتے تھے) اور "فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا اور اُس کے ہاتھ میں شریعت روشن" یعنی عربی زبان میں شریعت دی گئی (جس سے مراد قرآن مجید ہے) پس اس عالم کے قول سے ثابت ہے کہ فاران وہی جگہ ہے جہاں سے مذہب اسلام ظاہر ہوا یعنی حجاز یا مکہ معظمہ۔

چند سطروں کے بعد اسی آرٹیکل کا لکھنے والا پھر لکھتا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سینا اور سعیر اکثر بجائے اسرائیل اور عیسیٰ کے مستعمل ہوتے ہیں اور ادوم بجائے روم کے اور فاران تو صاف عرب کے لئے مستعمل ہے۔ صرف اس میں شبہ ہے کہ مکہ کے گرد کے پہاڑوں کا یہ نام ہے یا نہیں" مگر ہم اس شبہ کو بھی مٹا دیں گے اور قدیم جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت کر دیں گے کہ مکہ کے گرد پہاڑ ہی فاران ہیں۔

توریت کتاب اول باب ۲۱ آیت ۱۴ میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو اپنے پاس سے نکال دیا تو وہ دونوں بیرشبع کے بیابان میں پھرا کئے اور اُسی باب کی اکیسویں آیت میں لکھا ہے کہ بیابان فاران میں ساکن ہوئے۔

قرآن مجید سے بھی حضرت اسمٰعیل کی سکونت بیابان میں معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت اسمٰعیل کے اُس زمانہ کی سکونت کا ذکر ہے۔ جب کہ حضرت ابراہیم اُن کے پاس آئے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر کر کے اُسی کے پاس حضرت اسمٰعیل کی سکونت مستقل طور پر کر دی تھی۔ اور یہ بات توریت سے بھی پائی جاتی ہے کہ پہلے حضرت اسمٰعیل بیابان میں خانہ بدوش تھے۔ پھر بیابان فاران میں سکونت اختیار کی۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی دعا اس طرح پر مذکور ہے کہ "اے خدا میں نے اپنی اولاد میں سے تیرے بزرگ گھر کے پاس بن کھیتی کے میدان میں آباد کیا ہے" لفظ "مدبر" מדבר جو توریت میں عبرانی زبان کا آیا ہے اور لفظ "واد غیر ذی زرع" جو قرآن مجید میں آیا ہے اُن دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ پس توریت مقدس اور قرآن مجید میں یہ بات تو متفق ہے کہ حضرت اسمٰعیل وادی میں آباد ہوئے۔ مگر اس وادی کے نام اور مقام میں بحث

اللھم انی اسکنت ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم (قرآن)

باقی رہی۔ توریت مقدس سے تو اس کا نام فاران معلوم ہوا اور قرآن مجید سے اُس کا مقام وہ معلوم ہوا۔ جہاں کہ اب کعبہ ہے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مکہ معظمہ جہاں کعبہ بنا ہوا ہے وادی فاران میں واقع ہے۔ تو یہ امر بھی متفق علیہ ہو جائے گا۔

اب ہم اس بات سے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے یعنی کعبہ کے پاس حضرت اسمٰعیل کا آباد ہونا اُس سے قطع نظر کرتے ہیں اور جو بات توریت میں ہے اور جس کو یہودی اور عیسائی دونوں تسلیم کرتے ہیں اُسی کو مدار اپنے استدلال کا قرار دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل وادی فاران میں ساکن ہوئے۔

اب ہم کو قدیم جغرافیہ سے اس بات کی تلاش باقی رہی کہ حضرت اسمٰعیل کس جگہ آباد ہوئے تھے۔ کیونکہ جو مقام اُن کی سکونت کا ثابت ہو جائے گا وہی وادی فاران ہو گا۔

اس مطلب کے حل کرنے کے لئے تین سوال قابل غور ہیں:۔

اوّل :۔ یہ کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل اور اُن کی ماں کو گھر سے نکال کر کس مقام پر چھوڑا۔

دوم :۔ یہ کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی ماں بیابان میں پھرنے کے بعد کس مقام پر آباد ہوئیں۔؟

سوم :۔ یہ کہ وہ اسی جگہ رہتی رہیں جہاں انھوں نے پہلی دفعہ سکونت اختیار کی تھی یا کسی اور مقام پر جا رہی تھیں ؟

قرآن مجید میں ان باتوں کا کچھ تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن چند روایتیں اور کچھ حدثیں اس کے متعلق ہیں۔ حدیثوں کا جو اس معاملہ سے متعلق ہیں یہ حال ہے کہ وہ کافی اعتبار کے لائق نہیں اور نہ وہ مرفوع ہیں۔ یعنی اُن کی سند پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) تک نہیں ہے۔ پس وہ بھی مثل روایتوں کے نامعتبر ہیں اور روایتیں تو کسی طرح قابلِ اعتبار رہیں ہی نہیں۔ کیونکہ اُن میں نہایت اختلاف ہے اور مختلف اوقات کے واقعات سب ایک جگہ گڈمڈ کر دیئے ہیں پس پہلے سوال کی نسبت جو کچھ توریت مقدس میں لکھا ہے اُس سے زیادہ لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں اور وہ یہ ہے کہ "حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور اُن کے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو دو روٹیاں اور پانی کی ایک چھاگل دے کر نکال دیا اور وہ بیر شبع کے بیابان میں پھرا کیں" (توریت کتاب اول باب ۲۱ آیت ۱۶)

دوسرے سوال کا جواب اُس مقام کی تحقیق کرنے پر منحصر ہے جہاں حضرت اسمٰعیل آباد ہوئے اور اُس مقام کی تحقیقات کا اس سے زیادہ عمدہ اور قابلِ اطمینان کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ہم پُرانے جغرافیہ پر متوجہ ہوں اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد کے رہنے کے مکانات کے کھنڈروں کی تحقیقات کریں، جہاں وہ ملیں وہی مقام سکونت حضرت اسمٰعیل کا ہوگا اور وہی مقام وادی فاران بھی ضرور ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ وادی فاران میں آباد ہوئے تھے۔

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے تھے:۔

۱۔ نبایوث ۲۔ قیدار ۳۔ ادبئیل ۴۔ بسام ۵۔ مشماع ۶۔ دوما ۷۔ مسا ۸۔ حدر ۹۔ تیما ۱۰۔ یطور ۱۱۔ نافیش ۱۲۔ قیداہ۔

پہلا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا نبایوث عرب کے شمال مغربی حصہ میں آباد ہوا۔ ریورنڈ کارٹری۔ پی کاری ایم۔ اے نے اپنے نقشہ میں اُس کا نشان ۲۸ و ۳۰ درجہ عرض شمالی اور ۳۶ و ۳۸ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ نبایوث کی اولاد عربیا پٹیرا سے مشرق کی طرف عربیا ڈزرٹا تک اور جنوب کی طرف خلیج الاٹنک و حجاز تک پھیل گئی۔

اسٹریبو کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ نبایوث کی اولاد نے اس سے بھی زیادہ ملک گھیر لیا تھا۔ اور مدینہ تک اور بندر حور اور بندر ینبوع تک جو بحرِ قلزم کے کنارہ پر ہے اور مدینہ سے جنوب مغرب میں واقع ہے اُن کی عمل داری ہوگئی تھی۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبایوث کی اولاد صرف پتھریلے میدانوں میں نہیں پڑی رہی بلکہ حجاز اور نجد کے بڑے بڑے ضلعوں میں پھیل گئی۔

ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ نبایوث کی اولاد عرب کے بہت بڑے حصہ میں پھیل گئی ہو۔ الا یہ بات کہ نبایوث کی سکونت اور اُس کی اولاد کی سکونت عرب میں تھی بخوبی ثابت ہے۔

دوسرا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا قیدار نبایوث کے پاس جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں۔ اور زیادہ ثبوت اس کا حال کے جغرافیہ میں شہر الحدر اور بنت سے پایا جاتا ہے جو اصل میں القیدار اور نبایوث ہیں۔ اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اُس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی۔ اُس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد

عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اُسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ یورنیس اور بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ تو میں حجاز کی باشندہ تھیں۔ کیڈری یعنی قیدری دری یعنی مخفف قیدری اور کڈورنائٹ یعنی قیداری کرتی یعنی قیدری چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول صفحہ ۲۴۸ میں مندرج ہے۔ پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد تھا۔

ریورنڈ کارٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶ و ۲۸ درجہ عرض شمالی و ۳۷ و ۳۸ درجہ طول شرقی کے درمیان میں لگایا ہے۔

تیسرا۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا ادبئیل ہے۔ بموجب سند جوزیفس کے ادبئیل بھی اپنے ان دونوں بھائیوں کے ہمسایہ میں آباد ہوا تھا۔

چوتھا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا بسام ہے مگر اُس کی سکونت کے مقام کا پتہ نہیں ملتا۔

پانچواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مشماع ہے۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قیاس صحیح ہے کہ عبرانی میں جس کو مشماع لکھا ہے اُسی کو یونانی ترجمہ سبٹواجنٹ میں مسما اور جوزیفس مسماس و بطلیموس نے مسمیز لکھا ہے اور عرب میں اُسی کی اولاد بنی مسماع کہلاتی ہے۔ پس کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا قریب نجد کے اولاً آباد ہوا تھا۔

چھٹا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا دوماہ کا تھا۔ مشرقی اور مغربی جغرافیہ دان قبول کرتے ہیں کہ یہ بیٹا تہامہ میں آباد ہوا تھا۔ معجم البلدان میں لکھا ہے کہ دومۃ الجندل کا نام واقدی کی حدیث میں دوماہ الجندل آیا ہے اور ابن سقفیہ نے اس کو اعمال مدینہ میں گنا ہے اُس کا نام دوم ابن اسمٰعیل بن ابراہیم کے نام پر موسوم ہوا ہے اور زجاجی کا قول ہے کہ اسمٰعیل کے بیٹے کا نام دومان ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ اسمٰعیل کا ایک بیٹا تھا اس کا نام دما تھا اور شاید اس کے اصلی نام کو بگاڑ دیا ہے اور ابن کلبی کا قول ہے کہ دوماہ اسمٰعیل کا بیٹا تھا اور اسی کا قول ہے کہ جب تہامہ میں حضرت اسمٰعیل کی

دومۃ الجندل ... قد جاء فی حدیث الواقدی دوماہ الجندل وعدھا ابن الستقفیہ من اعمال المدینۃ سمیت بدوم ابن اسمٰعیل بن ابراھیم وقال الزجاجی دومان ابن اسمٰعیل وقیل کان لاسمٰعیل ولد اسمہ دما ولعلہ مغیر منہ وقال ابن الکلبی دوماہ ابن اسمٰعیل قال ولما کثر ولد اسمٰعیل عسر بالتہامۃ خرج دوماہ بن اسمٰعیل حتی نزل موضع دومۃ وبنی لہ حصناً فقیل دوماہ ونصب الحصن الیہ ... قال ابو عبید السکونی دومۃ جندل حصن وقری بین الشام والمدینۃ قرب جبل طے

... دومۃ من القریات من وادی القری بہت سی اولاد ہوگئی تو دوماہ وہاں سے نکلا
(معجم البلدان) اور بمقام دومہ قیام کیا اور وہاں قلعہ بنایا اور

اُس کا نام دوماہ اپنے نام پر رکھا اور ابو عبید سکونی کا قول ہے کہ دوماہ جندل قلعہ اور گاؤں شام اور مدینہ کے درمیان میں ہیں قریب جبل طے کے اور دوماہ وادی قری کے گاؤں میں سے ہے۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اُسی کو تسلیم کرتے ہیں اور اب تک یہ ایک مشہور جگہ عرب میں موجود ہے۔

ساتواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مسا تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں۔ کہ یہ بیٹا مسوپوٹیما میں آباد ہوا مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا جب حجاز سے نکلا تو یمن میں آباد ہوا اور یمن کے کھنڈرات میں اب تک مسا کا نام قایم ہے۔ ریورنڈ کارٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں اس مقام کا نشان ۱۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۲ درجہ اور ۳۰ دقیقہ طول شرقی میں قایم کیا ہے۔

اسمٰعیل اور ان کی تمام اولاد اولاً حجاز میں تھی۔ بلا شبہ جب اولاد جوان ہوئی اور کثرت ہوگئی تب مختلف مقاموں میں جاکر سکونت اختیار کی۔ مگر عمدہ بات قابل غور یہ ہے کہ سب کا پتہ عرب ہی میں یا حجاز کے آس پاس پایا جاتا ہے۔

آٹھواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا حدود تھا اور عہد عتیق میں حداد بھی اُس کا نام ہے۔ یمن میں شہر حدیدہ اب تک اسی کا مقام بتلا رہا ہے۔ اور قوم حدیدہ جو یمن کی ایک قوم ہے اُسی کے نام کو یاد دلاتی ہے۔ زہیری مؤرخ کا بھی یہی قول ہے اور ریورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا تیما تھا۔ اُن کی سکونت کا مقام نجد ہے اور بعد کو رفتہ رفتہ خلیج فارس تک پہنچ گئے۔

دسواں۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا یطور ہے۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں۔ کہ اس کا مسکن حدور میں تھا جو جبل کیسرنی کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق میں واقع ہے۔

گیارھواں۔ بیٹا حضرت اسمٰعیل کا نافیش تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر توریت اور جوزیفس کی سند سے لکھتے ہیں کہ عربیا ڈزرٹا میں ان کی نسل اسی نام سے آباد تھی۔

بارھواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا قیدماہ تھا۔ انھوں نے بھی یمن میں سکونت اختیار کی تھی ریورنڈ

مسٹر فارسٹر نے خیال کیا ہے کہ قیدماہ کاظمہ میں آباد ہوا تھا جو خلیج فارس پر ہے اور جس کا تذکرہ ابوالفدا نے کیا ہے۔ مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے۔

مسعودی نے صاف لکھا ہے کہ اصحاب الرس اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے اور وہ دو قبیلے تھے۔ ایک کو قدمان کہتے تھے اور دوسرے کو یامین اور بعضوں کے نزدیک رعویل اور یہ یمن میں تھے۔

اصحاب الرس کانوا من ولد اسمٰعیل وھم قبیلتان یقال لاحدھما قدمان وللاخریٰ یامین وقیل رعویل وذلک بالیمن (مروج الذھب مسعودی)

اب اس تحقیقات سے جو جغرافیہ کی رو سے نہایت قابلِ اطمینان ہے دو باتیں ثابت ہوگئیں۔ ایک یہ کہ حضرت اسمٰعیل اور اُن کی تمام اولاد عرب میں آباد ہوئی۔ دوسرے یہ کہ مرکز اس خاندان کی آبادی کا حجاز تھا جہاں اسمٰعیل کی مقدم اولاد کا مسکن ہوا تھا اور پھر اُس مرکز سے اور طرف عرب میں پھیلی۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت اسمٰعیل نے حجاز میں سکونت اختیار کی تھی اور اسی کا قدیم نام فاران ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت حبقوق نے اپنی بشارتوں میں بتایا ہے۔

توریت سامری کا عربی ترجمہ جس کو آرکیونن نے ۱۸۵۱ء میں بمقام گلدوتی نیا درم چھاپا فاران کو حجاز تبلایا ہے۔ چنانچہ اُس ترجمہ کی بعینہٖ یہ عبارت ہے :-

"وسکن بریہ فران (الحجاز) واخذت لہ امہ امرۃ من ارض مصر" (عربی ترجمہ توریت سامری)، لفظ حجاز جو دو ہلالی خطوں میں ہے مترجم نے اسی طرح لکھا ہے۔

اگرچہ یہ بات نہایت صفائی سے ظاہر ہے کہ وادی حجاز اور وادی فاران دونوں ایک ہیں اور اسمٰعیل کے خاندان کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اُس کی گواہی دے رہے ہیں۔ مگر بایں ہمہ عیسائی اس کو تسلیم نہیں کرتے اور موقع فاران کی نسبت مفصلہ ذیل تین رائیں قرار دیتے ہیں۔

اوّل۔ یہ کہ اُس وسیع میدان کو جو بیرشبع کی شمالی حد سے کوہ سینا تک پھیلا ہوا ہے فاران کہتے ہیں اور اُس کی حد عموماً اس طرح پر قرار دیتے ہیں۔

حد شمالی۔ کنعان	حد جنوبی۔ کوہ سینا
حد غربی۔ ملک مصر	حد شرقی۔ کوہ سعیر

اور کہتے ہیں کہ اس حد میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی وادی علیحدہ علیحدہ نام سے شامل ہیں۔ مثلاً شور۔ بیرسفع۔ اتھان۔ سیناسن۔ زن وادیم وغیرہ۔

دوسرے۔ یہ کہ قادیش جہاں حضرت ابراہیم نے کنواں کھدوایا جس کا نام بیرشبع تھا اور فاران

دونوں ایک ہیں۔

تیسرے۔ یہ کہ فاران اُس وادی کو کہتے ہیں جو کوہ سینا کے مغربی نشیب پر واقع ہے اور جہاں بہت سی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اور پرانی قبریں اور مینار وغیرہ اب تک موجود ہیں مسٹر روبر کا بیان ہے کہ اس مقام پر ایک ٹوٹا ہوا گرجا ملا جو حضرت عیسٰی کے بعد پانچویں صدی کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اُن کا قول ہے کہ چوتھی صدی میں اُس مقام پر عیسائی رہتے تھے اور ایک بشپ بھی وہاں رہتا تھا۔

ہماری رائے میں یہ تینوں توجیہیں محض غلط ہیں اور کسی طرح توریت مقدس کے بیان کے مطابق نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم ان تینوں توجیہوں کی تردید کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ تینوں توجیہیں نہایت مختصر تقریر سے رفع ہو سکتی ہیں کہ جب ان مقاموں میں حضرت اسمٰعیل یا اُن کی اولاد کے رہنے کا کوئی نشان تک نہیں ہے تو پھر کیونکر وہ مقام فاران تصور ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم اس سے قطع نظر کرکے ہر ایک توجیہ کی جدا جدا تردید بیان کریں گے۔

توجیہ اوّل کی تردید

پہلی توجیہ کا منشا یہ ہے کہ فاران ایک بہت بڑی وادی ہے اور اُس میں شور و سینا وغیرہ سب داخل ہیں۔ اس توجیہ کی تردید کے لیے توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دینی کافی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فاران ایک مستقل اور جداگانہ وادی ہے اور اور وادیوں سے مل کر نہیں بنا ہے۔

۱۔ توریت کتاب چہارم باب ۱۰ آیت ۱۲ میں لکھا ہے "بنی اسرائیل نے ..... بیابان سینی سے کوچ کیا اور بادل بیابان پاران میں ٹھہر گیا" پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بیابان سینی ایک جدا بیابان اور پاران جدا بیابان ہے۔

۲۔ توریت کتاب اول باب ۱۴ آیت ۶ میں لکھا ہے کہ "کدر لاعومر نے حوریوں کو پہاڑ سعیر میں ایل فاران تک جو صحرا کے نزدیک ہے مارا" پس اس آیت سے ثابت ہے کہ سعیر جدا ہے اور وادی پاران علیحدہ ہے۔

۳۔ توریت کتاب چہارم باب ۱۲ آیت ۱۶ و باب ۱۳ آیت ۱۷ و باب ۱۳ آیت ۳ میں لکھا ہے کہ "بنی اسرائیل حصیروت سے چلے اور بیابان فاران میں ٹھہرے اور وہاں سے زمین کنعان کی تلاش کو سرداران قوم روانہ کیے" اس سے صاف ثابت ہے کہ حصیروت سے آگے فاران اور اُن

سب وادیوں سے علیحدہ وادی ہے۔

۴۔ پھر اسی کتاب کے باب ۱۳ آیت ۲۵ و ۲۶ میں لکھا ہے کہ " وہ سرداران کنعان کو دیکھکر پھرے تو بیابان فاران میں سے قادیش میں پہنچے "۔ پس کنعان سے مراجعت کرتے وقت پہلے بیابان فاران پڑتا ہے اور پھر قادیش اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ قادیش جہاں ابراہیم نے بیرشبع بنایا اور بیابان فاران باہم پیوستہ ہیں۔ قادیش شمالی سرحد فاران پر واقع ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بیرشبع ابراہیم والا اور قادیش ایک ہیں۔ اس لئے کہ وہ قادیش میں بنایا گیا تھا اور اسحاق نے جو بیرشبع بنایا وہ علیحدہ اور قریب فلسطین کے واقع ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ خیال میں رکھنا ضرور ہے۔

یہ دونوں آیتیں توریت اور کتاب حبقوق نبی کی جن میں ہمارے پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بشارتیں مندرج ہیں اور جن پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ ان سے بھی ظاہر ہے کہ فاران و سعیر سب علیحدہ علیحدہ مقام ہیں۔

۵۔ کتاب اول سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۸ میں ہدد اور اس کے ہمراہیوں کے مصر میں جانے کے حال میں لکھا ہے کہ " وہ مدیان سے نکلے اور فاران میں آئے اور وہاں سے آدمی ساتھ لے کر مصر کو گئے " مدیان وہ شہر ہے جس کو عرب میں مدین کہتے تھے اور ساحل بحر قلزم پر جو حجاز کی جانب ہے تبوک سے تخمیناً چھ منزل جانب جنوب واقع ہے اور یہ شہر عین وادی فاران میں واقع تھا جو ٹھیک حجاز ہے۔ اس سے دو مطلب ایک حجاز اور وادی فاران کا متحد ہونا دوسرے وادی فاران کا ایک مستقل جدا وادی ہونا ثابت ہوتے ہیں۔

توجیہ دوم کی تردید

دوسری توجیہ یہ تھی کہ فاران اور وادی قادیش دونوں ایک ہیں۔ اس توجیہ کی تردید میں بھی توریت کی چند آیتیں لکھی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وہ دونوں الگ الگ مقام ہیں۔

۱۔ توریت کتاب اول باب ۱۴ آیت ۶، ۷ میں لکھا ہے کہ " کدر لاعومر نے حوریوں کو پہاڑ سعیر میں ایل فاران تک جو صحرا کے نزدیک ہے مارا اور وہاں سے پھر کر عین مشپاط میں جو قادیش ہے آئے "۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ پاران اور قادیش دونوں علیحدہ ہیں متحد نہیں۔

۲۔ توریت کتاب چہارم باب ۱۳ آیت ۲۶ میں لکھا ہے کہ " وہ سردار جو حضرت موسیٰ نے بھیجے

تھے از طرف فاران قادیش میں پہنچے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قادیش و فاران جدا جدا دو مقام ہیں۔

آیت جس کا ہم نے ذکر کیا اُس کے ترجمے میں لوگوں نے کسی قدر غلطی کی ہے۔ اس لئے ہم اس آیت کو معہ ترجمہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

וַיֵּלְכוּ וַיָּבֹאוּ אֶל-מֹשֶׁה וְאֶל-אַהֲרֹן וְאֶל כָּל-עֲדַת בְּנֵי-יִשְׂרָאֵל
אֶל-מִדְבַּר פָּארָן קָדֵשָׁה:

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے:۔

وَيِيلْخُو وَيَّابُؤُ اِلْ مُوشِه وَاِلْ اَهَارُوْنَ وَاِلْ كُلْ عَدَتْ بِنِي اِسْرَائِيل اِلْ مِدْبَرْ پَارَانْ
قَادِيشَه۔

عربی ترجمہ

ورحلوا وجاؤا الی موسٰی والی ہارون والی کل جماعۃ بنی اسرائیل الی بریہ فاران بالقادس۔

اُردو ترجمہ

اور کوچ کیا اور آئے موسٰی اور ہارون اور تمام جماعت بنی اسرائیل کی پاس طرف میدان فاران کے قادیش میں۔

انقلس نے اس مقام پر قادیش کو مقام نہیں خیال کیا بلکہ اُس کے معنی نائل کے لئے ہیں یعنی فاران میں واپس آئے بہ تیلِ مرام پس اگر یہ معنی لے جائیں تو اس آیت سے قادیش اور فاران کے ایک ہونے پر کسی طرح استدلال نہیں ہوسکتا۔

توجیہ سوم کی تردید

تیسری توجیہ یہ ہے کہ پاران کوہ سینا کے مغربی نشیب میں واقع ہے۔ جہاں کھنڈرات بھی پائے گئے ہیں۔ یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ ہم اُس بیان کے وجود سے جو کوہ سینا کے نشیب میں واقع ہے انکار نہیں کرسکتے۔ مشرقی جغرافیہ والوں کی تحریروں سے ثابت ہے کہ تین مقام فاران کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک کوہستان حجاز یعنی مکہ معظمہ اور ابو نصر بن قاسم بن قضاعۃ القضاعی الفاراالاسکندری جو حجاز کا رہنے والا تھا وہ حجاز ہی کے رہنے کے سبب فارانی کہلاتا تھا۔ دوسرا فاران کوہ طور یا سینا

کے پاس تھا اور تیسرا فاران نواح سمرقند میں واقع تھا چنانچہ یہ تفصیل کتاب مشترک یاقوت حموی میں لکھی ہے۔

جو فاران کہ نواح سمرقند میں تھا وہ تو بحث سے خارج ہے صرف اُس فاران سے بحث ہے جو کوہ سینا کے مغربی نشیب میں واقع ہے۔ مگر اُس کی نسبت اس قدر اور تحقیقات کرنی باقی ہے کہ آیا اس مقام پر فاران حضرت ابراہیم کے بلکہ حضرت موسیٰ کے وقت میں تھا یا نہیں۔ اور یہ وہی وادی ہے جس کا ذکر توریت میں ہے اور جہاں بیرشبع کے بیابان میں پھرنے کے بعد حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ نے قیام کیا تھا۔ اور یہ وہی مقام ہے جہاں اسمٰعیل کی اولاد آباد ہوئی۔ ان باتوں میں سے ایک بھی ثابت نہیں بلکہ اس کے برخلاف ثابت ہے جیسا کہ اگلی بحثوں میں بیان ہو چکا۔ مگر باایں ہمہ جو دلیلیں عیسائیوں نے اس فاران کی نسبت لکھی ہیں اور جس کو ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے ایک نہایت عمدگی اور غور سے جمع کر دیا ہے اُن سب کی ہم تردید بیان کرتے ہیں تاکہ بحث بخوبی پوری ہو جائے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ "توریت کتاب اول باب ۲۵ و آیت ۱۷ میں لکھا ہے "کہ اسمٰعیل کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو اشور کو جاتے ہوئے مصر کے برابر پڑتا ہے آباد ہوئی' اس آیت کو لکھ کر وہ کہتے ہیں کہ "اقرار خدا کا پورا ہو گیا کہ بنی اسمٰعیل شور سے حویلاہ تک یعنی عرب میں مصر کے کنارہ سے دریائے فرات کے موہانہ تک پھیل گئی۔

پہلی غلطی اس مصنف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دریائے فرات کے موہانہ پر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مقام جس کا بانی حویلاہ ہے اور جس کا نام توریت کتاب اول باب ۱۰ آیت ۲۹ میں آیا ہے یمن کے قریب واقع ہے۔ چنانچہ ریورنڈ کارٹری پی کاری ایم۔ اے کے نقشہ میں اُس کا نشان ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۳ درجہ ۳۰ دقیقہ طول شرقی پر لگایا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دوسری غلطی اس مصنف کی یہ ہے کہ وہ شور کو عربیا پٹیریا کے مغرب میں بتاتے ہیں اور یہ صریح غلطی ہے۔ کیونکہ شور کے بیابان سے وہ وسیع میدان بتایا جاتا ہے جو سریا کے جنوب سے مصر تک پھیلا ہوا ہے۔

توریت کی جس آیت کا ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے ذکر کیا یعنی کتاب اول باب ۲۵ آیت ۱۸ اُس میں دو لفظ ہیں שוּר شور אַשּׁוּרָה اشورہ اور کسی نام کے ساتھ لفظ بیابان کا نہیں ہے شور کا نام حال میں سریا ہے اور کچھ شک کا مقام نہیں ہو سکتا کہ حال کا نام اشورہ کا اُس سریا' ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اسمٰعیل کی اولاد اُس قطعہ زمین میں آباد ہوئی جو یمن کی شمالی سرحد سے سریا کی جنوبی سرحد تک ہے۔ اور یہی امر مطابق واقع کے بھی ہے اور توریت مقدس کے

بیان کے بھی مطابق ہے۔ اور اسی مقام میں اسمٰعیل کی اولاد کی آبادیوں کے نشان ملتے ہیں اور یہی ٹکڑا ان بن کا حجاز کہلاتا ہے اور اسی کا قدیم نام فاران تھا اور یہ ہمارا بیان اس بات سے اور زیادہ صحیح ہو جاتا ہے کہ جو مسافر وہاں سے اس سریا کو جاتا ہے تو ٹھیک مصر سامنے ہوتا ہے جیسا کہ توریت مقدس میں لکھا ہے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر سینٹ پال کے خط سے جو گلیشین کے نام لکھا تھا۔ ایک نیا نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ کوہ سینا اور ہاجر متحد ہیں۔ مگر یہ بھی سرتاسر غلطی ہے۔ ہم سینٹ پال کے خط کی وہ عبارت لکھتے ہیں اور پھر اس کا مطلب بیان کر کے ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی غلطی بتاتے ہیں۔

سینٹ پال کے خط کی یہ عبارت ہے " تم جو شریعت کے تابع ہوا چاہتے ہو، کیا تم نہیں سنتے کہ شریعت کیا کہتی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے ایک لونڈی سے دوسرا بیوی سے جو لونڈی سے ہوا تھا جسمانی طور پر پیدا ہوا اور جو بیوی سے تھا سو وعدہ کے طور پر پیدا ہوا۔ یہ باتیں تمثیلیں ہیں اس لئے کہ یہ دو عہد ہیں۔ ایک تو سینا پہاڑ ہے جس سے نرے غلام پیدا ہوتے ہیں اور یہ ہاجرہ ہے۔ کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا اور یہاں کے یروشلم کا جواب ہے جو اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کی یروشلم آزاد ہے سو یہی ہم سب کی ماں ہے " (نامہ سینٹ پال بنام گلیشین باب ۴ آیت ۲۱ لغایت ۲۶)

اس مقام پر جو یہ لفظ آیا ہے کہ " یہ ہاجرہ ہے " اس سے اس بات پر کہ کوہ سینا اور ہاجرا ایک ہے استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ اس مقام پر امر مذکور بیان نہیں ہوا بلکہ سارا بیان بطور تمثیل کے ہے۔

سینٹ پال اُن لوگوں کو جنھوں نے صرف ظاہری احکام شریعت کی پابندی اختیار کی تھی اور اُس کے نتیجہ یعنی روحانی نیکی کو بالکل چھوڑ دیا تھا اُن کو نصیحت کرتے ہیں۔ یہ بات یہودیوں میں مشہور تھی کہ حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت اسمٰعیل لونڈی سے (گو کہ یہ امر غلط ہے۔ مگر یہ مقام اس کی بحث کا نہیں ہے) دوسرے حضرت اسحٰق بیوی سے۔ اور یہ بھی مشہور تھا کہ حضرت اسمٰعیل تو جسمانی ہیں اور حضرت اسحٰق روحانی جو بموجب وعدہ کے پیدا ہوئے ہیں۔ اب سینٹ پال حضرت اسحٰق کی اولاد یعنی بنی اسرائیل کا بھی جسمانی ہونا اور صرف عیسائیوں کا روحانی بیٹا ہونا بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے کہتے ہیں

کہ جسمانی اور روحانی ہونا یہ تو تمثیلیں ہیں حقیقت میں یہ دو عہد ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ایک تو کوہ سینا سے ہے۔ جس سے بنی اسرائیل اسحٰق کی اولاد مراد ہیں۔ مگر اس عہد سے بھی غلام ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی صرف ظاہری شریعت میں پڑے ہوئے۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ "یہی ہاجرہ ہے" یعنی یہی معنی لونڈی کی اولاد ہونا ہے اور اس کی دلیل میں بیان کرتے ہیں کہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور یروشلم کا جواب ہے۔ جو یعنی یروشلم اپنے لڑکوں یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ غلامی میں ہے۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ روحانی یروشلم کا ہم کو بیٹا ہونا چاہیے اور مثل لونڈی کی اولاد کے غلامی کی حالت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ پس اس مقام سے ہاجرہ اور کوہ سینا کا ایک ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کوہ سینا سے علیحدہ عرب (حجاز) میں تھیں جن کو تمثیلاً عرب کا سینا بیان کیا ہے اور یروشلم کا مقابل۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر کتاب اول تواریخ ایام کی آیت ۹ و ۱۰ کی سند پر بیان کرتے ہیں کہ ہگری یعنی بنی ہاجرہ کنارہ دریائے فرات زمین گلعاد میں ساکن تھے اور وہاں چند آبادیوں کے ایسے نام بھی تلاش کیے ہیں جو بنی اسمٰعیل کے ناموں کے مشابہ یا مطابق ہیں۔

مگر اس کہنے سے کیا فائدہ ہے۔ بلاشبہ زمانہ کے دور میں بنی اسمٰعیل حجاز میں سے نکلے اور تمام عرب میں خلیج فارس تک پھیل گئے۔ فاران کی تحقیقات میں اُس مقام کو تلاش کرنا چاہیے جہاں حضرت اسمٰعیل آباد ہوئے سو وہ ثابت ہو گیا کہ حجاز میں اور گرد مکہ کے آباد ہوئے۔ پس وہی مقام فاران ہے۔ بعد کو وہ کتنی دور تک ملکوں میں پھیل گئے ہوں اُس سے کچھ بحث نہیں ہے۔

جو فاران کوہ سینا کے مغربی نشیب میں ہے اور جس کے کھنڈرات ملے ہیں وہ توریت کا فاران نہیں ہے اور حضرت موسیٰ کے زمانہ تک اُس کا وجود نہ تھا حضرت موسیٰ جب مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اور انھوں نے بحر احمر کی غربی شاخ کی نوک کو پار کیا جس کے پانی کو بہ سبب سمندر کے جذر کے خدا نے ہٹا دیا تھا۔ شور کے جنگل میں پہنچے اور جب سن کے جنگل کو طے کیا اور افیدم میں مقام ہوا تو وہاں عمالیق آئے اور موسیٰ سے لڑے۔ چنانچہ یہ سب حال توریت کتاب دوم باب ۱۷، آیت الغایت ۸ میں مندرج ہے۔ ان آیتوں میں جو یہ لفظ مندرج ہیں کہ "عمالیق آن کر لڑے" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمالیق افیدیم کے باشندے نہ تھے اور کیونکر ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ مقام محض بے آب تھا۔ مگر اس مقام پر اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ افیدیم کوہ سینا کے مغرب میں یعنی شرقی مصر میں واقع ہے۔

اب یہاں سے حضرت موسیٰ مشرق کی طرف یعنی کوہ سینا کی طرف چلے اور بیابان کوہ سینا میں پہنچ گئے اور اس سفر میں وہ مقام فاران جس کا غربی کوہ سینا میں واقع ہونا بیان کیا جاتا ہے گذر گیا اور حضرت موسیٰ نے اُس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔

اب بنی اسرائیل کوہ سینا سے آگے بڑھے اور شمال مشرق کو چلے اس راہ میں حضرت موسیٰ فرماتے ہیں کہ "بنی اسرائیل بیابان سے نکلے اور بادل بیابان فاران میں ٹھیر گیا (توریت کتاب چہارم باب ۱۰ آیت ۱۲)

پس اب بخوبی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں بیابان فاران جانب شمال و شرق کوہ سینا کے تھا جو قریب قادیش کے واقع ہے اور وہی بیابان حجاز کا ہے نہ غربی نشیب کوہ سینا کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب العاربہ کی ایک قوم جو اولاد میں فاران بن عوف بن حمیر کے تھی اور جو بنی فاران کے نام سے کہلاتی تھی کسی زمانہ میں وہاں جا کر بسی ہوگی اور اس سبب سے وہ مقام فاران مشہور ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ فاران ہرگز وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر توریت میں ہے۔

تمام مشرقی مؤرخ اور جغرافیہ داں اس بات پر متفق ہیں کہ جو کوہستان حجاز میں واقع ہیں۔ وہی فاران ہیں۔ اُن کے اس قول کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ حمیر جو عرب کا بادشاہ تھا اُس کا بیٹا عوف تھا جو نجد میں تھا اور جس کے نام سے کوہستان نجد معروف ہیں جیسا کہ کتاب مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع میں لکھا ہے اور تاریخ ابوالفدا سے ثابت ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا اور نہایت قیاس غالب ہے کہ متصل نجد کے جو زمین و کوہستان حجاز کے واقع ہیں وہ اس فاران کے نام سے موسوم ہوئے۔ مگر جو کہ اُس مقام پر ایک اور نامی اور متبرک چیز یعنی کعبہ معظمہ قائم ہو گیا اس سبب سے بجائے پہلے نام فاران سے مکہ یا کعبہ کا نام مشہور ہو گیا۔ فاران ۱۹۷۰ دنیوی میں تھا یعنی حضرت موسیٰ سے ۵۴۳ برس پیشتر پس اسی فاران کا نام حضرت موسیٰ کی کتاب میں آیا ہے۔ جہاں سے شریعت کے ظاہر ہونے اور خدا کے چمکنے کی بشارت دی گئی تھی جو خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے اور قرآن مجید کے نازل ہونے سے پوری ہوئی۔

عوف بفتح اوله وسکون ثانیه وآخره فاء جبل بنجد ... وعوق بالفتح ایضاً فی دیار غطفان بین نجد وخیبر (مراصد الاطلاع)

اب باقی رہ گیا تیسرا سوال اور وہ یہ تھا کہ حضرت اسمٰعیل جہاں رہتے تھے وہاں سے کسی دوسری جگہ تو نہیں جا رہے۔ اس بات کو کوئی بھی مؤرخ کیا عیسائی اور کیا یہودی اور کیا مسلمان

نہیں بیان کرتا کہ حضرت اسمٰعیل نے مقام سکونت کو تبدیل کیا تھا۔ پس کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہی ملک حجاز جہاں حضرت اسمٰعیل نے اول سے آخر تک سکونت اختیار کی تھی فاران ہے جس کا ذکر حضرت موسٰی کی کتاب میں آیا ہے۔

بشارت چہارم

حضرت سلیمان اپنے محبوب سے ملنا چاہتے ہیں اور جب نہیں مل سکتے تو خدا تعالیٰ کی مناجات اور اپنے محبوب کی تعریف اس طرح پر کرتے ہیں۔

דודי צח ואדום דגול מרבבה׃ ראשו כתם פז קוצותיו תלתלים
שחרות כעורב׃ עיניו כיונים על-אפיקי מים רחצות בחלב ישבות
על-מלאת׃ לחיו כערוגת הבשם מגדלות מרקחים שפתותיו
שושנים נטפות מור עבר׃ ידיו גלילי זהב ממלאים בתרשיש מעיו
עשת שן מעלפת ספירים׃ שוקיו עמודי שש מיסדים על-אדני-פז
מראהו כלבנון בחור כארזים׃ חכו ממתקים וכלו מחמדים (محمد یم)
זה דודי וזה רעי בנות ירושלם׃

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

دُودِی صَح وِادُوم دَغُول مِرِبَابَہ رُوشُو کِتِم پَاز قِصُو تَاوُتَلْتَلِیم شِحُو رُوت کِعُودِیب عَنَاو کِیُونِیم عَلْ اَفِیقِی رُحصُوت بحالاب یُوشِبُوت عَلْ مِلِیت: لِحَایَاوُ کعرونغت ھبِسم مِغدِلُوت مِرقَاحِیم سِفتُوتَاوُ شُوشَنِیم نُطَافُوت مُور عُوبِیر یَادَاوُ گِلِیلِی زَاھَاب مِمُلَّائِیم بَتَرشِیش مِعَاوُ عِشِت شِین مُعَلِفت سَپِیرِیم شُوقَاوُ عَمُودِی شِیش مِیُسَادِیم عَلْ اَدَنِی پَاز مَرِیمُو کَلِبَانُون بَاحُود کَارَازِیم: حِکُو مَمتَقِیم وِخلُو مُحَمَّدِیم زہ دُودِی وزہ رِعِی بُوت یروشَلَایِم

عربی ترجمہ

حبیبی ضحٌ ادمات سید بین الاف تصتہ متلتلہ حالک کا لغراب راسہ لامعۃ الالماس عیونہ کحمامۃ علی عین الماء مغسولہ بالحلیب قائمۃ الخیام غدارہ صلابۃ الطیب کمعراج التمام شفتاہ وردتقطر مرابطنہ صحیفۃ العاج مرصص بالدرد یداہ مصوغتان من الذھب مملوتان

بالجوھر سیقانہ اعمدۃ الرخام موسسۃ علی قواعد اللئالی سورتہ تمراء شاب کالصنوبر حنکۃ حلو وکلہ محمدیم ھذا خلیلی وذا حبیبی بنات اورشلیم۔

اُردو ترجمہ

میرا دوست نورانی گندم گون ہزاروں میں سردار ہے۔ اس کا سر ہیرے کا سا چمکدار ہے اُس کی زلفیں مسلسل مثل کوے کے کالی ہیں۔ اُس کی آنکھیں ہیں جیسے پانی کے کنڈل پر کبوتر دودھ میں دھلی ہوئی۔ نگینہ کی مانند جڑی ہیں۔ اُس کے رخسارے ایسے ہیں جیسے مٹی پر خوشبودار بیل چھائی ہوئی اور چھلکے پر خوشبو رگڑی ہوئی اُس کے ہونٹ پھول کی پنکھڑیاں جن سے خوشبو ٹپکتی ہے۔ اُس کے ہاتھ ہیں سونے سے ڈھلے ہوئے اور جواہر سے جڑے ہوئے اُس کا پیٹ جیسے ہاتھی دانت کی تختی جواہر سے لپی ہوئی اُس کی پنڈلیاں ہیں جیسے سنگ مرمر کے ستون کے بیٹھکی پر جڑے ہوئے اُس کا چہرہ مانند مہتاب کے جوان مانند صنوبر کے اس کا گلا نہایت شیریں اور وہ بالکل "محمدیم" یعنی تعریف کیا گیا ہے۔ یہ ہے میرا دوست اور میرا محبوب اے بیٹیوں یروشلیم کی (کتاب تسبیحات سلیمان باب ۵ آیت ۱۰ لغایت ۱۶)

اگرچہ اس مقام پر حضرت سلیمان نے خدا کی تسبیح میں گیت گایا ہے اور اُس کی مناجات کی ہے مگر ضرور وہ ایک کسی بڑے شخص قابل تعظیم وادب کے آنے کے متوقع ہیں اور اس کی بشارت دیتے ہیں اور اُسی کو اپنا محبوب بتاتے ہیں اور اپنے محبوب کی شاعرانہ تعریف کرتے ہیں اور پھر صاف بتاتے ہیں کہ وہ میرا محبوب (محمد) ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

محمدؐ کے معنی تعریف کئے گئے ہیں پس حضرت سلیمان نے اپنی مناجات میں اپنے محبوب کی تعریف کرتے کرتے اُس کا نام ہی لے دیا کہ اگر اس کے معنی لو تو وہ بھی ایک لفظ تعریف ہے۔ ورنہ وہ صاف صاف نام تو ہے ہی۔

یہ مقام ایسا ہے جس میں صاف نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بتا دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے خطبہ کے پڑھنے والوں کے دل میں شبہ جائے گا کہ اگر یہ نام بتانا تھا تو محمدؐ کہا ہوتا محمدیم کیوں کہا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عبرانی زبان میں یے اور میم علامت جمع کی ہے اور جب کوئی بڑے قدر کا شخص اور عظیم الشان ہوتا ہے تو اُس کے اسم کو بھی جمع بنا لیتے ہیں جیسا کہ خدا کا نام الوہ ہے اُس کی جمع الوہیم بنالی ہے اور اسی طرح بعل جو ایک بت کا نام تھا جس کو نہایت عظیم الشان سمجھتے تھے اُس کی جمع

بعلیم بنائی تھی اور یہی قاعدہ اسم استروث میں لگایا گیا ہے جو دوسرے بت کا نام ہے۔ پس اسی طرح اس مقام پر بھی حضرت سلیمان نے بہ سبب ذی قدر اور عظیم الشان ہونے اپنے محبوب کے اُس کے نام کو بھی صیغہ جمع کی صورت میں بیان کیا ہے اور سچ ہے محمد سے زیادہ کون شخص محمد یسم کہلانے کا مستحق ہے پس یہ ایسی بشارت ہے جس میں صاف صاف نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔

بشارت پنجم

حجی نبی ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دیتے ہیں۔

וְהִרְעַשְׁתִּי אֶת־כָּל־הַגּוֹיִם וּבָאוּ חֶמְדַּת כָּל־הַגּוֹיִם וּמִלֵּאתִי
אֶת־הַבַּיִת הַזֶּה כָּבוֹד אָמַר יְהוָה צְבָאוֹת

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے:۔

وهِرْعَشْتِي اِتْ كُلْ هگُوْيِم وَبَاؤُ حِمْدُتْ كُلْ هگُوْيِم ومِلّتِي اِتْ هَبّايِتْ هَزِه كَابُوْد أمَرْ يَهْوَا صِبَاؤُتْ۔

عربی ترجمہ

وازلزل الامم کلھا وحمد جمیع الامم تجئی واملاھذا البیت محمدا قال رب الخلائق۔

اُردو ترجمہ

سب قوموں کو ہلادوں گا اور حمد سب قوموں کا آوے گا اور اس گھر کو بزرگی سے بھردوں گا کہا خداوند خلائق نے (کتاب حجی نبی باب ۲ آیت ۷)

اس آیت میں لفظ (حمدث) جو آیا ہے اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بشارت نکلتی ہے ریورنڈ مسٹر پارک ہرسٹ حمد کے مادہ کی نسبت کہتے ہیں کہ "ہر قسم کی پاک چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے" اسی مادہ سے محمد اور احمد اور حامد اور محمود ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک نکلے ہیں اور اس بشارت میں لفظ حمدث کے کہنے سے صاف اشارہ ہے کہ جس شخص کے مبعوث ہونے کی اس میں بشارت ہے وہ ایسا شخص ہے کہ اُس کا نام حمد کے مادہ سے مشتق ہے اور وہ کوئی

نہیں سوائے محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

عیسائی مذہب کے پادری خیال کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کے مبعوث ہونے کی ہے مگر یہ خیال دو وجہ سے صحیح نہیں اول اس لئے کہ حضرت متی نے جس قدر بشارتیں عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ کی کی ہیں اُن سب کو بالتفصیل اپنی انجیل میں لکھا ہے کیونکہ وہ انجیل عبرانی زبان میں یہودیوں کی ہدایت کے لئے لکھی گئی تھی اور اسی سبب سے تمام بشارتیں جو توریت و زبور و صحف انبیاء میں حضرت عیسیٰ کی نسبت تھیں اُن سب کو حضرت متی نے لکھا تھا مگر اس بشارت کا ذکر حضرت متی نے نہیں کیا۔ اگر یہ بشارت حضرت عیسیٰ سے متعلق ہوتی تو ضرور حضرت متی اُس کا ذکر کرتے۔

دوسرے یہ کہ حمد کے مادہ سے حضرت عیسیٰ کے نام پر کسی طرح اشارہ نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ اشارہ خاص اُسی شخص کے نام کا ہے جس کا نام اُسی مادہ سے مشتق ہوتا ہے اور اس لئے بشارت حضرت عیسیٰ کی نہیں ہے، بلکہ اُس کی بشارت ہے جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے بشارت دی تھی کہ "یاتی من بعدی اسمہ احمد"۔

گاڈفری ہیگنس نے بھی اپنی کتاب میں باستدلال قول ریورنڈ پارک ہرسٹ صاحب کے لکھا ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی نہیں ہو سکتی بلکہ اُس شخص کی ہے جس کے آنے کی بشارت خود حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔

بشارت ششم

حضرت اشعیاہ نبی وحی کے رو سے اُن لوگوں کا ذکر جو خدا کی سچی پرستش از سرنو قایم کریں گے اس طرح پر کرتے ہیں۔

וְרָאָה רֶכֶב צֶמֶד פָּרָשִׁים רֶכֶב חֲמוֹר רֶכֶב גָּמָל וְהִקְשִׁיב קֶשֶׁב

רַב־קָשֶׁב׃

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے:۔

وِرا ئاہ رِخب صِمِد پارَشیم رِخب حمور رِخب گامال وھِقشیب قِشب رَب قاشِب۔

عربی ترجمہ

ورائی مرکب الفارسین راکب حمار راکب جمل والتفت التفاتا جیدا۔

اُردو ترجمہ

اور ایک جوڑی سواروں کی دیکھی ایک سوار گدھے کا اور ایک سوار اونٹ کا اور خوب متوجہ ہوا (کتاب اشعیاہ نبی باب ۲۱ و آیت ۷)

اس آیت میں حضرت اشعیاہ نبی نے دو شخصوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو خدا کی سچی پرستش از سرِ نو قائم کریں گے۔ اُن میں سے ایک کو گدھے کی سواری کے نشان سے بتلایا ہے اور اُس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اس سے حضرت عیسٰی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جناب ممدوح گدھے پر سوار ہو کر یروشلیم (بیت المقدس) میں داخل ہوئے تھے اور بلاشبہ حضرت عیسٰی نے خدا کی سچی پرستش قائم کی اور یہودیوں نے جو مکاری اور دغابازی سے شریعت کے صرف ظاہری احکام کی ریاکاری سے پابندی اختیار کی تھی اور دلی نیکی اور روحانی پاکیزگی کو بالکل چھوڑ دیا تھا اُس کو بتایا اور سچی پرستش خدا کی قائم کی۔

دوسرے شخص کو اونٹ کی سواری کے نشان سے بتلایا اور اُس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس سے حضرت محمد رسول اللہ کی طرف اشارہ ہے جو عرب کی خاص سواری ہے بچے سے بوڑھے تک اور عالم سے جاہل تک جس سے چاہو پوچھو اونٹ کا نام لیتے ہی عرب کا اشارہ سمجھ جائے گا۔ اور جب رسول خدا صلعم مکہ میں داخل ہوئے تو اونٹ پر سوار تھے اور بلا شبہ محمد رسول اللہ نے خدائے واحد کی پرستش قائم کی حضرت عیسٰی کے بعد جو لوگوں نے حضرت عیسٰی کو خدا کا بیٹا مانا اور تین خدا قایم کرکے پھر تین سے ایک خدا بنایا تھا اور خدائے واحد کی پرستش میں خلل آگیا تھا اُس کو مٹایا اور پھر سے خدا کی سچی پرستش قائم کی۔ اور یوں فرمایا۔ "یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ"۔

بشارات محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انجیل میں سے

بشارت اوّل

عید فسح سے تھوڑی مدت پہلے جب عیسٰی کو معلوم ہوا کہ اب اُن کا وقت بہت قریب آگیا ہے اور اب وہ گرفتار ہونے والے ہیں تو انھوں نے اپنے حواریوں کو بہت سی نصیحتیں کیں اُن ہی

نصیحتوں میں یہ بھی فرمایا کہ" یہ امور میں نے تم سے کہے، جب کہ تمہارے ساتھ ہوں، لیکن پیر بکلیطاس پاک روح جس کو باپ بھیجے گا میرے نام سے ہر بات تم کو سکھا دے گا اور یاد دلا دے گا تم کو تمام وہ باتیں جو نہ میں نے تم سے کہی ہیں (انجیل یوحنا باب ۱۴ - ۲۵، ۲۶)

تاہم میں تم سے سچ کہتا ہوں یہ بھلا ہے تمھارے لئے کہ یہاں سے میں چلا جاؤں کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو پیریکلیطاس تمھارے پاس نہ آئے گا (انجیل یوحنا باب ۱۶ - ۷)

بالفعل جو انجیل کے نسخے موجود ہیں اُن میں لفظ پیریکلیطاس اسی املاسے لکھا ہوا ہے جس طرح کہ ہم نے لکھا ہے مگر ہم مسلمان یہ یقین نہیں کرتے کہ حضرت عیسٰی نے یہ یونانی لفظ بولا تھا کیونکہ اُن کی زبان عبرانی تھی جس میں کالڈی یعنی خالدیہ کے زبان کے لفظ بھی ملے ہوئے تھے عبرانی و خالدی زبانیں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمانوں کا یہ یقین ہے کہ حضرت عیسٰی نے اس مقام پر دیوا فارقلیط کا لفظ فرمایا تھا۔ جیسا کہ بشپ مارش صاحب کی بھی رائے ہے مگر جب انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئیں تب اُس کی جگہ یونانی لفظ لکھا گیا بااین ہمہ ابتدا میں اس لفظ کا ترجمہ ... پیریکلیطاس نہیں کیا گیا۔ جس کے معنی تسلی دینے والے بیان کئے جاتے ہیں، بلکہ اس کا ترجمہ پیریکلیوطاس کیا گیا تھا جو ٹھیک فارقلیط کے لفظ کا ترجمہ ہے اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ٹھیک ٹھیک لفظ احمد ہے بلا شبہ اس بات کا ثبوت کہ یہ لفظ پیریکلیوطاس ترجمہ ہوا تھا اور پیریکلیطاس نہیں تھا۔ ہمارے ذمہ ہے۔ چنانچہ ہم اس کو بتائید روح القدس بخوبی ثابت کریں گے۔ اس لفظ پر بہت بڑے بڑے عالموں نے بحث کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں کے اقوال کا ذکر کرنا شاید کافی ہوگا۔

سرولیم میور صاحب لائف آف محمد جلد اول صفحہ ۱۷ میں ارقام فرماتے ہیں کہ "یوحنا کی انجیل کا ترجمہ جو ابتدا میں عربی زبان میں ہو اُس میں اس لفظ کا ترجمہ غلطی سے احمد کردیا ہوگا یا کسی خود غرض جاہل راہب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں جعل سازی سے اس کا استعمال کیا ہوگا۔ جس کو مسلمان اپنے پیغمبر کی بشارت قرار دیتے ہیں۔

اول تو ہم مسلمانوں کو یوحنا کی انجیل کے کسی ایسے عربی ترجمہ کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے پہلے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہو مطلق اطلاع نہیں دیتے نہ ہمارے اگلے بزرگوں نے اُس کا کچھ ذکر کیا ہے اور نہ ایسے ترجمہ کے موجود ہونے کا کچھ ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ عرب میں حضرت متی کی اصلی انجیل جو عبرانی زبان میں تھی اور اب معدوم ہے

البتہ پائی جاتی تھی اور اس کا ذکر ہمارے ہاں کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے مگر یوحنا کی انجیل کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کسی خود غرض راہب نے یہ جعل سازی کی ہو اس پر ہم یقین نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر کسی خود غرض راہب کے اس لفظ میں جعل کرنے کا ہم یقین کریں گے جیسا کہ سرولیم میور صاحب نے فرمایا ہے تو ہم کو بمجبوری اس بات کا یقین کرنا پڑے گا کہ بعض دین دار راہبوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں چھپانے کو بھی انجیل مقدس میں تحریفیں کی ہیں جیسا کہ عموماً مسلمان یقین کرتے ہیں مگر ہم کو ایسی بدگمانیوں پر تحقیق سے باز رہنا نہیں چاہیئے بلکہ استقلال سے تفتیش کرنی چاہیئے کہ اگلے عالموں نے اس پر کیا بحث کی ہے اور فیلالجی یعنی علم مطابقت لسان جو اس زمانہ میں نہایت ترقی پر ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

گاڈفری ہیگنس (آنجہانی) جو ایک بہت بڑے عالم حال کے زمانہ میں گذرے ہیں اور انگریز تو تھے ہی اور انگریزی زبان تو ان کی زبان ہی تھی مگر یونانی اور عبرانی و کالڈی زبان بھی خوب جانتے تھے اور علم مطابقت السنہ سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اس کی کیا تحقیق کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "مسلمان بیان کرتے آتے ہیں اور اب بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ نے محمد رسول اللہ کی دی ہے۔ جس طرح حضرت اشعیاہ نے کیخسرو کی پیشین گوئی تھی اور دونوں پیشین گوئیوں میں دونوں کا نام بتا دیا گیا تھا"۔

گاڈفری ہیگنس صاحب تو اس مقام پر مسلمانوں کی طرف سے ایک مجادلانہ تقریر کرتے ہیں۔ اور اُس کے بعد محققانہ اُن کی مجادلانہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے یہ ہے کہ "مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا تھا وہ اس لفظ سے نہیں لیا جو لفظ کہ اب انجیلوں میں موجود ہے بلکہ وہ لفظ پیریکلیطاس تھا جس کے معنی بزبان عربی احمد کے ہیں اور ابتداءً انجیل میں یہی لفظ تھا مگر سچ بات کے چھپانے کے لئے اُس کو تحریف کر دیا ہے اور عیسائی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اُن کی کتب موجودہ میں بہت سی تحریفیں یا اختلاف قرأت ہیں اور مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عبارت کے چھپانے کے لئے تمام قلمی نسخے غارت کر دیئے گئے۔ قلمی نسخوں کے غارت ہو جانے کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ وہ بات ہے جس کی نسبت جواب باصواب دینا مشکل ہے اور قدیمی نسخوں کی نسبت تو یہ ہے کہ چھٹی صدی کے قبل کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔

اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ترتولین اور قدیمی مصنفوں کی عبارت سے ثابت ہو سکتا

ہے کہ انجیلوں کی صحیح قرأت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پیشتر ایسی ہی تھی جیسے کہ اب ہے۔ اور اس لئے ان میں تحریف نہیں ہوئی تو اس صورت میں اُن قدیمی نسخوں میں بھی تحریف کا ہونا ثابت کرنا چاہیئے۔ اور کیا عجب ہے کہ اُن میں بھی ہوئی ہو جن لوگوں نے انجیل مقدس کے قدیمی قلمی نسخوں کو غارت کر دیا۔ انھوں نے ایک وصلی کو جس پر قدیمی مصنف کی تصنیف لکھی گئی ہو از سرِنو لکھنے میں کیا دریغ کیا ہوگا۔ اس بات کو اول درجہ کے دین دار عالموں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں اور اور مقصدوں کے لئے تحریف ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک مطلب کے لئے تحریف کریں گے وہ دوسرے مطلب کے لئے کیوں نہ کریں گے۔ اور جو کہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے۔ پس اگر غلط لکھا گیا ہو تو گمان غالب یہ ہے کہ ابتدا کے عیسائی مؤرخوں نے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والے ہیں اپنے خاص مطلب کے لئے جھوٹ بولا ہو اور یہ گمان نہایت ضعیف ہے کہ یوحنا حواری نے جو عبرانی شخص تھا کوئی غلطی کی ہو کیونکہ وہ عبرانی اور یونانی دونوں زبانوں کو سمجھتے تھے اور اگر بالفرض وہ عبرانی زبان کے بڑے عالم نہ ہوں اور اسی وجہ سے اُنھوں نے لفظ کلیطاس کو بجائے کلیوطاس غلطی سے لکھ دیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ یوحنا کی انجیل کے اصل متن میں تحریف ہوئی ہے۔

اس کے بعد گاڈفری ہگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے ایک اور مجادلانہ تقریر لکھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا بیان ہے کہ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ عیسائی اگر مناسب سمجھتے تو نہایت عمدہ قلمی نسخوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ جس طرح کہ اُنھوں نے بہت سے ولیوں کی لاشوں کو نہایت آسانی سے محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ یوحنا اور مریم اور پطرس اور پولس وغیرہ کی لاشیں ہر روز اٹلی میں نظر آتی ہیں۔

پس مسلمان ضرور بااصرار عیسائیوں سے کہیں گے کہ اس غلط ترجمہ کے چھپانے کے لئے کل قلمی نسخے غارت کر دیئے یا اُن میں جھوٹ ملا دیا گیا اور اگر ایسا نہ تھا تو وہ غارت کیوں کر دیئے گئے اور عیسائیوں کو اُن کا جواب باصواب دینے میں بہت کچھ دقت ہوگی۔ کیونکہ قلمی نسخوں کے غارت ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ موجود نہیں ہیں۔

اس لئے گاڈفری ہگنس صاحب نے محققانہ طور پر گفتگو شروع کی ہے۔ اول وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو بشارتیں ان آیتوں میں مندرج ہیں۔ اُن سے بہت سے قدیم عیسائی کسی شخص کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی سمجھتے تھے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رومی پادریوں اور پروٹسٹنٹ

نے جو اس لفظ کے معنوں میں تحریف کی ہے اور اس سے صرف روح القدس کا حواریوں پر آنا مراد لیا ہے۔ ابتدا میں یہ رائے عام نہ تھی۔ چنانچہ دوسری صدی میں ترتولین کے زمانہ سے پہلے مانٹینی آس ایک شخص پیدا ہوا تھا جس کو بہت لوگ سمجھتے تھے کہ وہی پیریکلیوطاس جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰ نے وعدہ کیا تھا اُس کے دشمنوں نے اُس کی نسبت بے اصل بات مشہور کی تھی کہ وہ روح القدس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے مانٹینی آس کے بسبب انجیلوں میں تحریف کی اور یہ ماجرا آنحضرت صلعم کے زمانہ سے بہت پہلے ہوچکا تھا۔ مانیٹنی آس کے زمانہ کے بعد اور آنحضرت صلعم کے زمانہ سے بہت پیشتر مینس کو بھی اُس کے پیرووں نے جو بڑے عالم اور طاقت ور تھے، وہی شخص سمجھا تھا جس کے مبعوث ہونے کی حضرت عیسیٰ نے بشارت دی تھی۔ لیکن اُس کے انجام سے ثابت ہوتا ہے کہ مینس شخص موعود نہ تھا اور اس کے پیرو غلطی پر تھے۔

بعد اس کے گاڈفری ہیگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے لکھتے ہیں کہ مسلمان کہتے ہیں۔ کہ اس لفظ سے جو عیسائی روح القدس کا حواریوں پر اُترنا مراد لیتے ہیں وہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے معنی تشفی دہندہ کے ہوں تو وعدہ تو ایک تشفی دہندہ کے آنے کا تھا پھر یہ کہنا کہ ظہور دربارہ زمانہ آتشین کا وہی شخص موعود ہے محض فضول ہے۔ علاوہ اس کے حواریوں کے قوانین اور خود عیسائیوں کی کتاب سے کسی طرح پایا نہیں جاتا کہ روح القدس کا حواریوں میں آجانا تشفی دہندہ موعود کا آنا ہوا اور صرف زبان سے کہہ دینے سے ایسے دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکتی ہے۔

علاوہ اس کے پینٹی کاسٹ کی ضیافت میں حواریوں پر روح القدس نازل ہوچکی تھی۔ کیونکہ بموجب قول عیسائیوں کے ایک بریدہ زبان آتش نے ہر ایک حواری پر طاری ہوکر اُسی لمحہ ان کو سب زبانیں بولنے کی طاقت بخشی تھی اور یوحنا کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ نے اپنے جانے سے تھوڑے عرصہ پیشتر یہ فیض اُن کو عطا کردیا تھا۔ یعنی پینٹی کاسٹ کی ضیافت کو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں دو مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ فیض مذکور عنایت کیا گیا تھا عیسائی مذہب کی تمام مذہبی کتابوں میں کہیں نہیں پایا جاتا کہ یہ زمانہ ہائے آتشیں جن سے کہ سب زبانیں بولنے کی طاقت عطا ہوئی تھی تشفی دہندہ موعود تھیں جو ایسا ہوتا تو ضرور کتاب مذکورہ میں ہوتا۔

اگر اُس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ وہ عطا یا جن کا بیان متی کی انجیل میں ہے اور فیض روح القدس جس کا بیان یوحنا کی انجیل کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت میں ہے صرف چند روز کے لئے تھا اور پھر لے لیا گیا تھا اور بعد کو ہمیشہ کے لئے آیا۔ تو مسلمان کہیں گے کہ یہ صرف ایک حیلہ ہے جس کی تصدیق انجیل کے کسی لفظ سے نہیں ہوتی۔

اسی بحث میں گاڈفری ہیگنس صاحب نے ایک نہایت عمدہ قول فیصل لکھا ہے کہ یعنی اگر تسلیم کیا جائے کہ یہ لفظ وہی ہے جو اس زمانہ کے عیسائی کہتے ہیں اور اُس کے معنی بھی روح القدس ہی کے ہوں تو مسلمان عیسائیوں سے کہیں گے، کہ تم کہتے ہو کہ انجیل میں بشارت ہے کہ روح القدس آئے گی یہ درست ہے کہ روح القدس آئی۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آئی جن کو روح القدس سے الہام ہوتا تھا پس تمہاری پیچیدہ عبارت کے یہی صحیح معنی ہیں اور یہی معنی درستی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

یہ لفظ تو گاڈفری ہیگنس صاحب کے تھے اور میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ جو عام ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور تمام جزیرہ عرب بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کرنے لگا۔ اور تمام دنیا میں وحدانیت کا ڈنکا بج گیا اور حضرت عیسیٰ پر جو اتہام خدا کے بیٹے ہونے کا کیا تھا۔ وہ مٹ گیا۔ اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ ضرور وہ روح القدس اور روح القدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اس کے بعد گاڈفری ہیگنس صاحب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ لفظ پیریکلیطاس نہیں ہے جس کے معنی تسلی یا تشفی دہندہ کے بیان کئے جاتے ہیں بلکہ یہ لفظ پیریکلیوطاس ہے جس کے معنی احمد کے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی دلیل کو بابت ترجمہ لفظ پیریکلیوطاس کے بجائے پیریکلیطاس کے اُس طرز تحریر سے بہت مدد ملتی ہے جو سینٹ جیروم نے انجیل کے لیٹن ترجمہ میں اختیار کی ہے۔ یعنی اُس ترجمہ میں لیٹن زبان میں پیریکلیطاس لکھا تھا۔ پیریکلیوطاس کی جگہ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جس کتاب سے سینٹ جیروم نے لیٹن میں ترجمہ کیا اُس میں لفظ پیریکلیوطاس

معنانہ پیریکلیطاس۔

لفظ پیریکلیطاس کے معنی پر پادریوں میں بہت اختلاف ہے چنانچہ مشہور عالم مائی کیلس کہتا ہے کہ ارنسٹائی نے بہت مناسب کہا ہے کہ اس کے معنی نہ حامی کے ہیں نہ تسلی دہندہ کے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں تحقیق خیال کرتا ہوں کہ پیریکلیطاس یا تو روح القدس کو کہتے ہیں یا معلم یا مالک کو یعنی بتانے والا خدا تعالیٰ کی سچائی اور میں اُس کی رائے سے در باب صحیح نہ ہونے ترجمہ کے مطابقت کرتا ہوں، گو میں اُس کو ڈاکٹر یعنی عالم متبحر کا لقب نہیں دیتا، بلکہ ماہٹر یعنی معلم کا لقب دیتا ہوں اس لئے کہ جو معنی اُس نے لفظ مذکور کے لکھے ہیں بہتیروں نے اختیار کئے ہیں البتہ اُس کے اثبات کا جو طرز اُس نے اختیار کیا ہے وہ عجیب ہے اُس کو چاہیئے تھا کہ لفظ مذکور کو کسی محقق کی تصنیف میں تلاش کرتا اور اُس کے معنوں کی تشریح اُس لفظ کے استعمال سے ثابت کرتا اُس نے ان سب باتوں کو چھوڑ کر جس زبان کے لفظ سے یہ نکلا ہے (یعنی کالڈی زبان سے) اُس کے محاورہ اور استعمال سے اپنا بیان ثابت کرنے پر استدلال رکھا ہے۔

بہت بڑے عالم اور معزز بشپ مارش نے کہا ہے کہ لفظ پیریکلیطاس کے تین ترجمے ہیں اور ہم کو اختیار ہے کہ اُن میں سے جو نسا چاہیں پسند کریں۔ اول معنی حامی کے ہیں جو معتبر اور یونانی اکابر کے نزدیک مسلّم ہیں۔ دوسرے معنی مبین کے ہیں اور یہ وہ معنی ہیں کہ ارنستائی نے بحوالہ لفظ فارقلیط کے جو کالڈی زبان کا لفظ ہے لکھے ہیں۔ تیسرے معنی واعظ کے ہیں جس کو خود بشپ مارش نے بحوالہ ایک عبارت مصنفہ فائلو کے تسلیم کیا ہے پس یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مشہور لفظ کے معنوں میں اور اُس پیغمبر کی قسم میں جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰ نے وعدہ کیا تھا بہت اشتباہ و شک تھا۔

یہ لفظ گاڈفری ہیگنس صاحب کے ہیں مگر میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ اگر بشپ مارش ہی کے معنی تسلیم کئے جائیں اور اس لفظ کو پیریکلیطاس ہی مانا جائے اور اُس کے معنی واعظ ہی کے قرار دیئے جائیں تو بھی بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کے حق میں یہ بشارت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ حواریین جنھوں نے انجیل کا وعظ کیا وہ اس سے پہلے روح القدس سے معمور ہو چکے تھے اور وہ سب اس وقت موجود تھے اُن کی نسبت تو یہ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ میں بھیجوں گا کیونکہ وہ موجود تھے محمد رسول اللہ جب آئے تو انھوں نے صاف صاف بتایا کہ میں بھی تم سا ایک آدمی ہوں صرف مجھ پر وحی بھیجی گئی ہے کہ بے شک تمہارا خدا ہی ایک خدا ہے پھر اس سے بھی زیادہ صاف

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الٰہ واحد (سورہ مریم آیت ۱۱۰)

قل لا املك لنفسی نفعا ولا ضرا الا ماشاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر ومامسنی السوء ان انا الا نذیر وبشیر لقوم یومنون (سورہ اعراف آیت ۱۸۸)

فرمایا کہ میں اپنی جان کے لئے بھی کچھ فائدہ یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہوں بجز اُس کے جو خدا چاہے اور اگر میں غیب کی بات جانتا ہوتا تو بہت کچھ بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی برائی چھوتی بھی نہیں ہیں تو اُن قوموں کو جو ایمان لائی ہیں ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔

اور پھر اور بھی صاف فرمایا کہ "میں تو تم کو صرف ایک بات کا یعنی لا الہ الا اللہ کا وعظ کرتا ہوں

قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنۃ ان ھو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید (سورہ سبا آیت ۴۵)

پھر تم خالصاً للہ دو دو ایک ایک کھڑے ہو اور سوچو کہ جو شخص تمہارے ساتھ ہے اُس کو کچھ جنون نہیں وہ تو تم کو صرف عذاب میں پڑنے سے پہلے ڈرانے والا ہے"۔ اس کے سوا اور بہت سی جگہ رسولِ خدا نے خدا کی طرف سے فرمایا کہ "خدا تم کو اس بات کا وعظ کرتا ہے اور خدا کا وعظ کرنا اور پیغمبر کا وعظ کرنا برابر ہے"۔ پس سوائے محمد رسول اللہ کے کسی پیغمبر نے ایسا صاف صاف نہیں فرمایا کہ میں تو صرف وعظ کہنے والا ہوں۔ پس اگر اس لفظ کے معنی واعظ ہی کے ہوں جیسا کہ بشپ مارش نے کہا ہے تو بھی وہ سچا واعظ بجز محمد رسول اللہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

بعد اس کے گاڈفری ہیگنس صاحب کہتے ہیں کہ "یہ تسلیم کرنا ضرور ہے کہ لفظ مذکور (یعنی فارقلیط) جیسا کہ بشپ مارش نے لکھا ہے کہ یقیناً عیسیٰ مسیح نے استعمال کیا تھا مسلمانوں کے دعوے کو بہت کچھ سہارا دیتا ہے وہ کہتے ہیں کہ میری رائے میں اہلِ اسلام لفظ فارقلیط کو یونانی میں پیریکلیوطاس بنا لینے کا اُسی قدر اختیار رکھتے ہیں جس قدر کہ عیسائی پیریکیلیطاس کر لینے کا بلکہ اُن کی رائے میں غلبہ کا پلہ مسلمانوں کی طرف ہے کیونکہ عیسائی مجاز نہیں کہ پچھلے جزو میں لفظ زبان خالدی کے حرف یہ یعنی یائے تحتانی کو جو مثل حرکت کسرہ کے ہے یا حرف ایتا کو جو یائے تحتانی ممدودہ معروف کے برابر ہے۔ حرف ایوتا کے عوض میں بدلیں۔

حرف ید حروف تہجی زبان خالدیہ کا دسواں حرف ہے اور شمار میں اس کے عدد بھی دس ہیں پس اگر لفظ مذکور ایک زبان سے دوسری زبان میں بدلا جائے تو اُس یونانی حرف سے بدلنا چاہیے جو دس کے معنی میں آیا ہے اور جو ابتدا میں حروف تہجی میں دسواں تھا قبل اس کے کہ یونانیوں کا حرف ڈگامہ جاتا رہے جیسا کہ میں نے اُس کو کثرت سے اپنے اُس جواب مضمون میں ثابت کیا ہے؟

ڈرباب جنوب مغربی فرنگستان کے قدیمی پادریوں کے لکھا ہے۔

مگر میں علاوہ اس کے یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر حضرت عیسیٰ کا استعمال کیا ہوا لفظ فارقلیط تھا اور یہ کہ اس لفظ کے معنی ستودہ کے ہیں جیسا کہ سیل صاحب کا بھی قول ہے تو اس کا ترجمہ اس لفظ یونانی پیریکلیطاس میں غلط ہے یعنی اختلاف قرأت کی جہت سے اور یہ کہ بشپ مارش اور انسٹائی دونوں کے کل ترجمے غلط ہیں اور لفظ مذکور اُس لفظ سے مبدل کرنا چاہتے جو ستودہ کے معنی رکھتا ہو اور واقع میں یہ لفظ پیریکلیوطاس ہونا چاہیئے۔

مگر اس کا ترجمہ فارقلیط علم کے معنی لے کر نہ کرنا چاہیئے بلکہ اسم صفت کے طور پر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اہل اسلام بمعنی احمد کے لیتے ہیں۔ اگر یہ لفظ حضرت عیسیٰ کا استعمال کیا ہوا زبان خالدیہ یا عبرانی عربی کا ہو تو اس سے وہی مراد پائی جانی چاہیئے جو اُس کے معنی اُن زبانوں میں تھے اگر وہ خالدیہ کا لفظ عربی مصدر سے مشتق ہو تو اُس کے وہی معنی چاہئیں جو عربی مصدر کے ہیں۔ اور تب اُس کے معنی ستودہ یا شخص ممتاز کے ہوں گے۔

اگر ناظرین غور کریں گے تو معلوم کر لیں گے کہ لفظ کلیوطاس کو ہومر اور ہیڈ دونوں نے بجائے ستودہ آدمی کے استعمال کیا ہے اس طرح سے میری دانست میں اہل اسلام کی دلیل اس سلیقہ کے ساتھ ہے کہ اگر اُن کو اُن کی غلطی پر معقول کیا جائے تو عجب نہیں کہ بہت مشکل پڑے یہ ادنیٰ بات ہے مگر اُن کی دلیل کی تردید میری نظر سے نہیں گذری۔

مگر مجھ کو اس مشہور لفظ فارقلیط کی نسبت کچھ اور بھی کہنا ہے۔ اس کو بشپ مارش نے جس کے قول کو عیسائی صادق جانتے ہیں۔ ایک مسلمان کی منتخب کی ہوئی دلیل میں تسلیم کر لیا ہے کہ وہ سریانی یا خالدیہ یا عربی ہے مگر یونانی نہیں۔ ان زبانوں میں سے ایک کو یا دو کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بولتے ہوں گے یا ادنےٰ درجہ یہ کہ سمجھتے ہوں گے اور یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لفظ مذکور کے یونانی ترجمہ کی نسبت آپ کو کچھ بحث ہوئی ہو کیونکہ حضرت عیسیٰ کے کلاموں کے یونانی ترجموں سے عرب کے لوگوں کو کیا غرض تھی۔ عرب میں اُن ترجموں کا کیا کام تھا اُن لوگوں کو وہ کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے جو اُن کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ بجز ایسے لوگوں کے جو اُس اصل زبان کو سمجھتے تھے جس کو حضرت عیسیٰ بولتے تھے۔ آپ نے لفظ مذکور اسی طرح پر لیا ہوگا جیسے کہ منقول چلا آتا تھا یا جیسا کہ سیل صاحب نے اُس کو لکھا ہے جس کے معنی ستودہ کے ہیں اور اس سے زیادہ غالباً آپ نے کبھی دریافت نہیں کیا۔ یہ خیال کرنا کیسا بیہودہ ہے کہ اپنی خاص زبان کے ایک لفظ کے

معنی کی تشریح غیر زبان میں ڈھونڈھتے آپ نے لفظ مذکور کو مثل اُس زمانہ کے دوسرے فرقوں کے شخص انسانی پر محمول کیا اور یہ اجازت نہیں دی کہ اس کو ثالث ثلثہ کہیں جیسا کہ اس زمانہ کے موحد بھی کہتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اُس کو احمد کے معنی میں لیا ہو اور اُس کی نسبت کبھی جھگڑا یا شک نہ کیا ہو۔

یہ تمام تقریر گاڈ فری ہیگنس صاحب کی ہے جو اُنھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کی ہے مختصر یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی بحث لفظ پیریکلیطاس پر جو اب یونانی انجیل میں ہے یا لفظ پیریکلیوطاس پر جو اصلی نسخوں میں تھا منحصر نہیں ہے کیونکہ یہ انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں جو حضرت عیسیٰ کی زبان نہیں تھی۔ پس اُنھوں نے جو لفظ فرمایا تھا وہ عبرانی یا خالدی زبان کا تھا جو دونوں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمان کہتے ہیں کہ وہ لفظ فارقلیط تھا۔ یونانی انجیلوں میں اس کے بجائے جو لفظ فارقلیط کا ترجمہ ہے ہم مسلمان کہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ یونانی میں پیریکلیوطاس کیا گیا تھا جو درحقیقت صحیح ترجمہ ہے اور اس کا ثبوت بھی جہاں تک ہو سکا دیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں پیریکلیطاس ہی اس کا ہمیشہ سے ترجمہ چلا آتا ہے تو ہم مسلمان یہ کہیں گے کہ یہ ترجمہ غلط ہے کیونکہ فارقلیط کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں ہے بلکہ پیریکلیوطاس ہے اور اس کا فیصلہ عبری و خالدی زبان کے لغت کی تحقیق پر ہر وقت ہو سکتا ہے اور جو کہ مشہور ہے کہ انجیل یوحنا درحقیقت حضرت یوحنا حواری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت یوحنا نے فارقلیط کے ترجمہ میں غلطی کی ہو اور جو دلیلیں مذکور ہوئیں اُن سے بھی پایا جاتا ہے کہ اُنھوں نے غلطی نہیں کی۔ اس لئے اصل میں وہ لفظ پیریکلیوطاس ہے بمعنی احمد نہ پیریکلیطاس بمعنی تسلی دہندہ۔

اکثر عیسائی خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس بشارت کو انجیل برنباس سے اخذ کیا ہے۔ اور جارج سیل صاحب نے بھی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں یہی خیال کیا ہے بلکہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی "یاتی من بعدی اسمہ احمد" اُسی انجیل میں سے اخذ کی گئی ہے اور شاید آخیر زمانہ کے ایک آدھ کچے مسلمان اور جاہل مولوی نے کہیں سن سُنا کر کہ برنباس کی انجیل میں بھی یہ مطلب آیا ہے شاید اُس کا حوالہ دے دیا ہو مگر قدیم عالموں اور بڑے بڑے محققوں نے اس بشارت کی بابت برنباس کی انجیل کا خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نام تک نہیں لیا۔ جارج سیل صاحب کی غلطی ہے جو وہ ایسا کہتے ہیں۔

بشارت دوم

جب بعد مصلوب ہونے اور قبر میں دفن کئے جانے کے حضرت عیسٰی زندہ ہو کر اُٹھے اور حواریوں سے ملے اور اُن کے سامنے مچھلی کا ٹکڑا اور شہد کھایا تو بیت عنیا میں جانے اور آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے اُنھوں نے اپنے حواریوں سے یہ فرمایا " اور دیکھو میں بھیجتا ہوں وعدہ اپنے باپ کا تم پر لیکن تم ٹھیرو شہر یروشلیم میں جب تک کہ تم پر عطا ہو قوت اوپر سے (انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۴۹)"

چند سطروں کے بعد لوقا اپنی انجیل ختم کرتے ہیں اور کچھ ذکر اُس وعدہ کے پورا ہونے کا نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰی یہ کہہ کر آسمان پر چلے گئے تو تمام حواری اُن کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے یروشلیم کو پھرے اور ہمیشہ ہیکل میں خدا کی تعریف اور شکر کرتے رہے اور ان ہی لفظوں پر لوقا کی انجیل ختم ہوتی ہے ۔ اور اُس وعدہ کے وفا ہونے کا کچھ ذکر نہیں ہوتا پس ثابت ہوتا ہے کہ لوقا کی زندگی تک یا کم سے کم اس انجیل کے لکھے جانے کے وقت تک وہ وعدہ جس کو لوقا سمجھے تھے پورا نہیں ہوا تھا ۔

لوقا کے نزدیک روح القدس کا زمانہ ہائے آتشیں میں حواریوں پر نازل ہونا (اگر وہ اُس کے بعد نازل بھی ہوئے ہوں) اس وعدہ کا پورا ہونا نہیں تھا کیونکہ اگر ہوتا تو وہ اُس وعدہ کے پورا ہونے کا ذکر ضرور لکھتے پس ضرور ہے کہ یہ وعدہ کسی اور شخص کے مبعوث ہونے کا تھا ۔

اب ہم کو اُس شخص کی تلاش کرنی مناسب ہے جس کے آنے کی حضرت عیسٰی نے بشارت دی ۔ جب ہم اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰی نے حواریوں سے فرمایا کہ " اُس وعدہ کے آنے تک تم شہر یروشلیم میں ٹھیرے رہو " تو ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ اُس وعدہ کے آنے اور شہر یروشلیم میں ٹھیرے رہنے سے کیا تعلق ہے اگر بالفرض اُس وعدہ سے حواریوں پر روح القدس کا نازل ہونا ہی مراد تھی تو بھی یروشلیم میں رہنے اور روح القدس کے آنے سے کوئی ضروری مناسبت نہیں پائی جاتی ۔ کیونکہ اگر حوارین شہر کے باہر چلے جاتے تو بھی اُن کے پاس روح القدس اُسی طرح آسکتی تھی جیسے کہ شہر میں رہنے کی حالت میں آسکتی تھی پس شہر یروشلیم میں ٹھیرے رہنے سے یہ مطلب نہیں ہے جو اُس کے لفظی معنوں سے نکلتا ہے ۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ جب تک وہ وعدہ پورا ہو تم شہر یروشلیم سے وابستہ رہو اور اُسی کی عزت و تعظیم جیسی کہ پیشتر سے کرتے آئے ہو کرتے رہو اُسی

کی طرف اپنا سر جھکاؤ اپنا منہ اُسی کی طرف رکھو جب تک وہ وعدہ پورا ہو چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور وہ وعدہ پورا ہوا۔ اور یروشلیم میں رہنے کا زمانہ منقطع ہو گیا اور بیت اللہ میں رہنے کا زمانہ آیا باپ کا وعدہ پورا ہوا۔ اور اوپر سے عطا ہو گئی بیت المقدس کی طرف جو مدت دراز سے قبلہ تھا موقوف ہوا اور مکہ میں ابراہیم کے بناتے ہوئے خانہ خدا اور کعبہ معظم کی طرف قبلہ اہل ایمان قرار پایا پس یہ بشارت صاف ہمارے پیغمبر کے مبعوث ہونے اور بیت المقدس کے قبلہ رہنے کے زمانہ کے اختتام اور بیت اللہ الحرام کے قبلہ ہونے کی بشارت ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃً ترضٰھا۔ فول وجھک شطر المسجد الحرام۔

بشارت سوم

جب کہ حضرت یحییٰ پیغمبر ہوئے تو یروشلیم سے یہودیوں نے کاہنوں اور لیویوں کو اُن کے پاس بھیجا تاکہ اُن سے پوچھیں؟ کہ وہ کون ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ گئے اور اُن سے یہ گفتگو ہوئی کہ اُس نے یعنی حضرت یحییٰ نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا اور اقرار کیا کہ میں کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح نہیں ہوں اور انھوں نے پوچھا اُس سے پھر کون کیا تو الیاس ہے؟ اور اُس نے کہا میں نہیں ہوں تو وہ نبی ہے؟ اور اُس نے جواب دیا نہیں۔ تب اُنھوں نے اُس سے کہا کہ کون تو ہے تاکہ ہم جواب دے سکیں اُن کو جنھوں نے ہم کو بھیجا ہے اپنے تئیں تو کیا کہتا ہے۔ اُس نے کہا میں ہوں آواز اُس کی جو کہ جنگل میں چلاتا ہے سیدھا کرو رستہ خداوند کا جیسا کہ نبی اشعیا نے کہا اور وہ جو بھیجے گئے تھے فروسی تھے اور انھوں نے اس سے پوچھا اور اُس سے کہا کہ تو کیوں اصطباغ کرتا ہے جب کہ تو نہ کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح ہے اور نہ الیاس اور نہ وہ نبی (یوحنا باب آیت ۲۱ لغایت ۲۵)

ان اوپر کی آیتوں میں تین پیغمبروں کا ذکر ہے ایک حضرت الیاس کا اور دوسرے حضرت عیسیٰ کا تیسرے اُس پیغمبر کا جو علاوہ حضرت عیسیٰ کے ہونے والا تھا یہودی یقین کرتے تھے۔ پیغمبر الیاس جن کو مسلمان خضر کہتے ہیں مرے نہیں بلکہ صرف انسانوں کی نظروں سے غائب ہو گئے ہیں اور یہودیوں کو حضرت عیسیٰ مسیح کی نسبت یہ یقین تھا اور اب بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن آویں گے لیکن اُن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ حضرت مسیح کے ایک اور پیغمبر کے آنے کی بھی اُمید

رکھتے تھے اور وہ پیغمبر ایسا مشہور تھا کہ بجائے نام کے صرف اشارہ ہی اُس کے بتانے کو کافی تھا جیسے کہ ہم مسلمان بھی پیغمبر کے نام کی جگہ صرف آنحضرتؐ اشارہ میں لکھتے بولتے ہیں اور یہ مشہور پیغمبر کون ہو سکتا ہے بجز اُس کے جس کے سبب خدا تعالیٰ نے ابراہیم و اسمٰعیل کو برکت دی اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کہا کہ تیرے بھائیوں میں تجھ سا پیغمبر پیدا کروں گا اور جس کی نسبت حضرت سلیمان نے کہا کہ میرا محبوب سرخ و سفید سب میں تعریف کیا گیا محمد ہے یہی میرا محبوب ہے اور یہی میرا مطلوب اور جس کی نسبت حجی نبی نے فرمایا کہ حمد تمام قوموں کا آئے گا اور جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ میرا جانا ضرور ہے تاکہ فارقلیط آئے۔ اب میں نہایت مضبوطی سے کہتا ہوں کہ یہ نامی اور مشہور پیغمبر حضرت محمد ہیں واللہ حضرت محمد ہیں۔

خطبہ گیارھواں

حقیقۃ شق الصدر و ماہیۃ المعراج

وما جعلنا الرویا التی ارینٰک الا فتنۃ للناس (القرآن)

شق صدر کی حقیقت اور معراج کی ماہیت کے بیان میں

اس خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کے شق کرنے کی حقیقت اور معراج کی اصلیت کا بیان ہے۔

جو واقعات کہ ہم اس خطبہ میں بیان کرتے ہیں اُن کی اصلیت کی نسبت اور جن الفاظ میں وہ بیان ہوئے ہیں اُن کے صحیح معنوں کی نسبت اکثر علمائے دین نے بحث کی ہے اور اُس کی تحقیقات کو انتہا درجہ تک پہنچایا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین اور شارحین نے اپنی پیچ در پیچ تاویلات اور لاطائل براہین سے بجائے اس کے کہ شکوک کو رفع کریں یا غلطی کی تصحیح کریں اُن الفاظ کے معانی کو اور بھی تاریکی میں ڈال دیا ہے۔

قرآن مجید کی رو سے ہم کو شرح صدر پر جس کو آخرکار لوگ شق صدر کہنے لگے اور نفس معراج کی صحت و صداقت پر بغیر کسی شبہ کے ایمان لانا چاہیے۔ پس جو امر کہ بحث طلب ہے اور جس پر ایک مدت تک علمائے اسلام کی توجہ مبذول رہی ہے اس بات سے علاقہ رکھتا ہے کہ شرح صدر یا شق صدر کی اصل حقیقت اور معراج کی ماہیت کیا تھی۔ اُن دونوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے اولاً ہم قرآن مجید کی اُن آیتوں کو نقل کرتے ہیں جو اُن سے متعلق ہیں۔

آیت اول۔ الم نشرح لک صدرک
کیا ہم نے تیرے لئے سینہ کو نہیں کھول دیا۔

آیت دوم۔ سبحٰن الذی اسری بعبدہٖ لیلا من ۔ پاک ہے وہ جو اپنے بندہ کو ایک رات
مسجد حرام سے مسجد اقصٰے تک لے گیا۔
جس کے دور کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم

المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من ایٰتنا انہ ھو السمیع البصیر۔ اُس کو اپنی نشانیوں میں سے دکھلا دیں بے شک وہ سننے والا ہے دیکھنے والا۔

آیت سوم۔ وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس۔ اور نہیں کیا ہم نے اُس رویا کو جو تجھ کو دکھلایا مگر آزمائش واسطے لوگوں کے۔

جو آیتیں کہ اوپر لکھی گئیں اُن میں سے صرف پہلی آیت شق صدر سے علاقہ رکھتی ہے اور باقی آیتیں معراج کے متعلق تصور کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں سینہ کے چیر پھاڑ کا کہیں ذکر نہیں ہے اور اُس کے اصلی اور اصطلاحی معنی جیسے کہ اکثر مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے اُس کشادگی کے ہیں جو دل اور سینہ میں عقلی اور روحانی وسعت سے عرفان الٰہی اور وحی کے منبع ہونے کے لئے کی گئی تھی۔

باقی رہیں وہ حدیثیں اور روایتیں جو شق صدر اور معراج سے علاقہ رکھتی ہیں لیکن وہ باہم اس قدر مختلف اور متعارض اور متناقض ہیں کہ کوئی بھی قابل اعتبار کے نہیں ہے اور اُن کی صحت کی کافی سندیں بھی نہیں ہیں۔ ہشامی ذیل کا قصہ حلیمہ سے نقل کرتا ہے کہ اُس نے بیان کیا کہ "ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ گھر کے قریب مویشی میں کھیل رہے تھے وہ دونوں دفعتہً میرے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور رو کر کہنے لگے کہ دو سفید پوش آدمی ہمارے قریشی بھائی کو پکڑ کرلے گئے اور اُن کا سینہ چاک کر ڈالا۔ میں اور میرا خاوند اُس مقام پر گئے دیکھا کہ آنحضرت کا مارے خوف کے رنگ فق تھا۔ ہم نے اُن کو چھاتی سے لگایا اور اُن کے اضطرار کا باعث پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ دو آدمی سفید پوش میرے قریب آئے اور مجھ کو چت لٹا کر میرا دل چیرا اور اُس میں سے کوئی چیز نکال ڈالی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز تھی"۔

اسی طرح کی ایک اور کہانی ہشامی نے بغیر کسی سند کے صرف یہ بیان کر کے کہ بعض علماء نے بیان کیا ہے اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت سے کہا کہ آپ کچھ اپنی تعریف بیان فرمائیے اُس پر پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ "میں اُن برکتوں کا مشتاق ہوں جن کے عطا کرنے کا وعدہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم سے کیا تھا اور میں وہ شخص ہوں جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ جب کہ میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا میری ماں کو معلوم ہوا کہ اُن سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محل منور ہو گئے۔ ایک دن میں اپنے دودھ بھائیوں کے ساتھ مویشی چرا رہا تھا کہ دفعتہً دو آدمی جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنے ہاتھ میں ایک سونے کا طشت برف اور پانی سے

بھرا ہوا لئے ہوئے تھے میرے پاس آئے اور مجھ کو زمین پر لٹا کر میرے سینہ کو چاک کیا اور میرے دل کو نکال کر چیرا اور اس میں سے ایک سیاہ قطرہ دبا کر نکال ڈالا۔ اس کے بعد انھوں نے دل کو اور سینہ کو برف سے دھو دھلا کر پاک صاف کر دیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس کو ایک طرف رکھ کر اور دس آدمیوں کو دوسری طرف رکھ کر تولو مگر میں وزن میں زیادہ ہوا تب اس نے سو آدمیوں سے مجھے تولا اس پر بھی میں وزن میں بڑھتی رہا۔ اس پر ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو کیونکہ اگر تم اس کو تمام جہان کے مقابلہ میں تولو گے تب بھی یہ کم نہ نکلے گا۔

واقدی نے بھی ان دونوں روایتوں کو نقل کیا ہے اور کتاب شرح السنۃ میں عرباض ابن ساریہ سے آنحضرت کے مذکورہ بالا فضایل کا بیان ہوا ہے اور دارمی میں ابوذر غفاری سے آنحضرت کے تولے جانے کی روایت بھی بیان ہوئی ہے۔ مگر ان روایتوں میں جو اختلاف ہے۔ وہ غور کے قابل ہے۔ حلیمہ سے جو روایت ہے اس میں برف کے پانی اور طشت کا اور دل کے دھونے کا کچھ ذکر نہیں ہے اور ہشامی کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کا تولا جانا شق صدر کے بعد حلیمہ کے گھر پر ہوا تھا۔ مگر دارمی میں جو ابوذر غفاری سے روایت ہے اس میں شق صدر کا کچھ ذکر نہیں ہے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ آنحضرت کا تولا جانا بطحائے مکہ میں ہوا تھا۔ بایں ہمہ یہ تمام روایتیں نہایت نامعتبر ہیں اور قصہ اور کہانی ہونے سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتیں۔

عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں۔ اور وہ اپنے ہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں اور توریت وانجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں بمنزلہ وحی یعنی کلام الہٰی کے سمجھتے ہیں۔ اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں۔ حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے اور اس خیال خام سے انھوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں اور روایتوں کو ناقابل خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن و تشنیع کی ہے۔ لیکن وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں کیونکہ مسلمان اپنے ہاں کی روایات واحادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ اور تاریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں اور ان کو ویسا ہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے ہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں جب کہ ان کے لئے کافی ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں۔ ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ یہ روایتیں جو ہشامی اور واقدی میں بیان ہوئی ہیں یا

وہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں ۔صحت سے بہت دور ہیں ۔محققین علمائے اسلام اُن کو محض ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں اور بیہودہ افسانے جو محض جہلا کے خوش کرنے کے قابل ہیں ۔خیال کرتے ہیں ۔پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے کہ اُن نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے۔

البتہ شق صدر کے معاملہ میں ایک روایت ہے جو ایک معتبر کتاب میں لکھی ہے یعنی مسلم میں اور اس لئے وہ اس لائق ہے کہ علمائے اسلام اُس پر توجہ کریں اور اس بات کی تحقیق وتدقیق کریں ۔کہ وہ روایت صحیح ہے یا بے اصل کیونکہ مسلم میں اُس روایت کے مندرج ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اُس کی صحت میں کچھ شبہ نہیں بلکہ صرف علماء کی توجہ کا استحقاق رکھتی ہے اور اگر بعد تحقیق کے معلوم ہو کہ وہ صحیح نہیں ہے تو گو کہ وہ مسلم نے بیان کی ہو ویسی ہی نامعتبر تصور ہوگی جیسے کہ اور کسی نے بیان کی ہوتی۔

مسلم میں ہے کہ انس ابن مالک نے کہا کہ" ایک روز جب کہ پیغمبر صاحب مکہ میں اور لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے ۔حضرت جبرائیل اُن کے پاس آئے اور اُن کا دل چیرا اور اُس میں سے ایک قطرہ نکال کر کہا کہ تجھ میں یہ شیطان کا حصہ تھا، تب اُس کو ایک سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا اور اُس کو بجنسہٖ جہاں رکھا ہوا تھا وہیں رکھ دیا ۔اور لڑکے بھاگ کر زہیرہ آنحضرت کی دودھ پلائی کے پاس گئے اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مار ڈالا ۔ وہ فوراً محمد کے پاس دوڑی آئی اور اُن کا رنگ فق پایا ۔ (انس کا بیان ہے کہ) سیون کا نشان جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر محسوس ہوتا تھا میں نے خود دیکھا تھا"

قطع نظر اس کے کہ اس روایت سے وہ تمام روایتیں جن میں حلیمہ کے گھر شق صدر ہونے کا بیان ہوا ہے۔ غلط اور باطل قرار پاتی ہیں یہ روایت بھی چار مستحکم دلیلوں سے قابل اعتبار کے نہیں۔

اول یہ کہ انہی انس نے ایک دوسری روایت میں اس واقعہ کا ہونا شب معراج میں بیان کیا ہے اور وہ زمانہ اس زمانہ سے جو اس روایت میں مذکور ہے ۔بالکل مختلف ہے ۔بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انس کے بعد کے راوی نے انس کی اُس لمبی روایت میں سے جو معراج سے متعلق ہے اور جس کا بیان آگے ہوگا ۔ ایک ٹکڑا توڑ کر اور اس میں کمی بیشی کر کے بیان کیا ہے ۔جس سے اس روایت کی بے اعتباری اور اس مضمون کا کہ سیون کے نشان انس نے دیکھے تھے لغو اور بے اصل ہونا ثابت ہوتا ہے ۔دوسرا یہ کہ اس روایت میں انس کا یہ قول کہ میں نے آنحضرت کے سینہ پر سیون کے

نشان بچشم خود دیکھے تھے بیان کیا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ بات غیر ممکن ہے ۔ کیونکہ اگر مانا جائے کہ آنحضرتؐ کا سینہ درحقیقت چیرا گیا تھا جیسا کہ اس روایت میں مذکور ہے تو اُس کی سیون کے نشان کا محسوس ہونا ناممکن تھا ۔ کیونکہ یہ سیون جراح کی سیون اور ٹانکوں کی مانند نہ تھی ۔ کسی روایت کی اصلیت کے امتحان کرنے کا یہ بھی طریقہ ہے کہ اگر وہ کسی ایسے امر کو بیان کرے جو خود اس معجزہ کے جو اُس روایت میں بیان ہوا ہے برخلاف ہو تو ایسی روایت محض بے اصل ہوگی ۔ پس اس دلیل سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت محض بے اصل و نامعتبر ہے اور انس کے بعد راوی نے اُس میں بالکل غلطی کی ہے ۔ تیسرے یہ کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ نے آنحضرت صلعم کے حلیہ کا مفصل بیان کیا ہے ۔ مگر کسی نے اس سیون کے نشانوں کا جس کا بیان اس روایت میں ہے ذکر نہیں کیا ۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے صحابہ اس کا ذکر کرتے ۔ چوتھے یہ کہ انس بروقت وقوع اس واقعہ کے موجود نہ تھے اور نہ انھوں نے اُن اشخاص کے نام بیان کئے ہیں جن کی وساطت سے اُن کو یہ روایت پہنچی ۔ روایت کے نامعتبر قرار دینے کو ایک مستحکم اصول یہ قرار پایا ہے کہ اگر راوی کسی ایسے واقعہ کو بیان کرے جس میں وہ خود موجود نہیں تھا تو وہ روایت قابل اعتبار کے نہیں ہے گو کہ وہ راوی صحابہ میں سے کیوں نہ ہو ۔

شق صدر کے متعلق روایتیں ایسی ہیں کہ اُن کی باہمی تطبیق نہیں ہوسکتی اور اس لئے وہ سب کی سب نامعتبر ہیں ۔ مصنف مواہب لدنیہ نے سب سے زیادہ نادانی کی ہے کہ ان مختلف روایتوں کو دیکھ کر بعوض اس کے کہ اُن کو نامعتبر ٹھیراتا یہ تسلیم کیا ہے کہ واقعہ شق صدر پانچ مرتبہ واقع ہوا تھا ۔ اول اُس وقت جب کہ پیغمبر صاحب اپنی دائی حلیمہ کے پاس رہتے تھے ۔ دوم مکہ میں جب کہ آنحضرتؐ کی عمر دس برس کی تھی ۔ سوم غار حرا میں ۔ چہارم شب معراج میں ۔ پنجم ایک دفعہ اور جس کے وقت کی تعین خود مصنف نہ کرسکا ۔ یہ تمام روایتیں ایسی ہیں جن پر تمام ذی علم اور تعلیم یافتہ مسلمان ذرا بھی اعتبار نہیں کرتے اور یہ روایتیں محققین علمائے اسلام کے نزدیک طفلانہ افسانوں سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتیں ۔

شق صدر کی نسبت صرف ایک روایت جس میں شب معراج میں شق صدر کا ہونا بیان کیا گیا ہے اعتبار کے لائق ہوسکتی ہے اور اُس واقعہ کو ہم معراج کے ساتھ بیان کریں گے ۔ مگر معراج کے تمام واقعات جو کچھ کہ ہوں بطور رویا کے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف ہوتے تھے پس جو بیان شق صدر کا اس روایت میں ہے وہ بھی رویا سے متعلق ہے ۔

اب ہم معراج کے حالات بیان کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں۔ معراج کے مقدم واقعات جن پر توجہ کی جاسکتی ہے یہ ہیں۔ آنحضرتؐ کے سینہ مبارک کا شق کیا جانا۔ آپ کا براق پر سوار ہوکر مکہ سے بیت المقدس کو جانا اور وہاں سے آسمان پر تشریف لے جانا۔ وہ واقعات اور مکالمات جو آسمانوں پر پیش آئے۔ مگر مطلق ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کے درحقیقت واقع ہونے کا کبھی دعوےٰ کیا ہو۔ قرآن مجید سے اور نیز اُن روایتوں سے جو راویوں نے معراج کی نسبت بیان کی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ مکہ سے بیت المقدس گئے ہیں اور اگر اُس روایت کو جس میں شق صدر کا بھی ذکر ہے صحیح مانا جائے تو یہ بھی آنحضرت نے خواب میں دیکھا تھا کہ اُن کا سینہ چاک کرکے اُن کا دل پانی سے دھویا گیا ہے اور اُسی خواب میں آنحضرتؐ نے اور بھی کچھ خدا کی نشانیاں دیکھیں جس کی تفصیل قرآن مجید میں مذکور نہیں۔

اول ہم اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ معراج صرف ایک رویا تھا۔ بخاری میں لکھا ہے۔ کہ

عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنۃ قال ھی رویا عین اریھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اسری بہ الی ببیت المقدس (بخاری)

"ابن عباس نے قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر میں "وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنۃ للناس کہا کہ یہ آنکھ کا رویا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس رات دکھایا گیا تھا۔ جب وہ بیت المقدس کو لے جائے گئے تھے۔

قتادہ کی روایت میں ہے کہ معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چت لیٹے ہوئے تھے۔

حسن کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات کو میں مقام حجر میں سوتا تھا۔

انس کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں سوتے تھے اور جب تمام قصہ معراج کا انس بیان کرچکے ہیں تو اُس کے آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ لفظ بیان کئے ہیں کہ "پھر میں جاگ اٹھا اور میں مسجد حرام میں تھا۔"

ام ہانی کی روایت میں ہے کہ معراج کی رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشا کی نماز پڑھ کر ہم میں سو رہے اور فجر کے پہلے ہم نے اُن کو جگایا۔

عبد ابن حمید کی روایت میں ہے کہ معراج کا حال بیان کرنے میں آنحضرت نے فرمایا "کہ میں

سوتا تھا" یا یہ کہا کہ "چت لیٹا ہوا تھا" یا یہ کہا کہ "سونے اور جاگنے کے بیچ میں تھا"۔

یہ روایتیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا آئندہ لکھی جائیں گی۔ یہ سب روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ معراج کے جو واقعات کہ بیان ہوتے ہیں وہ خواب کے واقعات ہیں اور اگر اُن روایتوں کی معتبری پر شبہ کیا جائے تو اتنی بات تو ضرور اس سے ثابت ہوتی ہے کہ اُس زمانہ کے لوگ جب کہ یہ روایتیں لکھی گئیں معراج کے واقعات کو رویا کے واقعات سمجھتے تھے علاوہ اس کے بہت سے علمائے محققین نے جن میں امیہ اور حذیفہ بھی داخل ہیں جو معتبر اصحاب میں سے ہیں بالاتفاق معراج کو ایک رویا قرار دیا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل سندوں سے ثابت ہوتا ہے۔

شفائے قاضی عیاض میں لکھا ہے کہ "ایک گروہ عالموں کا اس طرف گیا ہے کہ معراج روحانی تھی اور وہ سونے میں ایک رویا تھا۔ اسی کے ساتھ اُن سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ انبیاء کا رویا حق اور وحی ہے اور اسی بات کی طرف معاویہ بھی گئے ہیں اور حسن سے بھی یہی روایت کی گئی ہے۔ لیکن اُن کی مشہور روایت اس کے بر خلاف ہے۔ اور اُس کی طرف محمد ابن اسحاق نے اشارہ کیا ہے"۔

فذھب طایفۃ الی انہ اسری بالروح وانہ رویا منام مع اتفاقہم ان رویا الانبیأ حق ووحی والی ھذا ذھب معاویۃ وحکی عن الحسن والمشہور عنہ خلافہ والیہ اشار محمد بن اسحاق (شفاء)

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ محمد بن جریر طبری سے اُس کی تفسیر میں نقل کی گئی ہے کہ حذیفہ نے کہا کہ یہ (یعنی واقعہ معراج) رویا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نہیں گیا تھا اور معراج صرف روحانی تھی اور یہی قول عائشہؓ اور معاویہؓ سے بیان کیا گیا ہے۔

وحکی عن محمد بن جریر الطبری فی تفسیرہ عن حذیفۃ انہ قال ذلک رویا وانہ ما فقد جسد رسول اللہ صلعم وانما اسری بروحہ وحکی ھذا القول ایضاً عن عائشۃ رض وعن معاویہ رض (تفسیر کبیر)

مگر علمائے متاخرین نے مذہبی گرم جوشی سے یہ بات قرار دی کہ معراج جسمانی تھی اور تمام واقعات جو واقع ہوئے ہیں فی الحقیقت واقع ہوئے تھے۔ لیکن اس ادعا کی نسبت اُن کے پاس کوئی سند قرآن مجید کی موجود نہیں ہے۔ بلکہ بعض الفاظ کے معنوں پر جوش وخروش کے ساتھ بحث کر کے اس امر کو قائم کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ لفظ "اسریٰ" کا اطلاق رویا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کے معنی رات کے سفر کے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اس لفظ سے

واقعی رات کا سفر مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ یہ دلیل کرتے ہیں کہ لفظ "بعبدہ" کا اطلاق جس کے معنی اپنے بندہ کے ہیں۔ روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان دونوں چیزوں سے مرکب ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ سفر یعنی معراج جسمانی ہوئی ہو۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ لفظ رویا کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ اگرچہ اُس سے بالعموم خواب میں دیکھنے کے معنی لئے جاتے ہیں لیکن اس کا اطلاق فی الواقع آنکھ کے دیکھنے پر بھی ہو سکتا ہے اور اس لئے ممکن ہے کہ "رویا" کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے پچھلے معنی مراد ہوں۔ اس پر وہ یہ دلیل اور اضافہ کرتے ہیں کہ ابن عباس کی روایت میں جو لفظ "رویا عین" استعمال ہوا ہے۔ تو "عین" کی قید لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ رویا کے لفظ سے فی الواقع آنکھ کا دیکھنا مراد ہو۔

باقی حدیثوں کا جن میں آنحضرت کا سوتا ہوا ہونا مذکور ہے۔ یوں فیصلہ کرتے ہیں کہ یا تو آنحضرت معراج کے شروع ہونے کے وقت اس طرح پر لیٹے ہوئے ہوں گے جیسے کہ عموماً لوگ سونے کے واسطے لیٹتے ہیں یا معراج سوتے میں شروع ہوئی ہوگی اور پھر جاگ گئے ہوں گے۔ اور جاگنے کی حالت میں ختم ہوئی ہوگی۔

مگر ہر شخص پر جس میں ذرا بھی سمجھ ہے اور ذرا بھی استدلال کا مادہ رکھتا ہے واضح ہوگا کہ مذکورہ بالا دلیلیں کیسی پوچ اور ضعیف ہیں۔ ان دلیلوں کے پیش کرنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو جوش مذہبی میں اندھے ہو کر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اُن تمام روایتوں پر جو ذرا بھی مذہب سے علاقہ رکھتی ہیں گو وہ کیسے ہی بیہودہ اور محال اور قابل تضحیک ہی کیوں نہ ہوں۔ آمنا وصدقنا کہنا چاہیئے۔ بلاشبہ اُن مسلمانوں کا یہ جاہلانہ اعتقاد اُن کی نامعقولیت پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عیسائیوں کا یہ بیان کہ ہر مسلمان کو ان سب بیہودہ باتوں کو امور دینی سمجھ کر بلا وسواس اُن پر اعتماد رکھنا واجب ہے اور بھی زیادہ بیہودہ پن ہے۔ دیدہ ودانستہ ناانصافی اور عامیانہ جہالت کس قدر گہرے اور تاریک گڑھے میں پڑیڈو دھنسا ہوا ہوگا، جس وقت کہ اس نے یہ کہا کہ جملہ مسلمان اس کو ایک اصل امر دینی سمجھتے ہیں اور اس مذہب کے تمام لوگوں کا اس قصے پر ایسا مستحکم اعتقاد ہے جیسے کہ عیسائی انجیل کے کسی امر پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کی عادت ہے کہ جب وہ کوئی کتاب مذہب اسلام یا اُس کے بانی کے حالات میں لکھتے ہیں تو اُن کا ارادہ انصاف یا کیتمق حق کا نہیں ہوتا بلکہ قلم اٹھانے سے پہلے وہ قصد کر لیتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اُس کو لغو اور بیہودہ ظاہر کیا جائے۔ پس وہ اُن تمام لغو اور مہمل روایتوں

کو جن کو خود مسلمان تسلیم نہیں کرتے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر مسلمانوں کے خاص امور دینی بغیر کسی دلیل کے قرار دیتے ہیں اور اس پر زبان طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں۔ عیسائیوں نے باستثنائے معدودے چند کے اُس مقدس شخص کے احکام و طریقہ کو جس کے پیرو وہ اپنے تئیں بتاتے ہیں اور جس کے حلم اور نیک خصلت سے وہ محض بے بہرہ ہیں۔ بالائے طاق رکھ کر اُن لوگوں پر جو خدائے واحد برحق پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایسے الفاظ سے طعن و تشنیع کی ہے۔ جن کا ملحد اور لامذہب لوگوں پر بھی استعمال کرنا نازیبا ہے اُسی قسم کی ناانصافانہ سخت کلامیاں ہیں جو عیسائیوں نے معراج اور شق صدر کے باب میں لغو اور نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر مسلمانوں پر کی ہیں۔

مگر ہم اُن عیسائی مصنفوں کا شکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنھوں نے انصافانہ تسلیم کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس واقعہ کو خواب کا واقعہ بیان کرتے تھے اور اُنھوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ راویوں نے جو زیادتیاں اس میں کردی ہیں اُن سے بانی مذہب اسلام پر کوئی الزام عاید نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اکتوبر کے کوارٹرلے ریویو نمبر ۲۵۰ میں ایک عیسائی مصنف نے یہ رائے لکھی ہے کہ "جو کچھ ہم کو اس مقام پر بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے بعض سرگرم پیرؤوں کا ذمہ دار نہیں قرار دینا چاہیئے۔ جب کہ انھوں نے اس خواب کو (جس کے ہم پلہ تمام دوائن کا مڈی میں شاید ہی کوئی خواب ہو اور جس نے البتہ کسی قدر رنگ اس سے نادانستہ اڑایا ہے۔ لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو ہمیشہ خواب کہتے کہتے تھک گئے) ایک مہمل اور لایعنی چیز کے ساتھ بدل دیا۔"

اگرچہ ہم نے اُن روایتوں کی جو معراج سے متعلق ہیں بخوبی قدر و منزلت جیسی کہ اُن کی ہے بیان کردی ہے۔ لیکن اب ہم اُن تمام نامعتبر روایتوں کو اور اُن تمام بے بنیاد قصوں کو جو اُن میں مذکور ہیں۔ بغرض اتمام حجت واقعی تسلیم کرلیتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرلیتے ہیں۔ کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے ہاں ایک خاص امر دینی ہے اور، پھر ہم اُن متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنا پر مذہب اسلام پر طعن و تشنیع کرتے ہیں پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر دند مچاتے ہیں۔ جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا اُن کا یہ اعتقاد نہیں ہے اور وہ اس بات کو دینی امر خیال نہیں کرتے کہ حضرت الیاس آسمان پر انسانی جسم و شکل کے ساتھ بدون چکھنے ذائقہ موت کے ایک آتشیں گاڑی میں بذریعہ ایک آندھی کے اٹھائے گئے ہیں؟ اور کیا عیسائی اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیح مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے

گئے اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے یعنی خود اپنی ہی دست راست کی طرف کیونکہ وہ خود خدا تھے؟ (متی باب ۲۶ ورس ۷، مرقس باب ۱۶ ورس ۱۹)

اس واسطے ہم تمام عیسائیوں کو جو ایسی خراب اور ایذا رساں نظیر کی تقلید کی جانب مائل ہیں۔ ان کے احکام مرقومۃ الذیل کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ "تو اُس ذرہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اُس کو نہیں دیکھتا۔ تو اپنے بھائی سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرہ نکلوا لے جب کہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ کا شہتیر نکال لے تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ کا ذرہ نکالنے کے لئے صاف نظر آئے گا" (لوقا باب ۶ ورس ۴۱ و ۴۲)

گرم جوش پیرو ہمیشہ اس قسم کے واقعات کو جب نظم یا نثر میں بیان کرتے ہیں۔ تو اُس میں شاعرانہ خیالات ملا دیتے ہیں۔ اسی طرح معراج کے حالات نظم و نثر میں لوگ بیان کرتے ہیں تو اُس میں بھی شاعرانہ خیالات ملا دیتے ہیں۔ یہ امر مسلمان گرم جوش پیرؤں پر موقوف نہیں ہے، بلکہ عیسائی گرم جوش پیروؤں کا بھی یہی حال ہے۔ ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰ کے آسمان پر چلے جانے کے قصہ کو نہایت شاعرانہ رنگینی سے نظم کیا ہے جس کا ترجمہ ہم لکھتے ہیں۔

اُس نے آسمان کی طرف مراجعت کی اور اُس کے پیچھے صدائے مرحبا اور دس ہزار چنگوں کی سُریلی آوازیں تھیں جو زمزمہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں۔ زمین اور ہوا اُن کی آواز سے گونج رہی تھی تمام افلاک و بروج سے صدائے بازگشت آرہی تھی۔ سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لئے ٹھیر گئے تھے۔ جب کہ یہ نورانی جلوس طنطنہائے شادکامی کے ساتھ عالم بالا کا عازم ہوا۔ اُنھوں نے یہ نغمہ گایا اے لازوال دروازہ کھُل جاؤ۔ اے آسمانو اپنے دروازوں کو واکرو اور اس بڑے نجات دہندہ کو جو اپنے کام کو اختتام پر پہنچا کر شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے اندر لے لو اور اب خدا تعالیٰ نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ کرے گا اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولے الاجنحہ کو رحمت آسمانی کے پیغام دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا۔

پس کیا کسی مسلمان کو زیبا ہے کہ ان شاعرانہ خیالات کو مذہب عیسوی میں داخل قرار دے کر اُن پر بیہودہ طعن و تشنیع شروع کرے۔

اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اُس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی کیا نشانیاں دیکھیں یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں بجز اس کے کہ آنحضرتؐ نے خدا کی کچھ نشانیاں دیکھیں اور کچھ مذکور نہیں ہے۔ مگر قرآن مجید کے طرز کلام پر اگر ہم غور کریں اور اُس سے اُن نشانیوں کا استنباط

کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید میں آیت اور آیات کا لفظ احکام پر اطلاق ہوا ہے اور دکھلانے کا لفظ کسی بات پر کامل یقین کرا دینے کی نسبت بولا جاتا ہے۔ پس آیت معراج کے ان الفاظ کے "لنریہ من آیاتنا" کے یہ معنی ہوئے "تاکہ یقین کرا دیں ہم اُس کو اپنے بعض حکموں سے"۔ پس وہ نشانیاں وہی احکام تھے جو عالم رویا میں اُن کو وحی کیے گئے۔ اب ہم کو تلاش کرنی چاہیئے کہ وہ احکام کیا تھے۔ جب ہم اُس مقدس سورت کو بغور پڑھتے ہیں اور بخوبی چھان بین کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام جو آنحضرتؐ پر منکشف ہوئے اور جو اسی سورت میں مذکور ہیں وہ یہ ہیں:-

لا تجعل مع اللہ الٰہا اٰخر فتقعد مذموما مخذولا (آیت ۲۲)

مت مقرر کر ساتھ اللہ کے معبود اور پس بیٹھ رہے گا تو مذمت کیا گیا ہلاکت میں سونپا ہوا۔

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما (آیت ۲۴)

اور حکم کیا تیرے پروردگار نے کہ نہ پوجو مگر اُسی کو۔ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر پہنچیں تیرے نزدیک بڑھاپے کو دونوں میں سے ایک یا دونوں۔ پس مت کہہ اُن کو اُف اور مت ڈانٹ اُن کو۔ اور کہہ اُن کو معزز کہنا۔

واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا (آیت ۲۵)

اور نیچا کر اُن دونوں کے لئے ذلت کا بازو مہربانی سے اور کہہ اے پروردگار رحم کر اُن پر جس طرح پالا اُنھوں نے مجھ کو چھٹپن میں۔

واٰت ذاالقربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا (آیت ۲۸)

اور دے رشتہ دار کو اُس کا حق اور مسکین کو اور مسافروں کو اور فضول خرچی مت کر۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الیٰ عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا (آیت ۳۱)

اور مت کر اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کی طرف اور مت کھول دے اُس کو بالکل کھول دینا کہ بیٹھ رہے تو ملامت کیا ہوا درماندہ۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان

اور مت مار ڈالو اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہم اُن کو اور تم کو روزی دیتے ہیں۔ بے شک اُن کا مار ڈالنا

خطاء کبیرا (آیت ۳۳)	بڑا گناہ ہے۔
ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا (آیت ۳۴)	اور زنا کے پاس مت جاؤ۔ بے شک وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔
ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق (آیت ۳۵)	اور مت مار ڈالو اُس جان کو جس کو خدا نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔
ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتی یبلغ اشدہ واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا۔ (آیت ۳۶)	اور مت چھوؤ یتیم کے مال کو مگر پسندیدہ طریقہ سے یہاں تک کہ وہ پہنچے اپنی جوانی کو اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد پوچھا جائے گا۔
واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم۔ (آیت ۳۷)	اور پورا کرو پیمانہ کو جب ناپو اور وزن کرو سیدھ ترازو سے۔
ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔ (آیت ۳۸)	اور اس بات کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھ کو علم نہیں ہے بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہوگا۔
ولا تمش فی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا (آیت ۳۹)	اور زمین میں اکڑتا ہوا مت چل۔ یقیناً تو زمین کو پھاڑ نہ ڈالے گا اور لمبان میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا۔
کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا۔ (آیت ۴۰)	ان سب باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔
ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ ولا تجعل مع اللہ الھا آخر فتلقی فی جھنم ملوما مدحورا (آیت ۴۱)	یہ اُن چیزوں میں سے ہے کہ تیرے پروردگار نے وحی بھیجی تیری طرف حکمت سے۔ اور مت قرار دے خدا کے ساتھ دوسرا خدا کہ ڈالا جائے تو دوزخ میں ملامت کیا ہوا راندہ ہوا۔

٭پچھلی آیت سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان احکام کی وحی خدا تعالےٰ نے دی تھی اور جو کہ یہ تمام احکام اسی سورۃ معراج میں بلفظ وحی بیان ہوئے ہیں اُس سے یقین ہوتا ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ وسلم کو شب معراج میں احکام کا انکشاف ہوا تھا۔

بعض روایتیں اس خواب میں اور بہت سی چیزوں کے ظاہر ہونے کا بیان کرتی ہیں مگر اُن کی صحت کے واسطے کوئی بھی معتبر سند نہیں ہے۔ اور ایسی بہت کم روایتیں ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا تک پہنچتا ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان راویوں نے کوئی بات قرآن مجید سے اور کوئی بات حدیثوں سے بلا تنقیح اُن کی صحت کے اور کوئی بات کسی راوی کی زبانی روایت سے اور کوئی دوسری بات کسی دوسرے راوی کی زبانی روایت سے چُن کر اور اُن سب پر اپنے بے دلیل اور وہمی خیالات کا اضافہ کرکے ایک قصہ گھڑ لیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ سب روایتیں کچھ عقل ہی کے برخلاف نہیں ہیں بلکہ خود دین اسلام کے عقائد اصولی کے اس قدر خلاف ہیں کہ اُن پر ذرہ برابر بھی اعتقاد رکھنا محال ہے۔

علاوہ اس کے یہ روایتیں ایک دوسری سے ایسی مخالف اور متناقض ہیں کہ ہم کو کوئی شخص ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک کی دوسری سے تطبیق کر سکے۔ اس مقصد سے کہ جو کچھ ہم نے اوپر اُن کیا ہے ہماری اس کتاب کے پڑھنے والوں کے ذہن میں بخوبی آجاے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُن سب روایتوں کو اس مقام پر نقل کریں اور اُن کے اختلافات دکھانے کو اُن کو علیحدہ علیحدہ اٹھارہ حصوں میں تقسیم کریں۔

اوّل۔ اُن اختلافات کو دکھلایا جاتا ہے جو مقام وقوع معراج سے متعلق ہیں

عن قتادۃ عن انس بن مالک عن مالک بن صعصعۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثھم عن لیلۃ اسری بہ بینما انا فی الحطیم وربما قال فی الحجر۔ (قتادہ)

مالک بن صعصعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں سے شب معراج کا قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ اس درمیان میں کہ "میں حطیم میں تھا" اور کبھی فرمایا کہ حجر میں۔

عن ابن شہاب عن انس قال کان

انس سے روایت ہے کہ ابوذر حدیث بیان کیا کرتے تھے

ابو ذر یحدث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فرج عنی سقف بیتی وانا بمکۃ (ابن شہاب)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے گھر کی چھت شق ہوئی اور میں مکہ میں تھا۔

عن ام ھانی انھا قالت ما اسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا وھو فی بیتی تلک اللیلۃ (ام ھانی)

ام ہانی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ وہ اُس رات کو میرے گھر میں تھے۔

وقد روی عمر بن الخطاب فی حدیث الاسراء عنہ علیہ السلام انہ قال ثم رجعت الی خدیجۃ وما تحولت عن جانبھا (شفاء)

حضرت عمر بن خطاب نے معراج کی حدیث میں آنحضرت سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا پھر واپس آیا میں خدیجہ کی طرف اور اُنھوں نے کروٹ نہیں بدلی تھی۔

دوم۔ ان اختلافات کو دکھلایا جاتا ہے جو بروقت شروع معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے متعلق ہیں

مضطجعا (قتادہ)

لیٹے ہوئے (قتادہ)

وعن الحسن بینما انا نائم فی الحجر جاءنی جبرئیل فھمزنی بعقبہ فقمت فجلست فلم ار احدا فعدت الی مضجعی فذکر ذلک ثلثا فقال فی الثالثۃ فاخذ بعضدی فجرنی الی باب المسجد (حسن)

اس درمیان میں کہ میں حجر میں سویا ہوا تھا جبرئیل میرے پاس آئے پھر ٹھوکا دیا ایڑی سے پس میں اُٹھ بیٹھا سو مجھ کو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر میں اپنے خواب گاہ کی طرف پھرا۔ آپ نے (رسول اللہ نے) اُس کو تین بار ذکر کیا اور تیسری بار فرمایا کہ میرے بازو کو پکڑا اور مسجد کے دروازہ تک کھینچ لائے (حسن)

عن انس وھو نائم فی المسجد الحرام وذکر القصۃ ثم قال فی اخرھا فاستیقظت وانا بالمسجد الحرام (شفاء قاضی عیاض)

انس سے روایت ہے کہ وہ "سوتے ہوئے تھے مسجد حرام میں" قصہ کو بیان کیا۔ پھر اخیر میں کہا کہ جاگا میں۔ اور میں مسجد حرام میں تھا۔

(شفاء قاضی عیاض)

صلی العشاء الاخرۃ و نام بیننا فلما کان قبل الفجر اھبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما صلی الصبح وصلینا قال یا ام ھانی لقد صلیت معکم العشاء الاخرۃ کما رایت بھذا الوادی ثم جئت بیت المقدس فصلیت فیہ ثم صلیت الغداۃ معکم الان کما ترون (ام ھانی)

آنحضرت نے اخیر عشاء پڑھی اور ہم لوگوں میں سوئے فجر سے پہلے آنحضرت نے ہم لوگوں کو جگایا۔ پھر جب آپ نے صبح کی نماز پڑھ لی اور ہم لوگوں نے پڑھ لی آپ نے فرمایا اے ام ہانی میں نے تم لوگوں کے ساتھ اخیر عشاء پڑھی جیسا کہ تم نے اس میدان میں دیکھا۔ پھر میں بیت المقدس پہنچا اور وہاں نماز پڑھی۔ پھر صبح کی نماز اس وقت تم لوگوں کے ساتھ پڑھی جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو (ام ہانی)

فی روایۃ عبد بن حمید عن ھمام بینا انا نایم و ربما قال مضطجع و فی الروایۃ الاخری بین النایم والیقظان (شفاء قاضی عیاض)

ہمام سے روایت ہے کہ اس درمیان میں کہ میں سویا ہوا تھا اور کبھی فرمایا کہ لیٹا ہوا تھا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ سونے اور جاگنے کے درمیان میں۔ (شفاء عیاض)

وحکوا عن عایشۃ انھا قالت ما فقدت جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (شفاء)

عائشہؓ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم گم نہیں کیا۔ (شفاء)

سوم۔ متعلق شق صدر

اذا تانی ات فشق ما بین ھذہ الی ھذہ یعنی من ثغرۃ نحرہ الی شعرتہ۔ (قتادہ)

کہ میرے پاس ایک آنے والا آیا اور یہاں سے یہاں تک چاک کر دیا یعنی سینہ کی ہڈی سے بالوں تک (قتادہ)

فنزل جبرئیل ففرج صدری (ابن شہاب)

پس اترے جبرئیل اور چاک کیا میرا سینہ۔ (ابن شہاب)

چہارم۔ واقعات بعد شق صدر

فاستخرج قلبی ثم اتیت بطست من ذھب ملوا ایمانا فغسل قلبی ثم

پس میرا دل نکالا پھر ایک طشت سونے کا لائے جو ایمان سے بھرا ہوا تھا پھر میرے دل کو دھویا گیا پھر بھر دیا

حشی ثم اعید (قتادہ)

گیا اور ویسا ہی کردیا گیا (قتادہ)

وفی روایۃ ثم غسل البطن بماء زمزم ملاء ایمانا و حکمۃ (قتادہ)

ایک روایت میں ہے کہ پھر پیٹ کو زمزم کے پانی سے دھویا جو ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا تھا (قتادہ)

ثم غسلہ بماء زمزم ثم جاء بطست من ذھب ممتلی حکمۃ وایمانا فافرغہ فی صدری ثم اطبقہ (ابن شہاب)

پھر اُس کو دھویا زمزم کے پانی سے پھر ایک طشت سونے کا لایا گیا جو حکمت و ایمان سے بھرا ہوا تھا۔ پس اُس کو میرے سینہ میں اُنڈیلا اور پھر برابر کردیا۔ (ابن شہاب)

پنجم۔ متعلق براق

ثم اتیت بدابۃ دون البغل وفوق الحمار ابیض یقال لہ البراق یضع خطوہ عند اقصی طرفہ (قتادہ)

پھر ایک چوپایہ میرے پاس لایا گیا خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا۔ سفید رنگ کا جس کا نام براق تھا۔ جس حد تک اُس کی نظر جاتی تھی اس کا قدم وہیں پڑتا تھا۔ (قتادہ)

عن ثابت البنانی عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتیت بالبراق وھو دابۃ ابیض طویل فوق الحمار و دون البغل یقع حافرہ عند منتھی طرفہ (ثابت)

انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس براق لایا گیا جو ایک سفید لانبا چارپایہ ہے گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا سُم وہاں پڑتا تھا جہاں تک اُس کی نگاہ جاتی تھی۔ (ثابت)

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی بالبراق لیلۃ اسری بہ ملجما مسرجا (انس)

انس سے روایت ہے کہ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی۔ براق لایا گیا۔ زین کسا ہوا اور لگام چڑھا ہوا (انس)

ثم اخذ بیدی فعرج بی الی السماء (ابن شہاب)

پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ کو آسمان تک چڑھائے گیا (ابن شہاب)

ششم۔ متعلق سواری براق

فحملت علیہ (قتادہ)

پس میں اس پر سوار کرایا گیا (قتادہ)

نور کبتہ (ثابت)	پس میں اُس پر سوار ہوا (ثابت)
فاستصعب علیہ فقال لہ جبرئیل انجمن تفعل ھذا فما رکبک احد اکرم اللہ منہ فارفض عرقا وقال الترمذی ھذا حدیث غریب (انس)	پس اُس کو دشوار گذرا۔ جبرئیل نے اُس سے کہا۔ ارے تو محمد کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔ کوئی شخص اُن سے زیادہ بزرگ تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پس وہ پسینے سے تر ہو گیا ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ (انس)

ہفتم۔ واقعات بیت المقدس پہنچنے کے

حتی اتیت بیت المقدس فربطتہ بالحلقۃ التی یربط بھا الانبیاء (ثابت)	یہاں تک کہ میں بیت المقدس آیا۔ پس میں نے اُس کو اُسی حلقہ میں باندھ دیا جس میں اورانبیا باندھا کرتے ہیں (ثابت)
عن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما انتھینا الی بیت المقدس قال جبرئیل باصبعہ فخرق بھا الحجر فشد بہ البراق (رواہ الترمذی)	بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب ہم بیت المقدس پہنچے جبرئیل نے اپنی اُنگلی سے اشارہ کیا۔ پس پتھر پھٹ گیا اور اس سے براق کو اٹکا دیا (ترمذی نے اس کو روایت کیا)

قتادہ اور اس کے سوا اور راویوں نے جناب پیغمبر خدا کے بیت المقدس میں جانے اور وہاں چند رسوم کے ادا کرنے کا جن کو اب ہم بیان کریں گے کچھ ذکر نہیں کیا ہے۔

ہشتم۔ رسوم جو بیت المقدس میں ادا کی گئیں

قال ثم دخلت المسجد فصلیت فیہ رکعتین (ثابت)	فرمایا آنحضرت نے پھر داخل ہوا میں مسجد میں اور دو رکعت نماز اُس میں پڑھی (ثابت)
عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد رائیتنی فی الحجر وقریش تسالنی عن مسرای فسالتنی عن اشیاء من بیت المقدس لم اثبتھا فکربت کربا ما کربت مثلہ	فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں حجر میں تھا قریش میری معراج کا حال پوچھ رہے تھے۔ پس اُنھوں نے مجھ سے بیت المقدس کے متعلق چند باتیں پوچھیں جو مجھے یاد نہیں رہی تھیں۔ اس پر مجھ کو ایسا صدمہ ہوا کہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ پس خدا نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا کہ میں اس

فرفعه لي انظر اليه ما يسألوني عن شيء الا نبأتهم وقد رأيتني في جماعة من الانبياء فاذا موسى قائم يصلي فاذا رجل ضرب جعد كأنه من رجال شنوءة فاذا عيسى قائم يصلي اقرب الناس به شبها عروة بن مسعود الثقفي فاذا ابراهيم قائم يصلي اشبه الناس به صاحبكم يعني نفسه فحانت الصلوة (صلوة العصر) فاممتهم فلما فرغت من الصلوة قال لي قائل يا محمد هذا مالك خازن النار فسلم عليه فالتفت اليه فبدأني بالسلام (رواه مسلم)

کو دیکھنے لگا۔ پھر جو بات انھوں نے پوچھی میں نے سب بتائی۔ اور میں نے اپنے کو جماعت انبیاء میں دیکھا۔ یکایک موسیٰ نظر آئے کہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ ایک پیچیدہ مو آدمی تھے گویا شنوۃ کے لوگوں میں سے ہیں۔ پھر عیسیٰ نظر آئے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ عروۃ بن مسعود ثقفی اُن سے صورت میں بہت ملتے ہیں۔ پھر ابراہیم نظر آئے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اُن سے بہت ملتا ہوا تمھارا ساتھی ہے (حضرتؐ نے اس سے اپنے کو مراد لیا) پھر نماز عصر کا وقت ہوا۔ میں اُن سب کا امام بنا۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوا تو کسی کہنے والے نے مجھ سے کہا اے محمد یہ مالک ہے دوزخ کا داروغہ سو اس کو سلام کرو۔ میں اُن کی طرف متوجہ ہوا تو انھوں نے خود سلام میں پیش دستی کی۔

(اس کو مسلم نے روایت کیا ہے)

عن جابر انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لما كذبني قريش قمت في الحجر فجلى الله لي بيت المقدس فطفقت اخبرهم عن آياته وانا انظر اليه (متفق عليه)

جابر سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا جب قریش نے مجھ کو جھٹلایا تو میں حجر میں کھڑا ہوا تھا۔ پس خدا نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور بیت المقدس کی علامتیں بتاتا جاتا تھا (متفق علیہ)

وفي حديث ابي هريرة ثم سار حتى اتى بيت المقدس فنزل فربط فرسه الى صخرة فصلى مع الملائكة فلما قضيت الصلوة قالوا يا جبريل من هذا معك قال هذا محمد رسول الله خاتم النبيين قالوا وقد ارسل اليه قال نعم قالوا حياه الله من

ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے پھر چلے آنحضرتؐ یہاں تک کہ بیت المقدس آئے پھر اُتر کر اپنے گھوڑے کو ایک پتھر سے باندھ دیا۔ پھر فرشتوں کے ساتھ ساتھ نماز پڑھی۔ جب نماز ہولی تو لوگوں نے پوچھا اے جبریل تمھارے ساتھ یہ کون ہیں۔ جبرئیل نے کہا محمد رسول اللہ خاتم الانبیاءؐ لوگوں نے کہا کیا اُن کے پاس پیغام بھیجا گیا۔ انھوں نے کہا ہاں۔ سب نے کہا۔ خدا اُن کو زندہ رکھے۔ بڑے

اخ وخلیفة فنعم الاخ ونعم الخلیفة ثم لقوا ارواح الانبیاء فاثنوا علی ربهم وذکر کلام کل واحد منهم وهم ابراهیم وموسی وعیسی وداؤد وسلیمان ثم ذکر کلام النبی صلی اللہ علیه وسلم اثنی علی ربه فقال کلکم اثنی علی ربه وانا اثنی علی ربی الحمد للہ الذی ارسلنی رحمة للعالمین وکافة للناس اجمعین بشیرا و نذیرا و انزل علی القرآن فیه تبیان کل شیٔ وجعل امتی خیر امة وجعل امتی وسط وجعل امتی هم الاولون وهم الاخرون وشرح لی صدری ووضع عنی وزری ورفع لی ذکری وجعلنی فاتحا وخاتما فقال ابراهیم بهذا افضلکم یا محمد (شفاء قاضی عیاض)

اچھے بھائی اور خلیفہ ہیں - پھر انبیاء کی روحوں سے ملاقات ہوئی - سب نے اپنے خدا کی تعریف بیان کی اور ہر ایک کا کلام بیان کیا (ابو ہریرہ نے) اور وہ ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و داؤد و سلیمان تھے - پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بیان کیا (ابو ہریرہ نے) پس کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا کی تعریف بیان کی تو کہا کہ تم سب لوگوں نے اپنے خدا کی تعریف کی - اور اب میں اپنے خدا کی تعریف بیان کرتا ہوں - حمد ہے اُس خدا کو جس نے مجھ کو تمام عالم کے لئے رحمت کر کے بھیجا اور تمام لوگوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا - اور مجھ پر قرآن اُتارا جس میں ہر ایک شے کی توضیح ہے اور میری اُمت کو اور امتوں سے افضل کیا اور میری اُمت کو وسط کیا اور میری امت کو قرار دیا کہ وہی پہلے ہیں اور وہی پچھلے ہوں گے - اور میرا سینہ کھول دیا اور بوجھ مجھ سے اُتار دیا اور میرا چرچا بلند کیا - اور مجھ کو فاتح کیا اور خاتم کیا - پس ابراہیم نے کہا اسی سے محمدؐ تم سب سے بڑھ گئے - (شفا - قاضی عیاض)

وانکر ذلک (ای الصلوٰة فی البیت المقدس) حذیفة بن الیمان وقال واللہ ما زال عن ظهر البراق حتی رجع (شفاء)

اور انکار کیا اس کا (یعنی بیت المقدس میں نماز کا) حذیفہ بن یمان نے اور کہا بخدا رسول اللہ براق کی پیٹھ سے الگ نہیں ہوئے واپس آنے تک - (شفاء)

نہم - واقعات بروقت خروج از بیت المقدس

ثم خرجت فجاءنی جبرئیل باناء من خمر واناء من لبن فاخترت

پھر میں نکلا پس جبرئیل میرے پاس شراب کا ایک ظرف اور دودھ کا ایک ظرف لائے، پس میں نے دودھ کو

اللبن فقال جبرئیل اخترت الفطرۃ (ثابت)

اختیار کیا۔ جبرئیل نے کہا تم نے فطرت کو اختیار کیا۔ (ثابت)

دہم ۔ واقعات فلک اوّل

فانطلق جبرئیل حتی اتی السماء الدنیا فاستفتح قیل من ھذا قال جبرئیل قیل ومن معک قال محمد قیل وقد ارسل الیہ قال نعم قیل مرحبا فنعم المجی جاء ففتح فلما خلصت فاذا فیھا ادم فقال ھذا ابوک ادم فسلم علیہ فسلمت علیہ فرد السلام ثم قال مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح (قتادہ)

پس چلے جبرئیل یہاں تک کہ آسمان دنیا تک پہنچے اور کھلوایا۔ لوگوں نے کہا یہ کون ہیں۔ کہا جبرئیل۔ پھر لوگوں نے کہا اور تمھارے ساتھ کون ہے کہا محمد۔ لوگوں نے کہا کیا وہ بلائے گئے ہیں کہا ہاں۔ لوگوں نے کہا مرحبا خوب آئے پھر کھل گیا (آسمان) پھر میں جب پہنچا تو آدم نظر پڑے۔ جبرئیل نے کہا۔ تمھارے باپ آدم ہیں۔ اُن کو سلام کرو۔ میں نے سلام کیا۔ اُنھوں نے سلام کا جواب دیا پھر کہا اچھے بیٹے کو مرحبا۔ اچھے نبی کو مرحبا (قتادہ)

ثم عرج بنا الی السماء (وساق مثل معناہ) قال اذا انا بادم فرحب بی ودعا لی بخیر (ثابت)

پھر مجھ کو آسمان پر لے کر چڑھے (اور اسی طرح بیان کیا) فرمایا یکایک آدم نظر پڑے پس مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔ (ثابت)

فلما جئت الی السماء الدنیا (وساق مثل معناہ) اذا رجل قاعد علی یمینہ اسودۃ وعلی یسارہ اسودۃ اذا نظر قبل یمینہ ضحک واذا نظر قبل شمالہ بکی فقال مرحبا بالنبی الصالح

پس جب میں آسمان دنیا تک پہنچا (اور اُس کے مثل بیان کیا) یکایک ایک شخص نظر پڑے جن کے داہنے بائیں سیاہ شکلیں ہیں۔ جب داہنی جانب دیکھتے ہیں تو ہنس پڑتے ہیں اور بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا اچھے نبی کو مرحبا اچھے بیٹے کو مرحبا۔ میں نے جبرئیل سے کہا یہ کون ہیں کہا یہ

ولا بن الصالح قلت لجبرئیل من هذا قال هذا ادم وهذه الاسودة عن یمینه وعن شماله نسم بنیه فاهل الیمین منهم اهل الجنة والاسودة التی عن شماله اهل النار فاذا نظر عن یمینه ضحک واذا نظر قبل شماله بکی

آدم ہیں۔ اور اُن کے دائیں اور بائیں جانب کی سیاہ صورتیں اُن کی اولاد کی روحیں ہیں۔ سو دہنی جانب والے اہل جنت ہیں اور بائیں طرف والے اہلِ دوزخ ہیں پس جب وہ دہنی طرف دیکھتے ہیں تو ہنس پڑتے ہیں.......... اور بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔

(ابن شہاب)

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینا انا قاعد ذات یوم اذ دخل جبرئیل علیہ السلام فوکز بین کتفی فقمت الی شجرۃ فیها مثل وکری الطائر فقعد فی واحدۃ وقعدت فی الاخری فنمت حتی سدت الخافقین ولو شئت لمست السماء وانا اقلب وبصرت جبرئیل کانه حلس لاطئی فعرفت فضل علمه باللہ علی وفتح لی باب السماء ورایت النور الاعظم واذا دونی الحجاب وفرجة الدر والیاقوت ثم اوحی اللہ الی ما شاء ان یوحی (شفاء قاضی عیاض)

(ابن شہاب)

انس سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت نے میں بیٹھا ہوا تھا ایک دن یکایک جبرئیل آئے اور میرے دونوں شانوں کے درمیان ذرا دبایا پس میں ایک درخت کی طرف گیا، جس میں پرند کے گھونسلے بھی تھے۔ پس ایک میں جبرئیل بیٹھے اور ایک میں میں، پھر میں سوگیا یہاں تک کہ خافقین سے آگے بڑھ گئے۔ اور اگر میں چاہتا تو آسمان کو چھولیتا۔ اور میں پلٹے کھاتا تھا۔ مگر جبرئیل کو دیکھا تو وہ گویا عرق گیر تھے۔ (یعنی اپنی جگہ جمے رہے) پس میں نے اُن کا افضل ہونا علم الٰہی میں اپنے سے جان لیا۔ اور میرے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور میں نے نورِ اعظم دیکھا۔ اور یکایک میرے سامنے حجاب تھا اور موتی و یاقوت کے دریچے۔ پھر خدا نے میری طرف وحی کی جو وحی چاہی۔ (شفا قاضی عیاض)

وذکر البزاز عن علی ابن ابی طالب لما اراد اللہ تعالی ان یعلم رسوله الاذان جاءه جبرئیل بدابة یقال لها البراق فذهب یرکبها فاستصعب

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خدا نے چاہا کہ اپنے رسول کو اذان سکھائے۔ تو جبرئیل اُن کے پاس ایک چارپایہ لائے جس کو براق کہتے ہیں۔ پس آپ اس پر چڑھنے گئے۔ سو اُس کو

عليه فقال لها جبرئيل عليه السلام
اسكني فوالله ما ركبك غير اكرم على
الله من محمد صلى الله عليه وسلم
فركبتها حتى اتى بها الى حجاب الذى
يلي الرحمن تعالى فبينا هو كذلك
اذ خرج ملك من الحجاب فقال
رسول الله صلى الله عليه وسلم يا
جبرئيل من هذا قال والذى بعثك
بالحق نبيا انى لاقرب الخلق مكانا و
ان هذا الملك ما رأيته منذ خلقت
قبل ساعتى هذه فقال الملك الله
اكبر الله اكبر فقيل له من وراء الحجاب
صدق عبدى انا اكبر انا اكبر ثم قال
الملك اشهد ان لا اله الا الله فقيل
من وراء الحجاب صدق عبدى انا الله
لا اله الا انا وذكر مثل هذا فى
بقية الاذان الا انه لم يذكر جوابا
من قوله حى على الصلوة حى على الفلاح
وقال ثم اخذ الملك بيد محمد صلى الله
عليه وسلم فقدمه فأم اهل السماء فيهم
آدم ونوح قال ابو جعفر محمد بن على
الحسين راويه اكمل الله لمحمد صلى الله
عليه وسلم الشرف على اهل السموات
والارض (شفاء)

دشوار لگا - جبرئیل نے اُس سے کہا ٹھیر - بخدا محمد
صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اچھا شخص خدا کے
نزدیک تجھ پر نہیں سوار ہوا ہے - پس میں اُس پر
سوار ہوا - یہاں تک کہ اُس پردہ کے پاس آیا جو
خدا کے قریب ہے - اسی درمیان میں پردہ سے
ایک فرشتہ نکلا - پس آنحضرتؐ نے کہا اے جبرئیل
یہ کون ہے - جبرئیل نے کہا اُس کی قسم جس نے تجھے
نبی برحق مبعوث کیا میں خلق اللہ میں سب سے زیادہ
مقرب بارگاہ ہوں - مگر اس فرشتہ کو اس وقت سے
پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا - جب سے میں پیدا ہوا - پس
فرشتہ نے کہا اللہ اکبر، اللہ اکبر - پس پردہ کی اوٹ
سے آواز آئی - سچ کہا میرے بندہ نے - میں بڑا ہوں -
میں بڑا ہوں - پھر فرشتہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں
کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ - پردے سے آواز آئی
کہ سچ کہا میرے بندہ نے - میں خدا ہوں اور میرے سوا
کوئی خدا نہیں ہے - اور اسی طرح ذکر کیا اذان
کے بقیہ میں - مگر حی علی الصلوۃ - حی علی الفلاح کا
جواب نہیں ذکر کیا - اور کہا پھر فرشتہ نے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھایا - پس آنحضرت
نے آسمان والوں کی امامت کی جس میں آدم و نوح تھے -
ابو جعفر محمد بن علی الحسین جو راوی ہیں انھوں نے کہا کہ خدا
نے آنحضرت کو اہل زمین اور آسمان دونوں پر بزرگی
بخشی - (شفاء)

یازدہم۔ واقعات فلک دوم

ثم صعد بی حتی اتی السماء الثانیہ (وساق مثل معناہ) اذا یحیی وعیسیٰ وھما ابنا خالۃ (وساق مثلہ) قالا مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح (قتادہ)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ دوسرے آسمان پر آئے (اور اُسی کے ہم مضمون بیان کیا) ناگاہ وہاں یحیٰی وعیسیٰ تھے اور وہ دونوں بھائی ہیں (اور اُسی طرح بیان کیا) اُن دونوں نے کہا نیک بھائی اور نیک نبی کو مرحبا (قتادہ)

ثم عرج بنا الی السماء الثانیہ (وساق مثلہ) فاذا انا بابنی الخالۃ عیسیٰ بن مریم ویحیٰی بن ذکریا صلعم فرحبالی ودعالی بخیر (ثابت)

پھر مجھ کو دوسرے آسمان پر لے کر چڑھے (اور اسی طرح بیان کیا) پس ناگاہ میں دو بھائیوں عیسیٰ بن مریم ویحیٰی بن ذکریا کے پاس تھا۔ انھوں نے مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔ (ثابت)

حتی عرج بی الی السماء الثانیۃ (وساق مثلہ) قال انس فذکر انہ وجد فی السموات آدم وادریس وموسیٰ وعیسیٰ وابراھیم ولم یثبت کیف منازلھم غیر انہ ذکر انہ وجد آدم فی السماء الدنیا وابراھیم فی السماء السادسۃ۔ (ابن شھاب)

یہاں تک کہ مجھ کو دوسرے آسمان تک چڑھا لے گئے (اور اُسی طرح بیان کیا) انس نے کہا کہ پس ذکر کیا۔ آنحضرتؐ نے کہ پایا آسمانوں میں آدم وادریس وموسیٰ وعیسیٰ وابراہیم کو اور اُن کے مقامات نہیں متعین کئے۔ ہاں اس قدر ذکر کیا کہ آدم کو آسمان دنیا میں پایا اور ابراہیم کو چھٹے آسمان میں۔ (ابن شہاب)

وفی روایۃ رای یوسف فی الثانیۃ ویحیٰی وعیسیٰ فی الثالثۃ (لمعات)

ایک روایت میں ہے کہ یوسف کو دوسرے آسمان میں دیکھا اور یحیٰی وعیسیٰ کو تیسرے آسمان میں (لمعات)

دوازدہم۔ واقعات فلک سوم

ثم صعد بی الی السماء الثالثۃ (وساق مثلہ) اذا یوسف (وساق مثلہ) قال مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح (قتادہ)

پھر مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چڑھے (اور اُسی طرح ذکر کیا) ناگاہ یوسف ملا اور اُسی طرح ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا نیک بھائی ونیک نبی کو مرحبا۔

ثم عرج بنا الی السماء الثالثہ (وساق مثلہ، فاذا ھو یوسف صلعم واذا ھو قد اعطی شطر الحسن فرحب لی ودعالی بخیر (ثابت)

پھر مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چڑھا اور اُسی طرح ذکر کیا، پس ناگاہ وہ یوسف صلعم تھے اور اُن کو حسن کا ایک حصہ ملا ہے۔ مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔ (ثابت)

وفی روایۃ رای ادریس فی الثالثہ (رسات)

اور ایک روایت میں ہے۔ ادریس کو تیسرے آسمان میں دیکھا (لمعات)

وفی روایۃ رای یحییٰ وعیسیٰ فی الثالثۃ (لمعات)

اور ایک روایت میں ہے یحییٰ و عیسیٰ کو تیسرے آسمان میں دیکھا (لمعات)

سیزدہم۔ واقعات فلک چہارم

ثم صعد بی حتی اتی السماء الرابعۃ (وساق مثلہ) فاذا ادریس (وساق مثلہ)۔ (قتادہ)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ چوتھے آسمان پر آئے (اور اسی طرح بیان کیا) ناگاہ ادریس نظر پڑے (اور اسی طرح بیان کیا) قتادہ)

ثم عرج بنا الی السماء الرابعۃ وذکر مثلہ فاذا انا بادریس فرحب لی ودعالی بخیر قال اللہ ورفعناہ مکانا علیا (ثابت)

پھر چوتھے آسمان پر لے کر چڑھے (اور اُسی طرح ذکر کیا) ناگاہ وہاں ادریس نظر پڑے سو مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔ خدا نے کہا ہے ہم نے اُن کا درجہ اونچا کیا۔ (ثابت)

وفی روایۃ رای ادریس فی الثالثہ وھارون فی الرابعۃ (لمعات)

ایک روایت میں ہے ادریس کو تیسرے آسمان میں دیکھا اور ہارون کو چوتھے میں (لمعات)

چہاردہم۔ واقعات فلک پنجم

ثم صعد بی حتی اتے السماء الخامسۃ (فذکر مثلہ) فاذا ھارون (فذکر مثلہ)۔ (قتادہ)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ پانچویں آسمان پر آئے (پس اسی طرح ذکر کیا)، یکایک وہاں ہارون تھے۔ (پس اُسی طرح ذکر کیا) (قتادہ)

ثم عرج السماء الخامسۃ

پھر پانچویں آسمان کی طرف چڑھے (پس اسی طرح ذکر

(فذكره) فاذا بهارون فرحب لي ودعا لي بخير (ثابت)

(کیا) یکایک وہاں ہارون تھے۔ اُنھوں نے مجھ کو مرحبا کہا۔ اور دعائے خیر دی (ثابت)

وفي رواية اخرى راى ادريس في الخامسة (لمعات)

دوسری روایت میں ہے کہ ادریس کو پانچویں آسمان میں دیکھا (لمعات)

پانزدہم۔ واقعات فلک ششم

ثم صعد بي حتى الى السماء السادسة (فذكر مثله) فاذا موسى (فذكر مثله) (قتادہ)

پھر مجھ کو چھٹے آسمان تک لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں موسیٰ تھے (پس اسی طرح بیان کیا) (قتادہ)

ثم عرج بنا الى السماء السادسة (فذكر مثله) فاذا انا بموسى فرحب بي ودعا لي (ثابت)

پھر مجھ کو چھٹے آسمان کی طرف لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں موسیٰ تھے سو مجھ کو مرحبا کہا۔ اور دعا دی (ثابت)

فلما جاوزت بكى قيل له ما يبكيك قال ابكي لان غلاما بعث بعدي يدخل من امته الجنة اكثر ممن يدخلها من امتي (قتادہ)

پس جب میں آگے بڑھ گیا تو وہ روئے۔ اُن سے پوچھا گیا کیوں روئے۔ کہا میں اس لئے روتا ہوں کہ ایک نوعمر میرے بعد مبعوث ہوا اور اُس کی اُمت کے لوگ میری اُمت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔ (قتادہ)

انه وجد ..... ابراهيم في السماء السادسة (ابن شهاب)

اُنھوں نے پایا ..... ابراہیم کو چھٹے آسمان میں (ابن شہاب)

وفي حديث شريك انه راى موسى في السابعة۔ (شفاء قاضي عياض)

اور شریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کو ساتویں آسمان میں دیکھا۔ (شفا قاضی عیاض)

شانزدہم۔ واقعات فلک ہفتم

ثم صعد بي الى السماء السابعة

پھر مجھ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے (پس اسی

(فذکر مثلہ) فاذا ابراھیم قال ھذا ابوک ابراھیم (فذکر مثلہ) قال مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح (قتادہ)

طرح ذکر کیا) ناگاہ وہاں ابراہیم تھے۔ جبرئیل نے کہا کہ یہ تمھارے باپ ابراہیم ہیں (پس اسی طرح ذکر کیا) اُنھوں نے کہا کہ اچھے بیٹے اور اچھے نبی کو مرحبا (قتادہ)

ثم صعد بی الی السماء السابعۃ (فذکر مثلہ) فاذا بابراھیم مسندا ظھرہ الی البیت المعمور واذا ھو ید خلہ کل یوم سبعون الف ملک لا یعودون الیہ (ثابت)

پھر مجھ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے (پس اُسی طرح ذکر کیا) وہاں ابراہیم تھے۔ بیت معمور کی طرف اپنی پیٹھ ٹیکے تھے۔ اور وہاں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور دوبارہ نہیں آتے (ثابت)

وفی حدیث شریک انہ رای موسٰی فی السابعۃ (شفاء قاضی عیاض)

شریک کی حدیث میں ہے کہ موسٰی کو ساتویں آسمان میں دیکھا (شفا قاضی عیاض)

ہفت دہم۔ واقعات سدرۃ المنتہٰی

ثم رفعت بی الی سدرۃ المنتہٰی فاذا نبقھا مثل قلال ھجر واذا ورقھا مثل اذان الفیلۃ وقال ھذا سدرۃ المنتہٰی۔ (قتادہ)

پھر میں سدرۃ المنتہٰی پہنچا سو اُس کے پھل ہجر (ایک گاؤں کا نام ہے) کی کُپھال کے برابر تھے اور اُس کے پتے ہاتھی کے کان کے سے تھے۔ جبرئیل نے کہا کہ یہ سدرۃ المنتہٰی ہے۔ (قتادہ)

ثم ذھب بی الی سدرۃ المنتہٰی واذا ورقھا کاذان الفیلۃ واذا ثمرھا کالقلال (ثابت)

پھر مجھ کو سدرۃ المنتہٰی تک لے گئے سو اُس کے پتے ہاتھی کے کان کے سے تھے اور پھل کُپھال کے برابر۔ (ثابت)

واذا اربعۃ انھار نھران باطنان ونھران ظاھران قلت ما ھذان یا جبرئیل قال اما الباطنان فنھران فی الجنۃ واما الظاھران فالنیل والفرات۔ (قتادہ)

وہاں چار نہریں تھیں دو باطن میں دو ظاہر ہیں۔ میں نے کہا اے جبرئیل یہ دونوں کیا ہیں۔ کہا دونوں باطن کی تو جنت کی دو نہریں ہیں اور جو ظاہر ہیں وہ نیل و فرات ہیں۔ (قتادہ)

وفي رواية ابي هريرة من طريق
الربيع بن انس فقيل لي هذه
السدرة المنتهى ينتهي اليها كل
واحد من امتك خلى احد على
سبيلك وهي السدرة المنتهى يخرج
من اصلها انهار من ماء غير اسن
وانهار من لبن لم يتغير طعمه وانهار
من خمر لذة للشاربين وانهار من عسل
مصفى وهي شجرة يسير الراكب في ظلها سبعين
عاما وان ورقة منها مظلة الخلق تغشيها
نور فيغشيها الملائكة قال فهو قوله تعالى
اذ يغشى السدرة ما يغشى فقال الله
تبارك وتعالى له سل فقال صلى الله عليه
وسلم يارب انك اتخذت ابراهيم خليلا
واعطيته ملكا عظيما وكلمت موسى تكليما
واعطيت داود ملكا عظيما والنت له
الحديد وسخرت له واعطيت سليمان
ملكا عظيما وسخرت له الجن والانس
والرياح والشياطين واعطيته ملكا لا ينبغي
لاحد من بعده وعلمت موسى التوراة
وعيسى الانجيل وجعلته يبرئ الاكمه و
الابرص وعذته من الشيطان الرجيم فلم
يكن عليهما سبيل فقال له ربه تعالى اتخذتك
حبيبا فهو مكتوب في التوراة محمد حبيب الرحمن
وارسلتك الى الناس كافة وجعلت امتك

اور ابوہریرہ کی ایک روایت میں ہے پس مجھ سے
کہا گیا یہ سدرۃ المنتہٰی ہے۔ تیری اُمت میں سے ہر ایک
کی پہنچ یہیں تک ہے سوائے ایک کے جو تیرے رستہ پر
ہے اور یہی سدرۃ المنتہٰی ہے جس کی جڑ سے پانی کی نہریں نکلی
ہیں جو بگڑتا نہیں۔ اور دودھ کی نہریں جس کا مزہ بدلا نہیں
اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لئے لذت بخش ہیں
اور صاف شہد کی نہریں اور وہ ایک درخت ہے کہ سوار اُس
کے سایہ میں ستر برس چلا جاتا ہے اور اُس کا ایک پتا تمام
خلق پر سایہ کرتا ہے پس اوپر نور چھا رہا ہے اور فرشتے چھائے
ہیں۔ خدا کے اس قول سے اذ یغشی السدرۃ ما یغشی (یعنی
جب سدرۃ المنتہٰی کو چھا لیا اُس چیز نے جس نے چھا لیا)
یہی مراد ہے۔ پس کہا خدائے برتر و پاک نے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم سے مانگ، پس کہا صلی اللہ علیہ وسلم نے اے پروردگار
تو نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور اس کو ایک بڑا ملک عنایت کیا
اور موسیٰ سے کلام کیا اور داؤد کو ایک بڑی سلطنت عطا
کی اور اُن کے لئے لوہے کو نرم کر دیا اور مسخر کر دیا۔ اور
سلیمان کو ایک بڑا ملک عطا کیا اور اُن کے لئے جن اور
آدمی اور ہوائیں اور شیاطین مسخر کر دیئے اور ایسا ملک
دیا کہ اُن کے بعد پھر کسی کو نہیں مل سکتا اور موسیٰ کو توراۃ
سکھائی اور عیسیٰ کو انجیل اور اُن کو ایسا کر دیا کہ وہ کوڑھی
اور مبروص کو اچھا کر دیتے تھے اور ان کو مردود شیطان سے
محفوظ رکھا سو شیطان اُن دونوں پر قابو نہیں پا سکتا پس
کہا خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے تجھ کو
حبیب بنایا سو توراۃ میں لکھا ہے کہ محمد حبیب الرحمٰن ہیں
اور میں نے تجھ کو تمام خلق اللہ پر بھیجا اور میں نے تیری اُمت

لا تجوز لهم خطیئة حتی یشهدوا انك عبدی ورسولی وجعلتك اول النبیین خلقا واخرهم بعثا واعطیتك سبعا من المثانی ولم اعطها نبیا قبلك وجعلتك فاتحا وخاتما۔ (شفاء قاضی عیاض)

کو ایسا کیا کہ وہ اگلے بھی ہیں اور پچھلے بھی اور تیری اُمت کی خطا محسوب نہیں ہوتی جب تک وہ یہ گواہی دیتے رہیں کہ تو میرا بندہ اور پیغمبر ہے۔ اور میں نے تجھ کو سب نبیوں سے پہلے پیدا کیا اور سب کے آخر میں بھیجا اور میں نے تجھ کو دوہرے لفظوں سات آیتوں والی دی اور تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور میں نے تجھ کو فاتح اور خاتم کیا۔

قال فلما غشیها من امر الله ما غشی تغیرت فما احد من خلق الله یستطیع ان ینعتها من حسنها (ثابت)

فرمایا کہ جب چھا گیا اُس پر خدا کے حکم سے جو چھا گیا تو وہ متغیر ہو گیا۔ اور خلق اللہ میں سے کوئی شخص اُس کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتا۔ (ثابت)

وقال ابن شهاب حتی اتیت سدرة المنتهی فغشیها الوان لا ادری ما هی وقال ثم ادخلت الجنة فاذا فیها جنابذ اللؤلؤ واذا ترابها المسك (کما بیجی)

اور ابن شہاب نے کہا یہاں تک کہ میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچا سو اُس کو ایسے رنگوں نے ڈھک لیا کہ میں جانتا تھا وہ کیا ہیں اور۔ کہا پھر داخل کیا گیا میں بہشت میں سو وہاں موتی کے گنبد تھے اور اُس کی مٹی مشک ہے (جیسا کہ آگے آتا ہے)

وعن عبد الله قال لما اسری برسول الله صلی الله علیه وسلم انتهی به الی سدرة المنتهی وهی فی السماء السادسة الیها ینتهی ما یهبط به من فوقها فیقبض منها قال اذ یغشی السدرة ما یغشی قال فراش من ذهب (عبد الله ابن مسعود)۔

اور عبداللہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی۔ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچائے گئے۔ اور وہ چھٹے آسمان پر ہے۔ اُسی تک ختم ہوتا ہے جو اُس پر اوپر سے اُترتا ہے سو وہ اُس کو پکڑ لیتا ہے کہا اذ یغشی السدرۃ ما یغشی سے مراد سونے کا بچھونا ہے۔

(عبداللہ ابن مسعود)

وفی حدیث شریك انه رای موسی فی السابعة قال بتفضیل کلام الله تعالی له قال ثم علا به فوق ذلك بما لا یعلمه الا الله تعالی فقال موسی لم اظن ان یرفع علی احد

اور شریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کو ساتویں آسمان میں دیکھا۔ خدا کی باتوں کی تفصیل اُن سے بیان کی کہا کہ پھر اتنے اوپر گئے کہ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا پس کہا موسیٰ نے مجھ کو گمان نہیں تھا کہ مجھ سے اوپر بھی کوئی جائے گا۔ (شفاء قاضی عیاض)

(شفاء قاضی عیاض)

ثم رفع لی البیت المعمور

پھر میرے سامنے بیت المعمور لایا گیا۔

(قتادہ)

(قتادہ)

ثم اتیت باناء من خمر واناء من لبن واناء من عسل فاخذت اللبن فقال ھی الفطرۃ انت علیھا وامتک

پھر میرے سامنے شراب اور دودھ اور شہد کے ظروف لائے گئے پس میں نے دودھ کو لے لیا۔ پس کہا کہ یہی فطرت ہے تو اور تیری اُمت اس پر ہے۔

(قتادہ)

(قتادہ)

قال ابن شہاب فاخبرنی ابن حزم عن ابن عباس وابا حیۃ الانصاری کانا یقولان قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم عرج لی حتی ظھرت المستوی اسمع فیہ صریف الاقلام

ابن شہاب نے کہا کہ مجھ کو ابن حزم نے خبر دی کہ ابن عباس اور ابو حیہ انصاری دونوں کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مجھ کو اوپر لے گئے یہاں تک کہ میں ایسی جگہ پر پہنچا جہاں قلم کے لکھنے میں چلنے کی آواز مجھ کو سُنائی دیتی تھی۔

(ابن شہاب)

(ابن شہاب)

ہشت دہم۔ احکام جو عنایت ہوئے

فاوحی اللہ الی ما اوحی (ثابت)

پس وحی کی خدا نے میری طرف جو کی (ثابت)

ثم فرضت علی الصلوۃ خمسین صلوۃ کل یوم (قتادہ)

پھر مجھ پر ہر روز پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔

(قتادہ)

ففرض علی خمسین صلوۃ فی کل یوم ولیلۃ (ثابت)

پھر مجھ پر ہر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کیں (ثابت)

قال ابن حزم وانس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ففرض اللہ علی امتی خمسین صلوۃ (ابن شہاب)

ابن حزم وانس نے کہا۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پس فرض کیں خدا نے میری امت پر پچاس نمازیں۔

(ابن شہاب)

فرجعت فمررت علی موسیٰ فقال بما امرت قلت امرت بخمسین صلوۃ کل یوم قال ان امتک لا تستطیع خمسین

پھر میں لوٹا اور موسیٰ پر گذرا انھوں نے کہا تم پر کیا فرض ہوا۔ میں نے کہا ہر روز پچاس نمازیں موسیٰ نے کہا۔ تمھاری اُمت ہر روز پچاس نمازیں نہیں ادا کر سکے گی۔

صلوٰۃ کل یوم وانی واللہ قد جربت الناس قبلک وعالجت بنی اسرائیل اشد المعالجۃ فارجع الی ربک فسئلہ التخفیف لامتک فرجعت فوضع عنی عشرا فرجعت الی موسیٰ فقال مثلہ فرجعت فوضع عشرا فرجعت الی موسیٰ فقال مثلہ فرجعت فوضع عنی عشرا فامرت بعشر صلوٰۃ کل یوم فرجعت الی موسیٰ فقال مثلہ فرجعت فامرت بخمس صلوٰۃ کل یوم (قتادہ)

اور میں بخدا تم سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اور بنو اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما چکا ہوں۔ تم خدا کی طرف واپس جاؤ اور کم کراؤ اپنی اُمت کے لئے۔ پس میں واپس گیا سو خدا نے دس نمازیں گھٹا دیں۔ پھر میں واپس آیا موسیٰ کی طرف۔ موسیٰ نے پھر وہی کہا میں پھر لوٹا۔ خدا نے دس اور بھی کم کر دیں۔ پھر میں موسیٰ کے پاس آیا۔ موسیٰ نے پھر وہی کہا۔ میں پھر لوٹا۔ خدا نے دس اور بھی کم کر دیں تاآنکہ پس مجھ کو ہر روز دس نمازوں کا حکم ہوا۔ پس پھر میں موسیٰ کے پاس آیا۔ موسیٰ نے پھر وہی کہا۔ میں پھر لوٹا۔ پس مجھ کو ہر روز پانچ نمازوں کا حکم ہوا۔ (قتادہ)

فنزلت موسیٰ فقال ما فرض ربک علی امتک قلت خمسین صلوٰۃ فی کل یوم ولیلۃ قال ارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف فان امتک لا تطیق ذلک فانی قد بلوت بنی اسرائیل وخبرتہم قال فرجعت الی ربی فقلت یا رب خفف عن امتی فحط عنی خمسا فرجعت الی موسیٰ فقلت حط عنی خمسا قال ان امتک لا تطیق ذلک فارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف قال فلم ازل ارجع بین ربی تعالیٰ وبین موسیٰ حتی قال یا محمد انہن خمس صلوٰۃ کل یوم ولیلۃ (ثابت)

پس میں اُترا موسیٰ کی طرف۔ انھوں نے کہا خدا نے تیری اُمت پر کیا فرض کیا۔ میں نے کہا ہر رات دن میں پچاس نمازیں۔ موسیٰ نے کہا۔ پھر خدا کے پاس جاؤ۔ اور کہو کہ کم کر دے۔ کیونکہ تمھاری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں نے بنی اسرائیل کو آزما لیا ہے۔ اور دیکھ لیا ہے فرمایا آنحضرت نے پس میں واپس گیا۔ خدا کی طرف اور کہا کہ اے خدا میری اُمت پر تخفیف کر۔ پس پانچ نمازیں گھٹا دیں پھر میں موسیٰ کے پاس آیا اور کہا کہ پانچ کم ہوئیں۔ موسیٰ نے کہا تمھاری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تم پھر خدا کے پاس جاؤ۔ اور کمی کی درخواست کرو۔ فرمایا کہ میں برابر خدا اور موسیٰ کے درمیان آیا اور گیا یہاں تک کہ خدا نے کہا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن رات میں (ثابت)

فرجعت بذلک حتی مررت علی موسیٰ فقال ما فرض اللہ لک امتک قلت فرض خمسین صلوٰۃ قال فارجع الی ربک

میں اس کے ساتھ لوٹا۔ یہاں تک کہ موسیٰ پر گذرا۔ موسیٰ نے کہا خدا نے تمھاری اُمت پر کیا فرض کیا۔ میں نے کہا پچاس نمازیں۔ موسیٰ نے کہا تم لوٹ جاؤ اپنے خدا کی طرف۔ کیونکہ

فان امتك لا تطيق فراجعني فوضع شطرها فرجعت الى موسى فقلت وضع شطرها فقال راجع الى ربك فان امتك لا تطيق ذلك فراجعت فرجع شطرها فرجعته اليه فقال ارجع الى ربك فان امتك لا تطيق ذلك فراجعته فقال هي خمس وهي خمسون لا يبدل القول لدي فرجعت الى موسى فقال راجع ربك فقلت استحييت من ربي (ابن شهاب)

تمھاری اُمت سے یہ نہ ہو سکے گا۔ میں واپس گیا تو ایک حصہ معاف ہوا۔ میں موسیٰ کے پاس پھر آیا اور کہا کہ ایک حصہ معاف ہوا۔ موسیٰ نے کہا پھر خدا سے گفتگو کرو۔ تمھاری امت سے اتنا نہ ہو سکے گا۔ میں واپس گیا اور دوبارہ سوال کیا۔ ایک حصہ اور معاف ہوا۔ میں پھر موسیٰ کی طرف آیا۔ انھوں نے کہا پھر جاؤ۔ تمھاری اُمت سے اتنا نہ ہو سکے گا۔ میں نے دوبارہ سوال کیا۔ خدا نے کہا کہ یہ پانچ ہیں اور وہ (دراصل) پچاس ہیں۔ میری بات دوسری نہیں ہوتی پھر موسیٰ کے پاس آیا۔ اُنھوں نے کہا تم پھر خدا کے پاس جاؤ میں نے کہا اب تو میں خدا سے شرما گیا (ابن شہاب)

لكل عشرة فتلك خمسون صلوٰة (ثابت)

ہر نماز کے لئے دس ہیں۔ پس وہ پچاس نمازیں ہوئیں۔ (ثابت)

قال فاعطى رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلثا اعطى الصلوٰة الخمس واعطى خواتيم سورة البقرة وغفر لمن لا يشرك بالله من امته شيئا المقحمات - (عبد الله ابن مسعود)

کہا پس حضرت کو تین چیزیں عطا ہوئیں پانچ نمازیں اور سورہ بقر کے خاتمہ کی آیتیں۔ اور بخش دیا گیا اس کو حضرت کی اُمت میں سے جو خدا کا کسی کو ساجھی نہیں کرتا۔ (عبد اللہ ابن مسعود)

ومن هم بحسنة فلم يعملها كتبت له حسنة فان عملها كتبت له عشرا ومن هم بسيئة فلم يعملها لم تكتب عليه شيئا فان عملها كتبت له سيئة واحدة (ثابت)

اور جس شخص نے ایک نیکی کا قصد کیا اور کیا نہیں اُس کے لئے ایک نیکی لکھی جائے گی۔ اور اگر کرے تو دس لکھی جائیں گی اور جو شخص کسی برائی کا قصد کرے اور کرے نہیں تو کچھ نہ لکھا جائے گا اور اگر کرے تو ایک برائی لکھی جائے گی (ثابت)

فرجعت الى موسى فقال بما امرت قلت امرت بخمس صلوٰة كل يوم قال ان امتك لا تستطيع خمس صلوٰة كل يوم واني قد جربت الناس قبلك وعالجت بني اسرائيل اشد المعالجة فارجع الى ربك فسله

پس میں موسیٰ کی طرف واپس آیا۔ انھوں نے کہا تم کو کیا حکم ہوا۔ میں نے کہا ہر روز پانچ نمازوں کا موسیٰ نے کہا تمھاری اُمت ہر روز پانچ نمازیں نہ پڑھ سکے گی اور میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما لیا ہے۔ تم خدا کی طرف لوٹ جاؤ اور اپنی اُمت کے

التخفیف لامتك قال سالت ربی حتی استحییت ولکنی ارضی واسلم (قتادہ)

لیے تخفیف کی درخواست کرو۔ فرمایا میں خدا سے سوال کرتے کرتے شرما گیا۔ اب میں اسی پر راضی ہو جاؤں گا اور تسلیم کرلوں گا۔ (قتادہ)

قال فنزلت حتی انتھیت الی موسیٰ فاخبرتہ فقال ارجع الی ربك فاسئلہ التخفیف فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت قد رجعت الی ربی حتی استحییت منہ (ثابت)

کہا۔ پس میں اترا یہاں تک کہ موسیٰ کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی۔ موسیٰ نے کہا اپنے خدا کی طرف واپس جاؤ اور تخفیف کی درخواست کرو۔ پس فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں نے کہا کہ میں خدا کی طرف پھر پھر کے گیا۔ یہاں تک کہ اب میں اُس سے شرما گیا (ثابت)

قال فلما جاوزت نادی مناد امضیت فریضتی وخففت عن عبادی (قتادہ)

کہا پس جب میں آگے بڑھا ایک پکارنے والے نے آواز دی میں نے اپنا فرض نافذ کیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کی (قتادہ)

ثم انطلق بی حتی انتھی بی الی سدرۃ المنتھی وغشیھا الوان لا ادری ما ھی ثم ادخلت الجنۃ فاذا فیھا جنابذ اللؤلؤ واذا ترابھا المسك (ابن شہاب)

پھر مجھ کو لے کے چلے (جبرئیل) یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور اُس کو رنگوں نے ڈھک لیا کہ میں ان کو نہیں جانتا تھا۔ پھر میں جنت میں داخل کیا گیا۔ ناگاہ وہاں موتی کے گنبد تھے اور اُس کی مٹی مشک تھی۔ (ابن شہاب)

یہ سب روایتیں ایک دوسری سے اس قدر مختلف و متناقض ہیں کہ اُن کے قواعد کے پیش کرنے کی جن سے ان کا باطل اور موضوع ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔ غیر ضروری ہے۔ کیونکہ یہ خود روایتیں صراحۃً ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں اور اپنی صحت اور اعتبار کو خود کھو دیتی ہیں۔

مصنف لمعات کا بیان ہے کہ یہ روایتیں ایک دوسری سے اس قدر اختلاف رکھتی ہیں کہ اُن کا تطبیق کرنا بالکل غیر ممکن ہے تاوقتیکہ تعدد معراج کو تسلیم نہ کرلیا جائے۔ یا ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دی جائے۔ یعنی ان میں سے کسی کو مانا جائے اور باقیوں کو غلط اور بے اصل قرار دیا جائے۔

وعلی تقدیر صحۃ الروایات یتعذر الجمع الا ان یقال یتعدد المعراج او یرجح بعض الروایات علی بعض (لمعات)

وہ عیسائی مصنف جنہوں نے پیغمبر خدا کی سوانحعمری لکھی ہے ایک درجہ اور بھی بڑھ گئے

ہیں اور ان تعریفوں اور منظوم نعتوں کو جو مسلمان شاعروں نے اپنی شاعرانہ طرز سے مختلف امور متعلق بہ معراج مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زینت اور شان ۔ براق کی شکل ۔ فرشتوں کے جلوس وغیرہ پر لکھی ہیں ۔ روایات مستند شمار کر لیا ہے ۔ مگر انھوں نے اسلام کے حق میں یہ بہت بڑی عمدہ بات کی ہے ۔ اور اسلام کو ہمیشہ ان کی محنتوں اور جاں فشانیوں کا مشکور ہونا چاہیے ۔ کیونکہ جب کوئی منصف مزاج اور ذی فہم شخص ایسی تصنیفات کے مجموعہ پر نظر ڈالے گا تو ہم کو امید ہے کہ وہ اس نتیجہ کے استنباط سے باز نہ رہ سکے گا کہ یہ تصنیفات امر حق کی تحقیق اور تدقیق کے سوا اور کسی غرض کے لئے کی گئی ہیں اور بیہودگی اور یاوہ گوئی میں گردشیں کے کبوتر کے قصہ کے ساتھ ہمسری کرتی ہیں ۔

شق صدر اور معراج اگر مذہب اسلام سے تعلق رکھتے ہیں تو بہت سیدھا سادھا تعلق رکھتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں یا اُس واقعہ کے خواب میں ہونے سے انکار کرے اور یہ کہے کہ اس قسم کی کوئی چیز ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی اور یہ تمام روایتیں جو اس واقعہ کے حقیقی یا خیالی وقوع کو بیان کرتی ہیں بلا استثنا بالکل غلط اور سراسر بے اصل موضوع اور جعلی ہیں تو بھی اُس کے ایمان میں ذرہ برابر بھی خلل واقع نہ ہوگا بلکہ وہ پورا پکا اور سچا مسلمان رہے گا ۔

معراج کا خواب اُس قبیل سے ہے جیسا کہ حضرت یعقوب نے دیکھا تھا اور جو معراج یعقوب کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ توریت میں لکھا ہے کہ " پس بخواب دید کہ اینک زدبانے بہ زمین برپا گشتہ سرش بآسمان می خورد واینک فرشتگاں خدا ازاں بہ بالا وزیر می رفتند واینک خداوند براں ایستادہ می گفت من خداوند خدائے پدرت ابراہیم وہم خدائے اسحٰق ام ۔ ایں زمینے کہ براں می خوابی بتود بذریعہ تو می دہم ودزیہ تو مانند خاک زمین گردیدہ بہ مغرب ومشرق وشمال وجنوب منتشر خواہند شد ۔ واینک من باتوام وہر جائے کہ می روی ترا نگاہ داشتہ بایں زمین بازپس خواہم آورد ۔ تا بوقتیکہ آنچہ بتو گفتہ ام بجا آورم ترا وانخواہم گذاشت ۔ ویعقوب از خواب خود بیدار شدہ گفت بدرستی کہ خداوند دریں مکان است ومن ندانستم ۔ پس ترسیدہ گفت کہ ایں مکان چہ ترسناک است ایں نیست ۔ مگر خانۂ خدا وایں است دروازۂ آسمان (سفر تکوین باب ۲۸ درس ۱۲-۱۷)

معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے وہ اس قدر ہے کہ پیغمبر خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ۔ ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انھوں نے درحقیقت اپنے

پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں۔ خواہ وہ شخص اُن نشانیوں کو لامعلوم نشانیاں کہے خواہ اُن نشانیوں کے دیکھنے سے عمدہ ترین احکام وحی کا ہونا مراد ہے۔ مگر اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خواب میں دیکھا یا جو وحی ہوتی یا انکشاف ہوا وہ بالکل سچ اور برحق ہے۔

اگر کوئی مسلمان مذکورہ بالا عقیدہ پر ایمان رکھ کر اُن سب روایتوں کو جو معراج کے قصہ میں آئی ہیں نہ مانے اور سب کو موضوع اور نہایت قابل الزام خیال کر کے چھوڑ دے تو اُس کے دین و ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اور وہ اُس شخص کے ہم پایہ ہوگا۔ جو کسی چیز پر بلا تحقیق و تفتیش کے ایمان نہیں لاتا۔

روایات معراج میں اگر کوئی مسلمان کسی حکم کا تلاش کرنا چاہے تو اُس کو بعد از تلاش بسیار بجز دو حکموں کے اور کوئی حکم نہ ملے گا۔ ایک نماز پنجگانہ کا۔ اور دوسرا یہ کہ جو کوئی خدا تعالیٰ کا مثل اور ہمتا گردانے وہ مشرک خیال کیا جائے گا۔ مگر یہ احکام نہ اُن روایتوں پر منحصر ہیں اور نہ اُن کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے متعدد آیات قرآنی میں اُن کی نسبت صاف صاف اور بالتصریح حکم صادر فرمایا ہے پس اُن روایات کے نہ ماننے سے کسی حکم شرعی کا انکار لازم نہیں آتا۔

اگر اُن روایتوں کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اُن سے ایک شان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پائی جاتی ہے تو اس کی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ اگر یہ سب باتیں جو ان روایتوں میں مندرج ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جائیں تو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کچھ بڑھ نہیں جائے گی اور نہ اُس بے انتہا اعلیٰ درجہ کی شان میں کچھ زیادتی ہوگی اور اگر ان کا عشر عشیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ منسوب کیا جائے تو بھی اُس جناب کی عظمت و شان میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔

ہم مسلمان اپنے نبی کو "ابن اللہ" بنانا نہیں چاہتے اور نہ اُن کو "اللہ تعالیٰ کے دست راست" پر بٹھانے کے مشتاق ہیں۔ ہم اُن کی سب سے بڑی عزت اُس میں خیال کرتے ہیں جو خود اُنھوں نے اپنی نسبت فرمایا ہے کہ "انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم اللہ واحد - امنا باللہ وما جاء بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

خطبہ بارہواں

ولادتہ وطفولیتہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ
(القرآن)

اس خطبہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی ولادت سے آپ کی بارہ برس کی عمر تک کا حال ہے

عبداللہ ابن عبدالمطلب والد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چوبیس برس کی عمر تھی جب کہ انھوں نے آمنہ بنت وہب سے شادی کی۔ آمنہ بنت وہب قریش کے قبیلہ سے تھیں۔ جو عرب کے قبیلوں میں نہایت معزز اور شریف قبیلہ تھا۔ حضرت آمنہ حمل ہی سے تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ نے بغرض تجارت یثرب یعنی مدینہ کی طرف سفر کیا اور قبل پیدا ہونے آنحضرتؐ کے اُنھوں نے وفات پائی اور بنی نجار کے دار نبغہ میں مدفون ہوئے۔

اُن کی وفات کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ جمہور مؤرخین کی یہ رائے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارھویں ربیع الاول کو عام الفیل کے پہلے برس یعنی ابرہہ کی چڑھائی سے پچپن روز بعد پیدا ہوئے۔ مگر اس بات میں کہ عام الفیل سنہ عیسوی کے کون سے سال میں واقع ہوا تھا۔ مورخوں کی رائے میں اختلاف ہے۔ منقح امر جو قرار پایا ہے وہ یہ ہے کہ عام الفیل ۵۷۰ سنہ ع کے مطابق تھا۔ کیونکہ سب مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ سنہ ع میں مکہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تھی۔ یعنی نزول وحی سے تیرھویں برس اور وحی چالیس برس کی عمر میں نازل ہوئی تھی۔ ان برسوں کو اگر جمع کیا جاوے تو ترپن قمری سال ہوتے ہیں اور جب کہ

ان میں سے ایک برس قمری سال شمسی سال سے مطابقت کرنے کے لئے منہا کیا جاے تو باون برس باقی رہتے ہیں اور جب ان باون برس کو چھ سو بائیس میں سے نکال ڈالا جاتے تو پانسو ستر باقی رہتے ہیں اور اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی تھی۔

آنحضرت کی ولادت کی نسبت بہت سی عجیب روایتیں مشہور ہیں کہ ولادت کی رات کو کسرےٰ کے محل میں زلزلہ آیا اور اُس کے چودہ کنگورے گر پڑے۔ فارس کا مقدس آتش کدہ جس میں سالہا سال سے برابر آگ جلتی چلی آتی تھی دفعتہً بجھ گیا۔ وہاں کے موبدوں نے عجیب عجیب خواب دیکھے اور چشمہ ساوہ دفعتہً خشک ہو گیا۔ مگر ان روایتوں کی معتبری کی قابل اعتماد سندیں نہیں ہیں اور نہ ہی مذہبی روایتیں سمجھی جاسکتی ہیں۔ آنحضرت کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رونق پائی اور مسلمانوں کو فتوحات نمایاں حاصل ہوتی گئیں اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی اور وہاں کے قدیم آتش کدے برباد ہوئے اور کسرےٰ کے محلوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ ان واقعات کو جو بعد کو وقوع میں آئے شاعروں نے اپنے شاعرانہ خیالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے منسوب کیا کہ گویا اُن کا پیدا ہونا ہی فارس کے آتش کدوں کا بجھنا اور کسرےٰ کے محل میں زلزلہ پڑنا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعرانہ خیال بطور روایت کے مروج ہونے لگے اور عین روز ولادت ہی سے منسوب کر دیئے گئے۔ پس ان روایتوں کو مذہبی روایتیں تصور کرنا ان لوگوں کی غلط فہمی ہے جو مسلمانوں کی مذہبی روایتوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

علاوہ ان کے اور بھی روایتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی نسبت کتب سیر میں مذکور ہیں۔ اگرچہ اُن کی صحت کے لئے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر اُن کے غلط ہونے کے لئے بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبدالمطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی۔ عبدالمطلب فی الفور وہاں آئے اور آنحضرت کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر کعبہ میں لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ عبدالمطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ صریح مسلمانی طرز کا ہے اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ کعبہ میں عبدالمطلب کا دعا مانگنا صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ مگر ہم کو اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی وہ

مسلمانی طرز کی دُعا تھی کچھ تعجب نہیں ہوتا۔کیونکہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں میں سے خداپرستی بالکل معدوم نہیں ہوئی تھی اور اس بات کا بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خداپرستوں کا طریقہ ہے۔

چندروز تک ثوبیہ نے جو آنحضرتؐ کے چچا ابولہب کی آزاد کی ہوئی لونڈی تھیں آنحضرتؐ کو دودھ پلایا۔ثوبیہ نے آنحضرتؐ کے چچا حمزہ کو بھی دودھ پلایا تھا اور اس سبب سے حمزہ اور مسروق ابن ثوبیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دودھ بھائی تھے۔

عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد رکھا مگر حضرت آمنہ نے خواب میں ایک فرشتہ کو دیکھا تھا۔جس نے کہا تھا کہ آپ کا نام احمد رکھنا۔اس لئے انھوں نے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد رکھا اور اس طرح توریت اور انجیل دونوں کی بشارتوں کی تصدیق ہوگئی۔جن کا بیان ہم نے خطبہ بشارات میں کیا ہے۔ولادت کے ساتویں روز عبدالمطلب نے قربانی کی اور تمام اراکین قبیلہ قریش کو دعوت میں بُلایا۔

شرفاء مکہ کا دستور تھا کہ آب وہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیرزبان کا اثر نہ ہونے پائے اپنے بچوں کو جب کہ وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے دودھ پلانے والیوں کے سپرد کرکے باہر بھیج دیا کرتے تھے۔اسی رسم کے موافق آنحضرت کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کردیا گیا اور وہ اپنے گھر لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لاکر اُن کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلاجاتی تھیں۔دو برس بعد آپ کا دودھ چھڑایا گیا اور حضرت حلیمہ آپ کو لے کر حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی آب وہوا آپ کو موافق نہ ہوگی پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کردیا اور وہ ان کو اپنے ہاں لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لاکر ملاجاتی تھیں۔
جب آنحضرتؐ کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا۔پس حضرت حلیمہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ماں اور اُن کے خاوند حارث ابن عبدالعزیٰ دودھ کے رشتہ کے باپ اور اُن کی اولاد عبداللہ اور انیسہ اور حذیمہ عرف شیان دودھ بھائی اور دودھ بہن ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دودھ کے رشتہ کو خون کے رشتہ کے برابر سمجھتے تھے اور حضرت حلیمہ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور اُن کا ادب اور اُن کی تعظیم ماں کے برابر کرتے تھے۔ایک

دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ردائے مبارک جس کو مسلمان سر پر رکھنے اور آنکھوں سے لگانے کے لائق سمجھتے ہیں حضرت حلیمہ کے لئے بچھا دی تاکہ وہ اُس پر بیٹھیں۔ دودھ کے رشتہ کا ایسا بڑا پاس ولحاظ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور جو محبت اور اُلفت کہ حضرت حلیمہ اور اُس کی اولاد کے ساتھ برتتے تھے اور جس احسان مندی کا اظہار دودھ کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کرتے تھے نہایت اعلیٰ اور عمدہ مثالیں آنحضرت کے اخلاق حمیدہ نیک خوئی اور نرم دلی کی ہیں جس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں پائی گئی۔

بنی قریش اور بالتخصیص اُس کی وہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ طفولیت میں پرورش پائی تھی تمام ملک عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لئے مشہور تھی اور اسی سبب سے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت زبردست اور پُر اثر فصاحت وبلاغت رکھتے تھے۔ اہل عرب درحقیقت فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے اور جو شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا تھا اس کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل سمجھتے تھے گو وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اس سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جزیرہ نماعرب کی خوش نما زبان کے خالص ترین نمونہ پر بن گئی تھی ... جب کہ اُن کی فصاحت و بلاغت اُن کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی تو ایک خالص زبان اور ایک دل فریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوا۔ مگر ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں۔ جس میں یقین کیا جاتا ہے کہ خاص لفظ آنحضرت کے محفوظ ہیں جیسے دعائیں وغیرہ تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا طرز کلام اور فصحائے عرب کے طرز کلام سے کچھ غیر مشابہ نہیں ہے لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے اور دونوں میں بڑا فرق پاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی۔ کہ اول کلام انسانی ہے اور دوسرا کلام ربانی۔

جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیز و اقربا سے ملانے کے لئے مدینہ منورہ لے گئیں۔ کچھ عرصہ تک وہاں ٹھیریں اور پھر مکہ معظمہ کو مراجعت کی اور رستہ میں بمقام ابواء وفات پائی۔ جب کہ آنحضرت مکہ میں پہنچے تو آپ کے دادا عبدالمطلب

نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ طفولیت یعنی بارہ برس کی عمر تک کے بعض واقعات تعریضًا بیان کئے ہیں۔ مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ اُن کا کھیل کود میں مصروف رہنا اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا اور رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پہ رونا۔ اگرچہ ان باتوں کی اور اسی قسم کی اور باتوں کی تصدیق کی جو اُنھوں نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کرلی جائیں تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں جیسی کہ ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہوتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا کہ "انا بشر مثلکم یوحیٰ الی"۔ پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔

جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آٹھواں برس شروع ہوا تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجبر کو گئے تو لوگوں نے اُن کو روتے دیکھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے برخلاف منشار سر ولیم میور صاحب کے کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر نہ روتے تو نہایت تعجب ہوتا۔ آنحضرتؐ اُس وقت کم عمر تھے اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا اور دل کا جوش مارنا خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ رنج کے وقت دل کا ملائم ہونا اور محبت آمیز جوش کا اُٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم نے انسان کے دل کی تسلی اور اُس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ بنایا ہے۔ پس آنحضرت نے بھی اُسی فطرت کی پیروی کی تھی جو خدا نے انسان میں بنائی ہے۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش ابوطالب آپ کے چچا نے جو آپ کے والد عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے اپنے ذمہ لی۔ یہ بھی آنحضرتؐ کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے رہے۔ اور مثل پدر مہربان کے ہر طرح سے خبرگیری کی۔ جب آپ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو ابوطالب کو تجارت کے سبب سے شام کا سفر پیش آیا اور اُس کے سرانجام کے بعد پھر مکہ کو واپس آئے۔ سر ولیم میور صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابوطالب کے ہمراہ شام کو گئے تھے اور ابوطالب نے اول تو اپنے ہمراہ لے جانے سے انکار کیا تھا مگر آنحضرتؐ روانگی کے دن آتی لمبی مفارقت کے خیال سے افسردہ دل ہوکر اپنے مربی سے لپٹ گئے۔ اور

ابوطالب کو بھی جوشِ الفت آگیا اور اپنے ہمراہ لے گئے اس روایت کی کوئی معتبر سند نہیں ہے آنحضرت ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر میں جانا کسی طرح ثابت نہیں۔

جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہ برس کی عمر کو پہنچے تو زمانہ طفولیت کا منقضی ہوگیا تھا اور نوجوانی کا آغاز تھا اور جمیع اوصاف حمیدہ سے جن سے انسان ہردل عزیز ہوجاتا ہے آراستہ تھے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا اخلاق اور صبر اور مردانگی جن کو اوضاع و اطوار کی خوبی اور فصاحت وخوش بیانی سے دوبالا جلا ہوگئی تھی آپ کی ذات بابرکات میں اس طرح پر مجتمع ہوئے تھے کہ عالم شباب ہی میں آپ نے امین عرب کا لقب حاصل کیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ طفولیت کے صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں جو ہم نے بیان کئے اور اس کے سوا جو باتیں اس زمانہ کی مشہور ہیں وہ سب بے سند اور نامعتبر ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک کے تاریخی واقعات جو ہم نے اوپر بیان کئے اُن کے علاوہ سرولیم میور صاحب نے اپنی کتاب مسمّیٰ لائف آف محمد میں اور بھی کچھ واقعات بیان کئے ہیں۔ جو نہایت ضعیف اور نامعتبر روایتوں پر مبنی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ سرولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق معجزات حال کے مسلمانوں کے نزدیک بہت دل پسند مضامین ہیں"۔ مگر اس امر کی کچھ تحقیقات نہیں کی کہ کن معجزات کو حال کے زمانہ کے مسلمان بھی معتبر سمجھتے ہیں۔ اور کون سے معجزات کو نامعتبر بطور قصہ اور کہانی کے۔ اور یہ بھی نہیں بتایا کہ حال کے مسلمانوں کی جو انھوں نے قید لگائی ہے اُس سے اُن کا کیا مطلب ہے۔ غالبًا یہ مطلب ہوگا کہ متقدمین مسلمان اُن کو قابل التفات نہیں سمجھتے تھے۔ اگر یہی مطلب ہو تو صاف اس بات کا اقرار ہے کہ وہ روایتیں جن کو سرولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے۔۔۔ نامعتبر اور غیر صحیح ہیں۔ جس قدر کتب سیر یا کتب سوانح عمری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمائے اسلام نے لکھی ہیں اور جو روایتیں اُن میں بیان کی ہیں تمام مسلمان اُن روایتوں کو ایسی روایتیں خیال کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ وہ صحیح مانی جائیں روایۃً اور درایۃً کامل تحقیق و تدقیق کی محتاج ہیں۔ اس قسم کی روایتوں کو تا وقتیکہ اُن کی تصدیق کی کوئی کافی دلیل نہ ہو۔ مسلمان مطلقًا قابل اعتبار تصور نہیں کرتے بلکہ خود علمائے محققین نے اُن روایتوں کو نامعتبر قرار دیا ہے۔ علمائے محققین اسلام اور ذی علم مسلمانوں نے ان روایات پر ذرا بھی اطمینان نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہمیشہ اُن کی کوششیں اس بات کی تحقیق میں کہ کون سی اُن میں سے صحیح اور کونسی غیر صحیح ہیں مصروف رہی ہیں۔

سرولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں جہاں روایتوں کے وجہ اعتبار کو بیان کیا ہے اُن تمام روایات کی نسبت جن میں صحیح روایتیں اور موضوع اور نامعتبر روایتیں بلاتمیز شامل ہیں صرف اتنی بات کہکر فیصلہ کردیا ہے کہ یہ سب بے اصل اور راویوں کی محض اختراعات ہیں۔ مگرہم باوجود اس کے کہ سرولیم میور صاحب کے علم اور مرتبہ کا بہت ادب کرتے ہیں۔ اس کہنے پر مجبور ہیں کہ دعویٰ بلادلیل قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ بالعموم مان لیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ استدلال محض بے کار چیز ہے اور اُس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کہ یونان کے مشہور کاشت کار مسمی گارڈین کی گاڑی کے جوتے کی گرہ کو ایران کی بادشاہت کے طمع میں ہاتھ سے کھولنے کے عوض تلوار سے کاٹ دیا جائے جیسے کہ سکندر نے کیا تھا۔

فرض کرو کہ اگر کوئی یہ کہے؀ (جیسے کہ لوگوں نے کہا ہے) کہ حضرت یحییٰ محض عوام الناس میں سے اور یہود کے فرقہ السینین میں سے تھے اور حضرت عیسیٰ اُن کے ایک مرید تھے۔ اُن کے مصلوب ہونے کے بعد اُن کے مُریدوں نے شان الوہیت اور قدرت اعجاز کو اُن پر لگا دیا ورنہ وہ محض ایک عام یہودی تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس کہنے میں اور مسلمانوں کی تمام روایتوں کی نسبت اس بات کے کہہ دینے میں کہ وہ سب بے اصل اور راویوں کی اختراعات ہیں کیا فرق ہے؟"

زندگی کے عام معاملات میں بھی کسی شخص پر واجب نہیں ہے کہ کسی شخص کے محض زبانی بیان پر گو وہ کیسا ہی معزز اور ذی فہم کیوں نہ ہو یقین لے آئے تو ایسے بڑے معاملات میں کسی مصنف کے بیان یا رائے کو کیوں کر قطعی مان لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم قابل معافی ہیں۔ اگر ہم سرولیم میور صاحب کی اس رائے کو کہ "اُن روایات ہی کو غیر معتبر سمجھ کر خارج کر لینا چاہیے"، قابل تسلیم نہ خیال کریں جب تک کہ دلیل اور واقعات سے اُس رائے کی صحت کا ثبوت نہ ملے۔

جاننا چاہیے کہ مسلمانوں کے نزدیک روایتیں تین قسم کی ہیں۔ اول تو وہ روایتیں ہیں کہ اُن کی صحت و اعتبار کی معقول دلیلیں موجود ہیں اور علی العموم مسلم ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مشہور روایتیں شامل ہیں جن کا وقوع قوانین فطرت کے برخلاف نہیں ہے اور جن کی بے اصلی اور غیر معتبری کی نسبت کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ یہ روایتیں نہ تو بلاتحقیق نامعتبر کرنے کے

؀ دیکھو کتاب موسوم بہ "اے وائس فرام دی گنجز"۔

قابل ہیں اور نہ اس قابل ہیں کہ آنکھ بند کرکے اُن پر اعتماد کرلیا جائے۔ تیسری قسم میں وہ روایتیں ہیں جو بظاہر بحال معلوم ہوتی ہیں اور اُن کے ثبوت کی کوئی معتبر دلیل نہیں ملی ہے اور اس لئے غلط اور نامعتبر قرار دی گئی ہیں۔ پس اس سے زیادہ غلطی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اہل اسلام کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ اُن سب قسم کی روایتوں کو برحق سمجھتے ہیں اور اُن سب پر بلا امتیاز ایمان رکھتے ہیں۔ جیسے کہ ہم نے اپنے خطبہ "الروایات المرویات فی الاسلام" میں بیان کیا ہے۔

اب ہم اُن روایات کی نسبت بحث کرتے ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں لغویت مذہب اسلام ثابت کرنے کی منشا سے بیان کیا ہے اور بتلاتے ہیں کہ وہ روایتیں اقسام روایات متذکرہ بالا میں سے کون سی قسم کی روایتوں میں داخل ہیں۔ سر ولیم میور صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ولادت میں جو حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز سُن کر ڈر جانا یا ایک سفید مرغ کا دفعتہً نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اُس سے حضرت آمنہ کے اضطراب کو تسکین کا ہونا یا حضرت آمنہ کے لئے ایک خوش گوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا ملائکہ کی آوازیں آنی یا بغیر اس کے کہ کوئی شخص دکھائی دیتا ہو پاؤں سے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی نظر سے چھپانے کے لئے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اُترنا۔ بہشت کے پرندوں کا چہچہانا۔ بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں جو غالباً سر ولیم میور صاحب نے کسی مولودنامہ سے اخذ کئے ہیں اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہوگا سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے گرم جوش شاعرانہ خیالات ہیں جو اُنھوں نے اپنے مضامین کی تزئین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق کے لئے بیان کی ہیں جیسے کہ شاعروں کا اور خصوصاً مشرقی شاعروں کا شاعرانہ مضمون میں اس قسم کے واقعات بیان کرنے کا دستور ہے۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اسی قسم کے خیالات نظم میں بیان کئے ہیں جن کا نمونہ ہم نے اپنے خطبہ "فی حقیقۃ شق الصدر و ماہیۃ المعراج" میں دکھایا ہے اور ملٹن کی تمام پیراڈائز لاسٹ انھیں خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم اپنے ہاں کے اس قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو بطور مذہبی روایتوں کے قرار دے اور اُس کا فیصلہ یوں کردے کہ وہ سب راویوں کی اختراعات ہیں۔

اسی قسم کے وہ مضامین ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے بطور مذہبی روایتوں کے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا اور اپنی اُمت کی بخشش کی دُعا مانگی اور کلمہ پڑھا اور تین نورانی فرشتے آسمان پر سے اُترے ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی۔ اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن اور تیسرے کے پاس ایک ریشمی رومال اور آنحضرتؐ کو سات مرتبہ غسل دے کر آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا۔

ہم کو کس قدر تعجب آتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کو بھی اُنہی مخترع روایات میں شمار کیا ہے جن کو وہ عجیب و غریب بعید از قیاس اور خلاف قانون فطرت قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ بات نہ معجزہ سے علاقہ رکھتی ہے نہ عجائبات سے بلکہ محض تلونات فطرت سے متعلق ہے۔ ایسے تلونات فطرت کی بہت سی نظیریں بتلائی جا سکتی ہیں مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں علامات تذکیر و تانیث دونوں موجود ہوں۔ ایسے واقعات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کا اتفاقیہ انحراف کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے بلا توسل معجزہ یا عجائبات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مختون پیدا ہونا یقیناً قرین قیاس ثابت ہوتا ہے، اور اس کا ثبوت اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ابراہیم کی اولاد میں ختنہ کی رسم نہایت استحکام سے قرار پا گئی تھی اور عرب جاہلیت بھی اُس کا ترک کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا ہے۔

مہر نبوت کی روایت سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت اُن کی پشت پر نور کے حرفوں میں مرقوم تھی" تمام مستند حدثین بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ نہ دوسا تھا اور اُس پر بال تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ دعوٰی نہیں کیا کہ یہ مہری رسالت کی مہر ہے اور نہ کبھی اُس کو اپنی رسالت کے برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کیا۔ جس طرح کہ حضرت موسٰی نے اپنے ید بیضا کو نبوت کے ثبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی اور اسی خیال سے بعض لوگوں نے آنحضرت کی پشت کے غدود کو عام نام سے بولنا ایک بے ادبی اور گستاخی خیال کر کے استعارۃً اس کو مہر نبوت سے ...... معزز اور گرامی نام سے موسوم کیا ہوگا۔

بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اُس پر حرف لکھے ہوئے تھے جمیع علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے پس کیا ایک عیسائی عالم کو یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ مسلمانوں پر اُن کے نبی کی رسالت کے ثبوت میں ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار محض کرتے ہوں۔ شمایل ترمذی کے حاشیہ مسمے باجوری میں لکھا ہے کہ "یہ جو روایت ہے کہ اُس پر پچھنے کے سے نشان تھے یا عنزا جانور کے گھٹنے کی مانند یا غدود و سبز یا سیاہ رنگ کا تھا اور اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا یا یہ لکھا ہوا تھا" ایک منصور" ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے جیسے عسقلانی نے کہا ہے اور ابن حبان نے جو اس کی تصحیح کی ہے۔ وہ صرف اُس کا وہم ہے۔ اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر یعنی اُس شے پر جو آنحضرت کی پشت پر تھی الفاظ محمد رسول اللہ لکھے ہوئے تھے اُس کو دھوکا ہو گیا ہے۔ ہاتھ کی مہر میں اور اُس پشت کے غدودہ میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے کیونکہ وہ عبارت ہاتھ کی مہر میں کندہ تھی نہ پشت کی چیز پر" پس جو محقق امر باجوری اور عسقلانی نے لکھا ہے اُس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علمائے اسلام نے اُن روایتوں کو جن کو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے۔ خود رد کیا ہے اور مہر نبوت سے وہ کیا مراد لیتے تھے۔

واما روایۃ کاثر المحجم او کرکبۃ عنز او کشامۃ خضراء او سوداء و مکتوب فیہا محمد رسول اللہ او سطر فانک المنصور لم یثبت منہا شئی کما قالہ العسقلانی وتصحیح ابن حبان لذلک وہم وقال بعض الحفاظ من روی انہ کان علی خاتم النبوۃ کتابۃ محمد رسول اللہ فقد اشتبہ علیہ خاتم النبوۃ بخاتم الید اذ الکتابۃ المذکورۃ انما کانت علی الثانی دون الاول۔ (حاشیۃ الباجوری علی الشمائل)

شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ" وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ اُن کے باپ نے اُس چیز کو دیکھا جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی۔ اُن کے باپ نے کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ جو چیز آپ کی پیٹھ پر ہے میں اُس کا علاج کر دوں کیونکہ میں طبیب ہوں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم رفیق ہو اور اللہ طبیب ہے" اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے وہ کیا چیز تھی اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اُس زمانہ کے مسلمان جو

عن ابی رمثہ ... قال دخلت مع ابی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرای ابی الذی بظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال دعنی اعالج الذی بظہرک فانی طبیب فقال انت رفیق واللہ الطبیب (رواہ فی شرح السنۃ)

آنحضرت کے اصحاب تھے اُس کو کیا سمجھتے تھے۔ پس سر ولیم میور صاحب نے جو اس کو بطور عجائبات اسلام کے بیان کیا ہے۔ محض بے جا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے اور روایتیں لکھی ہیں جن میں بیان کیا ہے کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے کہ شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی اور ایک روایت لکھی ہے کہ حضرت آمنہ کو ایام حمل میں کچھ بوجھ یا تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی اور دوسری روایت اس کے برخلاف لکھی ہے کہ حضرت آمنہ کہتی تھیں کہ میں نے کسی بچہ کو پیٹ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھاری نہیں پایا۔ یہ روایتیں اور اسی قسم کی اور سب روایتیں بالکل سند سے معرا ہیں اور خود علمائے اسلام اُن کو غیر صحیح اور نا معتبر قرار دیتے ہیں اور یہ سب گرم جوش خیالات کے نتیجے ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب اسلام کی مذہبی روایتوں کی طرز پر بیان کرتے ہیں۔ اس منشا سے کہ اسلام کی ایک بے وقعتی ظاہر کریں۔

وہ روایت جس میں حضرت آمنہ سے نور کا ظاہر ہونا منقول ہے اور جو کتاب شرح السنہ میں بیان کی گئی ہے اُس طرح پر نہیں ہے جس طرح کہ سر ولیم میور صاحب نے بیان کی ہے۔ اس لئے ہم اُس روایت کو بلفظ نقل کرتے ہیں۔ شرح السنہ میں عرباض ابن ساریہ سے منقول ہے

عن العرباض بن ساریۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ... ساخبرکم باول امری انا دعوۃ ابراھیم وبشارۃ عیسیٰ ورؤیا امی التی رأت حین وضعتنی وقد خرج لھا نور اضاء لھا منہ قصور الشام۔ (رواہ فی شرح السنۃ)	کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں میں دعا ہوں ابراہیم کی اور بشارت ہوں عیسیٰ کی اور خواب ہوں اپنی ماں کا جس نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں دیکھا تھا کہ اس سے ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے ہیں۔ پس جن روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور کا پیدا ہونا منقول ہے۔ اگرچہ اُن کی بھی کوئی کافی سند صحت کی موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم ان

کو تسلیم کر لیں اور صحیح قرار دیں تو ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایسا ایک خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا تعجب انگیز ہے۔ نہ خلاف قیاس ہے اور نہ برخلاف فطرت۔

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ تمام راوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ میں دوشنبہ

کو ایک مشہور اور معروف دن خیال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اسی دن آپ کی زندگی کے سب سے بڑے واقعات ظہور میں آئے تھے۔ لیکن اس متبحر عالم نے اس جگہ کسی قدر غلطی کی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے ہاں دوشنبہ کے دن کو کوئی مذہبی شرف حاصل نہیں ہے۔ صرف یہ بات ہے کہ جب علما نے ان مشہور و معروف واقعات پر غور کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ظہور میں آئے تھے تو اکثر کو دوشنبہ کے دن واقع ہونا پایا۔ اس لئے انھوں نے ایک اتفاقی مطابقت کے خیال سے اپنی تصنیف میں دوشنبہ کا ذکر کیا۔ حالانکہ بعض علماء نے اس اتفاقی مطابقت سے بھی اختلاف کیا ہے۔ پس یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے کہ جس کے سبب اسلام کی طرف کسی نشاء سے کوئی اشارہ کیا جائے۔

سرولیم میور صاحب نے تاریخ واقدی کے چند اختراعات بیان کرنے کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ اُس مصنف نے بیان کیا ہے کہ حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا" اس کے بعد صاحب ممدوح فرماتے ہیں کہ "حمد کے مادہ سے جو نام مشتق ہوتے ہیں عرب میں مروج تھے مگر احمد عرب میں بہت کم نام ہوتا تھا اور آنحضرت کے سوا پانچ مختلف اشخاص اور بھی گذرے ہیں جن کا نام محمد تھا"

واقدی کے حوالہ سے صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ "یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنھوں نے یہود اور نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سنا تھا کہ عرب میں ایک نبی اس نام کا عنقریب ہونے والا ہے اور اکثر اشخاص اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھتے تھے۔ اور ہر شخص یہ امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخرالزماں ہونے کی شرف و عزت حاصل کرے۔

مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سرولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے۔ اگر توریت مقدس کی یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اُس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اُس کا نام اسمٰعیل رکھنا" (کتاب پیدائش باب ۱۶ ورس ۱۱) اور نیز یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارا تیری بی بی کے بے شک ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اُس کا نام اسحاق رکھنا" (کتاب پیدائش باب ۱۷ ورس ۱۹) اور نیز انجیل کی یہ آیت "اور اُس کے (یعنی مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ اور تجھ کو (یوسف کو) چاہیے کہ اُس کا نام عیسیٰ رکھے کیونکہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا" (متی باب ۱ ورس ۲۱) صحیح ہے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو کس بنا پر وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ نظر آیا تھا اور جو لڑکا کا

پیدا ہونے والا تھا احمد اُس کا نام رکھنے کو کہا تھا۔

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت وہ ہے جو ہم نے اپنے خطبہ بشارات میں بیان کیا ہے۔ یعنی عہد عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے۔ اور انجیل میں احمد کے نام سے اور اس لئے ان بشارات کے پورا کرنے کے لئے ضرور تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام بتا دیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں یا شاذ و نادر رکھتے تھے۔

مگر سر ولیم میور صاحب کا یہ بیان نہایت عجیب ہے۔ کہ "لفظ احمد" انجیل یوحنا کے کسی قدیم عربی ترجمہ میں بجائے لفظ "تسلی دہندہ" کے براہ غلطی واقع ہوا ہوگا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کسی جاہل یا متفنی راہب کی جعل سازی سے بجائے یونانی لفظ پیریکلیٹوس کے لفظ اس کر دیا گیا"۔ سر ولیم میور صاحب نے یہ بات اس لئے بیان کی ہے کہ پہلے یونانی لفظ پیریکلیٹوس کا ترجمہ تسلی دہندہ ہے اور دوسرے یونانی لفظ پیریکلیوٹوس کا ترجمہ احمد ہے۔ مگر مسلمانوں نے ان یونانی لفظوں کو معرب کر کے فارقلیط بنا لیا ہے۔ اور اس سبب سے کہ مسلمان فارقلیط کا ترجمہ احمد کرتے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے یونانی لفظ پیریکلیوٹوس کو معرب کر کے فارقلیط کیا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے جو یہ بیان کیا ہے کہ عرب میں محمدؐ نام کے اور لوگ بھی گذرے ہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرت سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی نہیں ہوا۔ بلکہ برخلاف اس کے انھوں نے اس قسم کی تمام روایتوں کو رد کر دیا اور نہایت تدین و ایمان داری سے اس امر کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گذرے تھے اور واقدی کو بھی ہم اُن ہی لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ مگر یہ بات کہ ان ناموں کے اور لوگ بھی آنحضرت سے پہلے درحقیقت گذرے تھے[1] یا یہ کہ اس نام کا مادہ حمد ہے اور حمد کے مادہ سے اہل عرب ناموں کو مشتق کیا کرتے تھے یا یہ بیان کہ یہ نام اکثر والدین اپنے لڑکوں کا اس قوی امید پر رکھتے تھے کہ شاید ہمارے ہی لڑکے کی قسمت میں نبی موعود ہونا ہو

---

[1] حضرت عیسٰی کے نام کی نسبت بھی ہم یہی حال پاتے ہیں۔ رینن صاحب کی لیف آف کرایسٹ میں لکھا ہے کہ عیسٰی جوان کا نام رکھا گیا تھا لفظ یوشع کا تبدیل کیا ہوا ہے یہ نہایت مروج نام تھا لیکن بعد کو اس نام میں اسرار اور اُمت کی نجات دہندہ کا اشارہ اپنی طرف سے اس میں لگا دیا گیا تھا۔

کسی طرح عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر مؤثر نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اُس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اُس لڑکے کے نبی ہونے کے طمع پر کیوں نہ رکھا ہو مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدا تعالیٰ کو نبی آخر الزماں کرنا منظور تھا۔ ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے، جب کہ ہم اُن بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت سے ظہور میں آئے تھے۔ اور وہ ایسے کام ہیں جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور جب کہ ہم اُس روحانی سرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے جس کو آنحضرتؐ نے اپنی حیات میں شائع کیا تھا اور آئندہ نسلوں کے لئے بطور ورثہ کے چھوڑ گئے اور جب کہ ہم اُس صدق اور پاک بازی کی ترویج پر نظر ڈالتے ہیں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رائج کیا اور جو زمانہ کی گردشوں کے بعد بھی غیر مبدل اور بے نقص رہی ہیں اور ابدالآباد تک ایسی ہی رہیں گی۔ تو ہم کو کامل یقین ہوتا ہے کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی، وہ وہی تھے جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

حضرت آمنہ کا رویا میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا اور عرب جاہلیت کے دستور کے موافق لوہے کے ٹکڑوں کو گلے میں لٹکانا یا بازوؤں پر بطور عمل اور تعویذ کے باندھنا اگر صحیح بھی تسلیم کیا جائے تو کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف اس امر کی تائید کرتا ہے کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے رویا میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا ہاں اس پر مگر صاحب کی عقل اور ایمان داری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو ضعف دماغ اور صرع کی بیماری تھی اور حضرت سارہ اور حضرت مریم نے جو فرشتوں کو دیکھا تھا اس کو صرع کی بیماری نہیں قرار دیتے۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں کسی منشاء سے اور بھی چند تعجب انگیز باتیں بیان کی ہیں کہ حضرت آمنہ کو خواب میں اطلاع ہوئی تھی کہ اس لڑکے کو قبیلہ ابو ذئیب میں سے ایک عورت دودھ پلائے گی اور حلیمہ کو بڑا تعجب ہوا جب بلا دریافت اُس کے شوہر کا نام اُس کو بتلا دیا اور جب حلیمہ آنحضرت کو لے آئی۔ تو دفعتہً اس کا اور اُس کی اونٹنی کا دودھ بہت زیادہ ہو گیا اور جب کہ حلیمہ آنحضرت کو لے کر چلی تو اُس کا سفید گدھا سب سے زیادہ تیز رفتار ہو گیا اور اُس کے مویشی نہایت فربہ ہو گئے اور کثرت سے دودھ دینے لگے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے اور اسی لئے یہ روایتیں مستند اور معتبر نہیں ہیں۔ لیکن اتفاقات سے ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے۔ مگر عیسائی عالم جو ایسی باتوں کو بطور دور از قیاس

باتوں کے بیان کرتے ہیں تو بلا شبہ ہم کو تعجب آتا ہے کیونکہ جب وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ" لابان نے اُس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھیر جا کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے" (کتاب پیدائش باب ۳۰ درس ۲۷) اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ" میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اور اب وہ کثیر التعداد ہو گیا ہے اور جب سے کہ میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے" (کتاب پیدائش باب ۳۰ درس ۳۰) اور اسی طرح کتاب پیدائش کے باب ۳۰ درس ۳۶ سے ۴۲ تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو حضرت یعقوب کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر حلیمہ کے مویشی میں کبھی برکت دی ہو تو اُس کو دور از قیاس اور تعجب انگیز طور پر بیان کیا جائے

سر ولیم میور صاحب واقدی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر اور دل کے دھونے کا واقعہ چار برس کی عمر میں واقع ہوا تھا اور ہشامی کے حوالہ سے اس بات کا استنباط کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع کا عارضہ تھا۔ ہم نے اپنے خطبہ" حقیقۃ شق الصدر و ماہیۃ المعراج" میں اس مضمون پر شرح و بسط سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ شق صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شب معراج کے خواب کا ایک جزو تھا نہ یہ کہ درحقیقت وہ جسمانی طور پر واقع ہوا تھا۔ مگر راویوں نے ان اسباب سے جو اکثر روایات کے بیان کرنے میں واقع ہوتے ہیں مختلف طور پر بیان کیا ہے اور اُس کے وقوع کے زمانہ میں بھی انہی اسباب سے اختلاف ہو گیا ہے بعض کا قول ہے کہ عہد طفولیت میں واقع ہوا تھا بعض کا بیان ہے کہ اس کا وقوع ایام شباب میں ہوا تھا اور بعض کے نزدیک شب معراج میں وقوع میں آیا تھا۔ ہم کو اس واقعہ کی حقیقت کا دوبارہ اس مقام پر بیان کرنا ضرور نہیں ہے۔ بلکہ اس مقام پر ہم کو یہ بیان کرنا منظور ہے کہ ہمارے ذی علم اور لائق مصنف سر ولیم میور صاحب نے جو ہشامی کی روایت سے (اگر وہ بالکل صحیح بھی مان لی جائے) یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع کا عارضہ ہو گیا تھا وہ کیسا غلط اور بے اصل ہے۔ سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ہشامی اور دیگر متاخرین بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو گمان ہوا کہ اس لڑکے کو" عارضہ ہو گیا ہے" جس لفظ کا ہم نے عارضہ ترجمہ کیا ہے وہ انگریزی لفظ" فٹ" ہے جو سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے" فٹ" کے معنی لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یکبارگی حملہ کے ہیں جس سے بدن کپکپانے لگے اور بعض اوقات غشی طاری ہو جائے جس سے غالباً صاحب ممدوح نے صرع مراد لی ہے۔ مگر ہشامی میں جو لفظ واقع ہے اُس کا" فٹ" ترجمہ کرنا بالکل غلط ہے۔ سر ولیم میور صاحب کو اُس لفظ کے صحیح پڑھنے میں بالکل غلطی ہوتی ہے جیسا کہ ہم آگے ثابت کریں گے۔

ہمارے پاس سیرت ہشامی موجود ہے جو ۱۸۵۸ء میں بمقام گاٹجن زیر اہتمام و نگرانی ڈاکٹر فرڈیننڈ وسٹن فیلڈ کے چھپی ہے اُس کتاب سے ہم وہ عبارت جو اس بحث سے متعلق ہے بلفظ نقل کرتے ہیں۔

قالت وقال لی ابوہ یاحلیمۃ لقد خشیت ان یکون ھذا الغلام قد اصیب فالحقیہ باھلہ۔

یعنی حلیمہ نے کہا اُس کے باپ (یعنی آنحضرتؐ کے دودھ باپ یعنی شوہر حلیمہ) نے کہا اے حلیمہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے اس لئے اُس کو اُس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے۔

مگر جب حلیمہ آنحضرتؐ کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے ان کو نہیں لیا اور حلیمہ سے کہا اس کو واپس لے جاؤ۔ اُس وقت حضرت آمنہ نے حلیمہ سے کہا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اُس پر شیطان مسلّط ہو گیا ہے یہ کلام بطور استفہام انکاری کے تھا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو یہ گمان ہوا کہ آنحضرت کو کچھ ہو گیا ہے وہ صحیح نہیں تھا۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب لیف آف محمد کے صفحہ کے ۲۱ کے حاشیہ پر بجائے لفظ اصیب کے امیب لکھا ہے یعنی صاد کی جگہ میم لکھا ہے اور اُس کے معنی "فٹ" یعنی عارضہ ہونے کے لکھے ہیں مگر یہ لفظ تاریخ ہشامی میں ہم کو نہیں ملتا ہے اور نہ اُس کے معنی عارضہ ہونے کے پائے جاتے ہیں ہشامی میں اصیب کا لفظ ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے ثابت ہوگا اور چونکہ ان دونوں لفظوں کی شکل میں بہت ہی کم فرق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے کسی غلط قلمی نسخہ سے اُس کو نقل کیا ہو گا۔ تمام عیسائی مصنف سوائے ایک دو کے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھی ہے اس بات کو بطور ایک امر واقعی کے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضہ صرع لاحق ہوا تھا! ولا ہم متحیر تھے کہ یہ خیال گرد شیس کے کبوتر کے قصہ کی طرح عیسائیوں کے دماغوں میں کیونکر سمایا۔ کسی تاریخ سے نہیں پایا جاتا کہ کوئی ڈاکٹر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حالت کا امتحان کرنے کو عرب میں گیا ہو اور نہ ایشیائی مصنفوں نے اس امر کی نسبت کچھ تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس خیال کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور کس نے اُس کو پھیلایا۔ آخر کار بہت سی تلاش کے بعد ہم کو تحقق ہوا کہ یہ خیال خام عیسائیوں میں دو وجہ سے پیدا ہوا۔ اول عیسائیوں کے توہمات مذہبی کے سبب سے اور دوسرے عربی عبارت کے زبان لیٹن میں غلط ترجمہ ہونے سے۔

کتاب لیف آف محمد مصنف پرڈیو مطبوعہ لندن ۱۷۱۲ء کے صفحہ ۱۰ سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی ابتداء یہاں سے ہوئی ہے اور تاریخ ابو الفدا کے بعض مقامات کے غلط ترجمہ سے بھی جو ڈاکٹر پوکاک نے لیٹن زبان میں کیا ہے اُس کی بنا معلوم ہوتی ہے یہ ترجمہ معہ اصل عبارت عربی کے پوکاک کے مسودہ سے ۱۷۲۳ء میں بمقام اکسفورڈ چھپا تھا اول ہم اُس چھاپہ سے اُس عبارت کو نقل کرتے ہیں اور پھر اُس کی عبارت اور نیز اُس کے ترجمہ کی متعدد غلطیاں بتاتے ہیں

اُس چھاپہ میں عبارت مذکورہ اس طرح پر لکھی ہے۔ فقالَ زَوجُ حَلِیمَۃَ لَھَا قَدْ خَشِیتُ اَنَّ ھٰذَا الغلامَ قَدْ اُصِیبَ فَالحَقِیۃِ بِاَھلِہٖ فَاحْتَمَلَتْہُ حَلِیمَۃُ وَقَدَّمَتْ بِہٖ اِلیٰ اُمِّہٖ۔

اس عبارت کا جو لیٹن میں ترجمہ کیا ہے اُس کا ترجمہ اُردو میں اس طرح پر ہوتا ہے "تب حلیمہ کے

شوہر نے کہا کہ مجھ کو بہت خوف ہے کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کرلیا ہے۔ اس واسطے اس کو حلیمہ سے لے کر اُس کی ماں آمنہ پاس لے گیا اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع کا عارضہ یا بیہوش کرنے والی بیماری مراد لی ہے۔

اول تو ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کتاب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے جس لفظ کو اُمیب پڑھا ہے وہ اصیب ہے اور پھر ہم بتاتے ہیں کہ کتاب مذکورہ بالا کے مصنف نے جس لفظ کو بالحقیۃ پڑھا ہے وہ بھی غلط پڑھا ہے وہ لفظ فَالحِقیہِ ہے اور ترجمہ میں یہ غلطی کی کہ جب مترجم نے دیکھا کہ لفظ بالحقیۃ کے معنی عبارت کے مناسب نہیں ہو سکتے تو اُس کا ترجمہ بالکل چھوڑ دیا اور جب لفظ اُصیب پر پہنچا تو اس کا ترجمہ اخذ کیا اور جب کہ عبارت میں کسی شے ماخوذ کا ذکر تھا اور نہ اُس کا ذکر تھا جس سے اخذ کیا اور بلحاظ قواعد نحوی اور ربط عبارت کے اُن دونوں کا ہونا ضرور تھا اس لئے مترجم نے اٹکل پچو لفظ باھلہ سے الفاظ "کسی اپنے ساتھی سے" اور الفاظ "دماغی بیماری" کو یا "بیہوش کرنے والی بیماری" کو بڑھا دیا حالانکہ وہ اصل عبارت میں نہیں ہیں۔

اگر عبارت مذکورہ کو صحیح طور پر پڑھا جائے تو صحیح ترجمہ اُس کا یوں ہوتا ہے: "تب حلیمہ کے شوہر نے اُس سے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے پس اُس کو اس کے لوگوں کے پاس پہنچا دے۔ پس اٹھا لیا اُس کو حلیمہ نے اور لے آئی اُس کو اس کی ماں کے پاس۔ اہلِ عرب ایسے مبہم کلمات کو ایسی بیماریوں کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے جن کا سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا تھا اور غالباً اُن کا خیال تھا کہ کسی مخفی قوئے یا ارواح کا اثر ہے اور جن بیماریوں کا سبب ان کو نہ معلوم ہوتا تھا ان کو شیطان کے اثر کی طرف بھی منسوب کرتے تھے۔

قدیم اہل یونان اپنے توہمات مذہبی سے صرع کی بیماری جو ایک عجیب و غریب قسم کی بیماری ہے یقین کرتے تھے کہ دیوتاؤں یا خبیث ارواحوں کے اثر سے ہوتی ہے۔ اُسی بنا پر عیسائی مصنفوں نے لفظ اصیب سے بالتخصیص صرع کی بیماری سمجھ لی۔ حالانکہ ایسا سمجھنا عرب کے محاورہ کے برخلاف ہے کیونکہ عرب صرف صرع ہی کی بیماری کو لامعلوم اثر کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ایک چیز کو جس کا سبب اُن کو نہ معلوم ہوتا تھا مخفی قوئے یا شیطان یا جن کے اثر کی طرف منسوب کرتے تھے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ لفظ اصیب سے صرع کا عارضہ مراد لیا جائے۔

اس بیان کی تائید میں ہم ایک نہایت ذی علم اور ذی فہم غیر متعصب مصنف کی رائے کو نقل کرتے ہیں جو کہتا ہے کہ یہ "متواتر بیان کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضہ صرع لاحق تھا یونانیوں کی ایک ذلیل اختراع ہے جنھوں نے اس عارضہ کے لحوق کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس غرض سے منسوب کیا ہو گا کہ اُن کے اخلاقی چال چلن پر ایک دھبہ ہو جو عیسائیوں کی طعنہ زنی تنفر کا مستوجب ہو"۔

نہایت مشہور اور لائق مؤرخ یعنی گبن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صرعی حملوں کی نسبت یہ لکھا ہے۔

کہ یونانیوں کا ایک نامعقول اتہام ہے"۔ اور ایک اور مقام پر اسی مؤرخ نے لکھا ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عارضہ صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری کو تھیوفینیز زوناریں اور اور یونانیوں نے بیان کیا ہے اور ہانجر اور پریڈو اور مارکشی نے اپنے سخت تعصب کے سبب اُس کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر نگل لیا ہے۔ قرآن میں جو دو سورتیں ہیں جن میں سے ایک کا نام مزمل اور ایک کا نام مدثر ہے اُن میں سے صرع کی بیماری کی تاویل کرنی مشکل ہے۔ مسلمان مفسرین کا سکوت اور صرع کی بیماری سے ناواقفیت اُن کے قطعی انکار کی نسبت زیادہ تر قاطع اور مرجح ہے۔ اور آزادانہ رستہ آکلی گیگیز اور سیل نے اختیار کیا ہے۔

اب ہم اس غلط اور بے اصل اتہام پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضہ صرع لاحق تھا بلحاظ طب کے غور کرتے ہیں۔ چیمبرز سائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں دفعتًہ بیہوشی طاری ہو اور عضلاتِ تنفس کے تشنج اور سانس لینے کے منفذ کے بند ہونے سے اعصاب اختیاری بے اختیار شدت سے پھڑکنے لگیں اور کبھی کبھی سانس بالکل بند ہو جائے۔ اس بیماری کا مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اُس کا حافظہ جاتا رہتا ہے اور اُس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی اور ایسی مُردہ دلی اُس پر چھا جاتی ہے جو اُس کو دنیا کے باقاعدہ کاروبار سے معذور کر دیتی ہے۔ بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے اور تمام قوائے جسمانی میں ضعف اور ناطاقتی گھر کر جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مصروع کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ اسی کے ساتھ مصروع کے ذہن میں اپنے ضعف و نقاہت کا یقین بخوبی جم جاتا ہے اور مشقت طلب اشغال سے نفرت ہو جاتی ہے بالخصوص ایسے اشغال سے جن میں اُس پر عام اندازہ سے زیادہ نظر پڑیں۔

اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس امر کی تنقیح کریں کہ آیا یہ سب آثار یا اُن میں کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے کسی حصہ طفولیت سے لے کر وفات تک پائے گئے تھے یا نہیں۔؟

کوئی مؤرخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا کہ منجملہ آثار مذکورہ بالا کے ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا گیا تھا بلکہ برخلاف اس کے سب کے سب متفق اللفظ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست اور قوی تھے۔ خود سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "دو برس کے سن میں حلیمہ نے اُن کا دودھ چھٹایا اور اُن کے گھر لے گئیں اور آمنہ اپنے لڑکے کی تندرستی اور قوی ہیئت کو دیکھ کر جو آپ سے دو چند عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتا تھا اس قدر خوش ہوئیں کہ حلیمہ سے کہا ان کو پھر صحرا لے جا"۔ "لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرتؐ مضبوط و تندرست اور قوی الجثہ تھے۔ وہ بہت تیز چلا کرتے تھے اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے تھے۔ تمام عمر اُن کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں۔ اور اُن سب کو اُنھوں نے کمال صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ اُنھوں نے خدائے واحد کی پرستش و عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی

نظیر و مثال نہیں پائی جاتی اور علم الہیات کو ایسے پختہ و معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر جہان سے معدوم ہے اُنھوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسے کمال پر پہنچا دیا۔ جو اُس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُن ہی کی وساطت سے انسانوں کی بہبودی اور رفاہ کے واسطے وہ ملکی و مالی و دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا جو اپنے نوع میں یکتا و بے نظیر ہے۔ آنحضرتؐ ہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرہ عرب کو فتح کیا اور مختلف قبیلوں کو مجتمع کر کے ایک مضبوط اور طاقتور عظیم الشان قوم بنا دیا۔ جس نے اُس زمانہ کی مہذب دنیا کے ایک جزو اعظم کو ایک عرصہ قلیل میں مفتوح و مسخر کر لیا۔ کیا اس بات کا خیال کرنا قرین عقل و انصاف ہے کہ ایسے کارہائے نمایاں ایک لاچار اور ناتواں مصروع شخص سے عمل میں آئے ہوں گے؟ ایسے کارہائے نمایاں کا عمل میں آنا بجز اس شخص کے جس کے قوائے رُوحانی و جسمانی کامل صحیح و سالم ہوں اور کسی شخص سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے اور اُس کی ماہیت تائید ربانی پر دلالت کرتی ہے۔

سرولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر سایہ افگن دیکھکر متوحش ہوئی اور انجام کار اُن کو اُن کی ماں کے پاس پہنچانے کے لئے روانہ ہوئی"۔ اس فقرہ پر صاحب موصوف یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر اُس روایت میں کچھ صدق ہو تو غالبًا عارضہ سابق کے یعنی صرع کے آثار کے عود سے مراد ہوگی تعجب ہے کہ بادل کے سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے اور سرولیم میور صاحب نے اُس سے آنحضرتؐ کے عارضہ صرع کے آثار کا عود خیال کیا۔ اگر حلیمہ کی نسبت آثار صرع کا خیال فرماتے تو شاید زیادہ مناسب ہوتا۔ پھر دوسرے مقام پر صاحب موصوف بیان فرماتے ہیں کہ اُن کے دوروں سے جن کو حلیمہ صرع کی قسم کے حملے سمجھ کر ڈر گئی تھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں اُن مضطر حالتوں اور بیہوش کنندہ غشوں کے صریح آثار نمودار تھے جو نزول وحی کے ہوتے تھے اور شاید جن کے سبب اُن کے دل میں نزول وحی کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور اُن کے متبعین نے اُن اضطرابوں اور غشوں کو نزول وحی کا شاہد قرار دیا تھا"۔

سرولیم میور صاحب نے اپنی تمام کتاب میں ایسی روایتوں کو اپنی کتاب کی بنیاد ٹھہرایا ہے جن کی صحت خود اہل اسلام کے نزدیک مشتبہ اور غیر ثابت ہے۔ یہ روایت کہ آنحضرتؐ پر بادل کا سایہ رہتا تھا محض باطل ہے اگر ایسا امر فی الحقیقت واقع ہوا کرتا۔ تو آنحضرتؐ کے اکثر صحابہ و رفقا اس کا تذکرہ کرتے اور احادیث مستندہ میں اُس کا ذکر ہوتا۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے تمام معتبر حدیثوں میں اُس کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے بعض حدیثوں میں جو نماز کے بارہ میں ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر مثل دیگر اشخاص کے دھوپ کا پڑنا ثابت ہوتا ہے۔ غلط روایت کی اشاعت کے بے شمار اسباب میں سے ایک یہ سبب بھی ہے کہ شے مردیّہ کا اتفاقی وقوع ہونا۔ لہٰذا یہ امر از قبیل ممکنات ہے کہ کسی شخص نے پیغمبر صاحب کو اتفاقیہ ایک بادل کے ٹکڑے کے سائے

میں دیکھا ہو اور یہ ماجرا دوسرے شخص سے بیان کیا ہو اور دوسرے نے تیسرے سے کہا ہو اور اس طرح رفتہ رفتہ عام شہرت ہو گئی ہو اور آخرالامر عام اعتقاد ہو گیا ہو کہ بادل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ہمیشہ سایہ ڈالے رہتا تھا اس قسم کی روایتیں جن کی صحت کی کوئی سند نہیں ہے محققین علمائے اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کی ہیں۔

نزولِ وحی کے وقت اضطرار اور غشی کی روایتیں ویسی ہی نامعتبر اور بے سند ہیں۔ اُن روایتوں میں خود راویوں کے خیالات اور توہمات ہیں ہم نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ عیسائیوں کا اتہام آنحضرتؐ کو بیماری صرع کے ہونے کا صدق سے محض معرا ہے تاہم سر ولیم میور صاحب کی اس رائے کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرعی غشوں نے اُن کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا تھا اور ان کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا۔ تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر شخص مصروع جانتا ہو اپنے صرعی غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے جو اپنی قوم کی بُت پرستی کے استیصال کے واسطے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ جو اُس کی اُس بیماری سے واقف ہوں۔ اُس کے عزیز و اقارب اور جمیع اکابر عرب اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کر لیں اور ہر شخص اپنے دین آبائی سے منحرف ہو کر اُس کے قول و فعل پر ایمان کامل لے آئے۔

جن نامعتبر روایتوں پر عیسائیوں نے اتہام عارضہ صرع آنحضرت کی نسبت قائم کیا ہے وہ روایتیں زیادہ تر شق صدر کی روایتوں سے علاقہ رکھتی ہیں۔ ہم نے حقیقت شق صدر کو اپنے ایک خطبہ میں بیان کیا ہے اور جو غلطیاں واقعات کے بیان کرنے میں راویوں کو واقع ہوئی ہیں اُن سب کو دکھایا ہے۔ پس اُن کے جاننے کے بعد عیسائیوں کا یہ اتہام سر کے بل گر پڑتا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لے جانے کا حال لکھ کر اپنی والدہ کے لئے بخشش کی دعا مانگنے کا ذکر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ "یہ بات یعنی اُن لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے احکامات کی سختی اور شدت کی اُن لوگوں کے حق میں جو دین سے جہالت کی حالت میں مرے ہوں ایک عجیب مثال ہے۔" ہم اس روایت کی صحت اور غیر صحت کی بحث کو چھوڑ کر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اُن لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور انبیائے سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گئے ہوں کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے، بلکہ زندہ آدمیوں کو بُت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لئے ایک نہایت کارآمد اور عمدہ ذریعہ ہے۔

پس جو شخص کہ ایسا کرے اُس پر سختی کا الزام نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ بالا امر کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے تو رحیم عیسائی مذہب میں اُن لوگوں کے واسطے جو گو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں مگر حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں کونسا نرم فیاضانہ اور ترحم آمیز سلوک کیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ہماری خلاف توقع رحیم مذہب عیسائی میں غیر معتقدین کے لئے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے۔ اُس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایتھینیین خطبہ کو جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں بروز ہائے معیّن پڑھا جاتا ہے اور تمام اہل کلیسیا کی منظوری سے منظور ہوا ہے اُن سب عقاید کے بیان کرنے کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر خواہ نخواہ فرض ہے بالتصریح یہ لکھا گیا ہے کہ "یہ عیسوی عقیدہ ہے جس پر بدون اعتقاد رکھنے کے کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا"۔ پس جب کہ رحیم مذہب عیسوی کے بموجب ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے اور اس لئے کسی کی دعائے مغفرت بھی اُس کے حق میں مفید نہیں ہے۔ تو عیسوی مذہب کو اس باب میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے؟

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب میں کسی منشا سے اس روایت کو بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پر موجود نہ ہوتے تھے تو تمام خاندان اپنے کفایت شعار کھانے سے بھوکا اٹھتا تھا۔ لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے تھے تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا اور یہ فرماتے ہیں کہ اس سے عروج پذیر بنی کی بڑائی مظنون ہوتی تھی مگر اہل اسلام تو ایسی روایتوں کو معتبر نہیں سمجھتے اور نہ اُن کے معتبر ہونے کی کوئی کافی سند موجود رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کو تعجب آتا ہے جب کہ عیسائی ایسی روایتوں کو کسی اشارہ آمیز ارادہ سے نقل کرتے ہیں کیونکہ اُن کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ وہ متی کے باب ۱۴ ورس ۱۹ و ۲۰ کے اس بیان پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ "اُس نے (یعنی حضرت مسیح نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی اور اُن کو توڑا اور روٹیاں اپنے حواریوں کو دیں اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں اور اُن سب نے پیٹ بھر کر کھائیں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے اُٹھا لیا۔"

اس کے بعد سر ولیم میور صاحب ایک اور روایت لکھتے ہیں کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کو گئے تو بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جماعت میں سے اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ اُن کے سر پر ایک بادل سایہ ڈالے ہوئے چلتا تھا اور درختوں کی شاخیں اُن کی دھوپ روکنے کے واسطے جھک جاتی تھیں اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے اور بتلاش مہر نبوت اُن کے جسم کا معائنہ کیا۔

جس اشارہ سے کہ سر ولیم میور صاحب نے اس روایت کو لکھا ہے اُس کی نسبت ہم بیان کرتے ہیں کہ اگر یہ یقین کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ ملک شام کو بغرض تجارت گئے تھے تو یہ بات ہرگز قابلِ تعجب نہیں ہے کہ بحیرہ نے ایسا خیال کیا ہو کیونکہ اس وقت یہود اور نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ محققین علمائے اسلام اس روایت کو معتبر روایتوں میں نہیں سمجھتے۔ وہ روایت جس میں بحیرہ کا حال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر میں جانے کا ذکر ہے اُس میں یہ بیان بھی ہے کہ ابو طالب نے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو بمعیت و نگرانی حضرت ابو بکر اور بلال کے شام سے واپس بھیج دیا تھا۔ بخاری اور مسلم میں جو سب سے زیادہ معتبر حدیث کی کتابیں ہیں یہ روایت مذکور نہیں ہے مگر ترمذی اور دیگر کم محتاط محدثوں نے بشوق تمام اس روایت کو اپنی کتابوں میں لکھا ہے منجملہ اُن بہت سی وجہوں کے جن سے ان روایتوں کی نامعتبری کا کافی ثبوت ملتا ہے ہماری رائے میں ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کے قول کا جس کو خود سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے اور جس سے اس روایت کی نامعتبری بخوبی ثابت ہوتی ہے اس جگہ بجنسہٖ نقل کرنا کافی ہوگا اور وہ یہ ہے کہ ترمذی کی یہ روایت کہ ابو طالب نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو بکر اور بلال کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا اس لئے لغو اور مہمل معلوم ہوتی ہے کہ ابو بکرؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے اور بلالؓ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام کا حال ابو طالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بارہ برس کی تھی اور جس کی نسبت ہم نے ابھی بیان کیا کہ وہ صحیح نہیں ہے سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "زمانہ سابق کے منہدم اور اُجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب و غریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پُر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کو صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ کرنے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خوض کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پائدار اثر کر دیا تھا"۔

ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص خوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سر ولیم میور صاحب کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی کو دیکھکر اس قدر اثر پذیر ہوا تھا۔ بعد کو انہی چیزوں سے مخالفت اختیار کی صلیب کو توڑا مورتوں کو پھوڑا۔ اُن کی پرستش سے منع کیا اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا اور اُسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اُسی کو رواج کیا۔

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر پیدا کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بُت پرست لوگوں میں گھرا رہا صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذرتی تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں اور صلیبوں اور مورتوں اور اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے اُن کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارہ میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا وہ لڑکا بلاشبہ مادرزاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اُس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ نے یہ کہکر بشارت دی تھی کہ سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمھارے لئے ضرور ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مصطفےٰ تمھارے پاس نہیں آئے گا اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اُس کو تمھارے پاس بھیج دوں گا۔
